چسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
بر 2013
نگران اعلیٰ
راج رسول

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 43 • شمارہ 12 • دسمبر 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم...

ہم برسوں کی دہلیز پر آ پہنچے ہیں۔ سال موجود کو الوداع کہنے اور سالِ نو کو گلے لگانے کا مرحلہ ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں یہ اس سال کا آخری شمارہ ہے گر قبول افتد... ایرانی صدر کو بارک اوباما کے فون کو شمارۂ اکتوبر کے اسی صفحے پر ایک بڑی پیش رفت قرار دے کر خوش گمانی کا اظہار کیا گیا تھا اور یہ گمان آخرکار حقیقت میں بدل ہی گیا۔ عالمی چوہدریوں اور ان کے سرخیل سے چھ ماہ کے لیے ایران کا ایک ابتدائی معاہدہ ہوگیا ہے۔ برف پگھل رہی ہے، ایک قوم کے عزم کے سامنے سارے ہی زبردست جھکنے پر آمادہ دکھائی دے رہے ہیں۔ اس معاہدے کی کوکھ سے ہمارے بھی ایک سنگین مسئلے کا حل برآمد ہوتا نظر آرہا ہے یعنی گیس پائپ لائن... دعا کریں کہ اونچ نیچ کے باوجود حالات کا یہ رخ یوں ہی رہے... ہمارے گیس اور بجلی کے قومی بحران کے حل کی فی الوقت یہی کلید نظر آتی ہے... عالمی منظرنامے کے ساتھ قومی افق پر بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ خاصے تردد اور تفکر کے بعد نئے سپہ سالار اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کا تقرر کردیا گیا ہے، پاکستان کے نئے منصفِ اعلیٰ کے نام کا بھی اعلان کیا جاچکا ہے۔ ملک اس وقت جس خوفناک داخلی صورتِ حال سے دوچار ہے، اس کے تدارک کے لیے انقلابی سوچ اور راہِ عمل کی اشد ضرورت ہے، ہلکی پھلکی نشتر زنی سے یہ زخم بگڑتے ہی جارہے ہیں۔ ہم سب کو بارگاہِ ایزدی میں التجا کرنی چاہیے کہ آنے والے دنوں میں غیروں اور اپنوں کے ہاتھوں ہماری زمین ہمارے ہی لہو سے داغ دار نہ ہو... نسل، مذہب اور فرقوں کے نام پر خوں ریزی نہ ہو اور ارضِ پاک سے محبت کرنے والے بے خوف و خطر اپنے شب و روز کی اُن پرانی رونقوں کو واپس لاسکیں جن کی دید کے لیے اب ہر دردمند آنکھ ترس گئی ہے... بہت ہوگیا، اب پوری قوم کو اجالوں کے سکھ اور آنے والی جاڑوں کی اندھیری راتوں کے چین کی ضرورت ہے۔ قوم کے پانچوں ستونوں کو یک جا ہوکر اس سمت میں کڑی محنت کرنی ہوگی۔ اس برس سب کچھ ہی بدل چکا ہے۔ پارلیمنٹ نئی ہے، حکمراں نئے ہیں، عدلیہ اور فوج کے سربراہان بھی خوش اسلوبی سے تبدیل ہوچکے ہیں اور ان سب پر نظر رکھنے کے لیے ابلاغِ عامہ کے ذرائع پہلے سے کہیں زیادہ مستعد اور فعال دکھائی دے رہے ہیں۔ ریاست کی ان پانچوں انگلیوں نے مل کر ایک زبردست مکے کا روپ دھار لیا تو سارے خوف اور اندیشے سایوں کی طرح تحلیل ہوجائیں گے۔ اندیشوں اور تفکرات کے بادلوں میں... ایک اچھی خبر کہ پاکستان نے گیارہ برس بعد جنوبی افریقہ کے خلاف اس کی اپنی سرزمین پر ایک روزہ کرکٹ سیریز جیتی ہے۔ اس فتح پر ٹیم کے ساتھ پوری قوم بھی مبارک باد کی حق دار ہے... ہم وطنوں کو قائدِاعظم کا یومِ پیدائش اور عیسوی مذہب سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں کو کرسمس کی بے پناہ خوشیاں مبارک ہوں...

خوشی خوشی اب ہم چلتے ہیں اس ماہ کی نئی محفل میں جہاں سب ہی باؤنسر اور تنقید کررہے ہیں۔

میانوالی سے احسان سحر کی ناپسندیدگی "ہمیشہ کی طرح جاسوسی 3 کو مل گیا جس طرح دن آتا ہے، گزر جاتا ہے، کبھی خوشگوار گزرتا ہے تو کبھی ناخوشگوار۔ اس طرح جاسوسی بھی ہر ماہ ایک ہی ذات کا جاسوسی مختلف روپ میں ہاتھوں میں آتا ہے اور اس ماہ جاسوسی ہمارے لیے خوشگوار یادیں چھوڑ گیا لیکن میں ذکر کرکے خط لمبا نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ خط جاسوسی کے لیے ہے میری ذات کے لیے نہیں۔ ٹائٹل کی طرف نظریں ملائیں۔ ہمیشہ کی طرح صنفِ نازک ہمایوں جیسے رومیو کو متاثر کرتی نظر آئیں۔ پستول سے دھواں گزری عید کی یادیں تازہ کررہا تھا۔ محفلِ چنانچہ میں پہنچے جہاں ہر کوئی اپنے آپ سے بڑھ کر اعلیٰ نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے لیکن وہی حساب ہے کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور۔ اس بار انور یوسف زئی اپنی خواہش کے ساتھ اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ بشریٰ افضل! کہیں ہمایوں خوشیوں کے جھولے میں جھولتے جھولتے جھول ہی نہ جائیں۔ (اللہ نہ کرے... کیسی بدفالیں منہ سے نکالتے ہیں) سید اکبر بادشاہ جی! پھولوں کی تمنا ہو تو کانٹوں کو نظرانداز نہیں کرتے۔ اس ماہ پہلے نمبر پر محی الدین نواب نے چاند کی طرح نمودار ہوکر مزہ دوبالا کردیا۔ ڈپلومیٹ کے ساتھ نہیں، آتش زیرِ پا کے ساتھ۔ عمر دراز نے محبت حاصل کرنے کے لیے مجرمانہ طریقہ اختیار کیا یا کرنا پڑا۔ پر کچھ ہضم نہیں ہوا۔ اتنی واردات نہیں کرتا، انجلی جس کو بلا کر رکھنا مصنوعی لگا، البتہ مضبوط گرفت اور دیگر کرداروں کی دلچسپی کی وجہ سے طویل کہانی ذائقے دار رہی۔ جواری، ابھی تک اس کی سمجھ نہ آسکی۔ نہ سر کی نہ دم کی۔ دوسرے سلسلوں کی طرح مصنف نے پھر مظلوموں کی فوج اکٹھی کرنی شروع کردی ہے اور ابھی تک نانا یا نانو رین کی تلاش میں اٹکا ہوا ہے۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہو کیا رہا ہے۔ بس کہانی دوڑے جارہی ہے۔ اچانک ہی جن کی طرح ایک مظلوم ڈھونڈ لیا تو بھی دوسرا، پھر آسانی سے کوٹھیوں پر کوٹھیاں حاصل ہوتی رہیں، کوئی نیا پن نہیں ہے۔ اب پھر پہلے کی طرح یہی سات افراد اکٹھے ہوکر ہر ماہ بور کرنے آتے رہیں گے۔ مداخلت، تحریر ریاض اس ماہ متاثر نہ کرسکے۔ امید لگائے بیٹھے تھے کہ باریک بینی سے کسی کیس کا سراغ لگایا جائے گا بلکہ سب الٹا ہوا۔ اس کے برعکس کامیابی پھر بھی عورت کی ہی ہوئی۔ گرداب میں اسلم نے کامیابی حاصل کرلی ہے، دیکھتے ہیں جنگل کے دشوار گزار راستوں سے کیسے ہمت کرکے نکلتا ہے۔ اصل امتحان تو اب شروع ہوگا۔ راجا اور جلیل پھر جی کے ہاتھوں بے وقوف بن گئے۔ پر اتنی زیادہ دلچسپی اس ماہ پیدا نہیں ہوئی جتنی پہلے ہوئی تھی۔ رنگوں کی بات ہو تو پہلا رنگ کچھ خاص نہ لگا۔ جولیا کا کردار بھی مصنوعی لگا۔ پہلے رنگ میں دلچسپی اور سسپنس نہ ہونے کے برابر، رنگ پھیکا سا لگا سوری۔ دوسرا اسامہ جلیل سید نے تھوڑا موڈ فریش کردیا۔ جذبات میں ڈوبا ہوا طاہر کا سفر اذیت ناک انجام سے دوچار ہوا۔ دھماکے میں بچ جانا کچھ ہضم نہیں ہوا۔ پھر بھی آپ چھائے رہے۔" (اور آپ پڑھتے رہیں ہم... شکر بجالاتے رہیں گے، خوش)

چتوکی سے ایف ایم کی بھونچالی کیفیت "جاسوسی میں پہلا محبت نامہ پیش کررہی ہوں۔ (ویلکم) خط لکھنے کا مقصد مغل انکل کو کچھ یاد کرانا، التجا کرنا ہے۔ یہ سب کچھ للکار پر تبصرہ کرتے ہوئے کروں گی۔ آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے اس لڑکی کو اتنے ماہ گزر جانے کے بعد کیا سوجھی تو بتاتی چلوں۔ (ہاں

بتاؤ... کیوں سوجھی اور کیا سوجھی) کچھ معروفیات، کچھ بلیک لسٹ کا ڈر اور کچھ دوسری وجوہات۔ انہی سوچوں میں گرمی گزاری۔ برسات نے ڈیرے ڈالے اور اب سردیاں... بالآخر اک نئے عزم کے ساتھ جذبات کی بوند بوند روشنائی سے قلم تر کیا اور کاغذ کے سینے پر الفاظ موتیوں کی صورت بکھرتے چلے گئے۔ سب سے پہلے سرورق پر تبصرہ۔ ذاکر انکل مجھے لگتا ہے آپ کے چشمے کا ایک نمبر بڑھ گیا ہے یا پھر آپ کے شہر میں خوب صورت لڑکیوں کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ کیونکہ پہلے تو صرف مرد حضرات پر خاص کرم تھا کہ ان کی تصویر روتے ہوئے بچے کو دکھائیں تو وہ بھی رونا بند کر دے مگر آہستہ آہستہ۔ اب اپنی کرم نوازی صنفِ نازک میں بھی منتقل کر رہے ہیں۔ مجال ہے جو کوئی اچھی تصویر بناتے ہوں۔ سرورق کے بعد انٹری دی میدانِ جنگ میں، جس میں ہر کوئی دوسرے پر ڈرون حملے کر رہا ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں سب سے پہلے راج بھیا (ہمایوں سعید راج)، ایمان بجوا اور تفسیر لالہ کے خط ڈھونڈتی ہوں۔ ان تینوں میں سب سے بہترین خط راج بھیا کا ہوتا ہے۔ راج بھیا! منگنی مبارک ہو۔ آپ کی بینا انشاء اللہ آپ کے لیے دعا گو رہے گی۔ (بہن شادی میں نہیں آئے گی؟) اب بات ہو جائے مغل انکل کی للکار کی۔ للکار کو پڑھنے کے بعد کی جذباتی کیفیت بیان کروں گی۔ میں نے بھائی سے جاسوسی مانگا تو انکار کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ بھی تم نہ ہی پڑھو تو بہتر ہے ورنہ رو رو کر پاگل ہو جاؤ گی۔ ان کی بات سنتے ہی دل کی دنیا ویران ہونے لگی۔ آخر کار انہوں نے اس شرط پر ڈائجسٹ دیا کہ روؤں گی نہیں مگر جب میں عشا کی نماز سے فارغ ہو کر پڑھنے بیٹھی تو پھر میری حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ عمران کی موت کے سین پر تو ایسا لگ رہا تھا میرا دل بند ہو جائے گا۔ بار بار صاف کرنے کے باوجود آنکھیں تھیں کہ برستی چلی جا رہی تھیں۔ بھائی پاس بیٹھے تسلیاں دیے جا رہے تھے۔ ان کی ہر تسلی کے جواب میں میری ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ زبان صرف ایک لفظ ادا کیے جا رہی تھی۔ مغل انکل نے اچھا نہیں کیا۔ ہیرو بھائی کے علاوہ پوری دنیا کو اڑا دیتے مگر انہیں رہنے دیتے۔ بعض اسٹوریز کے کردار، کردار نہیں رہتے۔ وہ ہماری زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے بنا جینا محال ہو۔ ہیرو بھائی بھی ایسا ہی کردار تھے۔ مغل انکل یہ سب لکھنے کا مقصد صرف ایک درخواست ہے۔ پلیز، آئندہ ایسا کچھ مت کیجیے گا۔ ورنہ اب کی بار برداشت نہیں کر پاؤں گی۔''

لاہور سے زویا اعجاز کی یادآوری ''جاسوسی ساتویں کوشش میں پانچ نومبر کی اُداس دوپہر میں ملا تو سکھ کا سانس آیا۔ ٹائٹل پر عید مبارک کا اسٹائل خاصا آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکا ہے کچھ جدت ہونی چاہیے جی اب۔ تاہم چاند اور تارے کافی پُرکشش تھے۔ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کبھی تو ہم بھی آئیں گے جی ٹاپ پر۔ اس بار محفل سے کئی جانے پہچانے نام غیر حاضر تھے۔ آتش زیر پا کی صورت میں نواب صاحب کی انٹری کافی خوشگوار لگی۔ ان کے قلم نے اپنے مخصوص تیکھے اور کٹیلے انداز میں خوب نشتر زنی کی۔ کلپنا کے کردار نے ثابت کر دیا کہ دشمن اپنی عیاری اور منافقت میں لاثانی ہیں۔ گرداب کافی تہلکہ انگیز رہی۔ جاوید علی کا جیالا کردار بہت متاثر کن ہے۔ کہانی میں اس مرتبہ سہ طرفہ ٹوئسٹ نظر آئے۔ عائشہ کے پاکستان آنے کے آثار محسوس ہو رہے ہیں۔ جواری کی یہ قسط کافی طویل رہی۔ سلونی اور انور علی کے کردار کچھ مشکوک لگ رہے ہیں۔ خاور یقینی طور پر کسی نئے بھنور میں پھنس چکا ہے۔ (یہ تو احمد اقبال کو پتا ہو گا) شاہین ونرگس موضوعاتی اعتبار سے اچھی تھی مگر پلاٹ اور کردار نگاری محدود اور کمزور تھے۔ زمین زادہ پیچیدہ ازدواجی نفسیات کی زبردست عکاس تھی۔ افشاں کے کردار کے کچھ پہلوؤں سے مکمل انصاف نہیں ہو پایا۔ یادش بخیر میں جلیل اور راجا کی شاندار واپسی نے دل خوش کر دیا۔ ان کی ناکام مہم نے بھی بہت محظوظ کیا۔ اب شامی اور تیمور کی آخری صفحات میں آمد کا انتظار ہے۔ مترجم کہانیوں میں قابلِ علاج، آخری قہقہہ اور مداخلت کے انجام بہت عمدہ تھے۔ کترنوں میں محسن مصطفی کا انتخاب بہترین تھا۔ آخر میں نیا ہجری سال سب کو مبارک ہو۔''

ملک سعید، چکوال سے حاضری دیتے ہیں ''مختلف رنگوں سے مزین سرورق اور اس پر دلکش انداز میں لکھا ہوا عید مبارک بہت اچھا لگا۔ کرسیِ صدارت پر تشریف فرما انور یوسف زئی کو مبارک باد۔ ہمایوں سعید میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ وہ زمانہ گیا جب محبت ایک احساس کا نام تھا۔ آج کل محبت تو بس۔ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ (کہاں ہیں؟) کہانیوں میں سب سے پہلے بات ہو جائے جواری کی جہاں اس دفعہ چودھری انور کا کردار پڑھنے کو ملا۔ قسط اچھی رہی۔ گرداب میں سلو اور شہریار نے آخر اشوک کو ٹھکانے لگا دیا۔ یادش بخیر میں بھی نے جلیل، راجا، مس حسینہ اور جانی چڑیا کو ڈبل کراس کیا۔ مریم کے خان کی قابلِ علاج زبردست تحریر تھی۔ آتش زیر پا اور سرورق کی دونوں کہانیاں اچھی تھیں لیکن شاہین ونرگس کا اینڈ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ مکافات اور مداخلت بھی اچھی بلکہ زبردست تحریریں تھیں۔ گمشدہ وقت کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔'' (تو ہمایوں سعید سے سمجھ لیں)

اٹک سے بشیر احمد خان کی درخواست ''میں عرصہ 6،7 سال سے جاسوسی ڈائجسٹ کا مستقل قاری ہوں۔ مجھے اس میں طبع زاد کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ مغربی کہانیوں کے ترجمے میں بالکل نہیں پڑھتا۔ ان کا کوئی مزہ نہیں آتا کیونکہ وہ ہمارے ماحول اور ثقافت سے لگا نہیں کھاتیں۔ (مغربی معاشرے میں گھومتی ان تحریروں میں انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی تو عیاں ہوتی ہے۔ اس سے تو انکار ممکن نہیں) اس لیے آپ سے التماس ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ میں طبع زاد کہانیاں زیادہ سے زیادہ شامل کیجیے اور سرورق کی کہانیاں بھی دو کے بجائے تین کر دیجیے جس طرح شروع شروع میں ہوتا تھا۔ اس طرح کم از کم چار کہانیاں تو پڑھنے کو ملیں گی۔ تین سرورق کی کہانیاں اور ایک پہلی کہانی۔ امید ہے آپ میری گزارش پر ضرور عمل کریں گے۔''

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی زیر، زبر، پیش ''آج کل معروفیات کا یہ عالم ہے کہ اپنی پڑوسن سے بات کرنے کا وقت نہیں مل رہا اس لیے محفل میں بھی شرکت کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے مگر منظرِ عام سے غائب ہو جاؤں تو میری پڑوسن کا کیا بنے گا جو اتنے شوق سے میرے تبصرے پڑھتی ہے۔ جاسوسی ہم کو اس دفعہ نومبر کی پانچ تاریخ تک ہی فراق میں مبتلا کر سکا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ اپنی صدر رنگ بزم میں پہنچے تو مدیرِ اعلیٰ کا متاثر کن اداریہ ملاحظہ کیا۔ خطوط کا سرسری جائزہ لیا۔ منصبِ صدارت پر انور یوسف زئی نے ایک ماہ کے لیے وقتی تسلط قائم کیا۔ ہماری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ زویا اعجاز نے اس دفعہ اختصار پر ہی اکتفا کیا اور خوب کیا۔ بنوں سے ہمایوں سعید، آپ جب مجھے پیارے کاظمی صاحب کہتے ہیں تو مجھے اپنی نامعلوم زوجہ کی یاد آنے لگتی ہے۔ پتا نہیں کہاں وہی چاول کھا رہی ہوگی وہ بھی شکر ڈال کے۔ باقی فنِ مزاح پر میری معلومات میں اضافہ کرنے پر تہِ دل سے پاکستانی صدر ہوں۔ میری کم علمی میں اتفاق سے مزاح کا یہ نکتہ بھی آیا ہے کہ اس میں ذہنی استعداد جسے عام قاری میں مینٹل اپروچ کہتے ہیں یہ بھی جزو لازم ہے۔ ہر قسم کا مزاح ہر

قسم کے بندے یا دماغ کے لیے نہیں ہوتا۔ محترمہ بشریٰ افضل آپ میرا تبصرہ غور سے پڑھ کے بتائیں کہ میں نے کب اور کس مقام پر معافی تلافی کی؟ بہت پیارے دوست سید اکبر شاہ کی مختصر حاضری اچھی لگی۔ صبا گل! آپ کا تقریباً شکریہ۔ عروج ناز! آپ کو میں انگارے چباتا کہاں نظر آ گیا؟ میں تو آپ کو بھی خواب میں بھی نظر نہ آؤں کیونکہ آپ میری سوتیلی پڑوسن بھی نہیں۔ عادل خان خٹک اور کسی کا تبصرہ دیکھ کر بغلیں بجانے کا کیا فائدہ؟ اس لیے اپنے تبصرے پر ہی اکتفا کر لیتا ہوں۔ جعفر حسین آپ کے لیے غالباً شیکسپیئر نے پنجابی میں ایک مقولہ لکھا ہے کہ 'فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔'' محسن علی موم آپ کی منظر کشی مدتوں یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کبیر عباسی صاحب نے اس دفعہ کہانیوں پر عمدہ تبصرہ کیا اور محفل پر تبصرہ کرنے سے کسی مستند معالج کے مشورے پر پرہیز کیا۔ امید ہے اگلی دفعہ افاقہ ہوگا۔ اوکاڑہ سے برادر تفسیر عباس بابر کا بہترین تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ بے شک اہلِ ظرف کا اسلوب ہمیشہ جداگانہ ہی ہوتا ہے۔ کہانیوں میں محی الدین نواب کی آتش زیر پا کا اس دفعہ سب سے پہلے مطالعہ کیا۔ عمر دراز کا کردار بہترین تھا مگر باقی تمام کہانی میں جا بجا دیوتا کی جھلک نظر آتی رہی۔ اس کے بعد احمد اقبال کی جواری کی طرف قدم بڑھائے۔ انور علی کی قید ناگہانی سے نجات اور پھر اکبر علی کی قید و فرار تک یہ قسط دلچسپی کا سامان لیے ہوئے تھی۔ ریشم کا کردار نورین کے مقابل آتا ہوا لگ رہا ہے۔ گرداب میں شہریار اور سلو انتہائی نازک صورتِ حال میں اگلے ماہ تک کے لیے انتظار کی سولی پر لٹکا گئے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ شاہین ونرگس آغاز میں جس قدر دلچسپ اور جاندار لگا تھا، کافی مزہ آیا۔ مگر میں آخری صفحہ پڑھنے کے بعد باقی آئندہ ماہ کے الفاظ تلاش کرتا رہا۔ ایک تو کہانی عجلت میں سمیٹی گئی اور دوسرا بہت ہی عجیب انداز میں کہانی کو ختم کر دیا گیا۔ جمال دتی کی شیطان سیجا جرم و سراغ رسی کی بہترین کاوش لگی۔ انسان اپنے کہے ہوئے الفاظ کی زد میں کس طرح آ جاتا ہے، یہ خود بھی اسے معلوم نہیں ہوتا۔ کاشف زبیر اس دفعہ سب پر سبقت لے گئے۔ جلیل اور راجا کو اس دفعہ بھی نے ہاتھ دکھا دیا۔ کہانی سطر سطر مزاح سے بھرپور تھی۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے اور اگر ہمارا تبصرہ پیش کر دیا گیا تو ہم زبر ہو جائیں گے۔''

سکھر سے آغا فرید احمد خان لکھتے ہیں ''اس ماہ جاسوسی نے بہت انتظار کرایا۔ آخر 6 نومبر تک ہمارے ہاتھوں سے نہ بچ سکا۔ سرورق کے کیا کہنے، حسینہ تو بلاشبہ حسینہ ہی ہے۔ اندازِ نظر بھی قیامت ہے، صنفِ وجاہت کے پسٹل سے دھواں نکل کر بڑی خوب صورتی سے عید مبارک بنا رہا ہے۔ آسمان پر جگمگ جگمگ ستارے خوشی کی نوید سنا رہے ہیں۔ اس ماہ کے سرورق کے لیے ذاکر انکل کو پورے نمبر دیتے ہیں۔ محفل میں پہلا خط انور یوسف زئی کا ہے، انور بھائی کو مبارک باد۔ زویا اعجاز! تم تو اس کی بھی کاپی کرتی ہو جو چوری چوری گھر میں رکھا دودھ پی جاتی ہے۔ بشریٰ افضل! کیا واقعی شادی کے بعد بندہ خوشیوں کے جھولے میں جھولتا ہے؟ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر اکبر شاہ، سعید راج کو بیسٹ آف لک کیوں کہہ رہے تھے اور تابی اور بالو اظہارِ افسوس کیوں کر رہے تھے؟ صبا گل! یہاں نئے چہروں کے ساتھ ساتھ پرانے چہرے بھی نام بدل بدل کے آئے ہیں، یقین نہ آئے تو سعدیہ بخاری سے پوچھ لیں۔ سعدیہ اینڈ کمپنی! پرانے تبصرے پر اس بار تو چھوٹ مل گئی، مجھے نہیں لگتا کہ آئندہ بھی یہ چھوٹ انجوائے کر سکو گی، سو پہلی فرصت میں رسالے کو ٹائم پر منگوا کر پڑھیں اور تبصرہ کریں، مشورہ مفت ہے۔ صفدر بھائی! ہمارے نیازی صاحب کے تبصرے ہمیشہ آپ کو دوسرے سے مختلف ہی ملیں گے۔ عروج ناز! آپ اور کتنے سال تک اپنی 18 ویں سالگرہ منائیں گی؟ جعفر حسین بھائی! پہلے آپ ردھم میں تبصرے کیا کرتے تھے اب وہ ردھم نظر نہیں آتا، کیا بات ہے؟ اے کیو بھائی، پلیز پورے نام کے ساتھ انٹری دیں۔ محسن موم بھائی! شکیل کاظمی کی پڑوسن کی نشست و برخاست پر اتنی نظر نہ رکھیں۔ کبیر عباسی بھائی! اچھا تبصرہ کیا کہانیوں پر۔ تفسیر عباس بابر! سعدیہ کا راز فاش کیوں کیا؟ کہانیوں کی ابتدا گرداب سے کی۔ شکر ہے کہ اسلم ماہ بانو کو اس معصیت سے نکال لایا اور اس معصیت کدے کو بھی نیست و نابود کر دیا۔ سرورق کی پہلی کہانی شاہین ونرگس درمیانے درجے کی کہانی ثابت ہوئی جس نے خاص تاثر نہیں چھوڑا البتہ دوسرا رنگ زمین زادہ کا پلاٹ بہت خوب صورت تھا لیکن اگر تھوڑا خیال کیا جاتا تو بہتر سے بہترین ثابت ہو سکتی تھی، انجام کچھ تشنہ تھا۔''

سرگودھا سے راجا اسلم حیات کے خیالات ''جاسوسی اس دفعہ ہلکی پھلکی بوندا باندی میں 6 تاریخ کی صبح موصول ہوا جس سے خوب صورت موسم کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ فہرست کا خوب صورت انداز اور وہاں موجود محی الدین نواب اور جلیل کا نام اس کو مزید چار چاند لگا رہا تھا۔ محفل پاؤ ہو کی صدارت انور یوسف زئی صاحب بڑی شان سے سنبھالے بیٹھے تھے، مبارکاں جی۔ تابی اینڈ بالو آپ کے نام کے اشتراک کی مناسبت سے ہمیں للکار یاد آ گئی۔ البتہ آپ کا تبصرہ جاندار تھا۔ عروج ناز صاحبہ! یہ کیا لکھ دیا کہ آپ پچھلے اٹھارہ سال سے اپنی اٹھارویں سالگرہ منا رہی ہیں۔ عادل خٹک صاحب! آپ کے ہمایوں سعید کے بارے میں خیالات سے ہم بھی متفق ہیں۔ قیصر بھیا! ہمارا مقصد کسی کو ہرٹ کرنا نہیں ہوتا۔ یہ نوک جھونک ہی تو محفل کی جان ہے۔ بشریٰ آپا ہمارے لیے بھی قابلِ احترام ہیں۔ اس کے علاوہ کبیر عباسی، تفسیر عباس، ہمایوں سعید اور محسن علی موم کے تبصرے شاندار تھے۔ ابتدائی صفحات پر نواب صاحب کی اپنے مخصوص انداز میں محبت اور ایکشن سے بھرپور کہانی بہت پسند آئی جس میں انہوں نے انڈر ورلڈ کی دنیا کی بھی سیر کروائی۔ گرداب کی یہ قسط بہت شاندار رہی۔ لگتا ہے جاوید نے بارڈر کراس کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شہریار اور سلو اپنی مہم اور ڈیل مکمل کر چکے ہیں اور اب پاکستان واپسی کی تیاریوں میں لگ جائیں گے۔ جواری بھی اب ردھم میں آ گئی ہے۔ اس بار خاور نے بھی کچھ ہاتھ پیر چلائے ہیں۔ رنگوں میں دوسرا رنگ بازی لے گیا۔ مصنف کا الفاظ کا چناؤ اور اندازِ بیاں بہت زبردست تھا۔ کاشف زبیر کی جلیل سیریز کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ اس بار جلیل بھی خالی ہاتھ ہی رہا۔ شنو کی کمی محسوس ہوئی۔ مغربی کہانیوں میں مریم کے خان کی قابلِ علاج پہلے نمبر پر رہی۔ دوسرے نمبر پر تنویر ریاض کی مداخلت رہی۔ شیطان سیجا میں فادر ڈیوٹ نے ایمی کو اپنی شیطانی ہوس کا نشانہ بنا ڈالا۔ اس کے علاوہ مکافات، شعبدہ گر اور آخری قہقہہ بھی خوب رہیں۔''

آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی حاضری ''نومبر 2013ء کا جاسوسی اس وقت ہاتھوں میں ہے۔ کب اور کیسے ملا، یہ شکایت لاحاصل ہے۔ سرورق کی حسینہ گو بڑی عمر کی ہے پر پھر بھی خوب جچ رہی ہے۔ بیک سائڈ پر ایک خوب صورت سا بندہ بدصورت پستول سے کسی کا نشانہ لیے ہوئے ہے۔ پستول سے نکلتا دھواں، چاند سے جا کر ملا ہوا ہے اور اس طرح چاند اور پستول کے درمیان ''عید مبارک'' کے الفاظ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ خیر مبارک۔ نکتہ چینی میں پہلے نمبر پر انور یوسف زئی براجمان ہیں۔ مختصر پیرائے میں لکھا گیا جامع تبصرہ، ویلڈن زویا۔ ہمایوں سعید صاحب! آپ بڑے ہیں، اس

لیے آپ کو کچھ نہیں بولوں گا۔ بس اپنے الفاظ پر تھوڑا سوچیے گا ضرور۔ عروج ناز! آپ یہ اٹھارھویں سالگرہ کب سے اور کتنی بار منا چکی ہیں۔ اینڈ آ گئے کب تک کا پروگرام ہے۔ مری سے کبیر عباسی ہمیشہ کی طرح اپنے شوخیانہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ کا تبصرہ ہمیں پسند ہے جناب، مائنڈ نہیں کرتا۔ سعدیہ سید اور شکیل کاظمی کی کمی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے حسب عادت گرداب کا مطالعہ کیا۔ اسلم کا ماہ بانو کو بازیاب کرنا اور امریکا کے بنائے ہوئے خفیہ نیٹ ورک کو تباہ کرتے سے دلی مسرت ہوئی۔ شہریار اور سلو بھی فل ایکشن میں نظر آئے۔ مجموعی طور پر یہ قسط شاندار رہی۔ جواری بھی روٹین میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ خاور جب حویلی میں قید تھا تو اس نے حویلی کا پورا نقشہ کیسے کھینچ لیا۔ گیراج میں کھڑی گاڑیاں، گیٹ، دروازے، پھول، کیاریاں سب کچھ اس نے ترتیب سے بیان کیا جبکہ تہ خانے سے اسے صرف چمکتا چاند ہی نظر آ رہا تھا۔ شاہین و نرگس، سرور اکرام کی کہانیاں مجھے بہت کم پسند آتی ہیں اور حالیہ اسٹوری بھی ان میں سے ایک ہے۔ زمین زادہ، ساحر جمیل سید، واقعی ساحر ہیں۔ کہانی نے اپنے شکنجے میں ایسا جکڑا کہ اردگرد کا کوئی ہوش نہ رہا اور اسٹوری کا اختتام۔ طاہر کے حوالے سے اتنا ہی کہوں گا کہ بےبسی بہت بڑی بلا ہے اور اگر ساتھ مفلسی بھی ہو تو طاہر جیسے لوگ جنم لیتے ہیں آتش زیر پا، محی الدین نواب کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ وہ ڈائجسٹ کی دنیا کے حقیقی نواب ہیں۔ کافی عرصے بعد انہیں پڑھا اور غیر حاضری کے سارے گلے شکوے دور ہو گئے۔ مختصر کہانیوں میں ہمیشہ مریم کے خان کو پہلے پڑھتا ہوں۔ قابل علاج میں انہوں نے بہترین علاج ڈھونڈا۔ شریف لوگ ہمیشہ شریف اور سستا علاج ہی ڈھونڈتے ہیں۔ جیسی اور کلائیڈ کو اتنا ڈرایا گیا کہ وہ اپنی نسلوں کو بھی نصیحت کر کے جائیں گے کہ کسی کو بلیک میل نہ کرنا۔“

کوٹلی آزاد کشمیر سے فہد علی جنجوعہ کا تبصرہ ”نومبر کی برستی بارش میں گرما گرم چائے کا کپ، بینگن کے پکوڑے اور جاسوسی کا سنگ ہو تو اس سے اچھا منظر اور کیا ہوگا؟ جی ہاں جناب اور اس منظر سے ہم نے جی بھر کر لطف اٹھایا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر دوڑائی۔ جہاں ایک ماہ جبیں جس کی شکل مہوش حیات (پاکستانی ایکٹریس) سے ملتی جلتی تھی، نظر آئی۔ اس کے پیچھے ایک پستول بدست شخص جس کی شکل واضح نہ تھی، نظر آیا۔ ذاکر انکل سے ایک گلہ ہے کہ وہ اپنی صنف یعنی صنفِ وجاہت کی کوئی اچھی سی تصویر کیوں نہیں بناتے۔ ٹائٹل کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد بغیر بریک لگائے ہم پہنچے اپنی پسندیدہ محفل چینی نکتہ چینی میں جہاں خلافِ معمول اس مرتبہ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ ماہا ایمان کی عدم موجودگی تھی۔ اس مرتبہ کرسی صدارت کے حق دار انور یوسف زئی ٹھہرے جن کو ہماری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ سید عبادت کاظمی صاحب! غالباً آپ کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے وابستہ ہیں تبھی تو آپ جناب کسی حافظ نیوز اسٹال کی ایڈورٹائزنگ کر رہے تھے۔ محترمہ صبا گل اپنے یاد نہ کیے جانے پر افسردہ نظر آئیں۔ محترم صفدر معاویہ صاحب نے تو چاپلوسی کی حد ہی کر دی۔ آپ جناب نے مظہر سلیم صاحب کو جناب عزت مآب قبلہ بھائی مظہر سلیم صاحب ہی کہہ دیا۔ اب کچھ بات ہو جائے اس ماہ کے فن پاروں کی۔ سب سے پہلے بات ہو جائے گرداب کی۔ لگتا ہے یہ قسط وار کہانی اپنے انجام کی طرف گامزن ہے۔ شہریار اور سلو یقیناً اگلی قسط میں ڈاکٹر فرحان کو پاکستان لے آئیں گے اور چودھری بھی جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ اسما قادری صاحبہ سے یہ بات پوچھنا تھی کہ ”موساد“ کے کردار کو بالکل ہی منظر سے غائب کر دیا گیا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟ بات اگر ہو جواری کی تو جواری بلاشبہ ایک اچھی تحریر ہے لیکن للکار کا نعم البدل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جواری میں ابھی تک ہیرو (خاور) کی زندگی کا پس منظر پوشیدہ ہے جسے جلد از جلد منظرِ عام پر لایا جانا ضروری ہے تاکہ قاری کہانی کی تمام جزئیات سے آگاہ ہو سکے۔ محی الدین نواب صاحب کا نام کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ نواب صاحب کا نام ہی کافی ہوتا ہے اور اولین صفحات پر موجود ان کی تحریر آتش زیر پا اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ کاشف زبیر صاحب کے قلم کی اختراع یا دشِ بخیر کی بدولت ہم جلیل کے ایک اور کارنامے سے محظوظ ہوئے۔“

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کے جوابات ”نومبر کا شمارہ نومبر کی ایک حسین شام کو موصول ہوا تو دل صحیح معنوں میں باغ باغ ہو گیا۔ ذاکر انکل نے پچھلے مہینے عید کی مبارک باد نہیں دی تھی تو اب کی بار جھینپ مٹانے کے لیے کب کی گزری عید کی مبارک باد دے ڈالی۔ انکل جی کا اداریہ حسبِ معمول افسردہ کر دینے والا تھا۔ انکل جی سے گزارش ہے کہ وہ اپنا اور ہمارا دل جلانے کے بجائے چھوٹی موٹی خوش خبریاں شیئر کیا کریں جیسے پٹرول 48 پیسے سستا ہو گیا۔ ڈالر کی قدر 10 پیسے گر گئی وغیرہ وغیرہ۔ (درست فرمایا۔ دل کو بہلانے کے لیے ایسے بہلاوے دینے پڑیں گے) انور یوسف زئی کو صدارت دے کر انکل جی نے دریادلی کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ زویا صاحبہ! اس بار تو آپ کا عظیم تبصرہ بھی موجود ہے مگر قسم لے لو جو پورے تبصرے میں ذرا بھی چینی ہاتھ آئی ہو۔ (منگنی آپ کی ہوئی ہے اس لیے آپ کے ہر لفظ سے شہد ٹپکنا چاہیے) بشریٰ جی! اتنی پیاری دعا کے لیے بہت بہت شکریہ، تابی اور تالو! ہماری شادی چودہ فروری 2016ء کو ہے، آپ افسوس کرنے ضرور آیئے گا۔ عبادت کاظمی صاحب! آپ کی معلومات بہت ناقص ہیں۔ میں تو کبھی بھی صنفِ نازک کے خلاف نہیں رہا اور جو رہتے ہیں ان کو بھی تو بالآخر اسی صنف سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ صبا گل صاحبہ مبارک باد بےشک مت دیں مگر اپنے غصے کا یوں سرِعام اظہار تو مت کریں۔ سمعیہ، شاہدہ، حائقہ، سلطانہ، شکیلہ، انیلا اور دیگر بےشمار کزنز کے درمیان پس کر تو بےچارے ڈائجسٹ کی چٹنی بن جاتی ہوگی۔ عروج ناز صاحبہ! ہماری دعا ہے کہ آپ کئی سالوں تک یونہی اپنی اٹھارھویں سالگرہ مناتی رہیں۔ عادل برادر! ایسا کچھ نہیں جو آپ سوچ رہے ہو، ہم واقعی بہت خوش ہیں۔ اے کیو حسین صاحب! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تفسیر صاحب! ہم نے تو کسی کو بانس پر نہیں چڑھایا اب جو خود ہی چڑھ جائے تو یہ سراسر ان کا سچا فعل ہے۔ ان کی منقولہ اور غیر منقولہ حرکت کی ذمے داری ہم پر ہرگز عائد نہیں ہو سکتی۔ شکیل کاظمی! مبارک ہو۔ آپ کی کوشش رنگ لائی اور محسن علی بھی آپ کی پڑوسن کو دیکھ کر موم ہو گئے اور فرمایئے ذکر پڑوسن کا۔ کہانیوں میں بلاجھجک اولین صفحات پر موجود محی الدین نواب کی کہانی آتش زیر پا سے شروعات کی گرداب کی بار وہ گرفت میں لینے والی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ صرف کلپنا کی محبت قابل ذکر رہی مگر گناہوں کی آمیزش نے اسے بھی آلودہ کیا۔ اقبال کاظمی کی مکافات زبردست رہی۔ سرورق کی دوسری کہانی زمین زادہ متاثر کن رہی۔ ایک نازک ڈور کی نزاکت اور اس نزاکت کو نہ سمجھنے والوں کی عبرتناک داستان تھی۔ معلوم نہ ہو سکا کہ قصوروار افشاں تھی یا طاہر یا شاید دونوں بےقصور۔“

سرگودھا سے قیصر اعوان کی درخواست ”ماہ نومبر کا جاسوسی خاصی محنت اور ڈھیر ساری منت، سماجت کے بعد 7 نومبر کو ملا۔ حسینہ سرورق نے خاصا

متاثر کیا۔ اشتہارات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہمارا پڑاؤ خطوط کی محفل میں ہوا۔ تمام دوستوں کو اچھے موڈ میں پا کر خوشی ہوئی۔ برادر انور یوسف زئی فرسٹ پوزیشن پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ برادر ہمایوں! منگنی تو ہو گئی اب بھابی کو گھر کب لا رہے ہو؟ ایڈوانس میں مبارک باد قبول فرما لیں پھر شاید مہلت نہ ملے۔ برادر تابی اینڈ بالو اوہ نہ تو شہزادہ کوہسار تھے نہ ہمایوں سعید بلکہ وہ اپنے بھائی ”ریوڑی“ میرا مطلب ہے کہ بڑوی صاحب تھے اور ہم بھلا دینا ملک کا کیسے سوچ سکتے ہیں، یہ جھنجھٹ آزاد لوگ پالتے ہیں اور ہم ٹھہرے اسیرِ زنداں۔ برادر سید عبادت کاظمی! آپ کو سید شکیل کاظمی کی پڑوسن کیسے یاد آ گئی خیر تو ہے ناں؟ بہنا صبا گل! اگر آپ کو ہماری موجودگی بری لگی تو آئندہ نہیں آئیں گے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے ہر دور میں صنفِ وجاہت کا بیڑا صنفِ نازک نے غرق کیا اور ہر بار خود ہی معصوم اور مظلوم بھی بن گئی خیر ہو آپ کی پالیسیوں کی۔ بہناں سمعیہ، مشاہدہ اینڈ کمپنی کوشش کریں کہ کسی طرح جاسوسی جلد مل جائے اس طرح آپ محفل کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ چل سکیں گی، ویسے تبصرہ اچھا تھا۔ بھیا جعفر حسین! آپ نے تبصرہ لکھنے سے پہلے کہیں سبز مرچ تو نہیں چبائی؟ بھیا اے کیو حسین! تبصرہ پسند کرنے اور دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ برادر محسن علی موم آپ کا تعلق آثارِ قدیمہ سے تو نہیں۔ ویسے یہ موم کا دم چھلا کیوں لگوا رکھا ہے؟ برادر کبیر عباسی ویلکم کرنے کے لیے شکریہ۔ بھابی کا کیا حال ہے؟ لالہ تفسیر عباس بابر! آپ کا تبصرہ ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی جدا، منفرد اور اچھا لگا۔ بہناں مہتاب عمیر رانا کہاں غائب ہیں؟ کہیں دولہا بھائی نے جاسوسی پر پابندی تو نہیں لگا دی۔ جلدی واپسی کی ٹرین پکڑیں۔ بہناں تصویر العین، ماہا ایمان، طاہرہ گلزار سب کہاں غائب ہیں، جلد واپس لوٹیں اور محفل کو 16 چاند لگائیں۔ باقی تمام قارئین سے دعا کی اپیل۔ میرا کیس لاہور ہائی کورٹ میں زیرِ سماعت ہے، اللہ پاک مجھے جلد آزاد فضاؤں کی نعمت سے نوازے، آمین۔“

بالاکوٹ سے محسن علی موم کی معصومیت ”6 کو جاسوسی ملا۔ 7 کو پڑھ کر 8 کو تبصرہ لکھ رہا ہوں اور میری اس کاوش کو دیکھ کر میرے ایک دوست نے اس شدید خواہش کا اظہار کیا ہے کہ میرا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج نہ کرنا میرے ساتھ اور پوری قوم کے ساتھ شدید زیادتی ہے لیکن میں نے اسے سمجھا دیا کہ ”ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے“ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی بےساختہ منہ سے ہائے نکلی۔ پاس موجود بھائی صاحب نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا اور اب وہ جب بھی مجھے ملتے ہیں کافی محفوظ فاصلے سے گزر جاتے ہیں۔ ٹائٹل گرل کے حسن کی تباہ کاریاں ہم ملاحظہ نہ کر سکے اور بزمِ یاراں کو چل دیے۔ کرسی صدارت پر انور یوسف زئی اور ان کے خط کو دیکھ کر حیران و پریشان رہ گئے۔ انور صاحب! آپ کو شوگر تو نہیں جو ماہا کو مٹھاس کہہ رہے ہیں۔ بشریٰ افضل کی چہکاریں آپ بھی انکل کمال کرتے ہیں۔ لوگوں کو کیسے نہال کرتے؟ واہ۔ (کیا کریں کرنا پڑتا ہے۔ ہر مہینے کیا آپ کو نہیں کرتے؟) صبا گل جی! یاد اسے کیا جاتا ہے جو بھول جائے اور کون کافر آپ کو بھولنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ (کیا انکشاف کہ ہم تو اب تک مسلمان سمجھ رہے تھے) عروج ناز محفل سے زیادہ خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ صرف اٹھارہ سال کی ہیں۔ ویسے آپ نے موم بتیاں دونوں طرف سے جلائی تھیں یا؟ تفسیر عباس بابر کا محبت نامہ خلوصِ دل سے پڑھا اور کافی محظوظ ہوئے۔ ٹیکسلا سے صنفِ نازک کی پرانی ہراول دستے کی سپہ سالار دُرنشین بلوچ عرصہ دراز سے لاپتا ہیں جس کسی کو بھی ملیں جاسوسی والوں کو خبر دے کر مشکور ہونے کا موقع دیں، اب تھوڑی بات کہانیوں پر۔ ابتدا جواری سے کی۔ اس ماہ کہانی کافی بہتر رہی۔ گرداب بہترین جا رہی ہے۔ اسلم، ماہ بانو تک پہنچ چکا ہے اور شہریار اور سلو بھارتیوں کے سینے پر مونگ دلتے ہوئے ایک مشن مکمل کرتے ہوئے اور دوسرے کو سرانجام دینے کے لیے لگتا ہے کہ کشتوں کے پشتے لگانے والے ہیں۔ جلیل کا اس بار کا کارنامہ پھر مزہ دے گیا۔ کہانی میں حسینہ کے کافرانہ ترکے بھی جاندار رہے اور جلیل کے ہاتھ آخر میں کچھ بھی نہ آیا۔“

شیخوپورہ سے محمد شایان سعید کی شوخی ”حسبِ معمول جاسوسی 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نگاہ پڑتے ہی میرا سر چکرا گیا۔ ارے بھئی، حسینہ کو دیکھ کر نہیں بلکہ وہاں پستول کے دھوئیں سے عید مبارک لکھا ہوا دیکھ کر۔ کہانیوں کی طرف چلتے ہیں۔ آتش زیرپا نہایت شاندار تحریر تھی۔ جلیل کی شوخیوں سے لطف اٹھایا گیا مگر سرورق کی دوسری کہانی پڑھ کر بوریت محسوس ہوئی۔ سرورق کی پہلی کہانی نسبتاً قدرے بہتر تھی۔ مداخلت اور قابلِ علاج بھی کافی اچھی رہیں۔ سلسلہ وار کہانیوں میں جواری بہتر جا رہی ہے۔ گرداب میں بیک وقت تین کہانیاں جاری ہیں۔ بھئی وہ مشابرم خان کدھر ہے؟ اسے تو میجر نے امریکا بھیجا تھا ماہ بانو کی مدد کے لیے مگر وہ تو کہیں بھی نہیں دکھ رہا ہے۔ للکار کتابی مجموعے میں مل سکتی ہے؟ پلیز پلیز ضرور بتایئے گا۔ (لاہور کے اردو بازار سے معلوم کیا جا سکتا ہے) اور ہاں، یہ میرا پہلا خط ہے اس لیے اسے ضرور شائع ہونا چاہیے ورنہ...... میں اگلی بار پھر لکھوں گا۔“

کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار کی خوش گمانیاں ”لو جی شہزادہ کوہسار کا آخری تبصرہ ملاحظہ کیجیے۔ ارے ارے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آخری تبصرہ مطلب 2013ء کا آخری تبصرہ۔ تو تبصرے کا آغاز کرتے ہیں حسبِ معمول بسم اللہ کے بعد ٹائٹل سے۔ ٹائٹل گرل کافی حسین تھی۔ فہرست کا سادہ سا انداز ہمارے دل کو بھا گیا۔ اداریہ بھی پسند آیا۔ زویا اعجاز وہ کسی سیانے نے کیا خوب فرمایا تھا کہ کاپی یعنی نقل کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور عقل نہیں تے نقل نہیں۔ سید اکبر شاہ! آپ نے ہمارے تبصرے کی تعریف کی اخلاق کا تقاضا ہے کہ ہم بھی آپ کو جوابی تعریف سے نوازیں کیونکہ ہم ٹھہرے بااخلاق بندے سو آپ کا تبصرہ شاندار تھا اور شگوفے نامی کترن بہت ہی شاندار۔ تابی اور بالو یقین جانیں ہمیں بھی بشریٰ آنٹی کو آنٹی کہتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے لیکن کیا کریں اگر اماں کہیں تو...... کوہاٹ سے سمعیہ اینڈ کزنز کا اجتماعی تجزیہ، تجزیہ آف دی منتھ رہا۔ صفدر معاویہ آپ کو لگتا ہے لفظ فوبیا کا فوبیا ہے کہ آپ نے لفظ فوبیا کا استعمال وہاں کیا ہے جہاں بہرحال بنتا نہیں تھا۔ عروج ناز اسے غلط فہمی نہیں خودشناسی کہتے ہیں۔ تفسیر عباس، ان تلوں سے ہمارے لیے تیل نکلا تھا جب ہی دودھ والا نکتہ اٹھایا۔ ہمایوں سعید! آپ کی جو اعجاز احمد سے سنجیدہ قسم کی لڑائی چل رہی ہے برائے کرم ہمیں اس میں مت گھسیٹیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ اپنے گریڈنگ سسٹم کے سپرہٹ ہونے کے بعد اس بار کہانیوں پر تبصرے کے لیے ہم نیا سسٹم لائے یعنی کیٹیگری سسٹم۔ اس بار ہم نے کہانیوں کو چار کیٹیگریز میں رکھا ہے۔ کیٹیگری اے میں بہت اچھی، کیٹیگری بی میں صرف اچھی، کیٹیگری سی میں اوسط درجے کی کہانیاں جبکہ کیٹیگری ڈی میں ان تحریروں کو رکھا ہے جو ہماری پسندیدگی کے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ بشریٰ امجد کی گمشدہ وقت امجد رئیس کی شعبدہ

گر، اسما قادری کی گرداب، مریم کے خان کی قابلِ علاج اور ساحر جمیل کی زمین زادہ کیٹیگری اے میں جگہ بنانے میں کامیاب رہیں۔ سلیم انور کی خوش نصیب، تنویر ریاض کی مداخلت اور سرور اکرام کی شاہین و نرگس کو ہم نے کیٹیگری بی میں رکھا۔ محی الدین نواب کی آتش زیر پا، جواری از احمد اقبال، بابر نعیم کی آخری قہقہہ، اپنے پسندیدہ مصنف کاشف زبیر کی یادش بخیر اور شیطان مسیحا از جمال دستی کیٹیگری سی میں آئیں۔ کیٹیگری ڈی میں صرف ایک کہانی آئی جو کہ اقبال کاظمی کی مکافات تھی۔ گرداب کی یہ قسط سنسنی سے بھرپور رہی۔ تمام کردار پوری طرح سے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے سسپنس عروج پر ہے۔ ساحر جمیل کی زمین زادہ کا آئیڈیا بھی حقیقت سے قریب ترین تھا اور اندازِ تحریر بھی اس وجہ سے یہ تحریر ہمیں بہت پسند آئی۔ مختصر تحریروں میں سب سے زیادہ اہم چیز کہانی کا آئیڈیا ہوتا ہے اور ساتھ ہی اندازِ تحریر بھی دلچسپ ہو اور کہانی کا تانا بانا بھی اچھے طور پر قدرے مختلف انداز میں بنا گیا ہو تو یہ چیز سونے پر سہاگا ہو جاتی ہے اور یہ تمام خصوصیات مریم کے خان کی قابلِ علاج، بشریٰ امجد کی گمشدہ وقت اور امجد رئیس کی شعبدہ گر میں تھیں۔ آتش زیر پا پڑھ کر ایسا لگا کہ جیسے دیوتا کی کوئی قسط پڑھ رہے ہوں۔ جواری میں کافی جھول دیکھنے کو ملے۔ بابر نعیم کی آخری قہقہہ کا آئیڈیا بہت پرانا تھا۔ جلیل سیریز میں ناقابلِ اشاعت الفاظ کی تکرار اور پرانا مزاح کے علاوہ کچھ خاص نہ تھا۔ البتہ آئیڈیا قدرے بہتر تھا۔ شیطان مسیحا کا آئیڈیا بھی کچھ خاص نہ تھا۔ یہ تھیں ان تحریروں کو کیٹیگری سی میں رکھنے کی وجوہات۔ اقبال کاظمی کی مکافات میں منصوبہ انتہائی احمقانہ تھا۔ روڈنی اتنے ماہ تک منصوبہ بندی کرتا رہا مگر اعشاریہ تین چار کے ریوالور سے دو گولیاں چلا کر قتل کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ کتر نیں اس دفعہ کافی بہتر رہیں مگر ہماری بھیجے جانے والی کترنیں حسبِ معمول پھر غائب تھیں۔ شاہد صاحب کے اسکیچ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار تھے جن پر غور ہم جیسے باریک بین قاری ہی کرتے ہوں گے۔ یہ تھا ہمارا اب تک کا سب سے زیادہ محنت کے ساتھ کیا جانے والا تبصرہ۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ کو پسند آئے گا اور آپ ہمیں ہمیشہ کی طرح پذیرائی بخشیں گے۔"

علی پور مظفر گڑھ سے محمد جاوید بشیر بربرہ کی رائے ''کافی عرصے کے بعد حاضرِ خدمت ہوں۔ نومبر کا شمارہ مقررہ تاریخ کو مل گیا۔ سرورق بہت پیارا تھا۔ آج کل ذاکر انکل ڈارک براؤن کلر کو زیادہ استعمال کر رہے ہیں۔ شاید ڈارک براؤن کا زیادہ اسٹاک ہے۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ کی تحریر نے کافی متاثر کیا۔ ہمارے حکمراں جو دولت کو اکٹھا کرنے کے چکر میں ہیں، ان کو انجام نظر نہیں آتا۔ اسلام آباد سے انور یوسف کا تبصرہ واقعی صدارت کے اہل تھا۔ مختصر تبصرے دیکھ کر یہ یقین ہو گیا ہے کہ صدارت کے لیے تفصیلی تبصرہ ہونا ضروری نہیں۔ اچھا تبصرہ مختصر ہی کیوں نہ ہو صدارت کا حق دار ہو سکتا ہے۔ محی الدین نواب کی آتش زیر پا بہت اچھی تحریر تھی۔ شیریں امجد کی گمشدہ وقت اچھوتی کہانی تھی۔ جواری احمد اقبال کی بہت اچھی کہانی جارہی ہے۔ گرداب کا اب اینڈ ہی کر دیں اور اس کے بعد ناصر ملک کی سلسلہ وار کہانی شروع کریں۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا اظہاریہ ''نومبر کا شمارہ 4 کو ہلکی ہلکی سی سردی میں ملا۔ سرورق پر خوب صورت سی دوشیزہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اور ہم اس کی نشیلی سی آنکھوں میں کھو گئے۔ ساتھ ہی پہلی دفعہ پسٹل سے گولی کے بجائے الفاظ کی بوچھاڑ وہ بھی عید مبارک کاش کہ ایسا ہو جائے کہ یہ پسٹل اور بندوقیں بجائے گولیوں کے محبت کے الفاظ کی بوچھاڑ کریں تو پوری دنیا میں امن ہی امن ہو جائے اور خاص کر ہمارے پیارے وطن پاکستان میں۔ چھلانگ لگائی بزمِ یاراں میں تو سلپ ہوگئے شکر ہے ٹانگ نہیں ٹوٹی کیونکہ وہاں پر ملالہ یوسف زئی کے بڑے بھائی انور یوسف زئی کرسیٔ صدارت پر قابض تھے مبارک بھائی جان۔ زویا اعجاز بڑے تیکھے تبصرے کے ساتھ سیکنڈ کی سیٹ پر موجود تھیں۔ ہمایوں سعید بھائی منگنی کے بعد زیادہ ہی بونگیاں مارتے نظر آئے۔ آنٹی بشریٰ افضل کا الفاظ کا چناؤ اچھا ہوتا ہے۔ تابی اور بالو بھی لفظوں کو الجھاتے نظر آئے، اچھا ہے اندازِ بیاں آپ کا۔ صبا گل صاحبہ! تھوڑا ہاتھ ہولا رکھیں کہیں آپ مرد فوبیا میں تو مبتلا نہیں، جیسے بھائی ہمایوں سعید اکثر صنفِ نازک فوبیا میں نظر آتے ہیں۔ اپنا پہلا خط چھپا دیکھ کر خوشی ہوئی۔ عروج ناز، کبیر عباسی، تفسیر عباس اور آپ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ قسط نہایت ہی اچھی تھی۔ کہانی اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے کیونکہ سارے کردار کلوز ہو گئے ہیں۔ آتش زیر پا میں آخر محبت کی جیت ہوئی کلپنا نے کوشش کی مگر ناکام رہی۔ گمشدہ وقت، مکافات، خوش نصیب اچھی کہانیاں تھیں۔ کاشف زبیر اپنی اچھی اسٹوری کے ساتھ موجود تھے۔ مریم کے خان کی کہانی بہت ہی اچھی ہوتی ہے ہمیشہ۔ شاہین و نرگس، سرور اکرام کی پُراثر تحریر جو دل میں وطن کی محبت اجاگر کرتی نظر آئی۔ آخری کہانی کوئی خاص نہیں لگی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا رہا۔"

حلہ گنگ سے عروج ناز کی خوش خبری ''اس دفعہ جاسوسی نے 6 تاریخ کو شرفِ دیدار بخشا۔ ذاکر انکل نے غالباً چاکلیٹی ہیرو کے روپ میں کبیر عباسی کو سرورق پر ابھارنے کی کوشش کی مگر ان کے حسن و جمال کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ ساتھ موجود حسینہ ہمایوں سعید سے ادھار لی گئی تھی یقیناً کترینہ کیف نے گھاس ڈالنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ خیر ہم نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور انٹری دی محفل ہاؤ ہو میں جہاں انور یوسف زئی صاحب کرسیٔ صدارت پر موجود تھے، مبارک باد جی۔ تبصرہ مختصر اور جامع تھا۔ کاشف علی میراں سے گزارش ہے محفل میں واپس آئیں۔ بشریٰ افضل اور زویا اعجاز کے تبصرے پسند آئے۔ تفسیر عباس کی ہمایوں سعید کے لیے سیڑھی والی مثال نے بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا اور ہاں ایک خوش خبری ہمارا پارٹ ون کا رزلٹ آ گیا ہے اور ہم اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئے ہیں۔ (بہت بہت مبارک ہو بھئی) ایڈوانس خیر مبارک۔ مٹھائی کے لیے قریبی بیکری سے رابطہ کریں۔ محی الدین نواب کی تحریر کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ جواری میں نت نئے کردار متعارف ہو رہے ہیں مگر ماضی جوں کا توں موجود ہے۔ گرداب پر بہت رہی۔ اسما جی! شہریار کو کچھ مت کیجیے گا۔ ہم ابھی تک عمران کے غم کو نہیں بھولے سو پلیز۔ کاشف زبیر کی یادش بخیر جوش و خروش سے کھولی مگر کوئی خاص رنگ نہ جما سکی۔ البتہ سرورق کے دونوں رنگ کمال کے تھے۔"

سندیلیانوالی سے ابرار وارث کی آمد بہار ''جاسوسی اس دفعہ 6 تاریخ کو ملا اور دل خوش کر گیا۔ ٹائٹل بہت ہی دلفریب تھا صرف اکیلی گرل ہائیں... گرل پر تبصرہ کبیر عباسی کے لیے چھوڑتے ہیں۔ جلدی سے محفل میں پہنچا۔ اسلام آباد سے انور یوسف زئی کو کرسیٔ صدارت پر براجمان دیکھا مبارک

ہو انکل جی... انکل جی چٹپٹی کی مٹھاس ماہا ایمان اب ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی ہیں، اطمینان رکھیں۔ زویا اعجاز! پسندیدگی کا شکریہ۔ ارے بھائی جاسوسی کی پسندیدگی کا کچھ اور نہ سمجھنا۔ ہمایوں سعید! میرے خیال میں ایک جذبات سے عاری شخص کو پیار، محبت کے الفاظ سوٹ نہیں کرتے۔ سید اکبر شاہ! بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کو صبر کا پھل ملا اور آپ کا تبصرہ شائع ہو گیا ہے۔ صفدر آباد والوں کو عرض ہے کبھی آپ کا شوشہ، شوشہ ہی رہا۔ مشارم خان کا تو ذکر ہی نہیں آیا۔ ہمارے ہیرو اسلم، ماہ بانو کو نکال لائے ہیں اب کیا خیال ہے؟ ڈیرہ اسماعیل خان سے عبادت کاظمی! میرے خیال میں نورین مری نہیں کھو گئی ہے۔ صبا گل! آتی رہا کریں ورنہ کوئی یاد بھی نہیں رکھے گا۔ آپ کی بات دل کو لگی کہ یہ کیا تک ہے کہ ہر لڑکی مفرور مجرم کو ہی ملتی ہے اور اس پر مرتی ہے۔ بھئی احمد اقبال صاحب ہتھ ہولا رکھیں۔ سمعیہ شاہدہ اور حائقہ وغیرہ کا تبصرہ بھی زبردست ہے۔ گرداب واقعی ایک اچھوتی تحریر ہے۔ چارسدہ سے عادل خان کا تبصرہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ رحیم یار خان سے اے کیو حسین، محسن علی موم کا تبصرہ بھی زبردست تھا۔ قیصر اعوان! اللہ آپ کو جلد رہائی عطا کرے۔ عمران بلوچ جو پچھلے ہفتے جیل میں گردوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر دم توڑ گئے، وہ بھی ہمارے جاسوسی اور سسپنس کے قاری تھے۔ ان کی مغفرت کے لیے دعا کی اپیل ہے۔ سب قارئین سے گزارش ہے کہ ان کی مغفرت کے لیے دعا ضرور کریں۔ گرداب کی یہ قسط پچھلی قسط کی نسبت بہتر تھی۔ امید ہے آپ کا ماتھی قسط والا غم دور ہو جائے گا۔ تفسیر عباس بابر کا تبصرہ بھی زبردست تھا۔ خاص کر سعدیہ بخاری کو دیا گیا مشورہ پسند آیا۔ ملک سعید خوش ہو گئے آپ، آپ کا تبصرہ بلکہ مختصر نامہ شامل ہو گیا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے محی الدین نواب کی کہانی آتش زیر پا پڑھی۔ بہت اچھی لگی، بہت تیز کہانی تھی اور کچھ غیر منطقی سی کہانی تھی۔ اس کے بعد تیزی سے گرداب میں جا پھنسے اور پتا اس وقت چلا جب وہ ختم ہو گئی۔ کیا کہنے ہیں اسما قادری کے۔ یہ قسط بہت شاندار تھی۔ خاص طور پر اسلم کا ماہ بانو کو نکالنا اس ادارے کو تباہ کرنا اور جنگل میں آگ لگنا۔ اللہ کرے جنگل سے نکل جائیں وہ۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سرورق کی دوسری کہانی زیادہ پسند آئی۔ کاشف زبیر کی یادش بخیر بھی زبردست لگی۔ اس سے زیادہ... دیر ہو رہی ہے پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں جاسوسی میں شکریہ کا موقع دیں۔"

سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے حافظ شاہد عمران کی دعائیں ''اس ماہ کا ڈائجسٹ بروقت 4 نومبر کو ہی مل گیا۔ بڑی خوشی ہوئی جلدی ملنے کی صورت میں کیونکہ جیل والوں کو اکثر ڈائجسٹ لیٹ ہی ملتے ہیں۔ سرورق بھی کافی اچھا لگا۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ نے ملکی بالخصوص کراچی کے حالات کی تصویر کشی کی تھی جسے پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اللہ میرے وطنِ عزیز کو دشمنوں سے محفوظ فرمائے، آمین۔ اسلام آباد سے انور یوسف زئی قلم کی نوک کے بل بوتے پر صدرِ محفل بنے ہوئے نظر آئے مبارک بھائی جی۔ ہمایوں سعید کا کلاسیکل تبصرہ بڑا زبردست لگا۔ بشریٰ افضل! انکل واقعی ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ ہم قیدیوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ میری ہم شہر ماہا ایمان! آپ کہاں گم ہو گئیں۔ واپس آؤ محفل میں یہ لوگ بہت باتیں کر رہے ہیں آج کل۔ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے قیصر اعوان بھائی کیا حال ہے اور باقی تمام دوستوں کو محبت بھرا اسلام۔ تفسیر عباس بابر صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تصویر العین کو کیوں بلیک لسٹ نہیں ہونا چاہیے؟ سید اکبر شاہ، تابی اور بالو، صبا گل، عروج ناز، عادل خان اور جعفر حسین کے تبصرے جاندار تھے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے احمد اقبال کی جواری پر پہنچے۔ اب کہانی کچھ کچھ جاندار ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ کہانی جلد ہی زبردست بن کر للکار کی جگہ لینے کی کوشش کرے گی۔ گرداب زبردست جارہی ہے۔ اب شہریار خان اور سلو انوکھی جگہ پر پھنس چکے ہیں۔ دیکھتے ہیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ آتش زیر پا بڑی زبردست لگی۔ آخری صفحات پر زمین زادہ نے بڑا متاثر کیا۔ یادش بخیر شاہین و نرگس اور شعبدہ گر بھی اچھی کوشش تھی۔ آخر میں رائے قیصر اقبال حافظ آباد سے جناب آپ محفل سے کیوں بھاگ گئے جلدی واپس آؤ، اللہ آپ کو ہمیشہ آزاد رکھے۔"

کراچی سے اوریس احمد خان کی باریک بینی ''جاسوسی ڈائجسٹ اپنے وقت پر مل گیا۔ ٹائٹل دیدہ زیب رنگوں سے مزین تھا۔ ٹائٹل گرل شاید عید کا چاند دیکھ رہی ہے۔ پستول کی نال سے نکلتا ہوا دھواں دھوئیں سے عید مبارک لکھا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر اچھا ٹائٹل ہے۔ ذاکر صاحب کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں اداریہ کے بعد انور یوسف زئی کے نام پر نظر پڑی سو مبارک۔ اس کے بعد جواری کی محفل میں پہنچے جہاں بساط پر تین داؤ اور چالیس چلی جارہی ہیں۔ نئی نئی لڑکیوں کی رفاقت جواری کو میسر آرہی ہے۔ اس کے بعد مقبولِ عام سلسلہ گرداب میں پہنچے جہاں ماہ بانو کو رہائی ملی اور اسلم نے دریا سے گزر کر ماہ بانو کو رہا کرا لیا۔ شہریار اور سلو بھی قدم قدم پر موت سے کھیلتے ڈاکٹر فرحان کو پاکستان حفاظت سے پہنچا کر ہی دم لیں گے۔ اس کے بعد محی الدین نواب کی کہانی آتش زیر پا پڑھی جو کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ گمشدہ وقت بھی بہتر تھی۔ مکافات میں روڈنی کے باپ نے سچ کہا تھا، واقعی قتل نہیں چھپ سکتا۔ روڈنی کی چھوٹی سی غلطی گلے کا پھندا بن گئی۔ خوش نصیب میں مقتول شوہر کی بیوی ایک جنونی رقیب روسیاہ کی دسترس سے بچ گئی۔ اس کو اس کی خوش نصیبی اور عقلمندی نے موت سے بال بال بچا لیا۔ آخری قہقہہ میں مقتول نے اپنی جان بڑے سکون و آسانی سے دے دی۔ مداخلت نے بھی متاثر کیا۔ جس میں ایک مجرم نے اپنی بیوی کے ساتھ اپنے بھائی کو بھی کھو دیا۔ محض دولت کے حصول کی خاطر وہ دونوں بھی اسی انجام کے مستحق تھے۔ شعبدہ گر میں کارل کو زر کی ہوس موت کی راہ دکھا گئی۔ یادش بخیر میں کافی دلچسپی رہی۔ ایک دوست نے دوست کی مدد کی۔ یہ قابلِ علاج میں دکھایا گیا۔ (اچھا...) جس میں ایک ایڈیٹر نے اپنے مصنف دوست کو اپنی مہارت اور ہنر مندی سے صاف بچا لیا اور حملہ قاتل ہونے سے بچا لیا اور بلیک میلرز کا خوف بھی ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا۔ مریم کے خان کی بہترین کہانی تھی۔"

جاپان سے زینش نگار کی شکایت ''اکتوبر کے شمارے میں شائع ہونے والی کہانی میں ایک قابلِ اعتراض جملے کی نشاندہی کی ہے... اس پر ادارہ ان سے معذرت خواہ ہے۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

راجہ اورنگزیب زیبی، سرگودھا۔ ماہین، کوٹری۔ محمد نعیم، علیم احمد اینڈ ثنا کنول، فیروزہ۔ رضوانہ سمیع، لاہور۔ رانا نقشی حماد فرہاد، ساہیوال۔ رفعت مقصود، کراچی۔ محمد اقبال، کراچی۔ شمائلہ، حیدرآباد۔ حنا، میرپور خاص۔

شرربار

ایچ اقبال

جس کے دل میں آگ لگی
ہو... اس کی شدید ترین
خواہش... ضد کی ایسی
صورت اختیار کرتی ہے کہ ایسا
کیا کروں کہ یہ آگ ختم نہ ہونے
پائے... اس وقت تک بھڑکتی رہے...
جب تک اس کی گرمی... تپش اور دہکتے
شعلے دوسروں کو جلا کر بھسم نہ کر
دیں... پھولوں ...جھرنوں اور فطرت کی
خوب صورتیوں کے قالب میں ڈھلی ایک نازک
اندام دوشیزہ کے بدلتے روز و شب... وقت کی ایک
ہی لہر نے اس کی خوش مزاجی... مسکراہٹ کو ملیا
میٹ کردیا... گہری اور ہولناک رات نے زندگی کے حسن و
جمال کو راکھ کے کفن میں لپیٹ دیا... غم... اذیت اور
مایوسیوں کے آہنی چنگل میں گرفتار ہونے کے باوجود... اپنے
زخموں کو نہ بھول کے صرف انتقام کے لیے زندہ تھی۔

طاقت ودولت کے ناقابلِ تسخیر قلعوں کومسمار کردینے والی ایک پُرانتقام کہانی

نازیہ اس وقت اس طرح ڈرائیونگ کررہی تھی جیسے اس پرجنون طاری ہو۔ چہرے سے بھی غصے کی علامات ظاہر ہورہی تھیں۔ ذرا ہی پہلے اس نے ایک ایسی ہی صورت حال کا سامنا کیا تھا کہ اس جیسے مزاج کی لڑکی اسے فراموش کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی چمکتی، قیمتی کار کارخ علاقے کے ایس پی چودھری رحمان کے دفتر کی جانب تھا۔

چودھری رحمان کو وہ دوتین سال سے جانتی تھی۔ وہ اکثر اس کے مرحوم والد سے ملنے گھر آیا کرتا تھا۔ وہ اس کے باپ کا دوست تھا اسی لیے وہ اس وقت چودھری رحمان سے ملنے کا ارادہ کربیٹھی تھی۔

ٹریفک کے باوجود وہ اتنی تیز رفتاری سے کار چلارہی تھی کہ کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا تھا لیکن اپنی ذہنی حالت کے پیشِ نظر اسے کسی بات کا خیال نہیں تھا۔

آخر اس کی کار اس پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ احاطے میں موجود کئی کاروں کے قریب اس نے اپنی کار ایک جھٹکے کے

ساتھ روکی۔ احاطے میں کچھ عام لوگوں کے علاوہ کچھ کانسٹیبل بھی نظر آئے تھے جنہوں نے آندھی طوفان کی طرح آنے والی کار کی طرف چونک کر دیکھا۔ انہی میں سے دو کانسٹیبل تیزی سے اس کی کار کی طرف آئے۔ وہ نازیہ کی تیز رفتاری کے سبب کچھ غضب ناک ہو گئے تھے۔

جب وہ کار کے قریب پہنچے تو نازیہ کار سے اتر چکی تھی۔ وہ جینز پہنے ہوئے تھی۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اس لیے اس کے اوپری جسم پر چرمی جیکٹ بھی تھی۔ پیروں میں اونچی ایڑی کے سینڈل، شانے سے ایک چھوٹا سا وینٹی بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس کی یہ وضع قطع ظاہر کر رہی تھی کہ اس کا تعلق کسی متمول گھرانے سے ہے۔

دونوں کانسٹیبل اس کے انداز و اطوار سے قدرے مرعوب ہو سکتے تھے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب نازیہ ان سے پوچھ بیٹھی۔

''رحمان صاحب کا دفتر کس طرف ہے؟''

اس نے ''ایس پی صاحب'' یا ''چودھری رحمان صاحب'' نہیں کہا تھا اس لیے کانسٹیبلوں پر یہ تاثر پڑا کہ یہ لڑکی ان کے افسر سے کوئی خاص تعلق رکھتی ہے۔ اس احساس کے باعث ان دونوں کے چہروں کی غضب ناکی کافور ہو گئی۔

''میرے ساتھ آیئے!'' ایک کانسٹیبل نے کہا۔ نازیہ، سر ہلاتے ہوئے اس جانب بڑھ گئی جہاں کانسٹیبل نے رخ کیا تھا۔

''صاحب کو شاید آپ پہلے سے جانتی ہیں؟'' نازیہ کی راہنمائی کرنے والے کانسٹیبل کا لہجہ مؤدبانہ ہو گیا۔

''ہوں۔'' نازیہ نے زیادہ بولنا ضروری نہیں سمجھا۔ ویسے بھی اس کا ہیجان ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

کانسٹیبل دوبارہ کچھ نہیں بولا۔ وہ دونوں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ راہداریوں میں پولیس والوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ان میں سے کئی نے نازیہ پر گہری نظریں ڈالیں لیکن نازیہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے کسی کی طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا۔

کانسٹیبل چق پڑے ہوئے ایک دروازے کے قریب رکا۔ وہاں نازیہ نے ''ایس پی چودھری رحمان'' کے نام کی تختی دیکھ لی۔ دروازے کے قریب ایک کانسٹیبل اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نازیہ کی راہنمائی کرنے والے کانسٹیبل کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

''آ گیا ویرو!'' اس کے منہ سے نکلا اور اس نے نازیہ پر بھی ایک نظر ڈالی۔

''میں صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔'' راہنما کانسٹیبل نے نازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا نام؟''

لیکن نازیہ جواب دینے کے بجائے ایک قدم آگے بڑھی اور چق اٹھا کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

باون سالہ ایس پی رحمان کسی فائل کے مطالعے میں غرق تھا۔ آہٹ سن کر وہ چونکا اور نازیہ کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

''اوہ، نازیہ بی بی! خیریت تو ہے؟''

نازیہ کے پیچھے وہ کانسٹیبل بھی تیزی سے اندر آیا تھا۔ وہ اپنے ''صاحب'' کے سامنے صفائی پیش کرنا چاہتا تھا۔

نازیہ کوئی جواب دیے بغیر میز کی طرف بڑھی۔ چودھری رحمان نے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس کے لہجے میں سختی تھی۔

''چائے لاؤں سر؟'' کانسٹیبل نے جلدی سے پوچھا۔

''جب ضرورت ہوگی، بلا لوں گا تمہیں۔'' چودھری رحمان کا لہجہ سخت ہی رہا۔

''جی سر۔'' کانسٹیبل اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

نازیہ ایس پی چودھری رحمان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے اپنا بیگ برابر کی کرسی پر رکھ کر چودھری رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک خاص کام آ پڑا ہے آپ سے۔''

''اس کا اندازہ تو مجھے ہو گیا ہے۔ آپ کا موڈ خاصا بگڑا ہوا نظر آ رہا ہے۔''

اس کے اندازِ تخاطب میں بے تکلفی اس لیے نہیں تھی کہ نازیہ کے گھر میں آمد و رفت کے باوجود نازیہ سے اس کی کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ جب بھی آمنا سامنا ہوا تھا، بات رسمی سی ہی ہوئی تھی۔

''جی ہاں۔ میرا موڈ بہت خراب ہے۔ آپ کے پاس میں صرف اس لیے نہیں آئی ہوں کہ آپ میرے ڈیڈی کے دوست رہے ہیں بلکہ میری اہانت آپ ہی کے علاقے میں ہوئی ہے۔''

''کون ہیں آپ کی اہانت کرنے والے نازیہ بی بی؟'' چودھری رحمان نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے علم میں تو ہوگا کہ ڈیڈی نے وفات سے قبل اپنا سبھی کچھ میرے نام کر دیا تھا کیونکہ میں ان کی اکلوتی اولاد...''

''مجھے معلوم ہے نازیہ بی بی! بٹ صاحب نے مجھے بتایا تھا۔''

نازیہ کے والد کا نام فیاض احمد بٹ تھا۔ وہ فوج میں ملازم تھے۔ بریگیڈیئر کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے گورنمنٹ کنٹریکٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ آٹھ سال میں ان کے ادارے کو خاصا استحکام بھی حاصل ہو گیا تھا۔

نازیہ بولی۔ ''آپ ہی کے علاقے میں ان کا ایک پلاٹ بھی ہے۔ وہ بھی انہوں نے میرے نام کر دیا تھا۔''

''ظاہر ہے، پلاٹ وہ کسی اور کے نام کیسے کر دیتے؟''

''ڈھائی ماہ گزر چکے ہیں ڈیڈی کی وفات کو۔'' نازیہ نے بات آگے بڑھائی۔ ''ان کی وفات کے باعث میں بہت ڈسٹرب رہی تھی۔''

''قدرتی بات ہے۔'' ایس پی کو شاید بیچ میں بولنے کی عادت تھی۔

''خود کو سنبھالنے میں مجھے خاصا وقت لگا۔'' نازیہ نے بات جاری رکھی۔ ''ابھی ایک ہفتے سے میں بڑی حد تک نارمل ہوں۔ آج مجھے خیال آیا کہ اپنا پلاٹ دیکھ آؤں۔ اس کی لوکیشن دیکھ لوں۔ فائل سے مجھے پلاٹ کا نمبر معلوم ہو گیا تھا اس لیے وہاں پہنچنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔''

''ہونی بھی نہیں چاہیے۔'' ایس پی رحمان بول پڑا۔

''وہاں پہنچ کر میں حیران رہ گئی۔'' نازیہ نے کہا۔ ''کچھ لوگوں نے پلاٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ پلاٹ کے گرد چار دیواری کھنچوانا چاہتے ہیں۔ قبضہ انہوں نے شاید ایک آدھ دن پہلے ہی کیا ہے کیونکہ ابھی اس کی چار دیواری نہیں بنی ہے۔ ابھی بنیادیں کھد رہی ہیں۔''

یہ سب کچھ سنتے ہوئے ایس پی رحمان بہت سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے سے سوچ بچار بھی ظاہر ہونے لگی تھی۔

نازیہ نے بات جاری رکھی۔ ''وہاں مزدوروں کے علاوہ اس وقت چار افراد تھے جن کی وضع قطع سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ اچھے لوگ نہیں۔ میں نے پہلے تو ایک مزدور سے بات کی۔ اس نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کر دیا تو میں ان کے قریب گئی اور ان سے کہا کہ وہ اس پلاٹ پر کیسے قبضہ کیے بیٹھے ہیں، پلاٹ تو میرا ہے۔ اس پر ایک ہنس کر بولا۔ خواب دیکھنا اچھی بات ہے لیکن بے تکے خوابوں کو سچا نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس جواب پر مجھے غصہ آیا۔ میں نہ جانے کیا کہہ بیٹھی۔ اس پر وہ بھی مجھ پر فقرے کسنے لگے۔ ایسے جملے تھے ان کے جو کوئی شریف آدمی کسی عورت یا لڑکی سے نہیں کہہ سکتا۔ مجھے شدید غصہ آ گیا۔ آخر ایک فوجی کی بیٹی ہوں میں۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون ایک فوجی کا ہے۔ ریوالور بھی رکھتی ہوں میں اپنے پاس۔ جی چاہا کہ ان پر گولیاں برسا دوں لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح خود کو اس سنگین اقدام سے باز رکھا۔''

اس دوران میں ایس پی رحمان سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ بیچ میں ایک آدھ فقرہ بھی نہیں بولا تھا۔

نازیہ نے ایک لمبی سانس لے کر دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''انہوں نے بڑے دبنگ الفاظ میں کہا تھا کہ وہ ان کا پلاٹ ہے اور آئندہ میں ادھر کا رخ نہ کروں۔ انہوں نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے ان کی باتوں پر کان نہیں دھرا تو مجھے پچھتانا پڑے گا۔''

ایس پی رحمان متفکرانہ انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

نازیہ پھر بولی۔ ''اب مجھے بتایئے کہ آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ معاملہ آپ ہی کے علاقے کا ہے۔''

''وہ لوگ ہیں کون؟'' ایس پی رحمان نے خاصی دیر بعد زبان کھولی۔

''مجھے تو وہ شہدے ہی لگے مگر وہاں انہوں نے ایک سیاسی پارٹی کا پرچم لگا رکھا ہے۔ میں کافی عرصے سے اخبارات میں اس قسم کی خبریں بھی پڑھ رہی ہوں کہ بعض سیاسی پارٹیاں ایسے کام کر رہی ہیں۔ میں ان خبروں کی روشنی میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کے لوگ ہیں یا کسی مافیا کے غنڈے۔''

ایس پی سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔

''آپ کوئی جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں انکل؟'' نازیہ جھنجلا سی گئی۔ ''آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں یا نہیں؟''

''میں سوچ رہا ہوں نازیہ بی بی... دراصل اسی قسم کے حالات کی وجہ سے شہر کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور...''

اس مرتبہ نازیہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''وہ تو ایک سال سے میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے ان لینڈ مافیا کے سامنے پولیس بے بس ہو گئی ہے۔ ٹارگٹ کلنگ پر بھی پولیس قابو نہیں پا سکی ہے۔''

''آپ صرف ایک سال سے دیکھ رہی ہیں، حالات تو برسوں سے بگڑتے چلے آ رہے ہیں۔''

یہ حقیقت تھی کہ وہ سب کچھ ایک سال سے ہی نازیہ کی نظروں کے سامنے تھا۔ ایک سال پہلے تو وہ لندن میں زیرِ تعلیم تھی۔ والد کی سنگین بیماری ہی کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر آئی تھی اور ابھی تک اسے واپس جانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن وہ یہاں کے حالات سے بے خبر بھی نہیں رہی تھی۔ والد سے اس کا رابطہ رہتا تھا اور ٹی وی چینلز کی وجہ سے بھی اسے آگاہی حاصل ہوتی رہتی تھی۔

''حالات برسوں سے بگڑتے چلے آرہے ہیں۔'' نازیہ نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ''اور پولیس تماشا دیکھتی رہی ہے۔''

''آپ تو خیر لندن میں بیٹھی رہی ہیں لیکن یہاں کے لوگ بھی نہیں جانتے کہ ان حالات کے پس منظر میں کیا کچھ ہے۔ خیر چھوڑیں۔ میں آپ کے معاملے میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔ آپ کا پلاٹ کہاں ہے؟''

نازیہ نے وضاحت سے جواب دے دیا۔

''آپ بیٹھیں۔'' ایس پی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی معلومات حاصل کر کے آتا ہوں۔'' اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

نازیہ کو یہ بات عجیب سی لگی۔ کئی ٹیلی فون تو کمرے ہی میں موجود تھے لیکن ایس پی موبائل پر معلومات حاصل کرنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

شاید غلطی ہوئی ہے یہاں آکر، نازیہ سوچنے لگی۔ ایس پی کو اپنے ہی علاقے کے حالات کی خبر نہیں تھی۔

نازیہ کی راہنمائی کرنے والا اندر آیا۔ وہ چائے کی ٹرے سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کی ہدایت اسے ایس پی ہی سے ملی ہوگی۔ اس نے خود چائے بنا کر پیالی نازیہ کے سامنے رکھی۔ ساتھ میں کچھ بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔

نازیہ اتنی دیر میں دردِ سر کا شکار ہوگئی تھی۔ اس نے بسکٹ وغیرہ کی طرف دھیان دیے بغیر چائے کی پیالی اٹھالی۔ وہ چائے پی چکی تھی جب ایس پی رحمان واپس آیا۔ وہ اب بھی متفکر نظر آرہا تھا۔ نازیہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔'' ایس پی نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اپنا موبائل نمبر مجھے دے دیں۔ میں کل تک کچھ بتاؤں گا آپ کو۔ فوری طور پر کوئی ایکشن لینا میرے لیے مشکل ہوگا۔''

نازیہ کو غصہ آگیا لیکن اس نے فوری طور پر کچھ کہے بغیر میز سے ہی ایک سلپ اٹھا کر اس پر اپنا موبائل نمبر لکھا اور سلپ ایس پی کی طرف بڑھانے کے بعد بولی۔ ''خوشی ہوئی آپ کا جواب سن کر۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ''آپ اس علاقے کے ایس پی ہیں۔ غنڈا گردی آپ ہی کے علاقے میں ہورہی ہے اور آپ فوری طور پر کوئی ایکشن نہیں لے سکتے۔''

''میں نے بتایا تھا آپ کو کہ یہاں کے حالات کا آپ کو صحیح طور پر علم نہیں ہے۔''

''آپ کو ہے؟''

''مجھے تو یقیناً ہے لیکن میں نہایت معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس بارے میں کسی کے سامنے بھی میں زبان نہیں کھول سکتا۔ مجھے اپنی ملازمت سے تو ہاتھ دھونا ہی پڑیں گے لیکن کوئی اور نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں عوام کی دادرسی کے لیے کوئی نہیں ہے؟'' نازیہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

ایس پی نے اس بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے پہلے تو ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولا۔ ''میں کہہ چکا ہوں نازیہ بی بی کہ میں اس معاملے میں کل تک کچھ بتا سکوں گا آپ کو۔''

نازیہ اپنا بیگ اٹھا کے ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

''میں آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔'' اس نے کہا اور مڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

واپسی پر اس کی ڈرائیونگ کا انداز پہلے سے بھی زیادہ جنونی تھا۔

☆☆☆

نازیہ تین سال پہلے انگلینڈ گئی تھی۔ اس کے والد ہی نے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا لیکن وہ وہاں صرف سال بھر ہی رہ سکی۔ اسے اپنے والد کی بیماری کی خبریں ملنے لگیں جو اس کے ذہنی انتشار کا سبب بنیں۔ پھر جب اسے علم ہوا کہ اس کے والد کو کینسر ہوگیا ہے تو وہ شدید جذباتی کیفیت میں انگلینڈ سے واپس آگئی تھی۔

ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اس کے والد چھ سات ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکیں گے لیکن وہ دو سال زندہ رہے تھے۔ دو سال بعد نازیہ تنہا رہ گئی۔ کچھ دور یا قریب کے اعزا تھے تو سہی لیکن ان سبھی سے نازیہ کے والد کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے تھے۔ اسی لیے میل جول بھی برائے نام ہی سا رہا تھا۔ خود نازیہ نے بھی اپنے زمانۂ تدریس میں اپنا حلقۂ احباب زیادہ نہیں بڑھایا تھا اور جو تھوڑے بہت احباب تھے بھی تو نازیہ کا زیادہ تعلق صرف رخشی اور ثاقب سے رہا تھا۔ وہ دونوں نازیہ ہی کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن صرف مالی اعتبار سے۔ ان دونوں ہی کے سرپرست ملازمت پیشہ کبھی نہیں رہے تھے۔ ان کا تعلق بزنس کمیونٹی سے تھا جس سے نازیہ کے والد کا تعلق ریٹائرمنٹ کے بعد بنا تھا۔

نازیہ سے ثاقب کے جذبات کا معاملہ دوستی سے کچھ آگے بڑھا ہوا تھا۔ اسے نازیہ پسند تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے جذبات میں شدت بھی نہیں تھی۔ وہ ایک کاروباری شخص کا بیٹا تھا جو کچھ عرصے سے ایک سیاسی پارٹی میں بھی شامل ہوگئے تھے۔

''بس ایک اچھے دوست بنے رہو۔'' نازیہ نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

رخشی پر اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ اس معاشرے میں کوئی لڑکی شادی کیے بغیر زندگی گزار ہی نہیں سکتی اس لیے شادی تو وہ بھی کرے گی لیکن فی الحال اس معاملے میں سنجیدہ نہیں۔

باپ کی بیماری کے دنوں میں نازیہ کا سارا وقت گھر پر ہی گزرا۔ کبھی کبھی وہ اپنے احباب کو بلا لیا کرتی تھی اور کچھ دوست اس کے والد کی مزاج پرسی کے لیے آجایا کرتے تھے۔ زیادہ آمد و رفت رخشی اور ثاقب ہی کی رہتی تھی۔ وہ دونوں اسے روزانہ فون بھی کرتے رہتے تھے۔ اس روز بھی ثاقب کا فون آیا جب نازیہ ایس پی سے ملنے کے بعد پولیس اسٹیشن سے اپنے گھر پہنچی۔

''میں نے اس لیے فون کیا کہ آرہا ہوں تمہاری طرف۔'' ثاقب نے فون پر کہا۔

''آج تو میری طبیعت بہت ڈل ہے ثاقب! کل کسی وقت آجانا۔''

''طبیعت ڈل ہے تو پھر مجھے آنا ہی چاہیے۔ رخشی کو بھی فون کر دو یا میں کر دیتا ہوں۔ وہ بھی آجائے گی۔ گپ شپ میں دل بہل جائے گا تمہارا۔''

''نہیں ثاقب، پلیز! میں آج بس آرام کرنا چاہتی ہوں۔ ویسے رخشی تو اپنے کسی عزیز کی شادی میں مصروف ہے۔ اس نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ وہ کل شام تک مصروف رہے گی۔''

''اچھا تو میں کل گیارہ بارہ بجے کے قریب آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

نازیہ نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔ حقیقتاً اس کی طبیعت ڈل نہیں تھی۔ اس کے رگ و پے میں صرف غصہ بھرا ہوا تھا اور وہ سوچنا چاہتی تھی کہ ان حالات میں اسے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ اگرچہ چودھری رحمان نے دوسرے دن فون کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن نازیہ کو اس سے زیادہ توقع نہیں تھی۔

ملک کے اور خصوصاً اپنے شہر کے حالات اس سے ڈھکے چھپے رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کی ساری زندگی ہی وہاں گزری تھی۔ صرف ایک سال کا عرصہ انگلینڈ میں گزرا تھا لیکن وہاں بھی وہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اپنے شہر اور ملک کے حالات سے باخبر رہی تھی۔ پھر گزرے ہوئے دو سالوں میں تو اس نے یہیں رہ کر دیکھ لیا تھا کہ صورتِ حال کافی گمبھیر ہو چکی تھی۔ ہر طرف غنڈا گردی اور بدعنوانی کا راج تھا۔ کئی محکمے بربادی کے دہانے تک پہنچ چکے تھے۔ لاء اینڈ آرڈر مذاق بن کر رہ گیا تھا۔

سب کچھ نازیہ کے سامنے تھا لیکن یہ بات کبھی اس کے سان گمان میں بھی نہیں آئی تھی کہ خود اسے بھی کسی وقت ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اپنے اس ذہنی خلفشار کے عالم میں وہ ٹی وی کا ایک ٹاک شو دیکھنے بیٹھ گئی۔ ٹاک شو میں یہ معاملہ زیرِ بحث تھا کہ ایک نہایت ہی بدنام زمانہ دہشت گرد داراب زین کو اسی دن عدالت سے بری کیا گیا تھا۔

ٹاک شو میں بحث چل رہی تھی کہ یہ بریت کیوں ہوئی اور اس کا ذمے دار کون ہے جبکہ داراب پولیس کو یہ بیان دے چکا تھا کہ اس پر لگائے جانے والے الزامات درست ہیں۔

کرکٹ

☆ گیری سوبرز واحد آسٹریلوی کھلاڑی ہیں جنہوں نے ایک اوور میں چھ گیندوں پر چھ چھکے لگا کر ریکارڈ قائم کیا۔

☆ مہندر سنگھ دھونی وہ واحد کپتان ہیں جن کی قیادت میں ان کی ٹیم نے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ اور چیمپئنز ٹرافی جیتی۔ 13-11-2007ئ۔

☆ پاکستان نے انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ میں پہلی اننگز میں سو سے کم رنز پر آؤٹ ہونے کے باوجود میچ جیت کر 105 سالہ ریکارڈ توڑا۔ 2012ئ۔

(تحریر و تحقیق: محمد شایان سعید)

''وہ عدالت میں اپنے اس بیان سے مکر گیا تھا۔'' ٹاک شو میں کوئی عورت کہہ رہی تھی۔ ''اس کا عدالتی بیان سامنے ہے کہ پولیس نے اس کا اعترافی بیان زبردستی لیا تھا۔ اس کے خلاف کوئی گواہی بھی نہیں تھی۔ پولیس جب اتنے کمزور کیس بنائے گی تو پھر عدالت کر بھی کیا سکتی ہے؟''

جواب میں کسی نے پولیس کی طرف داری کرتے ہوئے کوئی جواز پیش کیا جو پروگرام میں شامل باقی افراد کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سبھی زور زور سے بولنے لگے۔ اتنی چیخ پکار ہوئی کہ کسی کا موقف بھی سننے والے کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔

نازیہ نے ٹی وی بند کر دیا لیکن اس وجہ سے نہیں کہ کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھی۔ اگر کچھ سمجھ میں آرہا ہوتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس پروگرام سے نازیہ کو دلچسپی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے دماغ میں داراب زین کا نام گونجنے لگا اور اس گونج کے ساتھ کچھ خیالات بھی کلبلانے لگے۔

رات کا کھانا بھی نازیہ ٹھیک سے نہیں کھا سکی اور ذہن میں خیالات کا جو تانتا بندھ گیا تھا، اس کی وجہ سے اسے نیند بھی کافی رات گزرنے کے بعد آسکی۔ وہ ساڑھے دس بجے اٹھ سکی۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ اخبار لے کر بیٹھی۔ اسے داراب زین سے متعلق خبر کی تلاش تھی۔ جلد ہی اسے مطلوبہ خبر مل گئی۔ نازیہ نے وہ بڑی توجہ سے پڑھی اور پھر اس کا منہ بن گیا۔ وہ داراب زین کے بارے میں جو بات جاننا چاہتی تھی، اس خبر سے نہیں جان سکی۔ اس نے بیزاری سے اخبار ایک طرف پھینک دیا۔ اسی وقت ایک ملازم نے ثاقب کے آنے کی اطلاع دی۔

ڈرائنگ روم میں نازیہ نے ثاقب سے ملاقات کی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''جیسی کل تھی۔'' نازیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

ثاقب کچھ حیرت سے بولا۔ ''تم ڈل تو نظر نہیں آرہی ہو؟''

''کل بھی نہیں تھی۔''

''مگر مجھ سے تم نے...''

''جھوٹ بولا تھا میں نے۔'' نازیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کل میری جو کیفیت تھی، وہ اس وقت بھی ہے۔ غصہ میری رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہو گئی؟'' ثاقب کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

نازیہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر اس نے وہ سب کچھ بیان کر ڈالا جو اس کے غصے کا سبب تھا۔ ساری بات مکمل کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''یہ سب کچھ میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تم میری کچھ مدد کر سکو۔''

''کوئی اچھا وکیل تلاش کرنا ہے؟''

''نہیں۔'' نازیہ نے فوراً جواب دیا۔ ''مجھے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹانا۔''

''پھر کیا چاہتی ہو؟ اس کے علاوہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟''

''قانونی کارروائی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ زمینوں پر قبضے کرنے والے ان لوگوں کے سرپرست بڑے سربرآوردہ لوگ ہوں گے۔ ہمارے معاشرے سے اب تعفن اٹھنے لگا ہے ثاقب! اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کی ذہنیت اب مجرمانہ بن چکی ہے۔ قانون کو وہ اپنی جیب میں ڈالے پھرتے ہیں۔''

''پھر تم کیا چاہتی ہو؟''

''آج کا اخبار پڑھا تم نے؟''

''سرسری سی نظر ڈالی تھی۔ رات کو ٹی وی چینلز کے اتنے شوز دیکھ لیتا ہوں کہ حالات سے بڑی حد تک آگاہی ہو جاتی ہے۔''

''تو پھر ٹاک شوز سے ہی تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ عدالت نے کل ایک نامور دہشت گرد کو بری کیا ہے۔''

''تمہارا اشارہ داراب زین کی طرف تو نہیں؟''

''اسی کی بات کر رہی ہوں۔''

''تمہیں اپنے معاملے سے دلچسپی ہے یا دہشت گردوں سے؟''

''اپنے ہی معاملے کی وجہ سے مجھے داراب زین کا خیال آیا ہے۔''

''وہ کیوں؟'' ثاقب کے چہرے پر پھر حیرت کا تاثر ابھرا۔

''یہ لوگ پیسے کے حصول ہی کے لیے دہشت گرد بنتے ہیں نا؟''

''پیسے کے لیے بھی بنتے ہیں۔ کچھ اور مقاصد بھی ہوتے ہیں ان کے۔''

''لیکن کسی بڑی رقم کے عوض یہ کسی کے لیے بھی، کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔ کم از کم مجھے اس کا یقین ہے۔''

''تم چاہتی کیا ہو نازیہ؟'' ثاقب کے لہجے میں الجھن تھی۔

''تمہیں علم ہے کہ میرا وہ پلاٹ جس علاقے میں ہے، وہاں کی زمین بہت مہنگی ہو چکی ہے۔ پلاٹ دو ہزار گز کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کی قیمت کا بھی اندازہ لگا سکتے ہو۔ اب میں اس پلاٹ کی قیمت سے زیادہ رقم خرچ کرنے کے لیے بھی تیار ہوں اگر اس گروپ کو ننگی کا ناچ نچایا جا سکے جس کے آدمیوں نے مجھ پر کئی گندے فقرے بھی کسے تھے۔''

ثاقب نہایت تشویش سے نازیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب بتاؤ۔'' نازیہ پھر بولی۔ ''تم کسی طرح داراب زین کا پتا لگا سکتے ہو؟ میں اس سے رابطہ کرنا چاہتی ہوں ثاقب! وہ جو رقم بھی طلب کرے گا، میں دوں گی اسے... اگر وہ میرا یہ کام کر سکے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کا پتا لگانا کوئی ناممکن کام نہیں۔ پولیس کے کسی آدمی سے یا کسی اخباری رپورٹر کے ذریعے داراب زین کا ٹھکانا معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان دونوں ہی اداروں میں تمہارا کوئی شناسا نہیں ہے تو کسی کو بناؤ، خواہ اس کے لیے بھی رقم خرچ کرنا پڑے۔''

ثاقب کی تشویش میں اضافہ ہوا۔ ''تم قانون اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہو؟''

''اب عزت سے زندہ رہنے کی شاید یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے۔'' نازیہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر کسی کو اس شہر میں زندہ رہنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنا قانون وہ خود بنائے۔''

''تم انتہا پسندانہ سوچ کی طرف جا رہی ہو۔''

''جا رہی ہوں نہیں، جا چکی ہوں۔'' نازیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اگر تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے تو پھر میں کوئی اور ذریعہ تلاش کروں گی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ مجھ پر جو گندے فقرے کسے گئے تھے، وہ اس وقت بھی میرے دل و دماغ کو سانپ کی طرح ڈس رہے ہیں۔ میں اب اس طرح سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ فوری طور پر تو میں نے قانون ہی کا سہارا لینا چاہا تھا لیکن ایس پی چودھری رحمان کی باتوں اور اس کے رویے نے مجھے مایوس کر دیا ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ ایس پی رحمان کا فون آجائے۔ تمہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی معقول تدبیر کر سکے۔''

نازیہ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ اگر اس کا فون آیا بھی تو اس کی باتیں میرے لیے مایوس کن ہوں گی لیکن میں تمہیں یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی کہ میں نے ایک دوست کا مشورہ نہیں مانا۔ میں شام تک فون کا انتظار کیے لیتی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ مجھے چلنا تو اسی راستے پر پڑے گا جس پر چلنے کا میں فیصلہ کر چکی ہوں۔''

ثاقب پُرتشویش نظروں سے نازیہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

نازیہ چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''مجھے امید ہے کہ تم دوستی نبھاؤ گے۔ میری خاطر یہ کام ضرور کرو گے۔ پولیس یا اخبار کا کوئی شخص تمہیں داراب زین کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ اگر کسی سے تمہاری واقفیت نہ ہو تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ واقفیت پیدا کرنا کوئی ناممکن کام نہیں۔''

''نازیہ!'' ثاقب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تمہیں اس خطرناک راستے پر نہیں چلنے دوں گا۔''

نازیہ کا منہ بن گیا۔ ''دوست مشورہ تو دے سکتے ہیں لیکن حکم نہیں چلا سکتے۔ کیا ایسا نہیں ہوا کہ دو مرتبہ میں نے تمہیں کچھ کام کرنے سے روکا لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ اس پر میں تم سے ناراض تو نہیں ہوئی۔ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔''

''میرے معاملات کی نوعیت کچھ دوسری تھی۔'' ثاقب نے جواب دیا۔ ''قانون سے تصادم کا کوئی خطرہ نہیں تھا ان کاموں میں لیکن تم جو کچھ کرنا چاہتی ہو، اس میں خود تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''مجھے اپنی زندگی کا نہیں، عزت کا پاس ہے۔ مجھ پر گندے فقرے کس کر میری جو بے عزتی کی گئی تھی، اس کا انتقام میں ضرور لوں گی۔ تم مجھے کس طرح روک سکتے ہو؟ کیا پولیس کے پاس جا کر انہیں میری اس سوچ کے بارے میں بتاؤ گے؟''

''خیر، اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی دوسری مشکل کھڑی کر دوں۔ دوست ہوں تمہارا، دشمن نہیں ہوں۔ ابھی میں نے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں اس راستے پر نہیں چلنے دوں گا لیکن یہ میں نے دوستی کے زعم میں کہا تھا۔ میں اس پر قادر نہیں ہوں کہ تمہیں کسی اقدام سے روک سکوں۔ بہرحال، مشورہ پھر یہی دوں گا کہ اس خطرناک راستے پر چلنے کا خیال دل سے نکال دو۔''

''صاف صاف کہو کہ تم میرا یہ کام نہیں کرنا چاہتے؟''

''صاف صاف ہی کہا ہے میں نے۔ جب میں تمہیں اس راستے سے گریز کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ میں اس معاملے میں تم سے کوئی تعاون

نہیں کروں گا۔"

"تو پھر اب تم جا سکتے ہو۔" نازیہ نے بے رخی سے کہا۔ "ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔۔۔ مجھے سوچنا پڑے گا کہ اب داراب تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تم موجود رہو گے تو میں کچھ سوچ نہیں سکوں گی۔"

"اچھا!" اس مرتبہ ثاقب نے افسردگی سے کہا۔ "اتنی بے رخی بھی برت سکتی ہو تم مجھ سے؟"

"میرے سامنے مقصد ہی ایسا ہے۔" نازیہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

اس کا کھڑا ہو جانا اس بات کا اشارہ تھا کہ اب ثاقب کو وہاں سے چلا جانا چاہیے اور ثاقب بھی بے وقوف نہیں تھا کہ اشارہ نہ سمجھتا۔ وہ اپنا ہونٹ کاٹتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"میں رخشی کو ضرور بتاؤں گا کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو۔" اس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

نازیہ کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ رخشی بھی اس کے ارادے سے باخبر ہو جاتی۔ اسے رخشی اور ثاقب پر اتنا بھروسا تو تھا کہ وہ بات کسی تیسرے فرد تک نہیں پہنچائیں گے۔

☆☆☆

نازیہ نے ثاقب کے اس مشورے کی لاج ضرور رکھی کہ داراب تک پہنچنے کی ایک تدبیر سوجھ جانے کے باوجود ایس پی چودھری رحمان کے فون کا انتظار کرتی رہی لیکن پانچ بجے تک اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کے باوجود اس نے ایک مرتبہ خود چودھری رحمان سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے ایس پی۔۔۔ کا موبائل نمبر معلوم نہیں تھا اس لیے اس نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ چودھری رحمان آج آیا ہی نہیں تھا کیونکہ اس کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں کر دیا گیا تھا۔

نازیہ کے ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی سکتی تھی کہ چودھری رحمان از خود ایک دن میں اپنا تبادلہ نہیں کرا سکتا۔ یہ بات پہلے ہی طے پا چکی ہو گی اس لیے چودھری رحمان نے اسے ایک دن کے لیے ٹال دیا ہو گا۔

"شٹ۔" نازیہ نے زیر لب کہا اور گھر سے نکل آئی۔ جلد ہی اس کی کار شہر کے ایک بدنام علاقے کی طرف رواں دواں تھی۔ اسے علم تھا کہ اس علاقے کی بیس پچیس فیصد آبادی جرائم پیشہ عناصر پر مشتمل ہے اور وہ لوگ آئے دن پولیس کے لیے دردِسر بنے رہتے ہیں۔ وہاں رہنے والے شریف لوگوں کو بھی پریشانی لاحق رہتی تھی اس لیے جن لوگوں کی مالی حالت اچھی تھی، وہ وہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے۔

کاریں اس علاقے میں بھی چلتی تھیں لیکن نازیہ کی کار کو حیرت سے اس لیے دیکھا گیا کہ اس کی ڈرائیونگ کرنے والی ایک نہایت ماڈرن لڑکی تھی۔ نازیہ نے ان لوگوں کی طرف دھیان نہیں دیا اور کار پان کی ایک دکان کے سامنے روکی جہاں کھڑا ہوا چالیس بیالیس سالہ گاہک اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

نازیہ نے نہایت مغرورانہ انداز میں اس شخص کو انگلی سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ فوری طور پر تو اس شخص کے چہرے پر الجھن نظر آئی پھر وہ سگریٹ سلگاتا ہوا کار کے قریب آ گیا۔

پان والے کی توجہ بھی اس وقت نازیہ کی طرف ہو گئی تھی لیکن نازیہ نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر قریب آنے والے شخص سے کہا۔

"داراب کا گھر یہیں کہیں ہے؟"

داراب زین کا نام سن کر اس آدمی کا چونکنا لازمی امر تھا۔

"کیوں؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ملنا ہے اس سے۔" نازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔ "سی آئی ڈی والی ہو آپ؟"

"میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے۔" نازیہ بولی۔

اب اس آدمی نے منہ بنایا۔ "انکوائری کا دفتر نہیں ہے یہ۔" اس نے کہا اور مٹھی ہونٹوں سے لگا کر انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کا گہرا کش لیتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

نازیہ نے کار آگے بڑھا دی۔ اسے خود بھی اتنی جلدی اپنی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ اس نے کار کی رفتار کم رکھی۔ وہ اِدھر اُدھر دکھائی دینے والوں کا جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ جو لوگ بظاہر جرائم پیشہ نہیں معلوم ہو رہے تھے، وہ انہیں نظرانداز کرتی رہی۔ کار اس نے ایک ایسے مقام پر روکی جہاں اسے تین چار شہدے قسم کے افراد نظر آئے۔ کار کو دیکھ کر وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نازیہ نے یہاں بھی ایک آدمی کو انگلی سے قریب آنے کا اشارہ کیا لیکن وہ سبھی ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کے قریب آ گئے۔

"داراب زین کا پتا بتا سکتا ہے کوئی؟" نازیہ بولی۔

ان لوگوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر نازیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک نے جواب دیا۔

"دادا کوئی ہم جیسا نہیں ہے کہ سب کو اس کا پتا معلوم ہووے۔"

نازیہ نے مزید کچھ کہے بغیر کار آگے بڑھائی۔ ایک جملہ اچٹتا ہوا سا اس کے کان میں پڑا۔ "پٹاخہ ہے یہ تو گورے خاں! دادا کے تو۔۔۔"

نازیہ اس سے زیادہ نہیں سن سکی۔ اسے غصہ بھی نہیں آیا۔ وہ اس قسم کے لوگوں سے اسی قسم کی فقرے بازی کی توقع رکھتی تھی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ ان لوگوں میں سے ایک نے اپنے موبائل سے اس کی کار کی تصویر لی تھی۔ نازیہ کو اس سے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔

وہ مزید تین مقامات پر رکی۔ اس کا سوال ایک ہی تھا۔ جواب بے ہنگم ملتے رہے۔ ایک جگہ اس نے محسوس کیا کہ ایک شخص نے موبائل سے اس کی تصویر بھی لی تھی۔

اب اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ سردی بھی کچھ بڑھ گئی تھی۔ نازیہ نے برابر کی سیٹ پر پڑی ہوئی اپنی چرمی جیکٹ اٹھائی اور کار ایک جگہ روک کر وہ پہن لی۔ اس کے بعد کار پھر حرکت میں لائی اور اس علاقے سے نکل آئی۔ اسے داراب زین کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق اس کا وقت ضائع نہیں ہوا تھا۔ اسے بڑی حد تک توقع تھی کہ اس نے جن لوگوں سے داراب کے بارے میں بات کی تھی، ان میں سے کوئی نہ کوئی داراب زین کے کان تک یہ بات پہنچا دے گا کہ ایک لڑکی کو اس کی تلاش ہے۔

جن لوگوں سے اس نے پوچھ گچھ کی تھی، ان میں سے ایک نے اسے "سی آئی ڈی والی" کہا تھا لیکن اس کے خیال کے مطابق داراب کے دماغ میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ خفیہ ایجنسیوں کے لوگ اس کی تلاش میں اس طرح مارے مارے نہیں پھریں گے اور نہ اس علاقے کے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کریں گے۔

نازیہ کو یہ یقین بھی تھا کہ داراب تجسس تو بہرحال ہو گا اور اسے اکساہٹ ہو گی کہ وہ اس لڑکی کو دیکھے یا اس سے رابطہ کرے جو اس کی تلاش میں تھی۔

اندھیرا پھیل چکا تھا جب وہ اپنے گھر پہنچی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے ہیٹر آن کیا اور جیکٹ اتار کر ایک طرف ڈال دی۔ پھر پشت کی طرف جینز میں اڑسا ہوا ریوالور نکال کر بستر کی سائیڈ ٹیبل میں ڈال دیا۔

ایک فوجی کی بیٹی ہونے کے باعث وہ بچپن ہی سے ایسی خطرناک چیزوں کی شائق رہی تھی۔ پانچویں جماعت تک بھی اس کے پاس ایک ٹوائے ریوالور رہا تھا۔ جوان ہونے کے بعد اس نے باپ سے ضد کر کے اصلی ریوالور بھی خرید لیا تھا اور اس کا لائسنس اس نے پہلے ہی لے لیا تھا۔ ایک بریگیڈیئر کی بیٹی کو اس میں کوئی دشواری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

لباس تبدیل کر کے وہ بستر پر لیٹ کر اپنی دو گھنٹے کی مصروفیت کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ موبائل فون پر رخشی کی کال آ گئی۔ نازیہ نے طویل سانس لی۔ رخشی نے اپنی بے حد مصروفیت کے باوجود اسے فون کرنا ضروری سمجھا تھا جس کا مطلب نازیہ کے خیال کے مطابق یہی ہو سکتا تھا کہ ثاقب نے بات اس کے کانوں تک پہنچا دی تھی۔

"گھر پر ہو یا کہیں باہر؟" رخشی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"گھر پر ہی ہوں۔"

"ابھی کہیں جانا تو نہیں ہے؟"

"نہیں، کیوں؟"

لیکن اسے اپنی "کیوں" کا جواب نہیں ملا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ نازیہ سمجھ گئی کہ رخشی آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کے گھر پہنچ جائے گی۔

پچیس منٹ بعد ہی وہ ڈرائنگ روم میں تھی۔ رخشی کے ساتھ ثاقب بھی آیا تھا۔ دونوں کی کاریں آگے پیچھے آئی تھیں۔ دونوں ہی بے حد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"بے حد مصروفیت کے باوجود آئی ہوں۔" رخشی نے نازیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ثاقب سے وہ سب کچھ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔"

"لیکن میرے سر پر آسمان بھی ہے اور پیروں تلے زمین بھی ہے۔" نازیہ نے سنجیدگی سے کہا پھر ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے ناخوشگوار لہجے میں بولی۔ "اتنی جلدی کیوں تھی تمہیں کہ رخشی کو مصروفیت کے عالم میں ڈسٹرب کیا؟"

ثاقب کے بجائے رخشی بول پڑی۔ "اچھا کیا ہے ثاقب نے جلدی کر کے۔ تم نہ جانے کب، کیا قدم اٹھا بیٹھو۔"

"وہ تو مجھے اٹھانا ہی ہے بلکہ ایک حد تک اٹھا بھی چکی

ہوں۔ مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ اب داراب سے رابطہ ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

''تم خطرناک لوگوں سے بھڑنے جارہی ہو نازیہ... اس معاملے میں تم خود بھی خطرے میں پڑ سکتی ہو۔''

''یہ ثاقب نے بھی کہا تھا۔'' نازیہ بے پروائی سے بولی۔

''تم ہمیشہ ہی سے ضدی رہی ہو۔'' رخشی کچھ غصے سے بولی۔ ''اپنے دوستوں کا بھی خیال نہیں رکھتی ہو۔''

''مجھے اپنی عزت سب سے زیادہ عزیز ہے۔'' نازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اب اس شہر کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہر شریف شخص کو قانون اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ میں تو یہاں تک سوچ چکی ہوں کہ میری طرح اور بہت سے لوگ بھی ایسا کر چکے ہوں گے۔''

''انتقامی جذبہ بھی تم میں ہمیشہ رہا ہے۔''

''اچھا ہوگا رخشی کہ اب تم جاؤ۔ مصروفیت سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان سے مل لینا مجھ سے۔''

اس بات کے باوجود رخشی نے آدھے گھنٹے تک بک بک جھک جھک کی۔ نازیہ کے خیال کے مطابق وہ بک بک جھک جھک ہی تھی جس کا کوئی مثبت نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جو کچھ ٹھان لی تھی، اس پر کوئی مشورہ اثرانداز نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ تھی ہی منتقم مزاج اور ضدی جس کا رخشی نے اظہار بھی کیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ دونوں رخصت ہوئے تو ان کے چہروں سے فکرمندی عیاں تھی۔ اگرچہ رخشی کے ساتھ ثاقب بھی آیا تھا لیکن اس دوران میں اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔

ذہنی انتشار کے باعث کھانے پینے کو بھی نازیہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن رات کے کھانے پر اس نے اپنے ساتھ زبردستی کی اور اپنی خوراک کے مطابق ہی کھایا۔ اسے یہ خیال آگیا تھا کہ ان حالات میں اسے اپنی جسمانی طاقت بحال ہی رکھنا چاہیے۔

اس رات بھی اسے دیر تک نیند نہیں آئی اور مسلسل سوچ بچار کے باعث آدھی رات کے بعد اس کے سر میں درد ہوگیا۔ اس نے چائے بنانے کے لیے اپنے کمرے سے نکل کر کچن کا رخ کیا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ جب ملازمین سو چکے ہوتے تو وہ بے حد ضروری کام کے بغیر ان میں سے کسی کو نہیں اٹھاتی تھی۔ یہ عادت اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ مرحوم بھی زیادہ رات ہوجانے کے بعد اپنے معمولی کام خود ہی کرتے تھے حالانکہ گھر میں ملازمین کی کمی نہیں تھی۔

چائے بنا کر نازیہ کپ اپنے کمرے میں لے آئی۔ چائے پینے سے اس کے سر درد میں کمی آئی اور پھر اس نے سوچ بچار سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کی۔ مسلسل سوچتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نیند ہی غارت ہوتی۔ اس کی یہ سوچ رنگ لائی اور وہ سوگئی ورنہ دوسری رات کا زیادہ حصہ بھی جاگتے ہوئے ہی گزرتا۔

صبح اس نے غسل کرنے کے بعد ناشتا کیا اور پھر اخبار اٹھا کر خبروں پر نظر دوڑانے لگی۔ کوئی خاص خبر اسے دکھائی نہیں دی۔ بس وہی ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہونے والوں کی تعداد... بھتا خوروں کے خلاف تاجران کا واویلا... سیاسی جماعتوں کے ایک دوسرے پر الزامات...

نازیہ نے سرخیوں پر نظر دوڑانے کے بعد اکتائے ہوئے انداز میں اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ روزانہ اسی قسم کی خبریں شائع ہورہی تھیں۔ پڑھنے کے لیے کوئی اچھی خبر عنقا ہوچکی تھی۔

نازیہ اپنے اس قدم کے بارے میں سوچنے لگی جو اس نے گزشتہ روز اٹھایا تھا۔ اس کی دانست میں امکانات اس بات کے بھی تھے کہ اس کی اور اس کی کار کی جو تصاویر موبائل سے لی گئی تھیں، وہ بھی داراب تک پہنچ جاتیں۔ اس صورت میں داراب زین کار کے نمبر کے ذریعے اس کے گھر کا پتا لگا سکتا تھا۔

لیکن اس میں کتنا وقت لگتا؟ اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا اور نازیہ بے چین تھی کہ داراب سے اس کا رابطہ جلد از جلد ہو۔ وہ سوچنے لگی کہ اس سلسلے میں وہ مزید کیا کرسکتی ہے۔

معاً اس کے دماغ میں عامر کا نام ابھرا۔ تین سال قبل جب وہ انگلینڈ نہیں گئی تھی اور یہیں زیرِ تعلیم تھی تو عامر اس کا کلاس فیلو تھا جو ایک بڑے باپ کا آوارہ مزاج بیٹا تھا۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق اس نے کئی لڑکیوں کی زندگی برباد کی تھی۔ اس نے نازیہ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی جس کے باعث نازیہ اس سے سخت برہم رہنے لگی تھی۔

''کسی نہ کسی دن میں تمہیں ضرور پالوں گا نازیہ!'' ایک روز وہ بے باکی سے یہ بھی کہہ بیٹھا تھا۔

جواب میں نازیہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ بعد کے دنوں میں عامر اسے خونخوار

نظروں سے دیکھتا رہا لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ نازیہ کو اس کے باپ نے انگلینڈ بھیج دیا۔

انگلینڈ سے واپسی پر دو سال پہلے اسے رخشی سے معلوم ہوا تھا کہ عامر نے تعلیم ادھوری ہی چھوڑ دی تھی اور زیادہ ہی غلط راستوں پر نکل گیا تھا۔ جرائم پیشہ عناصر سے اس کے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے۔ شبہ کیا جارہا تھا کہ اس نے اسمگلنگ شروع کردی تھی مگر کیونکہ وہ ایک بہت بڑے اور بارسوخ باپ کا بیٹا تھا اس لیے پولیس اس پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر رہی تھی۔

نازیہ اپنی صورتِ حال کے باعث اس کا تعاون حاصل کرنے کے بارے میں بھی سوچ سکتی تھی اور غیرارادی طور پر اس کے دماغ میں عامر کا نام آیا بھی تھا لیکن وہ اس نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے خوب احساس تھا کہ اگر اس نے پرانی چپقلش بھلا کر عامر سے رابطہ کیا اور اس سے تعاون چاہا تو یہ عامر کے لیے ایک سنہری موقع ہوگا۔ وہ اس سے اپنے تعاون کا وہی معاوضہ طلب کرے گا جس کی خواہش کا اظہار وہ کر بھی چکا تھا۔

نازیہ نے بڑی نفرت سے وہ نام اپنے دماغ سے جھٹک دیا اور گھر سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اسے خیال آیا تھا کہ اپنے پلاٹ کی طرف ایک چکر لگالے اور دیکھے کہ بات کہاں تک پہنچی۔ وہ یہ تو دیکھ چکی تھی کہ وہاں کام بہت تیزی سے کیا جارہا تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ شاید اب چاردیواری کھڑی کرنے کا کام بھی شروع ہوگیا ہو۔

کام شروع ہوچکا ہوتا یا نہ ہوتا، اس سے فی الحال نازیہ کے لیے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا لیکن محض تجسس کے باعث وہ گھر سے روانہ ہوگئی۔ معمول کے مطابق وہ جینز میں تھی۔ موسم ابھی سرد ہی تھا اس لیے اس نے جیکٹ بھی پہن لی تھی۔ اس جیکٹ کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر اسے کسی جگہ کار سے اترنا پڑتا تو کمر پر اس کی جینز میں اڑسا ہوا ریوالور کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

ریوالور اس نے گزشتہ روز سے ہی اپنے ساتھ رکھنا شروع کیا تھا۔ اس نے خود کو جن حالات سے دوچار کرلیا تھا، ان حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ریوالور اپنے ساتھ رکھے۔

جب اس کی کار اپنے پلاٹ کے پاس سے گزری تو وہاں اسے نہ تو وہ شہدے قسم کے لوگ نظر آئے اور نہ مزدور... اس کے خیال میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ کام روک دیا جاتا لیکن اس کا امکان تھا کہ سردی کی وجہ سے وہ لوگ دیر سے آتے ہوں۔ اس وقت دس ہی بجے تھے اور ابھی فضا کی ٹھنڈک میں نمایاں کمی نہیں آئی تھی۔

نازیہ آگے چلی گئی۔ اس نے بے خیالی میں ایک ایسا موڑ لیا تھا کہ جلد ہی وہ قبرستان قریب آگیا جہاں اس کے باپ کی تدفین ہوئی تھی۔ جذباتی ہوکر اس نے کار روک دی اور اسے ایک طرف کھڑا کر کے قبرستان میں گئی۔ اپنے باپ کی قبر پر اس نے افسردگی کے عالم میں ایک گھنٹا گزار دیا۔ افسردگی کے باوجود اتنی دیر تک اسے یہ احساس بھی ہوتا رہا کہ وہ دنیا میں اکیلی نہیں رہ گئی تھی، اس کے باپ کی روح اس کے ساتھ تھی۔

گھنٹا بھر بعد وہ قبرستان سے نکل کر کار میں بیٹھی اور وہاں سے روانہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ فی الحال اس کے لیے کسی قسم کی مصروفیت تھی ہی نہیں۔ اسے اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے کاروبار پر توجہ تو دینا تھی، مگر فی الحال اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لے سکتی۔ اس کے مرحوم والد ہی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں سارا کام اپنے جنرل منیجر پر چھوڑ دیا تھا اور اب بھی وہی سب کچھ سنبھالے ہوئے تھا۔ نازیہ کو اس کی فکر بھی نہیں تھی کہ اگر وہ کچھ خورد برد کر بیٹھا تو کیا ہوگا۔

ایک بجے تک وہ اپنے کمرے ہی میں پڑی خیالات میں ڈوبی رہی۔ پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ پھر اپنے پلاٹ کی طرف جانے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اب اس نے جیکٹ اتار دی تھی اور ریوالور کمر میں اڑسنے کے بجائے وینٹی بیگ میں ڈال لیا تھا۔

ایک چوراہے پر اسے عین اس وقت رکنا پڑا جب سگنل بند ہوا تھا۔ وہ سگنل ڈیڑھ منٹ تک بند رہتا تھا۔

پھر بمشکل پچاس سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ نازیہ کو ''کھٹ، کھٹ'' کی آواز نے چونکایا۔ اس نے بے اختیار بائیں جانب کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک شخص جھکا ہوا کھڑکی کے شیشے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی نے انگلی سے کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹایا ہوگا۔ اس نے سر پر مفلر باندھ رکھا تھا اور مفلر کا ایک سرا اپنے چہرے کے سامنے کرلیا تھا۔

جیسے ہی نازیہ نے اس کی طرف دیکھا، اس نے اپنے چہرے سے مفلر ہٹایا۔ وہ داراب زین تھا۔ نازیہ اگرچہ اسی سے ملنے کے لیے بے چین تھی لیکن اسے پہچانتے ہی اس کا دل بڑی زور سے اچھلا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ کسی نامی گرامی دہشت گرد کے سامنے تھی۔

داراب نے اپنا چہرہ مفلر سے پھر چھپالیا۔ اس نے نازیہ کے چہرے سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔

کار کا دروازہ کیونکہ لاک تھا اس لیے داراب کو شیشہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش آئی تھی ورنہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آبیٹھنا اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا کیونکہ کار کھڑی ہوئی تھی۔

نازیہ چند لمحے کے لیے سکتے کی سی حالت میں رہ گئی۔ غالباً داراب کا اس طرح ملنا اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

داراب نے پھر شیشہ کھٹکھٹاتے ہوئے سگنل کی طرف دیکھا جہاں بدلتے ہوئے ہندسے ظاہر کررہے تھے کہ سات سیکنڈ گزر چکے تھے۔

پھر جب تواں سیکنڈ آیا تو نازیہ آٹومیٹک لاک کھول چکی تھی۔ داراب تیزی سے دروازہ کھول کر کار میں آگیا۔ نازیہ کے برابر کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بڑے اطمینان سے دروازہ بند کیا اور بولا۔

"تم کیسی لڑکی ہو کہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں لیکن مجھے دیکھ کر پریشان ہوگئیں؟"

"میں پریشان نہیں ہوئی تھی بلکہ..."

"بلکہ...؟"

نازیہ نے اپنی ادھوری چھوڑی ہوئی بات مکمل نہیں کی اور بولی۔ "تم اس طرح کیسے آگئے؟"

"اوہ!" یکایک داراب کے منہ سے نکلا اور مفلر جو اس کے چہرے سے ہٹ گیا تھا، وہ اس نے جلدی سے پھر چہرے پر کرلیا۔

"کیا ہوا؟" نازیہ نے جلدی سے پوچھا۔

"ٹریفک کانسٹیبل مجھے دیکھ کر چونک گیا تھا۔"

اس مرتبہ "اوہ" نازیہ کے منہ سے نکلا۔ وہ فوری طور پر اس خیال سے پریشان ہوگئی تھی کہ ایک دہشت گرد کو اس کی کار میں بیٹھا دیکھ لیا گیا تھا اور دیکھنے والا بھی ایک پولیس کانسٹیبل تھا۔

داراب نے غالباً اس کی زیادہ پروا نہیں کی اور نازیہ سے بولا۔ "مجھے کل ہی معلوم ہوگیا تھا کہ تم میری تلاش میں ہو۔ کار کی اور تمہاری تصویر بھی مجھے مل گئی تھی۔ آج صبح میں نے معلوم کروالیا کہ اس نمبر کی کار کس کی ہے۔ تمہارا پتا بھی معلوم ہوگیا۔ میں خود تمہارے گھر کا جائزہ لینے کے لیے ابھی وہاں پہنچا تھا۔ اسی وقت تمہاری کار پھاٹک سے نکلتی دکھائی دی تو اپنی کار میں تمہارے پیچھے چل پڑا۔

"تمہاری کار؟"

"ہاں، وہ پیچھے آرہی ہے۔ میرے ساتھ ایک اور بندہ بھی تھا۔ وہی چلارہا ہے کار۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ پیچھے لگا رہے۔" داراب نے جواب دیا۔ "یہاں سگنل کی وجہ سے تمہیں رکنا پڑا۔ یہ میرے لیے بڑا اچھا موقع تھا۔"

"ہوں۔" فوری طور پر نازیہ کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

داراب ہنسا۔ "بہت خوب صورت لڑکی ہو تم، اس لیے میرا دل بھی چاہا کہ تم سے ملوں۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ تمہارا تعلق کسی خفیہ ایجنسی سے نہیں ہوگا لیکن میں حیران بھی تھا... اب بھی حیران ہوں۔ آخر کیوں تلاش تھی تمہیں میری؟ تم خوب صورت ہی نہیں، بہادر بھی ہو۔ اس عمر کی لڑکیاں تو میرے سائے سے بھی بچنا چاہتی ہوں گی۔"

نازیہ کچھ پریشان ہوگئی۔ داراب نے دو مرتبہ اس کی خوب صورتی کا ذکر کیا تھا اس لیے نازیہ کے دماغ میں یہ خیال ابھرا تھا کہ کیا داراب بھی اس سے اس قسم کا مطالبہ کر سکتا ہے جس کی خواہش عامر کو تھی۔

چند لمحے بعد داراب پھر بولا۔ "تم کچھ بولو گی بھی یا صرف یہ چاہتی ہو کہ میرے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکلو۔"

کار اب حرکت میں آچکی تھی لیکن اسے حرکت میں لانا، نازیہ کا لاشعوری عمل تھا۔ اسے بالکل خیال نہیں تھا کہ سگنل کب سبز ہوا تھا۔

"مجھے ایک کام ہے تم سے۔" نازیہ بولی۔

"مجھ سے کام؟" داراب کے لہجے میں حیرت تھی۔ "تم جیسی خوب صورت لڑکی کو مجھ سے کیا کام پڑسکتا ہے؟"

نازیہ کا ذہن پھر تھوڑا سا منتشر ہوا کیونکہ داراب کی زبان پر تیسری مرتبہ "خوب صورت" کا لفظ آیا تھا۔

"کام بہت خطرناک ہے۔" نازیہ کچھ رک کر بولی۔

"اچھا!" داراب دھیرے سے ہنسا۔ "داراب کے لیے بھی کوئی کام خطرناک ہوسکتا ہے؟"

"یہ میں نے اپنی سوچ کے مطابق کہا۔" نازیہ نے کار اب ایک ایسی سڑک پر موڑلی تھی جہاں ٹریفک قدرے کم ہوتا تھا۔ "میں کسی کے قتل کو خطرناک ہی سمجھتی ہوں۔"

"قتل!" اس مرتبہ داراب چونکا۔

"ہاں۔" نازیہ نے کہا۔ "کچھ لوگوں نے میرے ایک قیمتی پلاٹ پر قبضہ کرلیا ہے۔ خیر، یہ بات تو مجھے زیادہ مشتعل نہیں کرتی لیکن ان لوگوں نے میرے ساتھ بدتمیزی

بھی کی تھی۔ آج کل کئی لینڈ مافیا ہمارے شہر میں سرگرم ہیں۔ ان کا تعلق بھی کسی لینڈ مافیا سے ہوگا۔"

"تم قانون کا سہارا بھی لے سکتی ہو۔"

"قانون۔" نازیہ نے حقارت سے کہا۔ "کیا اب اس شہر میں کوئی قانون بھی ہے؟"

داراب نے اس طرح آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا جیسے نازیہ سے سو فیصد متفق ہو۔

نازیہ پھر بولی۔ "اب اس شہر میں وہی لوگ عزت سے زندہ رہ سکتے ہیں جو اپنا قانون خود بنائیں۔ معاملہ چونکہ مافیا کا ہی ہوسکتا ہے اس لیے ان لوگوں کو ختم کروا کے ہی مجھے اپنا پلاٹ واپس مل سکتا ہے۔ ویسے مجھے شدید غصہ اس بات پر ہے کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ نہایت گھٹیا رویہ اختیار کیا تھا۔"

داراب چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "تمہارا نام نازیہ ہے نا خوب صورت لڑکی؟"

نازیہ چونکی۔ "یہ بھی معلوم کرلیا تم نے؟"

"یہ بھی جان چکا ہوں کہ تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھے۔" داراب نے جواب میں کہا۔ "اگر مجھے یہ معلومات نہ حاصل ہوتیں تو میں ابھی تم سے نہیں ملتا۔ ہم جیسے لوگوں کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے مگر میں تمہارے معاملے میں اتنا محتاط نہیں رہا جتنا محتاط رہنا چاہیے۔"

"کیوں؟ میرے معاملے میں زیادہ محتاط رہنا ضروری کیوں نہیں تھا؟"

داراب ہنسا۔ "تم بہت خوب صورت ہو۔ تصویر بھی خوب صورت تھی۔ وہ خوب صورت لڑکیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں جو بہادر بھی ہوں۔"

نازیہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ داراب سے مل کر اس سے غلطی تو نہیں ہوئی؟

"خیر! اب مطلب کی بات کی جائے۔" داراب کا لہجہ سنجیدہ ہوگیا۔ "قتل جیسے چھوٹے موٹے کام میں نہیں کرتا لیکن تم مجھے اچھی لگی ہو اس لیے میں تمہیں ایک ایسے آدمی سے ملوا دوں گا جو اسی قسم کے کام کرتا ہے۔ کام بہت صحیح طریقے سے ہوجائے گا تمہارا۔ ابھی رابطہ کرادوں گا اس سے... اس طرح میرا کام ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد میں تم سے نہیں ملوں گا اور تمہیں بھی پھر مجھ سے ملنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہماری یہ پہلی ملاقات ہی آخری ملاقات ہوگی۔ میں تو بس جاننا چاہتا تھا کہ تم جیسی لڑکی مجھ سے کیوں

ملنا چاہتی ہے۔ یہ مجھے معلوم ہو گیا لہٰذا اب دوبارہ ملنے کی ضرورت نہیں۔"

اس جواب سے نازیہ نے سکون محسوس کیا۔ وہ داراب کے بارے میں غلط سوچنے لگی تھی۔ اگر وہ اس قسم کا آدمی ہوتا تو ہرگز نہیں کہتا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہوگی۔

اطمینان حاصل ہوتے ہی نازیہ بے جھجک بات کرنے کے موڈ میں آگئی۔

"لیکن میں یہ کام تم ہی سے لینا چاہتی ہوں۔"

"میں نے کہا نا، میں ایسے چھوٹے موٹے کام نہیں کرتا جو دو چار پانچ لاکھ میں ہو جاتے ہیں۔۔۔ اور اگر کبھی مجھے کسی وجہ سے ایسا کوئی کام کرنا بھی پڑے گا تو معاوضہ میں اپنی مرضی کے مطابق لوں گا۔"

"میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ دوں گی۔"

"اچھا!" داراب ہنسا۔ "کتنے آدمیوں کو قتل کرنا ہے؟"

"مجھے تو چار ہی نظر آئے تھے۔ وہاں کام کرنے والے مزدوروں سے مجھے کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"اگر انہیں ایک ہی جگہ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں ختم کیا جا سکتا ہے تو میں اس کا معاوضہ پچاس لاکھ لوں گا۔"

"میں دوں گی۔" نازیہ نے فوراً جواب دیا۔

داراب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ غالباً یہ جواب اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

"کیا قیمت ہے تمہارے پلاٹ کی؟" وہ کچھ توقف سے بولا۔

"اس کی کوئی اہمیت نہیں۔" نازیہ نے جواب دیا۔ "اگر پلاٹ پچاس ہزار کا بھی ہوتا تو میں تمہیں پچاس لاکھ دینے کے لیے تیار ہو جاتی۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ان لوگوں نے مجھے ذلیل کیا تھا۔ اس کی سزا انہیں ملنا ہی چاہیے۔"

داراب نے پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت مال دار ہو؟"

نازیہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "میں تمہاری منہ مانگی رقم دینے کے لیے تیار ہوں، لہٰذا اب تمہیں اس کام پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"اچھا!" داراب نے طویل سانس لی۔ "تمہارا کام ہو جائے گا۔ تم اپنا پلاٹ دکھا دو۔"

نازیہ نے اطمینان کی سانس لی۔ "پلاٹ کی طرف میں تمہیں ابھی لے چلتی ہوں۔ ایڈوانس کے طور پر پچیس لاکھ کا چیک بھی تمہیں ابھی دے دوں گی۔"

"ایڈوانس نہیں، پوری رقم۔" داراب نے کہا۔ "تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا پڑے گا۔ اگر پچیس لاکھ کا بھروسا کیا جائے تو پچاس کا بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں غیر قانونی کام تو کرتا ہوں مگر بے ایمانی نہیں کرتا۔"

"ٹھیک ہے۔ پچاس لاکھ دے دوں گی۔"

نازیہ نے کہیں پڑھا تھا کہ "دو نمبر" کام کرنے والے واقعی بے ایمانی نہیں کرتے مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کلیہ دہشت گردوں کے سلسلے میں بھی منطبق ہوتا ہے یا نہیں۔۔۔ یہ بس اس کے جنون کی بات تھی اور اس کا جنون بہت بڑھا ہوا تھا جو کام کم رقم میں بھی کسی سے کروایا جا سکتا تھا، وہ اس کے لیے پچاس لاکھ دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

"لڑکی!" داراب نے طویل سانس لی۔ "تم مجھے ضدی بھی معلوم ہوتی ہو اور جنونی بھی اور بہادر بھی تم یقیناً ہو۔ بہر حال میں تم سے اس کام کے پچیس لاکھ ہی لوں گا۔"

"یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں تو پچاس بھی دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اس دوران میں نازیہ نے داراب کی باتوں اور اس کے لب و لہجے سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی ان پڑھ شخص نہیں تھا بلکہ کسی نہ کسی حد تک پڑھا لکھا ہی ہوگا۔

اتنی دیر تک ساتھ رہنے کے باعث داراب کی طرف سے نازیہ کا خوف بھی ختم ہو گیا تھا۔ وہ اس سے اس کے بارے میں کچھ استفسار کرنا چاہتی تھی لیکن اس وقت اس کا پلاٹ خاصا قریب آچکا تھا۔ وہ داراب کو آج ہی پلاٹ دکھا دینا چاہتی تھی۔

"وہ جو کھجور کا درخت نظر آرہا ہے نا، ذرا ٹیڑھا سا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "اس کے بعد والے بنگلے کے بعد خالی پلاٹ ہے جو میرا ہی ہے۔ وہاں موجود لوگوں کو گہری نظر سے دیکھ لینا۔ وہ مزدوروں سے مختلف نظر آئیں گے۔"

"میں اچٹتی سی نظر دیکھ کر بھی کسی کا چہرہ نہیں بھولتا۔"

"ہم پہنچ گئے۔" نازیہ جلدی سے بولی۔

اس کی توقع کے مطابق وہاں کام جاری تھا۔ دیوار اٹھانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ اس مشین کا شور خاصا تھا جس میں سیمنٹ اور ریت کا گارا بنایا جا رہا تھا۔

نازیہ جن آدمیوں کو قتل کروانا چاہتی تھی، وہ اس وقت ایک طرف کرسیوں پر بیٹھے نظر آرہے تھے۔

کار تیز رفتاری کے ساتھ پلاٹ کے سامنے سے

گزری لیکن نازیہ کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی کہ ان لوگوں کی نظر اس کی کار پر نہ پڑے۔ ان میں سے ایک کی نظر اس کی کار پر پڑ گئی تھی اور اس نے جلدی سے اپنے ساتھیوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ نازیہ کو یقین ہو گیا کہ جس نے اپنے ساتھیوں کو اس کی کار کی طرف متوجہ کیا تھا، اس نے اسے بھی ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھ لیا ہوگا اور شاید اس کے ساتھیوں نے بھی۔ ان کی نظر داراب پر بھی پڑی ہوگی لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکے ہوں گے۔ داراب کا چہرہ مفلر سے چھپا ہوا تھا۔

"وہ لوگ تمہاری کار دیکھ کر چونکے تھے۔" داراب بولا۔

"ہاں، میں چاہتی تو نہیں تھی کہ ایسا ہو لیکن خیر۔"

"اب گاڑی کسی ویران سی گلی میں موڑ کر روکو۔ وہاں میں تمہاری کار سے اتر جاؤں گا۔"

جلد ہی نازیہ نے کار ایک گلی میں موڑی۔ اس نے عقب نما آئینے پر بھی نظر ڈالی اور دیکھ لیا تھا کہ ایک قیمتی گاڑی بھی گلی میں داخل ہوئی تھی۔ داراب اسے بتا بھی چکا تھا کہ اس کا ایک آدمی گاڑی میں پیچھے آرہا ہے۔

دونوں گاڑیاں قریب قریب ہی رکیں۔

کار۔۔۔۔۔ کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک آدمی اتر کر نازیہ کی کار کی طرف آنے لگا۔ داراب نے کار میں بیٹھے ہی بیٹھے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔

جب وہ قریب آیا تو داراب کار سے اترا۔ اترنے سے پہلے اس نے نازیہ سے اس کے بینک کی برانچ کا پتا معلوم کر لیا تھا۔ وہ ادائیگی نقد چاہتا تھا۔

"گیرو!" داراب نے اپنے آدمی سے کہا۔ "میں ابھی راستے میں بتا دوں گا کہ تجھے کیا کرنا ہے۔" پھر اس نے کھڑکی سے نازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے آدمی کو اچھی طرح پہچان لو، یہ رقم لینے آئے گا۔"

"پہچان لیا ہے میں نے۔" نازیہ نے جواب دیا۔

"بس تو اب میں چلتا ہوں۔"

نازیہ کے کچھ بولنے سے پہلے وہ تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا آدمی بھی جسے اس نے "گیرو" کے عجیب و غریب نام سے مخاطب کیا تھا۔

نازیہ کی کار کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ وہ کار حرکت میں لے آئی اور سیدھی نکلتی چلی گئی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ داراب کی کار بیک کی گئی تھی۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو نازیہ کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ دو تین روز پہلے تک وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا موڑ بھی آئے گا جب وہ ایک نہایت خطرناک کام کے سلسلے میں ایک نامی گرامی دہشت گرد سے ملے گی۔

☆☆☆

ٹھیک ساڑھے تین بجے داراب کی کار۔۔۔۔۔ اس بینک کے سامنے موجود تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر گیرو ہی تھا۔

نازیہ پچیس لاکھ روپے نکلوا چکی تھی۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں تھیں جو نازیہ نے آس پاس موجود لوگوں کی نظر بچا کر کار۔۔۔۔ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے گیرو کی گود میں پھینک دی تھیں۔ اس کام میں اسے کوئی دشواری اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کا شیشہ کھلا ہوا تھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی کار میں جا بیٹھی۔ انجن اسٹارٹ کرتے وقت اس نے دیکھا کہ گیرو کی گاڑی اس کی کار کے عقب سے گزر گئی تھی۔

اب نازیہ نے کار بیک کر کے سڑک پر ڈالی۔ داراب سے ملنے کے بعد سے اب تک ایک خیال خاصا پریشان کر رہا تھا۔ وہ پہلے دن جب اپنے پلاٹ پر گئی تھی تو وہاں موجود افراد سے تلخ کلامی ہوئی تھی اور وہ سب کچھ مزدوروں نے یقیناً دیکھا ہوگا۔ داراب جب ان آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیتا تو پولیس اس کی تفتیش تو بہر حال کرتی۔ اسے ان مزدوروں سے یا کسی ایک مزدور سے نازیہ کی ان لوگوں کی تلخ کلامی کا علم لازمی ہوتا۔ ایسی صورت میں تفتیش کے لیے پولیس اس سے ضرور رابطہ کرتی۔ معاملہ اگر صرف اسی حد تک رہتا تو وہ کہہ سکتی تھی کہ تلخ کلامی کا سبب یہ تھا کہ ان لوگوں نے اس کے پلاٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کے لیے کسی بہت بڑے وکیل کا انتخاب کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے کسی اقدام سے پہلے ہی وہ لوگ قتل کر دیے گئے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ لوگ یقیناً ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوئے ہوں گے۔ شہر میں لینڈ مافیا کے کئی گروپ سرگرم تھے اور ان کی ایک دوسرے سے دشمنی بھی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو مارتے بھی رہتے تھے جن کا الزام عموماً کسی سیاسی جماعت پر لگایا جاتا تھا یا کم از کم اشارتاً اس سیاسی جماعت کی بات ضرور کی جاتی تھی۔

نازیہ کا خیال تھا کہ اس پلاٹ پر اس کے حق ملکیت کے باعث اس قسم کے بیانات سے وہ پولیس کو مطمئن کر سکتی

تھی لیکن اس کی پریشانی کا سبب یہ بات بن گئی تھی کہ ایک ٹریفک کانسٹیبل نے داراب کو اس کے ساتھ اس کی کار میں دیکھ لیا تھا۔ وہ پولیس کانسٹیبل یہ بات تفتیش کرنے والے پولیس افسران تک پہنچا سکتا تھا۔ اس صورت میں نازیہ کے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی۔

اس بارے میں غور کرتے ہوئے نازیہ کے ذہن میں ایک تدبیر آ ہی گئی۔ اسے یقین تو نہیں تھا کہ وہ تدبیر موثر ثابت ہوگی لیکن جواب دہی کے لیے کچھ مواد اس کے پاس بہرحال ہو جاتا۔ کچھ اطمینان اسے یہ بھی تھا کہ وہ ایک ریٹائرڈ فوجی آفیسر کی بیٹی تھی۔ دوسرے یہ کہ شہر میں موجود رینجرز کا کرنل ذوالفقار اسے اس کے والد کی وجہ سے جانتا تھا اور اس کے والد کی عزت بھی کرتا تھا۔ ان کی بیماری کے زمانے میں وہ ان کی مزاج پرسی کے لیے کئی مرتبہ آ چکا تھا۔ اگر پولیس کا رویّہ نازیہ کے لیے پریشان کن بنتا تو وہ کرنل ذوالفقار کی مدد لے سکتی تھی۔

بینک سے روانہ ہونے کے بعد گھر پہنچنے سے قبل اس نے ایک انگریزی ماہ نامے کے ڈیکلریشن کی حصولی کے لیے متعلقہ فارم بھر دیا۔ کلرک کو کچھ دے دلا کر اس نے فارم پر چند دن پہلے کی تاریخ بھی ڈلوا دی تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو خاصی تھکی ہوئی تھی۔ وہ کافی پی کر اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ اس دن اس نے جو اقدامات کیے تھے، ان کی وجہ سے وہ اعصابی دباؤ بہرحال محسوس کر رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک لیٹی سوچتی رہی پھر اس کی نظر اپنے کمپیوٹر پر پڑی۔ اس نے کافی دن سے اپنا میل باکس نہیں دیکھا تھا جبکہ انگلینڈ میں اس کی دوستی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ اس نے ان میں سے کئی کو اپنا ای میل ایڈریس بھی دے دیا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ کر کمپیوٹر کے سامنے کرسی پر جا بیٹھی۔ اس نے کمپیوٹر آن کرنے کے بعد اپنا میل باکس کھولا۔ اس میں چار خط تھے جن میں سے تین انگلش دوستوں کے تھے اور چوتھا مقامی تھا۔

مقامی خط نے نازیہ کو چونکا دیا۔ وہ رجسٹرار آفس کے ایک اوسط درجے کے افسر کا تھا جس کے لڑکے کو اس کے مرحوم والد نے اپنے دفتر میں رکھ لیا تھا۔ نازیہ اس بات سے واقف ہو چکی تھی۔

خط میں لکھا تھا۔ ”بریگیڈیئر صاحب... السلام علیکم! میں ایک ہفتے کی چھٹی گزار کر کل سے دفتر آیا ہوں۔ آج اتفاقاً یہ بات میرے علم میں آئی کہ آپ نے اپنا پلاٹ ایم این اے ایاز نائک کو فروخت کر دیا۔ مجھے یہ جان کر افسوس اس لیے ہوا کہ اس علاقے کی زمینوں کا بھاؤ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سال بھر بعد تک یہاں کی زمین کی قیمت دگنی ہو جائے گی۔ اگر ممکن ہو تو ایاز نائک صاحب سے اپنا پلاٹ واپس لے لیں، خواہ تھوڑا بہت نقصان ہو جائے۔ یہ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو اس سے آگاہ کر دوں۔ ویسے آپ کی مرضی۔ آپ کیونکہ بیمار ہیں اس لیے شاید اپنی میل نہ دیکھتے ہوں اس لیے میں یہ خط آپ کی صاحب زادی نازیہ صاحبہ کو بھی بھیج رہا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ ان کا میل ایڈریس میرے پاس کہاں سے آ گیا۔“ آخر میں خط بھیجنے والے کا نام تھا۔

خط کی ابتدائی سطریں پڑھتے ہی نازیہ کا جسم سنسنا گیا۔ یہ بالکل غیر متوقع بات اس کے سامنے آئی تھی لیکن یہ اسے یقین تھا کہ پلاٹ فروخت نہیں کیا گیا تھا۔ رجسٹرار آفس سے آنے والا وہ خط جس تاریخ کو بھیجا گیا تھا، اس تاریخ کو اس کے والد زندہ تھے۔ نہ صرف زندہ تھے بلکہ اس قابل بھی تھے کہ بات بھی کر سکتے تھے۔ اس کے دوسرے دن ان کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہوئی تھی اور پھر وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکے تھے۔

ایک دن قبل جب وہ باتیں کرنے کے قابل تھے تو نازیہ نے اپنا بیشتر وقت ان کے ساتھ ہی گزارا تھا۔ اگر انہوں نے پلاٹ فروخت کیا ہوتا تو وہ نازیہ کو ضرور بتاتے۔ اس کے برخلاف اسی دن یا اس سے ایک آدھ روز پہلے تو انہوں نے یہ تک کہا تھا کہ ان کا بنایا ہوا بنگلا نازیہ کو کیونکہ زیادہ پسند نہیں، لہٰذا اس پلاٹ پر وہ اپنی مرضی، اپنی خواہش کے مطابق گھر بنا سکتی ہے۔

شاید اسی لیے اس پلاٹ سے نازیہ کو اتنی شدید جذباتی وابستگی ہو گئی تھی کہ لینڈ مافیا کے لوگوں سے اپنا پلاٹ چھڑانے کے لیے اس نے گویا آن کی آن میں پچیس لاکھ روپے بھی دے دیے تھے۔

لیکن اب اس خط کی وجہ سے اس پر یہ بات آشکار ہو رہی تھی کہ اس پلاٹ کی فروخت کے سلسلے میں جعلسازی سے کام لیا گیا تھا اور یہ حرکت کرنے والا ایک ایم این اے تھا۔

ایاز نائک کا نام نازیہ کبھی کبھی اخبارات میں دیکھ چکی تھی۔ اس کے بارے میں بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ نہایت جھگڑالو قسم کا شخص تھا اس لیے کبھی کسی ٹی وی چینل نے اسے اپنے ٹاک شو میں نہیں بلایا تھا۔

ابتدائی طور پر تو رجسٹرار آفس سے آیا ہوا وہ خط پڑھ کر نازیہ کے جسم میں سنسناہٹ ہی پھیلی تھی لیکن اب اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں حدت بھی آ گئی تھی۔

ایاز نائک کو شاید معلوم ہوگا کہ اس پلاٹ کا مالک موت کے قریب پہنچ چکا ہے لہٰذا اس نے اس جعلسازی میں کچھ زیادہ جھجک محسوس نہیں کی ہوگی۔

نازیہ نے کمپیوٹر بند کر دیا اور غصے میں ٹہلنے لگی۔ اس نے سنا تو بہت تھا کہ حکومت میں شامل بہت بڑے بڑے لوگ جرائم میں ملوث پائے گئے تھے اور ان میں سے بعض پر مقدمہ بھی چل رہا تھا لیکن یہ بات بھی اس کے سان گمان میں کبھی نہیں آئی تھی کہ خود وہ بھی کسی کی سازش کا نشانہ بن جائے گی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے جن آدمیوں کو قتل کروانے کا بندوبست کیا تھا، ان کے قتل سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ نازیہ کو یہ تسکین تو مل جاتی کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ نہایت بدتمیزی کی تھی لیکن اس طرح اس کا پلاٹ اسے واپس نہیں مل سکتا تھا۔

اس سلسلے میں داراب سے دوبارہ رابطہ قائم کرنا پڑے گا، اس نے ٹہلتے ہوئے سوچا۔ داراب اسے اپنا کوئی کونٹیکٹ نمبر دے کر نہیں گیا تھا مگر اس کی کار ---- کا نمبر نازیہ ذہن نشین کر چکی تھی۔ ایک امکان یہ تھا کہ وہ ... کار... خود داراب کے نام پر نہ ہو لیکن اس کے ذریعے دوبارہ داراب تک پہنچنا اس کے خیال کے مطابق کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ وہ ایاز نائک سے اپنا پلاٹ واپس لینے کے لیے بھی داراب کی خدمات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

وہ ٹہل ہی رہی تھی کہ ملازمہ نے آ کر اسے رخشی کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ کیونکہ اکیلی ہی آئی تھی اس لیے نازیہ نے اسے اپنی خواب گاہ ہی میں بلا لیا۔ اسے یقین تھا کہ رخشی اسے ایک بار پھر سمجھائے گی اس لیے اس نے ٹی وی کھول لیا۔ ٹی وی کی وجہ سے گفتگو سے عدم توجہی کا جواز نکل آتا۔

”آؤ۔“ نازیہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس وقت کہا جب رخشی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت نازیہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ رخشی اس کے بستر پر ہی آ بیٹھی اور ایک نظر ٹی وی پر ڈال کر نازیہ سے بولی۔

”میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں اور تم یہ پُرشور ڈبا کھولے بیٹھی ہو۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔ ٹی وی بھی دیکھتے رہیں گے اور باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“

”نہیں۔“ رخشی نے کہا اور ایک طرف رکھا ہوا ریموٹ اٹھایا۔

نازیہ جلدی سے بولی۔ ”اچھا بس آواز بند کر دو۔ تصویر چلنے دو۔ ان دنوں حالات ایسے ہیں کہ کسی وقت بھی کوئی بریکنگ نیوز آ جاتی ہے۔“

رخشی نے اس کی یہ بات مان لی اور صرف آواز بند کی۔

”فارغ ہو گئیں؟“ نازیہ بولی۔

”ہاں اور پہلی فرصت میں پھر تمہارے پاس آئی ہوں۔ ایک دوست کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ تمہیں سمجھانے کی کوشش ترک نہ کروں۔ تم نے اب تک داراب سے ملنے کی کوشش تو نہیں کی؟“

”کوئی سوال مت کرو رخشی! تمہیں اپنا... میرا مطلب ہے کہ دوستی کا جو فرض ادا کرنا ہو، وہ کر لو تاکہ تمہارے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔“ نازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

رخشی اسے گھورنے لگی پھر بولی۔ ”تم صرف اس بات کا انتقام لینا چاہتی ہو کہ انہوں نے تم پر گندے فقرے کسے تھے؟“

”میں اپنا پلاٹ بھی اس قبضہ مافیا سے چھڑانا چاہتی ہوں۔“

”پھر وہی بات آ جاتی ہے کہ اس معاملے میں قانون کا سہارا لینے کی ضرورت ہے لیکن تم کہہ چکی ہو کہ قانون پر تمہیں اعتماد نہیں... تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ صبر کرو۔ ان جرائم پیشہ لوگوں سے ٹکر لیتے ہوئے تو مرد بھی ہچکچا جاتے ہیں، تم تو ایک لڑکی ہو۔ تم ان سے ٹکراؤ گی تو مزید ذلت بھی برداشت کرنا پڑ سکتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم سب کچھ خدا پر چھوڑ دو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن جو لوگ اپنے لیے کچھ کرنے کی کوشش نہیں کرتے، خدا بھی ان کی مدد نہیں کرتا۔“

”تم نہیں سمجھو گی۔“ رخشی نے مایوسی سے کہا پھر بولی۔ ”ابھی فون پر ثاقب سے میری خاصی بات ہو چکی ہے۔ اس کی تجویز ہے کہ تم اس معاملے سے خود کو الگ تھلگ کر لو اور ثاقب کو اجازت دو کہ وہ اس معاملے کو دیکھنے کی کوشش کرے۔“

”وہ کیا کوشش کرے گا؟“

”تم خود ایک بریگیڈیئر کی بیٹی ہوتے ہوئے، اس

سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کر رہی ہو لیکن ثاقب اس سلسلے میں کچھ بڑے افسروں سے رابطے کی کوشش کرے گا۔"

نازیہ چونک پڑی۔ اس نے ٹی وی اسکرین پر "بریکنگ نیوز" کے الفاظ دیکھے تھے۔ اس نے جھپٹ پڑنے کے سے انداز میں رخشی سے ریموٹ لیا اور ٹی وی کی آواز بڑھائی۔ اب اسکرین پر نیوز ریڈر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ٹارگٹ کلنگ کی ایک تازہ واردات کی خبر سنائی جو بیس منٹ قبل پیش آئی تھی۔ اس خبر کے مطابق ایک چلتی ہوئی تیز رفتار کار سے چار آدمیوں پر کسی خطرناک رائفل سے گولیاں چلائی گئی تھیں اور وہ چاروں آدمی موقع پر ہی دم توڑ گئے تھے۔ واقعہ ایم این اے ایاز نائک کے پلاٹ پر پیش آیا تھا جہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ ایاز نائک وہاں ایک بنگلا بنوانا چاہ رہا تھا جس کی تعمیر کا کام تین چار دن پہلے ہی شروع ہوا تھا۔

"یہ... یہ..." رخشی ہکلائی۔ "تمہارا پلاٹ بھی تو اسی علاقے میں ہے؟"

"یہ واقعہ میرے ہی پلاٹ پر پیش آیا ہے۔"

"کیا؟" رخشی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "لیکن نیوز ریڈر تو بتا رہی ہے کہ اس پلاٹ کا مالک ایم این اے ایاز نائک ہے۔"

نیوز ریڈر اس وقت خبر دہرا رہی تھی۔

نازیہ بولی۔ "ابتدائی طور پر غلط اطلاعات ملی ہیں ٹی وی والوں کو۔ ہوسکتا ہے اسی علاقے میں ایاز نائک کا بھی کوئی پلاٹ ہو۔"

نہ جانے کیوں اس نے رخشی کو یہ نہیں بتایا کہ اس کا پلاٹ ایاز نائک نے جعلسازی کے ذریعے اپنے نام کروالیا تھا۔

رخشی کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں نازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ واردات تمہارے ہی پلاٹ پر ہوئی ہے تو کیا میں سمجھوں کہ تم نے کسی طرح داراب سے رابطہ کرلیا تھا اور اسی سے ان لوگوں کو مروایا ہے؟"

"تم میری دوست ہو لہٰذا تمہارا ایک فرض یہ بھی ہوگا کہ آئندہ تمہاری زبان پر داراب کا نام نہ آئے۔" نازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری یہ بات ثاقب تک بھی پہنچا دینا۔"

اگرچہ اس نے رخشی کی بات کا صحیح صحیح جواب نہیں دیا تھا مگر رخشی نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ان چاروں آدمیوں کو ہلاک کرنے والا داراب ہی ہوگا۔

"یہ تم کیا کروا بیٹھی ہو نازیہ؟" رخشی کی آواز بھرا گئی۔ اس نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

بریکنگ نیوز ختم ہوچکی تھی اور اب ٹی وی پر معمول کا پروگرام چل رہا تھا۔

"تمہارے لیے چائے بنواؤں؟" نازیہ نے رخشی سے پوچھا۔

رخشی کی بدحواسی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ "نہیں... بس اب میں چلتی ہوں۔ میں تمہیں جو کچھ سمجھانے آئی تھی، اس کی اب مزید کوئی گنجائش نہیں۔"

نازیہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ رخشی چلی گئی۔ نازیہ کو یہ اطمینان تھا کہ وہ یا ثاقب کسی کو اس کے اور داراب کے بارے میں نہیں بتائیں گے لیکن اسے یہ تشویش ضرور تھی کہ مزدوروں میں سے کسی کے بیان اور ٹریفک کانسٹیبل سے حاصل شدہ معلومات کے ذریعے پولیس اس تک پہنچ سکتی ہے۔

نازیہ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اسی وقت موبائل پر کرنل ذوالفقار سے رابطہ کیا۔

"کیسی ہو بیٹی...؟" کرنل ذوالفقار نے ایک رسمی جملے کے بعد کہا۔ "اس وقت آپ کو میری یاد کیسے آگئی؟"

"میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں انکل۔"

"انٹرویو۔" کرنل ذوالفقار ہنسا۔ "یہ کس خوشی میں بیٹا؟"

"میں ایک میگزین نکال رہی ہوں انکل! ڈیکلریشن فائل کرچکی ہوں۔ امید ہے کہ جلد ہی مل جائے گا۔ میں تیاریاں اب جلد از جلد شروع کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے ایک دوست سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے دفتر کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ لے۔ میرا یہ میگزین لاء اینڈ آرڈر کی صورتِ حال پر ہوگا۔ میں اس میں آپ کا انٹرویو بھی شائع کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ تمہیں کیا سوجھی ہے؟" کرنل ذوالفقار پھر ہنسا۔ "تمہیں بریگیڈیئر صاحب کے کاروبار میں دلچسپی لینا چاہیے۔"

"مجھے اس قسم کے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سب کچھ میں نے جنرل منیجر پر چھوڑ دیا ہے۔ صرف آڈٹ کرواتی رہا کروں گی۔ میرا ایک دوست چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ میں نے اس سے بات بھی کرلی ہے۔"

نازیہ کا آخری فقرہ درست نہیں تھا۔ اس نے ابھی اس سلسلے میں کسی سے بھی بات نہیں کی تھی، البتہ اس کے ذہن میں یقیناً تھا کہ وہ اس بارے میں ثاقب سے بات کرے گی جس کا ایک دوست چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا۔

"خیر، تمہاری مرضی۔" کرنل ذوالفقار نے کہا۔ "لیکن مجھے انٹرویو دینے کے لیے ڈپارٹمنٹل اجازت لینا ہوگی۔"

نازیہ نہیں جانتی تھی کہ کرنل ذوالفقار کے لیے اپنے محکمے سے اجازت لینی ضروری تھی یا اس نے محض ٹالنا چاہا تھا۔

"آپ اجازت لے لیں انکل۔" نازیہ نے کہا۔ "میں بڑا اچھوتا ماہنامہ شروع کرنا چاہتی ہوں۔ میں جرائم پیشہ افراد کے انٹرویو بھی شائع کروں گی۔ عام لوگوں کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ لوگ جرائم پیشہ کیوں بن جاتے ہیں۔ ایک بات تو میں ضرور جانتی ہوں کہ بعض لوگوں کو ہمارا معاشرہ ہی اس غلط راہ پر ڈال دیتا ہے، یعنی مجبور کر دیتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک جرائم پیشہ شخص سے رابطہ بھی کر چکی ہوں۔"

"یہ تو مناسب نہیں ہوگا بیٹا۔" کرنل نے کہا۔

"کیوں انکل؟" نازیہ بولی۔ "آخر بعض ٹی وی چینلز بھی تو ایسا کر چکے ہیں۔ کئی ایسے افراد کو کوریج دی جاچکی ہے جن کے خلاف انتظامیہ نے کیس بنائے تھے لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے عدالت نے انہیں بری کردیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض روپوش جرائم پیشہ افراد سے ٹیلی فونک گفتگو بھی کی جاتی رہی ہے۔"

"ٹی وی چینلز کی بات دوسری ہے بیٹا... اچھا خیر، میں تم سے پھر کسی وقت بات کروں گا اس موضوع پر۔ ابھی مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل! آپ مجھ سے جلد ہی رابطہ کرلیجیے گا یا میں خود کسی وقت کرلوں گی۔"

گفتگو ختم ہوگئی جس سے نازیہ نے خاصا اطمینان حاصل کرلیا۔

اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔

پولیس کے سلسلے میں نازیہ کا خیال درست ثابت ہوا۔ رات کے ساڑھے دس بجے تھے جب پولیس اس کے گھر پہنچ گئی۔

"کیا معاملہ ہے؟" نازیہ نے پولیس آفیسر سے درشت لہجے میں کہا۔ اسے یہ زعم بہرحال تھا کہ وہ ایک بڑے فوجی آفیسر کی بیٹی تھی۔

"ٹارگٹ کلنگ کے ایک معاملے میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں۔" پولیس آفیسر نے کہا۔ وہ بڑے غور سے نازیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ٹارگٹ کلنگ کے معاملے میں کیا معلومات دے سکتی ہوں میں آپ کو؟"

"میں جس واردات کی تحقیقات کر رہا ہوں، اس کے سلسلے میں آپ کا نام پولیس کے سامنے آیا ہے۔"

"اچھا۔" نازیہ ہنسی۔ "میں نے کی ہے کہیں ٹارگٹ کلنگ؟"

"آپ کو آج شام ہونے والی کسی واردات کا علم تو ہوگا۔ اس کی خبر ٹی وی چینلز پر آچکی ہے۔"

"آج میں پانچ بجے کے قریب سو گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھی تو غسل کر کے کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ اب سوچ رہی تھی کہ ٹی وی دیکھوں۔" نازیہ کوشش کر رہی تھی کہ اطمینان سے گفتگو کرنے کا تاثر دے لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں تھوڑی سی بڑھ گئی تھیں۔

"چار آدمیوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا ہے۔" پولیس آفیسر نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور یہ واردات اس پلاٹ پر پیش آئی ہے جو آپ کے والد کا تھا اور جو انہوں نے مسٹر ایاز نائک کو فروخت کردیا تھا۔"

"بیچ دیا تھا؟" نازیہ نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "مجھے تو اس کا علم نہیں۔ ڈیڈی نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ شاید بھول گئے ہوں۔ وہ بیمار تھے۔ آپ نے بریگیڈیئر فیاض احمد کا نام شاید سنا ہو۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔"

"معلوم ہوچکا ہے مجھے... ابھی بنگلے کے پھاٹک پر ان کی نیم پلیٹ بھی دیکھ چکا ہوں لیکن مجھے اس معاملے میں آپ سے پوچھ گچھ اس لیے کرنا پڑے گی کہ مرنے والے مسٹر ایاز نائک کے ملازمین تھے جو اس پلاٹ پر بننے والے بنگلے کی تعمیر کی دیکھ بھال پر مامور کیے گئے تھے۔ آپ ان لوگوں سے لڑ پڑی تھیں۔"

نازیہ سمجھ گئی کہ پولیس کو یہ بات کسی مزدور ہی سے معلوم ہوئی ہوگی۔

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" پولیس آفیسر نے توقف کے بغیر اپنی بات میں اضافہ کیا۔

"جی نہیں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" نازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ایسا تو واقعی ہوا تھا کیونکہ میں اس بات سے بے خبر تھی کہ میرے مرحوم والد نے وہ پلاٹ فروخت کر

دیا تھا۔ میں پلاٹ دیکھنے گئی تھی اور وہاں نامعلوم لوگوں کا قبضہ اور اس کی تعمیر کا آغاز دیکھ کر میں بھڑک گئی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ایس پی چودھری رحمان صاحب سے اس کی شکایت بھی کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس معاملے کی چھان بین کریں گے۔"

"نگران کا تبادلہ ہو چکا ہے۔"

"مجھے ان کے تبادلے کا علم نہیں۔ میں تو انتظار کر رہی تھی کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق مجھے فون پر کچھ بتائیں گے۔ آپ کو تو علم ہوگا کہ ان کا تبادلہ کہاں ہوا ہے؟ آپ ان سے رابطہ کر کے میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں ان سے ملی تھی۔"

"وہ تصدیق تو میں کرلوں گا۔ اب آپ میرے ایک بہت اہم سوال کا جواب دیجیے... کیا آج آپ ایک دہشت گرد داراب سے ملی تھیں؟"

"یقیناً۔" نازیہ نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ "داراب پر صرف الزام ہے کہ وہ دہشت گرد ہے۔ یہ بات ثابت نہیں کی جاسکی اس لیے عدالت نے اسے بری بھی کردیا۔ اسی لیے میں اس کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں۔"

"انٹرویو... اس کا؟" پولیس آفیسر کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔

"جی ہاں۔" نازیہ نے جواب دیا۔ "میں جرائم کے سلسلے میں ایک ایسا میگزین نکالنا چاہتی ہوں جس میں اس قسم کے لوگوں کا موقف بھی پیش کیا جائے اور ایسے لوگوں کے انٹرویو بھی شائع کیے جائیں جو قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اسی سلسلے میں رینجرز کے کرنل ذوالفقار سے بھی رابطہ کر چکی ہوں۔ آپ ان سے بھی اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ کیا میں آپ کو ان کا موبائل نمبر دوں؟"

"وہ میں خود معلوم کرلوں گا۔" آفیسر نے خشک لہجے میں کہا۔ "آپ اب میرے ایک اور سوال کا جواب دیجیے۔ کیا آپ آج بھی اس پلاٹ کے سامنے سے گزری تھیں؟"

"یقیناً۔" نازیہ نے جواب دیا۔ "میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"آپ کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

اب نازیہ تھوڑی سی بگڑی۔ "آپ آخر جاننا کیا چاہتے ہیں؟"

"ہمیں شبہ ہے کہ ان لوگوں کو ختم کرنے میں داراب کا ہاتھ ہے۔"

"میں نہیں کہہ سکتی کہ آپ کا شبہ درست ہے یا غلط... لیکن کیا آپ یہ شبہ بھی کر رہے ہیں کہ ان لوگوں کو میں نے قتل کروایا ہے؟"

"کسی ثبوت کے بغیر میں یہ بات نہیں کہہ سکتا لیکن اس معاملے میں آپ کی شخصیت مشکوک ضرور ہو گئی ہے۔"

"ثبوت کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکتے تو اب مجھے پریشان بھی مت کیجیے۔"

اسی دوران میں نازیہ نے اپنے موبائل پر کرنل ذوالفقار سے رابطہ کرلیا تھا۔ "کرنل ذوالفقار پلیز!"

یہ اس نے صرف پولیس آفیسر کو سنانے کے لیے کہا تھا۔

"ہاں ہاں، بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔ "کیا اس وقت تم میری آواز بھی نہیں پہچان سکیں؟"

"دراصل اس وقت میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔ پولیس آگئی ہے گھر پر۔"

"کیوں؟" کرنل ذوالفقار نے حیرت سے پوچھا۔

نازیہ اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگی۔ پولیس آفیسر اس دوران میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کرنل ذوالفقار نے سب کچھ جاننے کے بعد ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ میگزین کے لیے تمہارا اس قسم کا اقدام مناسب نہیں... میں سمجھانے آتا تمہیں کسی وقت... اچھا خیر، اگرچہ اس قسم کے معاملات میں پولیس کا رویہ سخت ہو جاتا ہے لیکن میں کسی طرح اسے سنبھالوں گا۔ میں اس پولیس آفیسر کو اپنے دفتر بلالوں گا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

نازیہ نے پولیس آفیسر کے سینے پر لگا ہوا اس کا نام پڑھ کر کرنل ذوالفقار کو بتایا۔ دوسری طرف سے کرنل ذوالفقار نے کہا۔ "اس سے میری بات تو کراؤ۔"

نازیہ نے موبائل پولیس آفیسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کرنل آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

پولیس آفیسر نے موبائل ہاتھ میں لے کر کان سے لگایا۔ ان دونوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد پولیس آفیسر نے موبائل نازیہ کی طرف بڑھایا۔ کرنل ذوالفقار نے اس سے کہا۔ "وہ ضابطے کی کارروائی مکمل کرنا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ تمہیں اپنا بیان ریکارڈ کرانا ہوگا۔ پریشان مت ہونا۔ تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ پولیس آفیسر مجھ سے ملنے آئے گا تو میں اسے

مزید سمجھادوں گا کہ تم اس قسم کی لڑکی نہیں ہو۔"

"بہتر ہے۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

نازیہ پولیس آفیسر کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر گئی اور اپنا بیان ریکارڈ کرا کے واپس آگئی۔

دوسری صبح اسے کسی طرح داراب زین سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرنا تھی لیکن ٹی وی کی خبریں سنتے ہوئے اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔

ان دنوں پولیس مختلف علاقوں میں "ٹارگیٹڈ آپریشن" کر رہی تھی۔ رات تین بجے بھی ایک آپریشن کیا گیا تھا۔ کچھ افراد مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے اور کچھ کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ہلاک شدگان میں داراب زین بھی تھا۔

نازیہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس خبر سے اسے ذہنی دھچکا لگا تھا۔ وہ داراب کے ذریعے ایاز ناتک کو بھی سبق دینا چاہتی تھی جو اب اس لحاظ سے تو ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ داراب زین کا سہارا لے سکتی۔ اب اسے کوئی دوسری ہی تدبیر سوچنا تھی۔ اس کے خیال کے مطابق ایاز ناتک کو جعلساز ثابت کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا۔ اسے اندازہ تھا کہ ان دنوں ایم این اے قسم کے لوگ کتنے بارسوخ ہو چکے تھے۔

وہ سارا دن اس نے گھر میں ہی گزارا اور تلملاتی رہی کہ ایاز ناتک سے کس طرح نمٹا جائے۔ پہلے تو اسے خیال تھا کہ مافیا کے ان لوگوں کو ختم کروانے کے بعد اسے اپنا پلاٹ واپس مل جائے گا لیکن اب یہ بات سامنے آچکی تھی کہ وہ پلاٹ اس کا رہا ہی نہیں تھا، ایاز ناتک کا ہو چکا تھا۔

دن بھر گھر میں پڑے پڑے اس کا دل گھبرایا تو شام کو وہ کار لے کر نکل پڑی۔ اسے کسی خاص جگہ تو جانا نہیں تھا۔ کار کو بس ادھر سے اُدھر دوڑاتی رہی۔ پھر ایک بڑا شاپنگ پلازا سامنے پڑا تو وہ کار اس کے پارکنگ شیڈ میں لے گئی۔ اسے کچھ چیزوں کا خیال آیا تھا جو اسے لینا تھیں۔

خریداری میں اسے بیس پچیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ چھوٹی موٹی چیزیں لینا تھیں جو اسے ایک ہی دکان سے مل گئیں لیکن اس دوران میں بھی اس کا ذہن الجھا ہی رہا۔ ایک مرتبہ اسے عامر کا خیال بھی آیا۔ لیکن اس نے یہ نام اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

بیگ شانے سے لٹکائے اور چھوٹا سا شاپنگ بیگ ہاتھ میں لیے وہ شاپنگ پلازا سے نکل کر پارکنگ شیڈ میں اپنی کار کے قریب پہنچی۔ پھر اس نے چابی کار کے

بہر ملاقات ـ کھڑکیوں کی باہر سے صفائی ضروری ہے

دروازے میں لگائی ہی تھی کہ نیلے سوٹ میں ملبوس ایک شخص اس کے بالکل قریب آگیا۔ نازیہ نے محسوس کیا کہ کوئی سخت سی چیز اس کی کمر سے آلگی تھی۔

"یہ بہت خطرناک پستول ہے محترمہ!" نیلے سوٹ والے نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر زندگی پیاری ہے تو میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔"

نازیہ کا سارا جسم سنسنا گیا۔ "میرے پاس کچھ زیادہ رقم نہیں ہے۔" اس کی آواز کپکپا گئی۔ "موبائل تم لے لو۔"

ان دنوں موبائل چھیننے کی وارداتیں بہت ہو رہی تھیں اس لیے نازیہ نے یہی سمجھا تھا کہ وہ شخص اسی قسم کا جرائم پیشہ ہوگا۔

اسی وقت ایک اور شخص قریب آگیا۔ چابی کار میں ہی لگی ہوئی تھی۔ قریب آنے والے نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

"چلیے محترمہ!" نیلے سوٹ والا بولا۔ "بیٹھ جائیں پیچھے۔"

اب نازیہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ اسے اغوا کرنا چاہتے تھے۔ اسے خیال آیا کہ شاید وہ اسے اس کے گھر لے جاتے تاکہ وہاں کی تمام قیمتی اشیا لوٹ کرلے جاسکتے۔

ریوالور اس وقت بھی نازیہ کی کمر میں اڑسا ہوا تھا مگر اسے اتنی مہلت نہیں مل سکتی تھی کہ ریوالور نکال لیتی۔ اسے خیال آیا کہ کار میں بیٹھنے کے بعد اسے اس کا موقع مل سکتا تھا لیکن کیا وہ اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھا سکتی تھی؟ اس بارے

میں کوئی اندازہ لگانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس سے لگے لگے نیلے سوٹ والا بھی کار میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے والے نے انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔ نیلے سوٹ والے نے دروازہ بند کیا اور کار حرکت میں آگئی۔ اب نیلے سوٹ والے نے اس کی کمر سے لگا ہوا اپنا ہاتھ سامنے کرلیا۔
.... نازیہ نے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول دیکھا۔

کار کا رخ اس راستے کی طرف نہیں تھا جو اس کے گھر کی طرف جاتا۔ نازیہ بے اختیار بول اٹھی۔ ''میرا گھر اس طرف نہیں ہے۔''

''معلوم ہے۔'' نیلے سوٹ والا غرایا۔ اب اس کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ ''ہم تمہیں کہیں اور لے جارہے ہیں مگر تمہیں جہنم رسید نہیں کریں گے حالانکہ تم نے ہمارے چار ساتھیوں کو دوسری دنیا میں بھجوا دیا ہے۔''

کسی خیال نے نازیہ کو چونکایا اور وہ بولی۔ ''کس کی بات کر رہے ہو تم؟ میں نے کسی کو...''

''تم نے یہ کام کسی اور سے لیا ہوگا۔'' نازیہ کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ ''حالانکہ وہ پلاٹ اب تمہارا نہیں ہے جسے تم اپنا سمجھ کر ہمارے ساتھیوں سے بھڑ گئی تھیں۔''

اب نازیہ کو یقین ہو گیا کہ اسے اغوا کروانے والا ایاز نائک ہی ہوگا۔ یہ دونوں اسی کے آدمی ہوں گے۔

یہ احساس ہوتے ہی نازیہ نے خود کو بے حد خطرے میں محسوس کیا۔ اس کا یہ احساس بالکل غلط ثابت ہو چکا تھا کہ وہ دونوں لٹیرے تھے۔ اگر اسے کار میں بیٹھنے سے قبل یہ احساس ہو گیا ہوتا کہ وہ ایاز نائک کے آدمی ہو سکتے ہیں تو وہ کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا فیصلہ ہی نہیں کرتی بلکہ عملاً کچھ کر بیٹھتی لیکن کار میں بیٹھنے کے بعد اس کے لیے کچھ کر گزرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اگر وہ شور مچانے کی کوشش کرتی تو وہ شخص اسے سیٹ پر گرا کر اس کا گلا دبا سکتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر خاصا طاقتور دکھائی دے رہا تھا جس کے سامنے نازیہ کی ذرا بھی نہیں چل سکتی تھی۔

اگر اسے اپنا ریوالور نکالنے میں کامیابی ہو جاتی تو خاصا خون خرابا ہو جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے کیونکہ نیلے سوٹ والے کا پستول تو پہلے ہی اس کو زد پر رکھے ہوئے تھا۔

نیلے سوٹ والا بولا۔ ''تو یہ بات درست ہے نا کہ تم ہی نے ہمارے... ساتھیوں کو مروایا ہے؟''

''اگر میں اس کا جواب نفی میں دوں؟''

''تو اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔''

''تو پھر میں تمہاری بات کا کیا جواب دے سکتی ہوں؟''

''نہ دو۔'' سوٹ والے نے بے پروائی سے کہا۔

''آخر تم لوگ....''

''بس اب چپکی بیٹھی رہو۔'' سوٹ والے نے اس کی بات کاٹ دی۔

نازیہ دراصل اسے باتوں میں الجھا کر اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ سرکا کر کمر تک لے جانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

''اپنا ہاتھ سامنے رکھو۔'' سوٹ والا ڈپٹ کر بولا۔

''کھجلی ہو رہی ہے۔'' نازیہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

سوٹ والا لوفرانہ انداز میں ہنسا۔ ''میں کھجا دیتا ہوں۔''

اس نے اپنا بایاں ہاتھ نازیہ کی پشت پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں کھجلی ہو رہی ہے؟''

نازیہ کو یقین ہو گیا کہ اگرچہ وہ جیکٹ پہنے ہوئے تھی لیکن ریوالور کا ابھار سوٹ والے کو محسوس ہو جاتا اور پھر اسے یقینی طور پر ریوالور سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

نازیہ کو یہ احساس بھی ہو چکا تھا کہ ایاز نائک اس کا نہ جانے کیا حشر کروائے لہٰذا وہ اپنی جان پر کھیل گئی۔ اس نے پوری قوت سے سوٹ والے کے پستول پر جھپٹا مارا۔ وہ پستول چھیننے میں تو کامیاب نہیں ہو سکی لیکن پستول کی نال کا رخ نیچے ہو گیا۔ اس وقت نازیہ نے بڑی تیزی سے اپنا ہاتھ پشت پر لے جا کر اپنا ریوالور نکالا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکی۔ سوٹ والے نے فوراً ہی اسے نشست پر گرا کر اس طرح دبوچ لیا تھا کہ وہ کسی طرح بھی اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتی تھی۔

ڈرائیونگ کرنے والا شروع سے اب تک خاموش رہا تھا اور اب بھی خاموش رہا۔ اسے جیسے اس بات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی کہ پچھلی نشست پر کیا ہو رہا تھا۔

''تھوڑی دیر بعد تمہیں بے ہوش تو کرنا ہی تھا۔'' سوٹ والا غرایا۔ ''لیکن تم جلدی بے ہوش ہونا چاہتی ہو تو یہی سہی۔''

اس نے ایک نم رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ غالباً اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے نکالا ہوگا۔ اس رومال کی تیز بو نے نازیہ کا دماغ ناکارہ کر دیا اور اسے کسی بات کا احساس نہیں رہا۔

پھر جب اسے ہوش آیا تو اس کے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہی تھی؟ لیکن وہ جس عالم میں تھی، اس کے باعث اس سوال کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں گیا۔ وہ کسی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ دونوں کلائیوں میں آہنی کڑے تھے اور ان کڑوں سے منسلک زنجیریں نہ جانے کہاں باندھی گئی تھیں کہ وہ اپنا کوئی ہاتھ موڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہی اس کی ٹانگوں کے ساتھ بھی کیا گیا تھا۔ آہنی کڑے اس کے ٹخنوں میں چبھ رہے تھے اور ان سے منسلک زنجیریں بھی کہیں باندھ دی گئی تھیں۔

نازیہ بستر پر خود کو بالکل بے بس پا رہی تھی اور اس کے جسم پر اس کی جیکٹ اور جینز تو کجا، کوئی دھجی بھی نہیں تھی۔ اور کوئی شخص اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے اس پر جھکا ہوا تھا۔

''نہیں۔'' نازیہ کے منہ سے وحشیانہ سی چیخ نکلی اور اس کی روح تک لرز گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

نقاب پوش نے اس کی چیخ پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ غالباً اسے اطمینان تھا کہ نازیہ کی چیخ پکار سے کوئی انہونی نہیں ہو جاتی۔ ہونا وہی تھا جس کا اندازہ نازیہ لگا چکی تھی۔

☆☆☆

لگ بھگ پون گھنٹے بعد نازیہ اسی عمارت کے کسی اور کمرے میں تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر ایسے نشانات تھے جیسے وہ روتی رہی ہو۔ جسم پر اس کی جیکٹ اور جینز موجود تھی لیکن اب اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نیلے سوٹ والے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے ہی موجود تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ ایسا تاثر دے رہی تھیں جیسے وہ نازیہ کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

''چار آدمیوں کی جان لی تھی تم نے۔'' سوٹ والا بولا۔ ''لیکن تمہیں جان سے نہیں مارا گیا۔ یہ سودا تمہارے لیے مہنگا تو نہیں رہا نا؟''

نازیہ کی نظریں جھکی رہیں۔ اس کا چہرہ اب بالکل سپاٹ تھا جیسے پتھرا گیا ہو۔

سوٹ والا اٹھ کر اس کی پشت پر آیا۔ اب وہ نازیہ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ رہا تھا۔ نازیہ ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ جو کچھ ہو چکا تھا، اس کے بعد اب جو کچھ بھی ہو جاتا، نازیہ کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

''یہ ضروری ہے۔'' سوٹ والا بولا۔ ''یہاں سے باہر نکلتے وقت تمہیں یہ نظر نہیں آنا چاہیے کہ تم کس عمارت سے نکلی ہو۔''

نازیہ اب بھی چپ رہی۔

''چلو۔'' پٹی باندھنے کے بعد سوٹ والے نے اسے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ ''تمہارا ریوالور وہیں لگا دیا گیا ہے جہاں تم نے اسے چھپا رکھا تھا۔ بس اسے خالی کر دیا گیا ہے۔ اس میں گولیاں نہیں ہیں۔''

خود نازیہ بھی محسوس کر چکی تھی کہ ریوالور اس کی کمر پر اس کی جینز میں اڑسا ہوا تھا۔

آنکھوں پر پٹی بندھی ہونے کے باعث نازیہ یہ دیکھنے سے قاصر رہی کہ سوٹ والا اسے بازو سے پکڑ کر کہاں سے گزارتا ہوا کہاں تک لایا۔

''چلو بیٹھو۔'' سوٹ والے نے نازیہ کا ہاتھ پکڑ کر جس چیز پر رکھا وہ کار کا کھلا ہوا دروازہ تھا۔

اسے کار میں بٹھا دیا گیا۔ وہ پچھلی نشست تھی۔ نازیہ نے محسوس کیا کہ یہ اسی کی کار تھی۔

سوٹ والا بھی اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ نازیہ نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی جس کے بعد کار حرکت میں آگئی تھی۔

نازیہ کی آنکھوں پر پٹی بدستور بندھی رہی۔ اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں صرف ایک سوال کی گونج تھی۔

''یہ کیا ہو گیا؟''

''یہ کیا ہو گیا؟''

اسے یہ بھی احساس نہیں ہو سکا کہ کار کتنی دیر تک چلنے کے بعد رکی تھی۔ کار رکنے کے بعد اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔

''اب تم اپنے گھر جاسکتی ہو۔ تمہیں تمہارے گھر کے قریب ہی چھوڑا جارہا ہے۔''

نازیہ ساکت بیٹھی رہی۔ شاید وہ صحیح طور پر سن بھی نہیں سکی تھی کہ اس سے کیا کہا گیا تھا۔

سوٹ والے نے غالباً اس کی ذہنی حالت سمجھ لی۔ اس نے خود ہی کار کا دروازہ کھولا اور نازیہ کا بازو پکڑ کر اسے کار سے اتارا۔

ڈرائیونگ کرنے والے نے کار سے اتر کر دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک ویران گلی تھی جہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

اب سوٹ والے نے نازیہ کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا

اور دروازہ بند کر کے بولا۔ ”تمہارا موبائل اتنی دیر تک بند رکھا گیا تھا لیکن اب میں اسے کھول کر تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ دل چاہے تو پولیس والوں سے رابطہ کر کے ہمارے خلاف رپورٹ دے دو۔ انہیں بتادو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔“ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ نازیہ کا مذاق اڑا رہا ہو۔

اس نے موبائل نازیہ کی گود میں پھینکا اور تیزی سے مڑ گیا۔

نازیہ کی کار کے پیچھے چند گز کے فاصلے پر ایک اور کار کھڑی تھی۔ نازیہ کی کار ڈرائیو کرنے والا اسی کار میں ڈرائیونگ کرنے والے کے برابر میں جا بیٹھا تھا۔ سوٹ والا اس کار کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ کار کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ کیا جا چکا تھا۔ وہ تیزی سے بیک کی گئی۔ اس طرف سڑک تھی۔ اگر نازیہ عقب نما آئینے پر نظر ڈالتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کار اب غائب ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ابھی تک اس کے ہوش و حواس بحال نہیں ہو سکے تھے۔

اس کی گود میں پڑے ہوئے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ نازیہ نے آہستگی سے سر جھکا کر موبائل کی طرف دیکھا۔ موبائل اس کی گود میں سیدھا ہی پڑا ہوا تھا۔ گھنٹی بجنے کی وجہ سے اس کی اسکرین روشن تھی۔ کال کرنے والے کا نام دکھائی دے رہا تھا۔ وہ رخشی تھی۔

اب یکا یک نازیہ کے ہونٹ کانپنے لگے اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس کی حالت ایسی ہی تھی کہ اگر کوئی ہمدرد سامنے آجائے تو انسان جذباتی ہو جاتا ہے۔ رخشی سامنے تو نہیں آئی تھی لیکن اس کا نام بھی اس وقت نازیہ کے لیے ایسا تھا کہ اس کی پتھرائی ہوئی سی کیفیت ختم ہوئی تھی اور اس کے جذبات امڈ پڑے تھے۔ اس نے موبائل اٹھایا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ موبائل آن کرتے ہوئے اس کے انگوٹھے کا دباؤ بھی اتنا کم تھا جیسے جسم میں طاقت ہی نہ رہی ہو لیکن موبائل اتنے کم دباؤ سے بھی آن ہو گیا۔

”ہیلو... ہیلو!“ رخشی کی بے تابانہ آواز سنائی دی۔ ”تم بول کیوں نہیں رہی ہو نازیہ؟“

”ہاں۔“ نازیہ بمشکل اتنا ہی بول سکی۔ اس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

”یہ تمہاری آواز کیسی ہے؟“ رخشی نے جلدی سے پوچھا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

نازیہ جواب دینے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ موبائل اس کے کان سے لگا رہا۔

”ارے... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ رخشی کچھ روہانسی ہو گئی۔ ”کہاں ہو تم؟“

لیکن نازیہ کی آنکھوں سے جو سیلاب امڈا تھا، اس نے اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلنے دی۔

”خدا کے لیے کچھ بتاؤ نازیہ!“ رخشی جیسے چیخ پڑی۔ ”دو گھنٹے سے تو تمہارا موبائل ہی بند مل رہا تھا۔ اب تم سے بات ہو رہی ہے تو تم کچھ بتا نہیں رہی ہو۔ خدا کے لیے بولو، کیا ہوا ہے تمہیں؟ کہاں ہو تم؟... میں تو ایک گھنٹے سے تمہارے گھر پر ہوں۔“

”میں... میں... آ رہی...“ نازیہ بڑی مشکل سے بول سکی اور موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کی گود میں گر پڑا۔ وہ اس نے آف بھی نہیں کیا تھا۔ اسے کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ اسے بس یہ احساس تھا کہ اس کی ایک ہمدرد اس کے گھر پر تھی اور اب وہ جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتی تھی۔

اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے چابی پکڑی جو کار میں ہی لگی ہوئی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ کار حرکت میں لاتے وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے پاؤں بھی بے جان سے ہو رہے تھے۔ کلچ اور ایکسلریٹر پر ان کا دباؤ بھی درست نہیں تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ پہلی کوشش سے کار حرکت میں آگئی ورنہ اسے جھٹکے سے بند ہو جانا چاہیے تھا۔ اسٹیئرنگ بھی پوری طرح اس کے قابو میں نہیں تھا۔ اس خیال سے کہ حادثہ نہ ہو جائے، اس نے کار کی رفتار بہت کم رکھی۔ وہ تقریباً رینگنے کے انداز میں گلی سے نکلی۔

وہ اس کا جانا پہچانا علاقہ تھا کیونکہ وہ یہیں رہتی تھی۔ اس کا گھر وہاں سے پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

گود میں پڑے ہوئے موبائل سے رخشی کی آواز اب بھی آ رہی تھی لیکن نازیہ نے وہ نہیں اٹھایا۔ وہ اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھنا چاہتی تھی کیونکہ سڑک پر اِکا دُکا گاڑیاں بھی آ جا رہی تھیں۔

”کیا تم ڈرائیونگ کر رہی ہو؟“ رخشی کا ایک سوال اس کے کان میں پڑا لیکن اب بھی اس نے جواب دینے کے لیے موبائل نہیں اٹھایا۔ وہ چاہتی تھی کہ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر ہی رکھے۔ ایک ہاتھ سے وہ اسٹیئرنگ کو قابو میں نہیں رکھ پاتی۔

آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے لیکن اب وہ خاموشی سے رو رہی تھی۔

گھر تک کا فاصلہ جو پانچ منٹ کا تھا، دس منٹ سے بھی کچھ زیادہ میں طے ہوا۔ اس نے اپنے گھر کے پھاٹک

اور قریب ہی لگے ہوئے الیکٹرک پول کی روشنی میں رخشی کو دیکھا جو بے تاب ہو کر گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ نازیہ کو اپنی کار کی ہیڈ لائٹس جلانے کا تو خیال ہی نہیں آیا تھا۔

رخشی نے کچھ دور ہی سے اس کی کار دیکھ لی ہو گی کیونکہ اب اس نے موبائل اپنے کان سے نہیں لگا رکھا تھا۔ اسی لیے نازیہ کے موبائل سے بھی اب اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

نازیہ کے گھر کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ وہ رخشی ہی نے اس کی کار دیکھ کر کھلوایا ہو گا۔ نازیہ کے سبھی ملازمین کو رخشی اور ثاقب سے اس کے حد درجہ قریبی تعلقات کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے وہ دونوں اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کے گھر آ سکتے تھے اور ملازمین ان دونوں کے کسی بھی حکم کی تعمیل اسی طرح کرتے تھے جیسے اس گھر کی مالک نازیہ ہی نہیں بلکہ رخشی اور ثاقب بھی ہوں۔

نازیہ کے آنسو اب رک چکے تھے۔ حواس کی بحالی بھی کسی حد تک ہو گئی تھی ورنہ وہ کار چلا کر گھر تک پہنچ بھی نہیں پاتی۔ اس کا چہرہ البتہ اب بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ملازمین کو دیکھ کر اس نے پھاٹک پر ہی کار روک دی اور جیکٹ ہی کی آستینوں سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی۔

رخشی جلدی سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نازیہ کے برابر میں بیٹھ گئی اور جلدی سے بولی۔ ”گاڑی چلاؤ نازو۔“

نازیہ پھر کار حرکت میں لائی۔ ملازمین نے اس کی حالت دیکھی تو پریشان نظر آنے لگے اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نازیہ نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا اور کار برآمدے کے سامنے لے جا کر روک دی۔ جب وہ انجن بند کرنے کے بعد دروازہ کھول کر اتر رہی تھی تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ رخشی نے فوراً اسے سہارا دیا۔ وہ نازیہ سے پہلے ہی دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گئی تھی۔

ملازمین پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ چوکیدار نے پھاٹک بند کر دیا تھا۔

رخشی، نازیہ کو سہارا دیے اس کی خواب گاہ کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ”تمہارا فون نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہو کر میں نے ثاقب کو بھی اطلاع کر دی تھی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔ وہ بھی اس وقت میرے ساتھ یہاں ہوتا لیکن اس نے بتایا تھا کہ اس کے والد کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ وہ نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے والد دل کے مریض ہیں نا۔“

نازیہ کچھ نہیں بولی۔ اگر اسے ملازمین کا خیال نہ ہوتا تو وہ وہیں رخشی سے لپٹ کر رونے لگتی۔ جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئیں تو نازیہ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ رخشی سے لپٹ کر بے تحاشا رونے لگی۔

”کیا بات ہے نازو! کچھ بتاؤ تو... آخر ہوا کیا ہے؟“ اب رخشی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

نازیہ نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن بول نہیں سکی۔ رخشی اسے بستر کے قریب لے گئی اور اسے لٹانا چاہا لیکن نازیہ اس سے بری طرح لپٹی ہوئی تھی۔ رخشی کو بھی اس کے ساتھ بستر پر لیٹنا پڑا۔

موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ موبائل رخشی کا تھا اور کال ثاقب کی تھی۔

”ہاں ثاقب!“ کال ریسیو کرتے وقت رخشی کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ ثاقب نے فوراً پوچھا۔ ”ابھی میں نے پھر اس سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کا فون بند تو نہیں ہے لیکن مسلسل انگیج مل رہا ہے۔“ وہ بولتا ہی چلا گیا۔ ”ڈیڈی کی طبیعت زیادہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں انہیں اسپتال لے جا رہا ہوں۔ ابھی راستے ہی میں ہوں۔“ وہ یقیناً ذہنی طور سے اتنا منتشر تھا کہ اپنی بات کا جواب لینے سے پہلے ہی اس نے اپنے والد کے بارے میں بتانا شروع کر دیا تھا۔ اسی ذہنی انتشار کے باعث اس نے یہ بھی محسوس نہیں کیا ہو گا کہ رخشی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”سب ٹھیک ہے ثاقب۔“ رخشی نے اپنی آواز قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ثاقب کو مزید پریشان کرے۔ وہ اپنے والد کی وجہ سے پہلے ہی پریشان ہو گا۔

”کیا سب ٹھیک ہے؟“ ثاقب نے جلدی سے پوچھا۔

”نازیہ آ گئی ہے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“ رخشی نے کوشش کی تھی کہ ثاقب سے بات کرتے وقت اپنا سر نازیہ سے دور رکھے تاکہ ثاقب اس کی آواز کے ساتھ ساتھ نازیہ کی ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز نہ سن لے۔

ثاقب نے پوچھا۔ ”تو اب اس کا موبائل فون کیوں انگیج مل رہا ہے۔“

”وہ کسی سے بات کر رہی ہے۔“ رخشی کو جھوٹ بولنا پڑا۔ ویسے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اب نازیہ کا

موبائل انگیج کیوں تھا۔
"شکر ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔" ثاقب نے کہا۔ "تم ابھی اسی کے پاس ہو؟"
"ہاں۔"
"چلو اب ادھر سے کچھ اطمینان تو ہوا مجھے... اب میں اسپتال پہنچنے کے بعد ڈیڈی کی حالت سنبھل جانے پر فون کروں گا۔"
اس نے رخشی کے کچھ بولنے کا انتظار نہیں کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
رخشی نے فون کرنے کے بعد نازیہ سے پوچھا۔ "تمہارا موبائل کہاں ہے؟"
نازیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس روتی رہی۔
اب اچانک رخشی کو خیال آیا کہ جب وہ نازیہ سے فون پر بات کر رہی تھی تو بعد میں رابطہ تو منقطع نہیں ہوا تھا لیکن اس نے کار کے انجن کی آواز سنی تھی۔ اس لیے یہ امکان تھا کہ اسٹیئرنگ سنبھالنے کے باعث نازیہ نے موبائل فون اپنے قریب کی سیٹ پر ڈال دیا ہو یا اپنی گود میں گرا دیا ہو۔ پھر کار سے اترتے وقت اسے اپنا ہی ہوش نہیں تھا۔ موبائل فون وہ کار میں ہی گرا بیٹھی ہو گی۔
وہ نازیہ کا چہرہ تھپتھپاتی ہوئی اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی رہی۔ آخر کچھ دیر میں نازیہ کی آنکھوں سے ابلتا ہوا آنسوؤں کا سیلاب رکا لیکن وہ سسکیاں لیتی رہی۔ اب رخشی پر اس کی گرفت بھی مضبوط نہیں تھی۔ رخشی کو بستر سے اٹھنے کا موقع مل گیا۔
"میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے کہا اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔
باہر وہ نازیہ کی کار کے پاس پہنچی۔ موبائل کار کی ڈرائیونگ سیٹ کے پائیدان میں پڑا ہوا تھا۔
رخشی واپس پہنچی تو نازیہ بستر پر نیم دراز تھی۔ اب اس کا چہرہ پھر سپاٹ نظر آنے لگا تھا۔
"یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے نازو! کچھ تو بتاؤ۔ آخر ہوا کیا ہے؟" رخشی اس کے قریب لیٹ کر اس کا سر سہلانے لگی۔
نازیہ نے اس کی طرف دیکھا، دیکھتی رہی پھر بولی۔ "ڈیڈی شراب پیتے تھے۔ ان کے کمرے میں دو چار بوتلیں اب بھی پڑی ہوں گی۔ ان میں سے کوئی بوتل اٹھا لاؤ۔" اس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی مشین سے نکل رہی ہو۔
رخشی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم شراب پیو گی؟"
نازیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، اس وقت میری دماغی حالت ایسی ہی ہے۔ شراب پی کر کچھ سنبھالا لے سکتی ہوں۔"
"تم نے پہلے بھی پی ہے؟" رخشی کی حیرت میں اضافہ ہوا۔
"کبھی کبھی ایک آدھ پیگ پیا ہے۔"
رخشی کو پہلی مرتبہ اس کا علم ہوا۔
"پلیز رخشی!" نازیہ پھر بولی۔ "ڈیڈی کا کمرا لاک نہیں رہتا۔ تمہیں معلوم بھی ہے ان کا کمرا۔ شراب کی بوتل کپ بورڈ میں مل جائے گی۔"
"اس کے بغیر ہی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"
نازیہ نے اسے گھور کے دیکھا اور پھر اس نے خود بستر سے اٹھنا چاہا۔
"اچھا رکو۔" رخشی نے اسے جلدی سے روکا۔ "میں لاتی ہوں۔" وہ نازیہ کی ضد سے خوب واقف تھی۔

☆☆☆

ایک پیگ ختم کرنے تک نازیہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ اس دوران میں رخشی کے گھر سے اس کا فون آ گیا تھا کیونکہ بارہ بج چکے تھے۔
"مام!" رخشی نے اپنی ماں کو جواب دیا۔ "دیر مجھے اس لیے ہو گئی کہ نازیہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آج رات یہیں رک جاؤں۔ آپ جانتی ہیں کہ نازیہ اکیلی رہتی ہے۔"
رخشی کو وہاں رکنے کی اجازت مل گئی۔ اس کی والدہ اس کے اور نازیہ کے گھرے تعلق سے بخوبی واقف تھیں۔
نازیہ نے دوسرا پیگ بنایا۔
"پہلے تو میں نے تمہیں اپنے گھر سے ہی فون کیا تھا۔" رخشی اسے بتانے لگی۔ "جب تمہارا موبائل مستقل بند ملتا رہا تو میں نے پریشان ہو کر یہاں فون کیا۔ ملازم نے بتایا کہ تمہیں گئے ہوئے دیر ہو چکی ہے۔ تم پر جو جنون طاری رہا ہے، اس کی وجہ سے میں پریشان تو تھی ہی اور فون پر ملازم سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے میں یہاں دوڑی آئی۔ میں نے ثاقب کو بھی فون کر دیا تھا۔ وہ بھی یہاں آ گیا۔ ملازمین سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ پھر ثاقب کے گھر سے فون آ گیا۔"
آدھا پیگ ایک سانس میں پی لینے کی وجہ سے اس کا سینہ جل اٹھا تھا۔ رخشی تشویش سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

گلاس اب بھی نازیہ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ رخشی نے اس سے گلاس لینے کی کوشش نہیں کی۔ اسے اندازہ تھا کہ نازیہ گلاس نہیں دے گی۔
ایک منٹ بعد نازیہ نے آنکھیں کھول کر کسی حد تک سیدھی بیٹھ کر ایک گھونٹ لیا۔
"میں باتھ روم ہو آؤں۔" اس نے کہا اور گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ کر بستر سے اٹھنے لگی۔ رخشی نے اسے سہارا دینا چاہا۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" نازیہ بولی۔
رخشی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اب رخشی نے اٹھ کر کمرے کا ہیٹر آن کر دیا۔ اس کا ذہن اتنا الجھا رہا تھا کہ اتنی دیر تک اسے خیال ہی نہیں آیا تھا اور نازیہ تو اپنے آپے ہی میں نہیں تھی۔
جب وہ باتھ روم سے نکلی تو اس نے منہ دھو لیا تھا اور اپنے بکھرے ہوئے بال بھی ٹھیک کر لیے تھے۔ اس نے ہیٹر آن دیکھ کر اپنی جیکٹ اتار دی اور جینز میں اڑا سا ہوا ریوالور نکال کر سائڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔ ریوالور دیکھ کر رخشی کو تعجب نہیں ہوا۔ وہ اس بارے میں جانتی تھی۔
نازیہ گلاس اٹھا کر ٹہلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی لیکن جلدی جلدی۔
"اتنی تیزی سے نہ پیو۔" رخشی بولی۔
نازیہ نے ٹہلتے ٹہلتے گلاس ختم کیا پھر تیسرا پیگ بنا کے بستر پر بیٹھ گئی۔ رخشی کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس کے تاثرات بار بار بدل رہے تھے۔ کبھی وہ مغموم نظر آتی، کبھی اس کے چہرے سے اشتعال جھلکنے لگتا۔
"میں تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گی... ہرگز نہیں۔" وہ آدھا گلاس ختم کرنے کے بعد اس طرح بڑبڑائی جیسے اس پل رخشی کی موجودگی کا خیال ہی نہ رہا ہو اور وہ خود کو تنہا سمجھ رہی ہو۔
رخشی چونکی۔ "کس کو نہیں چھوڑو گی؟"
اس کی آواز نے نازیہ کو چونکایا۔ گلاس پر اس کی گرفت سخت ہو گئی اور وہ رخشی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"جس نے آج مجھے لوٹ لیا۔"
"لوٹ لیا؟" رخشی حیرت سے بولی۔ "کوئی کچھ چھین لے گیا تم سے؟"
"ہاں۔"
"مگر کیسے؟"
"میں ایک شاپنگ پلازا میں تھی جب مجھے اغوا کیا گیا۔"
رخشی پھر چونکی۔ نازیہ بولتی رہی۔ "وہ یقیناً ایاز نائک کے آدمی تھے۔ انہیں نہ جانے کیسے، نہ جانے کیوں یقین تھا کہ ان کے تین ساتھیوں کو میں نے ہی مروایا ہے۔ کار میں انہوں نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک بستر پر تھی لیکن میرے ہاتھ پیر اس طرح جکڑ دیے گئے تھے کہ میں مزاحمت نہ کر سکوں۔ اس کمرے میں صرف ایک شخص تھا جس نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے مجھے لوٹا اور میں رونے دھونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکی۔"
رخشی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "تم... تمہارا... مطلب... یعنی..." وہ ہکلا گئی۔
"ہاں۔" نازیہ نے کہا۔ "وہی مطلب ہے جو تم سمجھی ہو۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا لیکن میری ذلت کی یہ کہانی ثاقب کو نہ سنانا۔"
رخشی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
نازیہ پاگلوں کی طرح ہنسی۔ "لٹی تو میں ہوں، تم کیوں رونے لگیں۔"
رخشی جو پہلے ہی سے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی، اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی اور اس نے اپنا سر نازیہ کی گود میں ڈال دیا۔
"اسی کے بارے میں کہا تھا میں نے۔" نازیہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ "میں اسے چھوڑوں گی نہیں، خواہ مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ اپنی زندگی سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا ہے کہ اس نے مجھے لوٹنے کے بعد زندہ کیوں چھوڑ دیا۔ قدرت نے ہی اس کے دل میں یہ بات ڈالی ہو گی تاکہ اسے تڑپا تڑپا کر مارنے کا موقع مل جائے مجھے۔"
رخشی نے اس کی گود سے سر اٹھایا۔ اس نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تمہیں یاد ہے؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ ان جیسے خطرناک لوگوں سے ٹکراؤ گی تو مزید ذلت بھی اٹھانا پڑ سکتی ہے۔"
"ہاں۔" نازیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر ایک بڑا گھونٹ لیا پھر بولی۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ عورت واقعی ایک کمزور مخلوق ہے لیکن ایک اور بات بھی طے ہے۔ عورت کو جب غصہ آ جائے تو وہ زہریلی ناگن بھی بن جاتی ہے جس کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔"
"تم خود کو اور کسی مصیبت میں ڈال لو گی نازو۔" رخشی

نے کپکپاتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ”اب ہمارے ملک میں ایم این اے بہت بڑی چیز ہوتا ہے۔“

نازیہ نے کوئی جواب دیے بغیر گلاس خالی کیا اور مزید پیگ بنانے لگی۔

”اب بس کرو، پلیز۔“ رخشی بول پڑی۔ ”تمہاری زبان میں لکنت آگئی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ نازیہ نے آنکھیں پھاڑنے کے انداز میں رخشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن... پینے دو مجھے... اس کے بغیر نیند نہیں آئے گی آج... مجھے سکون کی ضرورت ہے رخشی... میں سونا چاہتی ہوں۔“

رخشی نے اپنا سر تھام لیا۔ نازیہ چوتھا گلاس بنانے لگی۔

چوتھا پیگ پیتے ہوئے وہ بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ غالباً اسے خود بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ توازن قائم رکھنے میں دشواری محسوس کر رہی تھی۔ رخشی اب خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اب وہ کچھ کہے گی بھی تو نازیہ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔

”عورت۔“ نازیہ بڑبڑائی۔ ”کیوں ہے عورت اس دنیا میں۔“

اس کا دماغ اب ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

”یہ تو مردوں کی دنیا ہے۔“ وہ بڑبڑاتی رہی۔ ”درندوں کی دنیا۔ عورت تو ہرنی ہے... کیوں ہے وہ درندوں کے اس جنگل میں۔“

نشے نے اسے اسی کی یہ بات بھلا دی تھی کہ عورت زہریلی ناگن بھی بن جاتی ہے۔

”لیکن میں ہرنی نہیں ہوں۔“ نازیہ کو جیسے یاد آیا۔ ”میں تو ناگن بنوں گی، زہریلی ناگن۔“

پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جو شراب اس میں باقی تھی، بستر پر بہہ گئی اور گلاس لڑھک کر بستر سے نیچے جا گرا۔

جب وہ بیدار ہوئی تو دن خاصا چڑھ چکا تھا۔ اس نے اپنے سر میں شدید درد محسوس کیا۔ اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے اس نے دیکھا کہ رخشی اس کے برابر میں لیٹی ہوئی تھی۔

”تم گئیں نہیں رخشی؟“

”نہیں۔“ رخشی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی ممی کا فون پھر آیا تھا۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی۔ میں چاہتی تھی کہ تم جاگ جاؤ۔ تم نشے میں نہ ہو تو میں ایک بار پھر تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں۔“

”سوئیں نہیں تم؟“

”سو گئی تھی۔ ممی نے فون کیا، تبھی جاگی تھی۔ تم اس کی آواز سے بھی نہیں جاگ سکی تھیں۔“

نازیہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نہالوں۔ سر میں بہت درد ہو گیا ہے۔“

وہ باتھ روم میں چلی گئی۔

رخشی نے ناشتا اس کے ساتھ ہی کیا۔ اسے ثاقب کے والد کی طبیعت کے بارے میں بھی بتایا کہ اب ان کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔

نازیہ جب باتھ روم میں تھی تو ثاقب کا فون آیا تھا۔

ناشتے کے دوران میں رخشی اسے وہی سب کچھ سمجھاتی رہی جو پہلے بھی سمجھا چکی تھی۔ نازیہ نے اس موقع پر جواب میں کچھ نہیں کہا، بس سنتی رہی۔ اس کی مسلسل خاموشی سے رخشی کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ نازیہ کو تنہا چھوڑے لیکن رات بھر گھر سے غائب رہنے کے بعد اب اس کا جانا ضروری تھا۔

نازیہ اسے چھوڑنے کے لیے باہر تک گئی جہاں نازیہ کی کار کھڑی تھی۔ رخشی نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنے سے پہلے نازیہ کو اپنے سینے سے لگایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا نازو کہ میں اپنی ایک اچھی دوست سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤں۔“

نازیہ نے ہنس کر اس کی پیٹھ تھپکی لیکن کچھ کہا نہیں۔

رخشی چلی گئی۔ نازیہ اپنے کمرے میں آگئی۔ شراب کی بوتل سرہانے سائڈ ٹیبل پر موجود تھی لیکن اب نازیہ نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اب اسے ہوش و حواس کے ساتھ سوچنا تھا کہ.... وہ کیا کر سکتی ہے۔ غسل کرنے اور ناشتا کرنے کے بعد اس کے سر کا درد ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

گزشتہ رات اس کے ساتھ جو کچھ ہو گیا تھا، اس کے صدمے سے وہ باہر آچکی تھی۔ اب اس کے رگ و پے میں صرف انتقام کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ رخشی کے سمجھانے بجھانے کا اس نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ وہ ہر صورت میں ایاز نائک سے انتقام لینا چاہتی تھی۔

سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں پھر عامر کا نام ابھرا جس کے بارے میں اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بہت غلط راستوں پر نکل گیا تھا۔ ایک مرتبہ نازیہ اس کا نام اپنے ذہن سے جھٹک چکی تھی لیکن اب حالات دوسرے تھے۔

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے عامر سے ملنے کا

جونی! اس سے لڑنے کا ارادہ ترک کردو تو بہتر ہے...... دیکھتے ہیں اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں

فیصلہ کر لیا۔ اب اس کے سامنے دشواری یہ تھی کہ وہ اس تک پہنچے کیسے؟ وہ اس کے گھر سے بھی ناواقف تھی اور اسے اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر بھی نہیں معلوم تھا۔ سوچتے سوچتے اسے رؤف کا خیال آیا جو عامر کا دوست تھا۔ وہ بھی ایک لفنگا ہی تھا۔ نازیہ ایک مرتبہ کہیں سے گزرتے وقت اتفاق سے رؤف کو ایک گھر میں جاتے دیکھ چکی تھی۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اسی کا گھر ہو لیکن اس گھر سے اس کا کوئی تعلق یقیناً ہونا چاہیے تھا۔ اس تعلق ہی کے باعث یہ بات ممکن تھی کہ وہاں سے اس گھر کا پتا چل جاتا جہاں وہ رہتا تھا۔

نازیہ اس معاملے میں رخشی یا ثاقب سے مدد لے سکتی تھی لیکن یہ اب وہ مناسب نہیں سمجھ رہی تھی کہ ان دونوں کو اپنے عزائم سے باخبر کرے۔ ایک بار پھر وہ دونوں اس کے لیے ناصح بن جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ جس طرح ثاقب نے داراب زین کا پتا لگانے کے سلسلے میں اس سے تعاون نہیں کیا تھا، اسی طرح اب اس کے ساتھ رخشی بھی اس سے تعاون کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتی۔

بارہ بجے کے قریب نازیہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ اس کی کار کا رخ اس علاقے کی طرف تھا جہاں وہ رؤف کو ایک گھر میں جاتے دیکھ چکی تھی۔

وہ رہائشی علاقہ تھا۔ وہاں پہنچ کر نازیہ کو احساس ہوا کہ گزرے ہوئے عرصے میں وہاں خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ غالباً کچھ لوگوں نے اپنے گھر تڑوا کر دوبارہ تعمیر کروا لیے تھے یا صرف بیرونی حصوں میں تبدیلیاں کی تھیں۔ گھروں کی منزلوں میں بھی اضافہ نظر آ رہا تھا۔

کیونکہ وہ ایک کشادہ راستہ تھا اس لیے نازیہ کو یہ یقین بہرحال تھا کہ انہی میں کہیں وہ گھر ہونا چاہیے جس کی اسے تلاش تھی۔ ان میں سے بعض گھروں پر نمبر پلیٹ اور نیم پلیٹ موجود تھی اور بعض پر نہیں تھی۔ پھر بھی نازیہ نے کار کی رفتار کم کر کے وہ نیم پلیٹ دیکھیں جو تھیں۔ اس عمل سے بھی وہ کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی اور یہ اسے مناسب نہیں معلوم ہوا کہ وہ مختلف گھروں کی کال بیل بجائے اور لوگوں سے رؤف کے بارے میں پوچھے۔

اسی سڑک پر ایک بہت بڑا ڈپارٹمنٹل ٹائپ کا ایک جنرل اسٹور تھا۔ نازیہ نے اپنی کار وہاں روکی اور اتر کر اس میں داخل ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس قسم کے اسٹور کو آس پاس رہنے والے بیشتر لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ

معلوم ہوتا ہے۔

نازیہ نے بلا ضرورت کچھ چیزیں خریدیں اور پھر ادائیگی کے کاؤنٹر پر جا کر بل دینے کے بعد بولی۔ ''محترم! مجھے یہاں ایک صاحب سے ملنا ہے لیکن کئی سال بعد آئی ہوں اس لیے گھر بھول گئی ہوں۔ شاید آپ کو علم ہو۔ یہاں کوئی رؤف صاحب رہتے ہیں؟''

''رؤف صاحب... وہ جو انجینئر ہیں؟''

''جب پہلے میں یہاں آئی تھی تو وہ انجینئر نہیں تھے۔ اب شاید ہو گئے ہوں۔''

''تو پھر آپ کو رؤف انجینئر صاحب ہی کے گھر کی تلاش ہوگی۔ میں اس نام کے صرف دو افراد کو جانتا ہوں۔ دوسرے رؤف صاحب تو پچاس سال سے زیادہ کے ہوں گے۔ رؤف انجینئر صاحب بھی چھ ماہ قبل انجینئر بنے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کچھ دن تو بیکار ہی رہے تھے۔ اگر اسٹور سے باہر نکل کر بائیں جانب جائیں تو گیارہ مکان چھوڑ کر بارھواں گھر انہی کا ہے۔ چاکلیٹی رنگ کی دیواروں کا اس رو میں وہی ایک گھر ہے۔ شاید آپ کو انہی رؤف صاحب کی تلاش ہو۔''

''بہت بہت شکریہ! میں دیکھ لیتی ہوں۔''

نازیہ اسٹور سے نکل آئی اور اسٹور والے کے بتائے ہوئے مکان کے سامنے جا کر رکی۔ اس نے کال بیل کا بٹن دبایا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے سوچنے لگی یہی مکان ہونا چاہیے۔ اب اس مکان میں تبدیلی یہ آئی تھی کہ پہلے اس کی صرف ایک منزل تھی لیکن اب وہ تین منزلہ تھا۔ اب یہ بات بہرحال طے تھی کہ یہاں رؤف کسی سے ملنے نہیں آیا تھا بلکہ رہتا ہی یہاں تھا۔

کال بیل کے جواب میں جو عورت دروازہ کھول کر باہر آئی، وہ وضع قطع سے ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔

''رؤف صاحب سے ملنا ہے مجھے۔'' نازیہ نے اس سے کہا۔

''وہ تو جی ابھی گھر پر نہیں ہیں۔ دفتر گئے ہوئے ہیں۔''

''کب آتے ہیں؟''

''پانچ چھ بجے تک آئیں گے۔''

''اچھا!'' نازیہ نے کچھ سوچا پھر اپنے بیگ سے چھوٹی سی نوٹ بک نکالتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں اپنا نمبر دے جاتی ہوں۔ یہ دے دینا انہیں۔ وہ مجھے فون کر لیں۔''

ملازمہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

نازیہ نے نوٹ بک کا ایک ورق پھاڑ کر اپنا موبائل نمبر لکھا۔ اپنا نام دانستہ نہیں لکھا۔ اسے یقین تھا کہ نام نہ ہونے کے باوجود رؤف متجسس ہو کر اسے فون ضرور کرے گا۔

ملازمہ کو وہ نمبر دے کر نازیہ مڑی اور اپنی کار میں جا بیٹھی۔ اب اسے اور کوئی کام نہیں تھا اس لیے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

ڈیڑھ بج چکا تھا جب وہ گھر پہنچی۔ رؤف اور اس کے بعد عامر سے ملنے کا خیال اسے ہیجان میں مبتلا کر چکا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ کھانا کھانے کے لیے بیٹھی اور ابھی اس نے چند ہی لقمے لیے تھے کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھا۔

کون ہو سکتا ہے؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔

اس کے خیال کے مطابق رؤف کا فون تو پانچ بجے کے بعد آنا چاہیے تھا۔ بہرحال اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو!''

''آپ کون بول رہی ہیں؟'' دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔ ''میں اپنے دفتر سے بول رہا ہوں۔ ابھی میرے گھر سے فون آیا تھا کہ کوئی خاتون مجھ سے ملنے کے لیے گھر پہنچی تھیں۔ میں گھر پر نہیں تھا اس لیے وہ اپنا کانٹیکٹ نمبر چھوڑ گئی تھیں۔''

نازیہ کے ہاتھ میں دبا ہوا نوالا چھوٹ کر پلیٹ میں گر گیا۔ اب کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ کال کرنے والا رؤف تھا۔

''میں نے اسی نمبر پر فون کیا ہے۔'' رؤف کی آواز آئی۔ ''کیا آپ ہی میرے گھر پہنچی تھیں؟''

''یقیناً۔'' نازیہ نے فوراً جواب دیا۔ ''میرا نام نازیہ ہے۔''

''نازیہ؟'' رؤف کے لہجے میں الجھن تھی۔

''بریگیڈیئر فیاض احمد کی بیٹی۔''

''اوہ۔'' اس مرتبہ چونک کر کہا گیا۔ ''اُفوہ!... اتنے سال بعد تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا؟''

''سچی بات تو یہ ہے رؤف کہ مجھے عامر سے ملنا ہے لیکن مجھے نہ تو اس کا گھر معلوم ہے اور نہ اس کا کانٹیکٹ نمبر ہے میرے پاس... تمہارا گھر تو مجھے اتفاق سے معلوم تھا اس لیے پہنچ گئی۔''

''واہ۔'' رؤف دھیرے سے ہنسا۔ ''تعجب ہے کہ تم

عامر سے ملنا چاہتی ہو۔''

دراصل یہ رؤف کے سامنے کی بات تھی جب نازیہ نے عامر کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہیں تعجب کیوں ہو رہا ہے۔'' نازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''حقیقت یہ ہے رؤف کہ ماضی میں جو کچھ ہوا، وہ میری غلطی تھی۔ مجھے وہ نازیبا حرکت نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں اس سلسلے میں عامر سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے اس کا پتا یا نمبر دے سکتے ہو؟''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔

''ہیلو!'' نازیہ بے تابی سے بول پڑی۔

''میں سوچنے لگا تھا کہ... اچھا خیر... میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہارا نمبر اسے دے دیتا ہوں۔ وہ تم سے خود بات کر لے گا۔''

''ایسا کر لو۔ میں تمہاری شکرگزار رہوں گی۔ میں اس سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میرا نمبر دیتے وقت اسے یہ بھی بتا دینا تاکہ اس کی ناراضگی ختم ہو جائے۔''

''اچھا میں اسے ابھی فون کرتا ہوں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اس بات چیت سے نازیہ اتنی بے چین ہوئی کہ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھا سکی۔ اسے گمان تھا کہ رؤف سے اس کے بارے میں معلوم ہوتے ہی عامر اسے فون کرے گا۔ وہ اس کی کال کے لیے بے چین ہو کر ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے میں آ گئی اور ٹہلنے لگی۔

پندرہ منٹ بعد اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر اسے ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

''عامر بول رہا ہوں۔'' نازیہ کی ''ہیلو'' سننے کے بعد دوسری طرف سے کہا گیا۔

''میں بہت بے چینی سے تمہاری کال کا انتظار کر رہی تھی۔''

''مجھے تعجب ہوا۔ اتنے عرصے بعد تمہیں خیال آیا ہے کہ تم نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی اس لیے تمہیں مجھ سے معافی مانگنی چاہیے۔ رؤف نے مجھے یہی بتایا ہے۔''

''ٹھیک بتایا ہے۔ میں واقعی بہت پشیمان ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم جلد از جلد مجھ سے ملو اور تمام گلے شکوے دور کر لیے جائیں۔''

''جلد از جلد سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''مطلب یہ کہ... اگر ممکن ہو تو ابھی۔''

''اتنی جلدی تو ممکن نہیں۔ میں اس وقت شہر سے باہر ہوں۔ رات کو واپس آؤں گا۔ آخر اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ پشیمانی کا اظہار تم نے کر ہی دیا۔ اس کے بعد اب مجھے بھی تم سے کوئی شکایت نہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں؟'' عامر دھیرے سے ہنسا۔

''میرا خیال ہے کہ میں تمہیں سچی بات بتا دوں۔ اور سچ یہ ہے کہ مجھے ایک کام آ پڑا ہے جو تم ہی کر سکتے ہو یا کسی سے کروا سکتے ہو۔ اس کام ہی کی وجہ سے مجھے تم یاد آئے اور مجھے خیال آیا کہ کبھی کسی سے اپنا تعلق خراب نہیں کرنا چاہیے۔ انسان کو کسی وقت بھی کسی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ممکن ہے تم یہ سوچو کہ مجھے اپنے کام کی وجہ سے تمہاری ضرورت ہے، لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اس کام کی وجہ سے تم یاد آئے اور میں نے سچ مچ پشیمانی محسوس کی۔ میں نے واقعی غلطی کی تھی۔''

''کام کیا ہے؟'' عامر سنجیدہ ہو گیا۔

''فون پر وہ باتیں نہ کی جائیں تو بہتر ہے۔''

''کچھ اشارہ تو دو۔ دراصل ایک امکان یہ بھی ہے کہ شاید میں آج رات کو بھی نہ آ سکوں، کل کسی وقت آؤں لیکن اگر تمہارے کام کی اہمیت معلوم ہو جائے تو میں آج ہی آنے کی کوشش کروں گا۔ کوشش کیا کروں گا، یقینی طور پر آ جاؤں گا۔''

''اچھا۔'' نازیہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''دراصل مجھے اس کا علم تو شروع ہی میں تھا کہ تم کن راستوں پر چل پڑے ہو۔ پچھلے سال مجھے معلوم ہوا کہ تم اس راستے پر بہت آگے نکل گئے ہو۔ پہلے میں یہی سمجھتی تھی کہ وہ صحیح راستے نہیں ہیں لیکن اب خود مجھ پر پڑی ہے تو مجھے خیال ہے کہ آج کے معاشرے میں زندگی کی شرط ہی یہ بن چکی ہے کہ اسی قسم کے راستوں پر چلا جائے۔ اسی لیے تو مجھے تمہاری یاد آ گئی۔ اس معاملے میں تم جیسا شخص ہی میری مدد کر سکتا ہے۔''

''آخر ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ؟'' دوسری طرف سے کچھ رک کر پوچھا گیا۔ ''تم اتنا کچھ کہہ گئیں لیکن اپنے کام کے بارے میں نہیں بتایا۔''

''ایک سربرآوردہ شخص نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔'' نازیہ کو ملاقات سے پہلے ہی مجبوراً صاف صاف بات کرنا پڑی۔ ''میں اس شخص سے اس زیادتی کا بدلہ لینا چاہتی ہوں لیکن میں ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ صرف تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔''

"زیادتی کیا کی ہے اس شخص نے؟ اور وہ ہے کون؟"

نازیہ کے لیے یہ بتانا ممکن نہیں تھا کہ ایاز نائک نے اسے بے آبرو کیا تھا لیکن اپنے پلاٹ کی بات وہ کرسکتی تھی۔

"اس نے میرے ایک بہت قیمتی پلاٹ پر قبضہ کرلیا ہے عامر! جعلسازی سے وہ اپنے نام کروالیا ہے۔"

"ایسی بات ہے تو تم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کرسکتی ہو۔"

"وہ ان لوگوں میں سے ہے جو قانون کو اپنی جیب میں ڈالے پھرتے ہیں۔ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرکے میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گی۔ اس کے خلاف کوئی غیر قانونی ہی قدم اٹھانا پڑے گا اور جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں، ان کی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ یہ کام تم ہی کرسکتے ہو یا ان لوگوں سے کرواسکتے ہو جن سے تم نے اپنے مراسم بہت بڑھالیے ہیں۔"

دوسری طرف سے ایک طویل سانس لینے کی آواز آئی۔ پھر کہا گیا۔ "اتنا کچھ بتا ڈالا تم نے لیکن اس آدمی کا نام نہیں بتایا۔"

"ایم این اے ہے وہ... نام ایاز نائک ہے۔"

"اوہ۔"

"اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ مجھ جیسی لڑکی اس سے ٹکر نہیں لے سکتی۔"

"تمہارا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ایم این اے قسم کے لوگ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں دیکھ لوں گا اس معاملے کو لیکن اس کے لیے تمہیں اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اگر آج رات نہ آسکا تو کل آجاؤں گا اور اس بارے میں تم سے تفصیلی بات چیت ہوجائے گی۔"

"تفصیلی بات تو فون پر ہی ہوگئی۔" نازیہ جلدی سے بولی۔ "پلیز! آج ہی آجاؤ۔" وہ بہت بے چین تھی اور چاہتی تھی کہ ایاز نائک کے خلاف جلد از جلد کارروائی ہوسکے۔

"اچھا۔" پھر طویل سانس لے کر کہا گیا۔ "اچھا، میں آج ہی آجاؤں گا لیکن خاصی دیر لگے گی۔ شاید گیارہ بارہ بج جائیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں بے چینی سے تمہاری منتظر رہوں گی۔ میرے گھر ہی آجانا۔ میرا پتا لکھ لو۔"

"کیا تم نے اپنا گھر بدل لیا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو پھر پتا بتانے کی کیا ضرورت ہے۔" عامر نے ہنس کر کہا۔ "تمہارا پتا تو میرے دل پر لکھا ہوا ہے۔ چاہت کی بات ہو تو دل پر سبھی کچھ نقش ہوجاتا ہے۔"

نازیہ ان فقروں کا مطلب سمجھ گئی۔ عامر نے فون پر ہی اپنی خواہش کا اعادہ کرڈالا تھا اور نازیہ اس کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی آمادہ تھی۔

"تو پھر میں بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گی۔"

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے ریسیور کا بوسہ لیا گیا ہو اور پھر سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

وہ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ جب کسی کا انتظار ہو تو لمحہ لمحہ بھاری ہوتا ہے۔

کوئی آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے پر ملازمہ تھی جس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جس پر جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ اس نے نازیہ کو دیا۔ لفافے پر نازیہ کا نام لکھا تھا۔

"یہ کہاں سے آیا؟" نازیہ نے پوچھا۔

جواب سے نازیہ کو معلوم ہوا کہ دو گھنٹے پہلے جب مالی گھاس کاٹنے میں مصروف تھا تو وہ لفافہ چار دیواری کے باہر سے کسی نے پھینکا تھا اور وہ کیاری میں گرا تھا۔ مالی نے اسے کسی بچے کی شرارت سمجھ کر دھیان نہیں دیا تھا۔

لفافہ قدرے وزنی تھا۔ نازیہ نے اسے چاک کرتے ہوئے ملازمہ کو جانے کا اشارہ کیا۔ اس وقت اس کے دماغ میں یہ خیال بھی چکرا رہا تھا کہ اس طرح لفافہ اس کے گھر میں پھینکنے کا مقصد تو یہی ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص لفافہ دینے کے لیے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

لفافے میں تہ کیے ہوئے ایک کاغذ کے ساتھ نازیہ کی تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر نازیہ سناٹے میں آگئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان تصویروں کو دیکھنے لگی۔ اس کی وہ تصویریں اسی نامعلوم عمارت کے کمرے کی تھیں جہاں اس نے ہوش میں آنے پر ایک بستر پر خود کو بالکل بے بس پایا تھا۔ تصویروں میں اس کی کلائیاں اور ٹخنے نہیں تھے جن سے ظاہر ہوتا کہ وہ اس حالت میں بالکل بے بس تھی۔ اس کی کلائیوں اور پیروں کے ٹخنوں میں پڑے آہنی کڑے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

تصویروں کی تعداد پانچ تھی۔ وہ مختلف زاویوں سے کھینچی گئی تھیں۔

دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ نازیہ نے تہ کیا ہوا کاغذ

کھولا۔ اس پر جو تحریر نظر آئی، وہ بھی ٹائپ میں تھی۔ اس میں لکھا گیا تھا۔

لڑکی... تم مجھے اچھی لگی ہو ورنہ تمہاری سزا تو یہی تھی کہ تمہیں ختم کردیا جاتا۔ تمہیں زندہ اسی لیے رکھا گیا ہے کہ جب تک تم سے میرا دل نہیں بھر جاتا، تمہیں اپنے پاس بلاتا رہوں۔ میرا وہی آدمی تم سے مل لیا کرے گا۔ تم اس کے ساتھ چلی آیا کرنا۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تمہاری یہ تصویریں انٹرنیٹ پر ڈال دی جائیں گی۔ تصویروں کے ساتھ تمہارا اور تمہارے باپ کا نام بھی ہوگا۔ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوگی اس لیے جب تک میں تمہیں بلاتا رہوں، آتی رہنا۔ انکار کی صورت میں...

آخری جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

کہاں تو ان تصویروں کو دیکھ کر نازیہ سناٹے میں آگئی تھی اور کہاں اب یہ ہوا کہ غصے سے اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"تیری موت بہت ضروری ہوگئی ہے ایاز نائک۔" وہ بڑبڑائی۔

☆☆☆

شام کو ثاقب اس سے ملنے آیا۔

"کیسے ہیں اب تمہارے والد؟" نازیہ نے بے اختیار پوچھا۔

"اب وہ ٹھیک ہیں۔ کل رات تو میں بہت گھبرا گیا تھا ان کی حالت دیکھ کر... اگر ان کی وہ حالت نہ ہوجاتی تو رخشی کے ساتھ میں بھی تمہارے گھر پر ہوتا۔ بہت فکر ہوگئی تھی تمہاری طرف سے... تمہارا موبائل بند نہ ملتا تو کم از کم تمہاری وجہ سے پریشانی نہیں ہوتی۔"

نازیہ کا یہ یقین درست ثابت ہوا تھا کہ رخشی ثاقب کو ان باتوں سے آگاہ نہیں کرے گی جو اس نے رخشی کو بتائی تھیں۔

"بس اتفاق کہہ لو۔" نازیہ نے ثاقب کو جواب دیا۔ "بے خیالی میں آف کر بیٹھی تھی موبائل... بہت دیر بعد کسی کو فون کرنے کا خیال آیا، تب دیکھا تھا میں نے۔" پھر اس نے کہا۔ "رخشی نہیں آئی آج؟"

"فون پر ابھی بات ہوئی تھی اس سے... وہ کچھ مصروف تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جاؤں گی نازیہ کے گھر۔"

اس کے بعد ثاقب تقریباً آدھے گھنٹے تک بیٹھا۔ اس نے صاف صاف بات تو نہیں کی مگر اشاروں کنایوں میں یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ نازیہ نے ایاز نائک کے خلاف کوئی غیر قانونی قدم اٹھانے کا ارادہ ختم کردیا ہے یا ابھی تک غصے میں ہے اور کچھ سوچ رہی ہے کیونکہ دارا اب تو پولیس مقابلے میں مارا جاچکا تھا۔

زیادہ صاف صاف بات ثاقب نے شاید اسی لیے نہیں کی ہوگی کہ اگر وہ نازیہ کو سمجھانے کی کوشش کرے گا تو وہ پھر بھڑک جائے گی۔ ایک مرتبہ تو وہ اس کے ساتھ بے رخی سے پیش آہی چکی تھی۔

نازیہ اس کے اشاروں کنایوں کو نظرانداز کرتی رہی۔ آخر ثاقب چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد رخشی آئی۔

"ہاں، فون کیا تھا ثاقب نے۔" وہ نازیہ کے استفسار پر بولی۔ "میں آج دن بھر سوتی رہی ہوں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے جاگی تھی۔"

"کھانے کا وقت قریب ہے۔ کھانا لگواؤں؟"

"نہیں۔" رخشی نے جواب دیا۔ "ابھی گھر سے کھا کر چلی تھی۔ اب تم کیسا محسوس کررہی ہو؟"

"کیا مطلب؟"

رخشی نے براہِ راست سوال کرنے کے بجائے پوچھا۔ "اور شراب تو نہیں پی؟"

"نہیں۔"

"جو کچھ ہوگیا، اسے بھولنے کی کوشش کرو نازیہ۔" رخشی نے سنجیدگی سے کہا۔ "موجودہ حالات میں اس قسم کے لوگوں سے ٹکرانا کسی اور بدترین صورتِ حال کا سبب بھی بن سکتا ہے۔"

نازیہ نے اس طرح سر ہلا کر نظریں جھکالیں جیسے اس نے واقعی حالات کے سامنے سپر ڈال دی ہو۔

ایک گھنٹے بعد رخشی بھی چلی گئی۔ اسی دوران میں نازیہ نے کھانا کھالیا تھا۔ رخشی کھانے میں تو اس کے ساتھ شریک نہیں ہوئی تھی لیکن نازیہ کے کھانے کے بعد اس کے ساتھ چائے پی لی تھی۔

اس کے جانے کے بعد نازیہ کو پھر اس کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا کہ عامر کا انتظار کرے۔ وہ ان تصویروں کے بارے میں سوچنے لگی۔ رات کو کھینچی گئی تصویریں اتنی جلدی ڈیولپ ہوکر آگئی تھیں کہ وہ صبح ہونے کے بعد گیارہ بجے ہی اس کے گھر پہنچادی گئی تھیں۔ ایک ایم این اے کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

نازیہ انتظار کرتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عامر اتنا بڑا کام کر بھی سکے گا یا نہیں... نازیہ کے لیے اب ضروری ہوگیا تھا کہ ایاز نائک کو اغوا ہی کیا جائے کیونکہ اب معاملہ

تصاویر کا بھی آ گیا تھا۔ وہ تصویریں اس کے ڈیجیٹل کیمرے میں لازمی طور پر ہونا چاہیے تھیں۔ ان کا ختم کیا جانا بھی ضروری تھا۔

گیارہ بجنے کے بعد نازیہ کا اضطراب بڑھ گیا۔ اگرچہ عامر نے گیارہ بارہ بجے کے درمیان آنے کا وعدہ کیا تھا اور ابھی بارہ نہیں بجے تھے کہ وہ بے چین ہونے لگی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے تو اس کا اضطراب اتنا بڑھا کہ وہ باہر برآمدے میں نکل آئی اور وہیں کھڑے کھڑے پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ پونے بارہ بجے اس کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ اس نے عامر سے رابطہ کرنے کے لیے اپنا موبائل نکالا۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ کال عامر کی تھی۔

نازیہ نے موبائل آن کرتے ہوئے کان سے لگایا اور بے تابی سے بول پڑی۔ ”کہاں رہ گئے عامر؟“

دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی سنائی دی پھر کہا گیا۔ ”بہت ہی بے چین ہو۔ خیر، میں بس پہنچنے ہی والا ہوں۔“

نازیہ نے سکون کی سانس لی۔

عامر کی آواز آتی رہی۔ ”ویسے میں ابھی خود بھی تمہیں فون کرنے والا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میری کار وہاں پہنچے تو مجھے پھاٹک کھلا ہوا ملے۔ مجھے پھاٹک پر رکنا نہ پڑے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری کار وہاں کھڑی دیکھ لے۔“

”خیر، پھاٹک تو میں کھلوادوں گی لیکن اگر کوئی تمہاری کار وہاں کھڑی دیکھ لے گا تو اس سے تمہارے لیے کیا فرق پڑے گا؟“

”یہ میں آ کر ہی بتاؤں گا۔ تم پانچ منٹ بعد پھاٹک کھلوا دینا۔ میرا خیال ہے کہ میں اب تمہارے گھر سے اتنی ہی دور رہ گیا ہوں کہ پانچ منٹ میں پہنچ جاؤں گا یا شاید چھ سات منٹ لگ جائیں۔ اس سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تمہیں پھاٹک کھلا ہوا ملے گا۔“ نازیہ نے جواب دیتے ہوئے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

نازیہ برآمدے میں ٹہلتی رہی اور بار بار گھڑی پر نظر ڈالتی رہی۔ پھر برآمدے سے اتر کر پھاٹک کی طرف بڑھی۔ اس نے چوکیدار کو آواز بھی دی تھی۔

نازیہ کے حکم پر پھاٹک کھول دیا گیا۔

”ایک کار آنے والی ہے۔“ وہ چوکیدار سے بولی۔ ”پھاٹک اب اس وقت تک بند نہیں کرنا جب تک وہ اندر نہ آ جائے۔“

”اچھا بی بی جی۔“ چوکیدار نے کہا۔

نازیہ برآمدے میں چلی گئی اور وہیں کھڑے کھڑے پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بمشکل ایک منٹ گزرا تھا کہ ایک شاندار کار پھاٹک سے اندر آتی دکھائی دی۔ کار کے اندر تاریکی تھی اس لیے نازیہ عامر کو اس وقت دیکھ سکی جب کار اس کے سامنے آ کر رکی۔ عامر نے ہیڈ لائٹس بجھاتے ہوئے انجن بھی بند کیا اور پھر کار سے اتر کر مسکراتا ہوا برآمدے کی طرف آیا۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا۔

”ہیلو۔“ نازیہ نے اس کا استقبال کیا۔

”یقین نہیں آ رہا ہے کہ اتنے عرصے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے۔“ عامر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”اور دعوت بھی مجھے اس لڑکی نے دی ہے جس نے...“

”پلیز عامر!“ نازیہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”اب شرمندہ تو نہ کرو۔ میں معافی مانگ چکی ہوں۔ اب تمہیں وہ سب کچھ بھول جانا چاہیے۔“

”چلو سوری کر لیتا ہوں۔“ عامر ہنسا۔

نازیہ اسے اندر لائی اور دانستہ ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بجائے اپنے کمرے میں لے گئی۔

”بیٹھو، کیا پیو گے؟“

عامر نے مسکراتے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ گی۔“

”مناسب نہیں تھا کہ وہاں بیٹھ کر ڈرنک کی جائے۔“

”ڈرنک؟“ عامر چونکا۔

”ہاں، کیوں؟... مجھے یقین ہے کہ تم پیتے ہو گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں پیتا ہوں لیکن تم؟ میرا خیال تھا کہ تم نہیں پیتی ہو گی۔“

”کبھی کبھی ایک آدھ لے لیتی ہوں۔“ نازیہ نے جواب دیتے ہوئے بوتل نکالی۔ ”تم کوئی اور برانڈ تو پسند نہیں کرتے؟“

”سبھی اچھی شرابیں میری پسندیدہ برانڈ ہیں۔“

نازیہ نے بوتل تپائی پر رکھنے کے بعد گلاس اور جگ فلاسک بھی نکال کر رکھا پھر عامر کے سامنے بیٹھ کر گلاس میں پیگ بنانے لگی۔

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہو گیا ہے نازیہ؟“

”سبھی کچھ تو فون پر پوچھ چکے ہو تم۔“

”تمہارا پلاٹ کہاں ہے؟“

جب نازیہ نے اپنے پلاٹ کے بارے میں بتایا تو عامر چونک کر بولا۔

”وہی پلاٹ تو نہیں جہاں چار آدمیوں کو فائرنگ کر کے ہلاک کیا گیا تھا؟“

”وہی۔“

نازیہ نے پیگ بنا کر عامر کی طرف بڑھا دیا پھر بولی۔ ”شروع کرو۔“

عامر نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ نازیہ عامر کے چہرے پر الجھن کا تاثر دیکھ رہی تھی۔

”انہیں مارا کس نے؟“ عامر نے ایک گھونٹ لے کر گلاس تپائی پر رکھ دیا۔

”پولیس تو مجھ پر ہی شبہ کرنے لگی تھی کیونکہ ان لوگوں سے میرا جھگڑا ہو چکا تھا جو پولیس کے علم میں آ گیا تھا۔“

”جھگڑا؟ مجھے اس معاملے کی ہر بات بتاؤ نازیہ! اس کے بعد ہی میں تم سے صاف صاف پوچھوں گا کہ تمہیں مجھ سے کیا کچھ توقع ہے۔“

نازیہ نے ان آدمیوں سے اپنے جھگڑے سے لے کر اس وقت تک کی کہانی بیان کر ڈالی جب پولیس اس کے گھر آئی تھی اور اپنی گلوخلاصی کے لیے اسے کرنل ذوالفقار کا سہارا لینا پڑا تھا۔

نازیہ نے اس کے گلاس میں شراب ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ ان لوگوں کی کس سے دشمنی تھی اور کس نے انہیں مارا۔ ہو سکتا ہے بات سرے سے دشمنی کی نہ ہو۔ آج کل لوگوں کو بلاوجہ گولیاں ماری جا رہی ہیں۔“

عامر نے اثبات میں سر ہلایا پھر پوچھا۔ ”فون پر تم سے جو باتیں ہوئی تھیں، ان سے مجھے صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اپنا پلاٹ واپس ملنا چاہیے لیکن تم نے اس سے انتقام لینے کی بات کی تھی۔ پلاٹ کی واپسی تو اس طرح ممکن ہے کہ اسے کسی طرح اغوا کر لیا جائے اور تاوان کی رقم اس پلاٹ سے دو تین گنا زیادہ ہو۔ اس طرح تم ویسا ہی پلاٹ خرید سکتی ہو۔ اس سے جو زیادہ رقم ملے گی، اسے تمہارا انتقام سمجھا جا سکتا ہے۔“

”نہیں، یہ میرا انتقام نہیں ہو گا۔ جب اسے اغوا کر لیا جائے گا تو میں اس کے منہ پر تھوکوں گی۔ اسے جوتوں سے مار کر ذلیل کروں گی۔ اس کے آدمیوں نے میرے ساتھ جو بدتمیزی کی تھی، اس کا انتقام یہی ہو سکتا ہے۔“

”اس طرح تو تمہیں اس کے سامنے آنا پڑے گا۔ وہ جان لے گا کہ اسے اغوا کر کے تاوان کس نے وصول کیا ہے۔ اس کے بعد وہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔“

”یہی تو کمال دکھانا ہے کسی طرح کہ وہ میرے خلاف کچھ نہ کر سکے۔“

”سوچنا پڑے گا۔“ عامر نے اس طرح سر ہلایا جیسے سوچ میں پڑ گیا ہو۔

نازیہ یہ نہیں کہہ سکی کہ دراصل تو وہ ایاز ناتک کی موت چاہتی تھی۔ ایسی موت کہ وہ تڑپ تڑپ کر مرے لیکن یہ بتانے کی صورت میں اسے یہ بھی بتانا پڑتا کہ اتنا شدید انتقام کس لیے... اور نازیہ، یہ بات اپنی زبان پر نہیں لا سکتی تھی کہ ایاز ناتک نے اسے بے آبرو کیا تھا۔

”تم یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں؟“ نازیہ نے صاف صاف سوال کر ڈالا۔

”میں خود تو نہیں کروں گا۔ کچھ اور لوگوں سے کام لوں گا۔ اسے اغوا کروانے کی منصوبہ بندی میں کچھ وقت تو بہرحال لگے گا۔ ایم این اے ہے وہ، اس کی سیکیورٹی اچھی خاصی ہو گی۔ وہ تو خیر دیکھ لیا جائے گا لیکن سوچنا یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے آ جانے کی صورت میں تمہارا بچاؤ کس طرح ممکن ہو گا؟“

”چلو تم اس بارے میں زیادہ نہ سوچو۔ اس سے

انتقام لینے کے بعد میں ہر قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"نہیں سویٹی! میں تمہیں اس کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتا۔" عامر نے ہوس ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کر اس کے برابر میں آبیٹھا۔ بڑے صوفے پر اتنی گنجائش تھی۔ "تم مجھے بہت پسند ہو، یہ تم جانتی ہو۔" اب اس نے اپنا ایک ہاتھ بھی نازیہ کے گلے میں ڈال دیا۔

نازیہ جانتی تھی کہ یہ سب تو ہوگا۔ وہ عامر کی طرف دیکھتی ہوئی اس طرح مسکرائی جیسے "سپردگی" کے لیے تیار ہو۔

عامر دوسرا پیگ بھی دو تہائی ختم کر چکا تھا۔ باقی وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

"تمہارے ہاتھ سے آج دو آتشہ جیسی کیفیت ہو گئی ہے جانِ من۔" عامر زیادہ بے تکلف ہوا۔

نازیہ ہنس کر آگے جھکی اور اس کے لیے تیسرا پیگ بنانے لگی۔

"تمہارا گلاس تو ابھی آدھا ہی ہوا ہے۔" عامر بولا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا... بس ایک آدھ پیگ لیتی ہوں۔"

"آج ہم دونوں کی دوستی کا آغاز ہوا ہے۔ اس خوشی میں تمہیں زیادہ پینی چاہیے۔"

"میں آدھا پیگ اور لے لوں گی۔" نازیہ نے کہا اور تیسرا گلاس عامر کو دیتے ہوئے اپنا گلاس اٹھا کر بھی ایک گھونٹ لیا۔ "یہ بتاؤ کہ میرا کام کب تک ہو جائے گا؟"

"دو دن میں بھی ہو سکتا ہے اور چار پانچ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ موقع محل سب کچھ دیکھنا پڑے گا۔ تم اپنے ذہن میں ایک ہفتہ رکھو۔"

"میں انتقام کی آگ میں جل رہی ہوں۔ ایک ہفتے تک جلتی رہوں اس آگ میں؟"

تیسرا پیگ عامر نے ایک سانس میں آدھا کر دیا اور پھر گلاس تپائی پر رکھ کر نازیہ کو اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے بولا۔ "میں ایک ہفتے تک اس آگ کو ٹھنڈا کرتا رہوں گا ڈارلنگ... روزانہ رات کو اسی وقت آتا رہوں گا۔"

نازیہ نے خود کو اس کی آغوش میں ڈھیلا چھوڑتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔ اس وقت وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ "یہ رشوت تمہیں بس اسی وقت تک ملے گی عامر جب تک میرا انتقام پورا نہیں ہو جاتا۔"

☆☆☆

عامر نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے تک نازیہ کی آگ بجھاتا رہے گا لہٰذا وہ دوسری رات بھی آیا۔ نازیہ نے اس رات بھی اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ اس نے برآمدے میں اس کا استقبال کیا تھا اور پھر سیدھی اپنی خواب گاہ میں لے گئی تھی۔

"تم بہت ہی پُرجوش ہو عامر۔" نازیہ نے والہانہ انداز میں کہا۔ "گزشتہ رات میری زندگی کی یادگار رات تھی۔"

"آج کی رات کو کل سے زیادہ یادگار بنا دوں گا۔" عامر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر صوفوں کی طرف بڑھتا ہوا بولا اور تپائی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "آج تم نے پہلے ہی سے سارا انتظام کر لیا ہے۔"

تپائی پر گزشتہ رات کی بوتل کے ساتھ ایک بھری ہوئی نئی بوتل بھی تھی۔

نازیہ بیٹھ کر نئی بوتل کھولنے لگی۔ عامر نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دونوں قریب قریب ہی بیٹھے تھے۔

"میرے کام کا کیا رہا؟" نازیہ نے پیگ بناتے ہوئے پوچھا۔

"آج سے ایاز نائک پر نظر رکھنا شروع کر دی گئی ہے۔" عامر نے اپنے ہاتھ کی گستاخی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے معمولات کا علم ہونے کے بعد ہی کوئی منصوبہ بنایا جا سکتا ہے لیکن اب تم اس سلسلے میں اپنا دماغ نہ تھکاؤ۔ سب کچھ مجھ پر ہی چھوڑے رکھو۔"

نازیہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

"تم بھی اسی میں سے پیو نا۔" عامر نے نئی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے سوچا تھا کہ یہ آج ختم ہو جائے۔ خیر، تم کہتے ہو تو میں بھی یہی لے لیتی ہوں۔" نازیہ نے اپنے لیے پیگ بنایا اور دل ہی دل میں بولی۔ "تمہیں مجھ پر شک کیوں ہو گیا ہے؟ تم شبہ کر رہے ہو کہ میں نے نئی بوتل میں کچھ ملا نہ دیا ہو... خیر... تمہارا شک کسی وجہ سے بھی ہو، غلط نہیں لیکن میں نے بوتل میں کچھ نہیں ملایا۔ جو کچھ ہے وہ اس گلاس میں ہے جو میں نے تمہیں دیا ہے۔"

نازیہ کا دماغ گزشتہ رات ہی گھوم گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عامر ہی ایاز نائک ہوگا۔ ایاز نائک کے جسم پر اس نے جو نشانات دیکھے تھے جو عامر کے جسم پر بھی تھے۔ اس سوال نے اسے بری طرح چکرائے رکھا تھا کہ عامر کا نام ایاز نائک کیسے ہو گیا۔

نازیہ گزشتہ رات ہی اس کے خلاف کچھ کر بیٹھتی لیکن

اس کے لیے کچھ تیاری کی ضرورت تھی۔ نازیہ پہلے اسے بے ہوش کرنا چاہتی تھی اور وہ کسی فلم کا کردار تو تھی نہیں جس کے پاس بے ہوش کرنے کی دوا تو کجا، زہر تک پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔

یہ اطمینان اسے تھا کہ عامر یا ایاز نائک دوسری رات بھی اس کے پاس ضرور آئے گا اس لیے اس نے رخصت کرتے وقت بھی اپنے چہرے پر ایسے تاثرات نہیں آنے دیے جو اس پر منکشف ہونے والے راز کا اظہار کر دیتے۔

باقی رات کا خاصا حصہ اس نے سوچ بچار میں گزارا تھا۔ وہ سوچتی رہی تھی کہ بے ہوش کر دینے یا گہری نیند سلا دینے والی کوئی چیز اسے کسی بھی میڈیکل اسٹور سے نہیں مل سکتی تھی۔

صبح ناشتے کے بعد اسے خیال آیا کہ بعض بے ضرر دواؤں کی آمیزش سے زہر بھی بن سکتا ہے۔ اس نے ناشتے کے بعد انٹرنیٹ سنبھال لیا۔

سرچنگ کے معاملے میں زیادہ ماہر نہ ہونے اور ذہنی انتشار کے باعث اسے کمپیوٹر پر دو گھنٹے صرف کرنا پڑ گئے لیکن وہ ایسی کچھ لکوئیڈ دواؤں کے نام معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی جن کی آمیزش کے بعد اس لکوئیڈ کے دو تین ہی قطرے کسی شخص کو خاصی دیر کے لیے گہری نیند سلا سکتے تھے۔ وہ دوائیں کسی بھی میڈیکل اسٹور سے بہ آسانی مل بھی سکتی تھیں۔

نازیہ نے یہ احتیاط برتی تھی کہ وہ دوائیں مختلف میڈیکل اسٹورز سے خریدی تھیں۔

اس لکوئیڈ کے چار قطرے اس نے اس گلاس میں ڈال دیے تھے جس میں اس نے عامر یا ایاز نائک کے لیے پیگ بنایا تھا۔ یہ وہ گزشتہ رات ہی دیکھ چکی تھی کہ عامر پہلا پیگ تیزی سے ختم کرتا تھا۔

ایک بڑا گھونٹ لینے کے بعد وہ بولا۔ "دراصل دوسرے پیگ میں، میں دونوں شرابیں ملا کر پیوں گا۔ موقع اچھا مل رہا ہے نا۔" وہ ہنسا۔ "کہا ہے نا کسی شاعر نے کہ نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں۔"

اس بات سے نازیہ کو اطمینان ہوا کہ عامر کو اس پر شک نہیں ہوا تھا بلکہ وہ دونوں شرابیں ملا کر پینا چاہتا تھا۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ آدھا گلاس ختم کرتے کرتے اس کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے۔

"یہ کیسی شراب ہے نازیہ؟" اس کی آواز بھرائی

شوبار

کیا مصیبت ہے...... جب دفتر میں کام زیادہ ہوتا ہے تو تمہیں کسی دوسری عورت کے خواب آنے لگتے ہیں...... مجھے کیا پتا میری جیب میں کیا لٹک رہا ہے

ہوئی تھی۔ "مجھے تو نیند..." اس کا جملہ پورا نہیں ہو سکا۔ اس کے ہاتھ سے گلاس فرش پر گرا اور وہ خود نازیہ پر ڈھیر ہو گیا۔

نازیہ حقارت اور غصے سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی صوفے سے اٹھ گئی۔ عامر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کب تک ہوش و حواس سے بیگانہ رہا تھا۔ اس نے خود کو نازیہ کے بستر پر چت پڑا ہوا دیکھا۔ اس وقت اس کے جسم پر صرف پتلون تھی۔ اوپری جسم برہنہ تھا۔ اس کے ہاتھ پیر مضبوط ریشم کی ڈوریوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے نازیہ کھڑی حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ... یہ... یہ کیا ہے... یہ... نازیہ؟" وہ ہکلانے کے سے انداز میں بولا۔

"یہ وہی ہے ایاز نائک جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔" نازیہ نے جواب دیا۔ "بس اتنا فرق ہے کہ آہنی زنجیروں کے بجائے ریشمی ڈوری ہے لیکن ان کی گرفت بھی اتنی مضبوط ہے کہ تم نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ میرے منہ سے ایاز نائک سن کر تم چونک گئے ہو۔ بالکل اسی طرح کل رات میں بھی چونکی تھی۔ تمہارے جسم کے بعض نشانات نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم ہی ایاز نائک ہو۔"

عامر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

نازیہ بولتی رہی۔ "ایک خاص چیز کے چند قطرے میں نے تمہارے گلاس میں ڈال دیے تھے جنہوں نے تمہیں دو گھنٹے تک گہری نیند سلائے رکھا۔ میں کل رات ہی یہ اس وقت کرگزرتی جب تم نے جانے سے پہلے ایک پیگ اور پیا تھا۔"

"اس طرح..." عامر پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ "تم چاہتی کیا ہو۔ جب تم... جان چکی ہو کہ میں ایم این اے ہوں... تو... تمہیں یہ اندازہ بھی لگا لینا چاہیے کہ تمہیں یہ سب کچھ مہنگا پڑ سکتا ہے۔"

"بہت مہنگا سودا تو تم نے کیا تھا عامر! جب تم نے مجھے بے آبرو کیا تھا۔" نازیہ مشتعل سے لہجے میں بولی۔ "آج مجھے وہ سب حساب بے باق کرنا ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم ایاز نائک کیسے بن گئے؟"

عامر اسے گھورتا رہا۔

"کیا یہ چھوٹی موٹی باتیں جاننے کے لیے بھی مجھے تم پر تشدد کرنا پڑے گا؟" نازیہ بولی۔

عامر بدستور اسے گھورتا رہا۔ نازیہ نے کہیں سے ایک ماچس اٹھائی اور اس کی ایک تیلی سلگاتے ہوئے بولی۔ "اس سے میں تمہارے کان کی لو جلا دوں گی اگر تم جواب نہیں دو گے۔"

"میں چیخنا شروع کر دوں گا۔" عامر کچھ زور سے بولا۔ "تمہارے ملازمین جمع ہو جائیں گے۔"

نازیہ زہریلے انداز میں ہنسی۔ "کوئی نہیں آئے گا یہاں۔ ان سب کو میں نے اس لکویڈ کے زیادہ قطرے پلا دیے ہیں۔ وہ صبح تک سوتے رہیں گے اور یہ بنگلا بہت بڑا ہے۔ تمہاری چیخ پکار کی آوازیں بنگلے کے باہر بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں گی۔"

اتنی دیر میں ماچس کی تیلی اتنی جل چکی تھی کہ اس کی تپش نازیہ کو اپنی انگلیوں پر محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے وہ تیلی تپائی پر رکھے ہوئے ایش ٹرے میں ڈال دی۔ پھر عامر کے قریب پہنچ کر دوسری تیلی نکالتے ہوئے بولی۔ "جواب دو گے یا میں دوسری تیلی سلگاؤں؟"

"مجھے اپنا نام پسند نہیں تھا۔" عامر نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈیڑھ سال پہلے میں نے اپنا نام بدل لیا تھا۔"

"مدت کا علم تو مجھے ہو چکا ہے۔ میں نے تمہارا شناختی کارڈ دیکھ لیا ہے۔ اس پر تمہارا نیا نام، تصویر اور ڈیڑھ سال پہلے کی تاریخ ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ تم نے اپنا نام کیوں بدلا؟"

"پہلا نام مجھے پسند نہیں تھا۔ بتا تو چکا ہوں۔"

"اچھا۔" نازیہ اطمینان سے بولی۔ "اب مجھے ان تصویروں کے بارے میں بتاؤ جو تم نے بھیجی تھیں۔ وہ ڈیجیٹل کیمرے سے کھینچی تھیں نا؟"

"ہاں۔" عامر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اپنے کمپیوٹر میں ڈال کر اس کے پرنٹ نکالے ہوں گے؟"

"ہاں۔"

"کمپیوٹر اور کیمرا کہاں ہیں؟"

عامر خاموش رہا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

"بتاؤ؟" نازیہ سخت لہجے میں بولی۔

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔" عامر نے اپنے لہجے میں مضبوطی لانے کی کوشش کی۔ "وہ تمہیں نہیں مل سکتے۔"

"تمہارے تو فرشتے بھی بتائیں گے کہ وہ کہاں ہیں؟" نازیہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ایک دراز کھول کر اس میں سے تیز دھار چاقو نکالا۔

"تم مجھے نہیں مار سکتیں؟" عامر ہذیانی انداز میں چیخ پڑا۔

"اور زور سے چیخو... بلکہ ابھی چیخو گے۔" نازیہ اس کے سر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ دائیں ہاتھ سے چاقو سنبھالتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے عامر کے کان کی لو پکڑی۔

"کیا... کیا کر رہی ہو؟" عامر گھبرا کر ہانپنے لگا۔

"تمہارے کان کی لو کاٹوں گی۔"

"نہیں۔" عامر پھر چیخ پڑا۔ "تم اتنی سفاک نہیں ہو سکتیں۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے ثابت ہو گیا کہ نازیہ اب سفاکی پر اتر آئی تھی۔ چاقو کے ایک جھٹکے سے عامر کے کان کی لو الگ ہو گئی۔

عامر بڑے زور سے چیخا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا... ابھی اور چیخو گے۔" نازیہ نے کان کی لو بستر پر ہی ڈال دی۔ عامر کے کان سے بہتا ہوا خون تکیہ رنگین کرنے لگا۔ اس کے چہرے سے شدید تکلیف ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس نے دانت پر دانت جما لیے۔

نازیہ بستر کے گرد گھوم کر عامر کے سر کی دوسری

جانب آ گئی۔

"بتاتے ہو یا نہیں؟"

"نہیں۔" عامر بری طرح ہانپنے لگا۔ "اسی کے ذریعے تو میں انتقام لوں گا تم سے۔"

"انتقام لینے کے قابل ہی نہیں رہو گے تم عامر۔" نازیہ نے دانت پیستے ہوئے اس کے دوسرے کان کی لو پکڑی۔ "یہ میں جھٹکے سے نہیں کاٹوں گی... آہستہ آہستہ... بہت دھیرے دھیرے... تمہاری چیخیں سن کر مجھے بہت سکون ملے گا عامر!"

"نہیں نازیہ... نہیں... ایسا مت کرو... دیکھو..." اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ نازیہ نے اس کے کان کی لو پر چاقو پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ خون کے قطرے اس کے ہاتھ پر گرنے لگے۔

"چیخو عامر! چیخو... چیختے رہو۔" نازیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں بھی چیختی رہی تھی، روتی رہی تھی... لیکن تم وہ سب کچھ کر کے رہے تھے جو تمہیں کرنا تھا... اور آج میری باری آئی ہے۔"

کان کی لو دھیرے دھیرے کٹتی رہی۔ عامر نے اب سختی سے دانت پر دانت جما لیے۔ وہ چیخنے کے بجائے تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مردانگی دکھاؤ گے؟" نازیہ نے کان کی باقی لو ایک جھٹکے سے اڑا دی۔ عامر نے آنکھیں بھینچ لیں۔ اس کے چہرے پر اب پسینا آ چکا تھا۔

"اب۔" نازیہ کے چہرے پر وحشت برسنے لگی تھی۔ "بتا دو عامر ورنہ اب میں تمہارا پورا کان کاٹوں گی... پھر بھی نہیں بتاؤ گے تو دوسرا کان کاٹوں گی... تمہاری زبان کھلنے تک اس چاقو کی پیاس نہیں بجھے گی۔ دوسرے کان کے بعد میں تمہارے ایک گال سے بوٹی اڑاؤں گی... پھر دوسرے گال سے اڑاؤں گی... میں تمہارے جسم کا ہر عضو کاٹ پھینکوں گی اگر تم نے مجھے جواب نہیں دیا۔"

بے بسی یا تکلیف کے احساس سے اب عامر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ چہرہ اب پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

پھر جیسے ہی نازیہ نے چاقو کی دھار اس کے کان پر رکھی، وہ چیخ پڑا۔ "بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔"

نازیہ نے اس کے کان سے چاقو ہٹا لیا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

سرداریاں

ایک آدمی سردار جی سے: "سردار جی! آپ کو کبھی کسی سے پیار ہوا؟"

سردار جی: "ہاں یار، پر وہ مانتی ہی نہیں۔"

آدمی: کیا کہتی ہے؟"

سردار جی: "کہتی ہے I LOVE YOU 2۔ پتا نہیں یہ دوسرا کمینہ کون ہے۔"

☆☆☆

ایک سردار آئینہ دیکھ کر سوچنے لگا یار اس کو کہیں دیکھا ہے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد "او لکھ (لاکھ) لعنت، یہ تو وہی ہے جو اس دن میرے ساتھ بال کٹوا رہا تھا۔"

☆☆☆

سردار کو ایس ایم ایس آیا "اگر تو ذہین ہے تو 200 کا بیلنس بھیج، ہوشیار ہے تو 300 کا بھیج۔" سردار نے 500 کا بھیجا اور لکھا۔ "ہم ذہین بھی ہے اور ہوشیار بھی ہے۔"

(فہد علی جنجوعہ کا، کوٹلی آزاد کشمیر سے انتخاب)

☆☆☆

پانچ سردار اور ایک پٹھان ہیلی کاپٹر کی رسی سے لٹک رہے تھے۔ پائلٹ نے کہا۔ "لوڈ زیادہ ہو گیا ہے اس لیے کسی ایک کو کودنا ہوگا۔" پٹھان نے کہا۔ "یہ قربانی میں دوں گا۔" یہ سن کر سارے سردار تالیاں بجانے لگے۔

☆☆☆

ایک دفعہ ایک سردار ڈاکٹر کے پاس گیا۔

"ڈاکٹر: سردار جی آپ کے گردے فیل ہو گئے ہیں۔"

سردار: "ہاہاہا... کیا مذاق کر رہے ہو میرے گردے تو کبھی اسکول ہی نہیں گئے۔"

(علی پور مظفر گڑھ سے جاوید شبیر بربرہ کا تعاون)

"میرے گھر پر ہیں دونوں چیزیں۔" عامر کی آواز سے بھی اب تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"کس گھر پر؟" نازیہ نے پوچھا۔ "مجھے یقین ہے کہ جو تمہارا مستقل گھر ہے، وہاں نہیں ہوں گی یہ دونوں چیزیں۔ اپنی عیاشی کے لیے تم نے کوئی اور گھر لے رکھا ہو گا۔ تمہارے مستقل گھر پر تو سیکیورٹی کے لوگ ہوتے ہوں گے۔ میرے پاس تو تم ان لوگوں سے چھپ کر آئے ہو گے۔ کوئی ایسا دروازہ استعمال کیا ہو گا جو عام طور پر استعمال نہیں ہوتا ہو گا۔"

عامر نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہاری عدم موجودگی میں بھی وہاں کوئی رہتا ہو گا؟" نازیہ بولی۔ "شاید وہی دونوں آدمی جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا یا شاید ان دونوں کے علاوہ بھی۔"

عامر نے پھر سر ہلا دیا۔

"نیلے سوٹ والے کا نام کیا ہے؟" نازیہ نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے آدمیوں میں سب سے اہم ہو گا؟"

عامر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی سی آواز میں نام بتایا۔

"ہاں۔" نازیہ نے ایک جانب رکھا ہوا عامر کا موبائل اٹھایا۔ "یہ نام اور اس کا نمبر فیڈ ہے اس میں... میں تمہارا موبائل چیک کر چکی ہوں۔ اب تمہیں یہ کرنا ہے عامر کہ تم طالش سے وہ دونوں چیزیں منگواؤ گے۔ کہاں منگواؤ گے؟... یہ میں ذرا دیر بعد بتاتی ہوں۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا وہ دوسرا بنگلا کہاں ہے؟"

عامر اب ہتھیار ڈال چکا تھا۔ اس نے پتا بتایا۔

نازیہ نے سر ہلا کر اپنا موبائل نکالا اور ثاقب سے رابطہ کیا۔ ثاقب نے کئی گھنٹیوں کے بعد ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو" کہتے وقت اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ غالباً اس نے اسکرین پر بھی نظر نہیں ڈالی تھی ورنہ اسے معلوم ہو جاتا کہ کال کس کی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اس وقت جگا دیا۔" نازیہ بولی۔

"اوہ، تم۔"

"مجھے تم سے اسی وقت ایک کام ہے۔ اپنے گھر سے نکلنا ہو گا تمہیں۔"

"تین بج چکے ہیں نازیہ۔"

"مجھے بھی معلوم ہے۔ کیا اس وقت تم میری خاطر گھر سے نہیں نکل سکتے؟"

"کیوں نہیں نازیہ... کیوں نہیں۔ کیا تمہارے گھر آؤں؟"

"ہاں آنا تو یہیں ہے لیکن اس سے پہلے ایک اور جگہ بھی جانا ہے۔ تم باہر نکلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں دس منٹ بعد تمہیں پھر فون کروں گی۔"

"آخر معاملہ کیا ہے؟ تم نے تو پریشان کر دیا مجھے۔"

"جب میرے پاس آؤ گے تو سب کچھ جان لو گے۔"

نازیہ نے رابطہ منقطع کیا۔ "اب میں تمہارے موبائل سے طالش کا نمبر ملاتی ہوں۔" اس نے عامر سے کہا۔ "اس سے کہو کہ وہ تمہارا کمپیوٹر... نہیں... کمپیوٹر نہیں... تم نے اپنے گھر سے الگ ایک جگہ لے رکھی ہے اس لیے لیپ ٹاپ استعمال کرتے ہو گے... جھوٹ مت بولنا عامر! دونوں چیزیں یہاں آنے کے بعد میں انہیں چیک تو کروں گی۔ مجھے معلوم ہو جائے گا کہ میری تصویریں اس میں ہیں یا نہیں۔ لیپ ٹاپ ہے نا؟"

عامر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

نازیہ بولی۔ "وہ بھی سو رہا ہو گا لیکن گھنٹی تو اسے بھی جگائے گی۔ اس سے کہو کہ وہ لیپ ٹاپ اور ڈیجیٹل کیمرا لے کر..." نازیہ نے رک کر کچھ سوچا، پھر ایک جگہ کا نام لے کر بولی۔ "یہاں تک پہنچنے میں اسے آدھا گھنٹا لگ سکتا ہے۔ اور ہاں... اس سے بات کرتے ہوئے تمہیں اپنی تکلیف پوری طرح ضبط کرنا ہو گی۔ اگر اسے تمہاری آواز سے کسی قسم کا شبہ ہو گیا اور میرا کھیل بگڑا تو پھر... میں قسم کھا کر کہتی ہوں عامر! میں تمہیں مرنے تو نہیں دوں گی لیکن تمہارے جسم کی بہت سی بوٹیاں اس کمرے میں بکھری ہوئی ہوں گی۔"

عامر اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ وہ تکلیف ضبط کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کان سے بہتا ہوا خون سارا تکیہ سرخ کر چکا تھا۔

نازیہ نے اسے ثاقب کی کار کا نمبر بتا کر کہا۔ "طالش دونوں چیزیں اس کار میں موجود شخص کو دے کر خاموشی سے واپس چلا جائے۔ کسی قسم کی بات کرنا قطعی غیر ضروری ہو گا۔"

عامر کے چہرے سے شکست خوردگی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد نازیہ ڈرائنگ روم میں تھی۔ ثاقب دونوں چیزیں لے آیا تھا۔ گھبرائی ہوئی سی رخشی بھی آگئی تھی۔ اسے ثاقب نے فون کر دیا تھا لیکن اسے آنے میں کچھ دیر لگی تھی۔ وہ اور ثاقب تقریباً آگے پیچھے آئے تھے۔

"یہ پیچ کش وغیرہ کا پیکٹ ہے۔" نازیہ نے ثاقب سے کہا۔ "لیپ ٹاپ سے اس کی ہارڈ ڈسک نکال کر کسی طرح بھی برباد کر دو۔"

"آخر چکر کیا ہے نازو؟" رخشی پریشانی سے بولی۔

"یہ بھی اچھا ہوا کہ ثاقب نے تمہیں فون کر دیا۔ تم بھی آگئیں۔ ذرا دیر بعد تم بھی سب کچھ جان لوگی۔"

نازیہ اپنے ہاتھ دھو کر وہاں آئی تھی۔ ورنہ خون آلود ہاتھ رخشی اور ثاقب کو بہت زیادہ پریشان کر دیتے۔

نازیہ نے ڈیجیٹل کیمرے کی میموری بھی ختم کی اور میموری کارڈ بھی ضائع کر دیا۔

قریب ہی ایک وزنی ہتھوڑا بھی رکھا تھا۔ نازیہ ہی وہ اسٹور سے نکال کر لائی تھی۔ لیپ ٹاپ کی ہارڈ ڈسک برباد کرنے کے لیے ہتھوڑے کی شاید ایک ضرب ہی کافی ہوتی لیکن نازیہ نے وحشیانہ انداز میں اس پر کئی ضربیں لگا دیں۔

رخشی اور ثاقب اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"اب۔" نازیہ نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب میں بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔ تم دونوں یہیں بیٹھو۔ جلد ہی تم دونوں کو میرے کمرے میں آنا ہو گا۔ پھر سب کچھ معلوم ہو جائے گا تمہیں۔"

رخشی اور ثاقب نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

نازیہ اپنا موبائل نکال کر کسی سے رابطہ کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"کیا معاملہ ہے یہ رخشی؟" ثاقب پریشان لہجے میں بولا۔

"تمہیں کچھ نہیں معلوم تو مجھے کیا معلوم ہو گا لیکن جو معاملہ بھی ہے، وہ ہے بہت غیر معمولی... کیسی وحشت برس رہی ہے نازیہ کے چہرے پر۔"

نازیہ ان دونوں کی باتوں سے بے خبر اپنی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ جاتے وقت وہ عامر کے منہ میں کپڑا اٹھونس گئی تھی۔ اب وہ کپڑا نکالتی ہوئی بولی۔ "میں تمہارا منہ اس لیے بند کر گئی تھی کہ میری عدم موجودگی میں اگر تم چیخو تو تمہاری آواز ڈرائنگ روم تک نہ چلی جائے جہاں میرے دوست موجود ہیں۔ انہیں ابھی تمہارے بارے میں کچھ علم نہیں لیکن اب ہو جائے گا جب وہ تمہاری چیخیں سنیں گے۔"

"کیا... کیا مطلب؟" عامر ہکلایا۔

"اب میں تمہیں گولی مار کر ہلاک کروں گی عامر۔"

عامر گڑگڑانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ لیپ ٹاپ اور کیمرا ملنے کے بعد نازیہ اسے چھوڑ دے گی۔

"میں تمہیں زندہ کیسے چھوڑ سکتی ہوں عامر؟" نازیہ نے ایک طرف رکھا ہوا چاقو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے بھی تو مجھے قتل کیا ہے اور دو مرتبہ قتل کیا ہے۔ ایک مرتبہ زبردستی اور دوسری مرتبہ کل... لیکن کل میں اپنی خوشی سے قتل ہوئی تھی... میں ایاز نائک سے انتقام لینے کے لیے اپنی خوشی سے قتل ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ تم ہی ایاز نائک ہو۔"

عامر کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"لیکن..." نازیہ اس کے قریب پہنچ کر بولی۔ "تمہیں گولی مارنے سے پہلے میں تمہارے جسم کی بہت سی بوٹیاں کاٹوں گی۔ میں تمہاری چیخیں سننا چاہتی ہوں عامر! ایک رات میری چیخیں تمہارے بنگلے میں گونجی تھیں، آج تمہاری چیخیں میرے گھر میں گونجیں گی۔" خاموش ہوتے ہی اس نے چاقو عامر کے گال میں گھونپ دیا۔ عامر کی چیخ بڑی کریہہ تھی، پھر اس کی اس سے زیادہ کریہہ چیخ اس وقت نکلی جب نازیہ نے چاقو کو جھٹکا دیا۔ چاقو کی دھار عامر کے منہ سے باہر آئی اور اس کا گال لٹک گیا۔ اس کے دانتوں کی قطار نظر آنے لگی۔

چاقو پھر حرکت میں آیا اور عامر کے سینے کی ایک بوٹی اڑ گئی۔ نازیہ پر دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ اس کا ہاتھ بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ عامر کے جسم کے مختلف حصوں سے بوٹیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کا خون اچھل کر نازیہ کے چہرے اور اس کے کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا اور عامر کی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نازیہ نہیں سن سکی۔ ثاقب اور رخشی دوڑتے ہوئے دروازے تک آگئے تھے۔ انہوں نے عامر کی چیخیں یقیناً سنی ہوں گی۔

نازیہ نے خواب گاہ میں آنے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

"نازو!" رخشی کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے نازو؟"

''سب ٹھیک ہورہا ہے رخشی۔'' نازیہ نے عامر کے بازو کی ایک بوٹی اڑاتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''جو چیخیں تم اور ثاقب سن رہے ہو، یہ ایاز نائک کی چیخیں ہیں۔''

نازیہ کا سارا بستر خون میں ڈوب چکا تھا۔

''نازیہ... نازیہ...! یہ کیا کررہی ہو تم؟'' ثاقب کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ دونوں اب زور زور سے دروازہ بھی پیٹ رہے تھے۔

نازیہ دیوانوں کی طرح عامر کے جسم سے بوٹیاں اڑاتی اور اس کی چیخیں سنتی رہی۔ پھر یک بہ یک چیخیں رک گئیں۔ نازیہ نے چونک کر دیکھا۔ عامر کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ جسم کی تڑپ بھی رک گئی تھی لیکن سینے کے پھولنے پچکنے سے ظاہر ہورہا تھا کہ عامر کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف بے ہوش ہوا تھا۔

''بدبخت!'' نازیہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ''چپ ہوگیا کمینہ!''

پھر اس نے چاقو پھینک کر اپنا ریوالور نکالا۔ اس نے پے در پے دو گولیاں عامر کے سینے پر داغیں، پھر اس کے قریب گئی اور ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔

عامر ٹھنڈا ہوگیا۔ ایک دردناک موت... ایک اذیت ناک موت اس کا مقدر بن چکی تھی۔

''نازو... نازو!'' رخشی چیخے جارہی تھی۔

نازیہ دروازے کی طرف اس طرح بڑھی جیسے خواب میں چل رہی ہو لیکن ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے دروازے کا بولٹ کھولا اور پیچھے ہٹی۔ رخشی اور ثاقب تیزی سے اندر آئے اور پھر جیسے سکتے میں رہ گئے۔

کمرے کا منظر ان کے لیے کریہہ تھا اور بھیانک بھی... ہر طرف عامر کی بوٹیاں بکھری ہوئی تھیں۔ خون کے چھینٹے بھی ہر طرف نظر آرہے تھے۔ خود نازیہ کا لباس بھی خون کے دھبوں سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ خون میں ڈوبے ہوئے تھے اور چہرہ بھی عامر کے خون سے رنگا ہوا تھا۔

عامر کی لاش نازیہ کے خون میں ڈوبے ہوئے بستر پر پڑی تھی۔ نازیہ کا انتقام پورا ہوچکا تھا۔ ایک عورت کا انتقام جو ''زخمی'' ہوکر ناگن بن گئی تھی۔

''یہ تم نے کیا کردیا نازو؟'' رخشی پھٹی پھٹی سی آواز میں بولی۔

نازیہ اس سے کچھ کہنے کے بجائے ثاقب کی طرف دیکھتی ہوئی مسکرائی۔

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا ثاقب!''

ثاقب کچھ کہنے کے بجائے اس کی طرف تکتا رہ گیا۔

''اور آج...'' نازیہ پھر بولی۔ ''آج پہلی مرتبہ مجھے احساس ہورہا ہے کہ میں نے تمہاری محبت کی قدر نہ کر کے غلطی کی تھی۔''

اس وقت سائرن کی آواز قریب آتی سنائی دی۔

''پولیس آرہی ہے۔'' نازیہ ثاقب کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ''میں نے ہی فون کیا تھا پولیس کو جب ڈرائنگ روم سے نکل رہی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں پولیس کے آنے تک اپنا کام مکمل کرلوں گی۔ اب وقت ختم ہوچکا ثاقب! پولیس کے اندر آنے سے پہلے مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ میں... نہ جانے کیوں... تمہاری آغوش میں مرنا چاہتی ہوں۔''

ثاقب اب تک سکتے کے عالم میں تھا۔ نازیہ خود ہی اس سے لپٹ گئی۔ اس وقت ثاقب چونکا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے نازیہ کو اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔

''بہت اچھا لگا ثاقب! بہت اچھا لگا۔'' نازیہ کی آواز میں مسرت تھی۔ ''میں تمہیں اپنا لیتی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں اس قابل نہیں رہی تھی ثاقب کہ اپنا آپ تمہیں سونپتی۔ مجھے تو یہ ظالم روند چکا ہے جس کی لاش تم دیکھ رہے ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ اس قتل کی پاداش میں اپنی زندگی جیل میں کاٹوں۔ بس اسی لیے تمہاری آغوش میں اپنی جان دے رہی ہوں۔''

گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ نازیہ نے ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹریگر دبایا تھا۔

''نازو!'' رخشی چیخ کر جھپٹی۔

نازیہ کے ہاتھ سے ریوالور گر چکا تھا اور اس کی لاش ثاقب کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔

پولیس جب اس کمرے میں پہنچی تو ثاقب فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ نازیہ کی لاش فرش پر تھی۔ اس کا سر ثاقب کے زانو پر رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی رخشی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

شاطر

تنویر ریاض

ہر مجرم کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو... کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے... ایک عرصے تک گولہ بارود کی گھن گرج میں رہنے والے ویت نامیوں کی زندگی پر اس جنگ کے مضمر اثرات اب تک طاری ہیں... ویت نام کی گلیوں میں پروان چڑھتی کہانی کے اسرار و رموز... جو آپ کو تاریخ میں لے جائیں گے... اور لمحہ بہ لمحہ اپنی گرفت میں قید کرتے چلے جائیں گے...

اس شاطر کھلاڑی کا خونی کھیل جس نے کبھی کسی محاذ پر مات نہیں کھائی تھی

مجھے اپنے آپ کو یقین دلانا مشکل ہورہا تھا کہ وہ گم ہوگئی ہے۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا نیچے گلی میں دیکھ رہا تھا۔ میری نظر ایک درمیانی عمر کے ویت نامی پر گئی جو نقلی نوٹ جلا کر ان کی راکھ ایک ٹین کے ڈبے میں ڈال رہا تھا۔ یہ ویت نامیوں کا رواج تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے روزانہ صبح کے وقت یہ عمل کیا کرتے تھے۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد مجھے یہاں کے بارے میں اور بھی کئی سچائیوں کو قبول کرنا پڑا جو یہاں کے لوگوں کے مزاج کا

حصہ تھیں۔ مثلاً اپنے آپ کو دھوکا دینا، پریشان ہونا، غصہ کرنا اور ہر بات کی نفی کرنا۔ مجھے یہاں آئے صرف دو دن ہوئے تھے اور میں یہاں بالکل اجنبی تھا اس لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی تلاش کرنے کا آغاز کہاں سے کروں۔ اس کے لیے مجھے کسی ماہر کی ضرورت تھی اور اس کام کے لیے نیٹ برگ سے زیادہ موزوں شخص کون ہوسکتا تھا۔ وہ ہنوئی کے چپّے چپّے سے واقف تھا اور بلاگ پر اس بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔ میں نے حال ہی میں اس کی دی ہوئی معلومات پر اپنی رائے دی تھی جس کے بعد ہمارے درمیان بات چیت شروع ہوگئی۔ وہ یہاں پانچ سال سے مقیم تھا اور اپنے آبائی شہر شکاگو سے زیادہ یہاں کے بارے میں جانتا تھا۔

میں نے اسے پیغام دے کر کے اپنے مسئلے کے بارے میں مختصراً بتایا اور توقع ظاہر کی کہ وہ اس معاملے میں میری مدد کرے گا۔ میری توقع کے برعکس فوراً ہی اس کی ای میل آگئی۔ وہ اس رات میرے مسئلے کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ہنوئی رائل سٹی میں اپنا پروگرام ختم کرنے کے بعد مجھ سے بات کرے گا۔ ابھی اس ملاقات میں کئی گھنٹے باقی تھے لہٰذا میں لیٹ کر اپنی دوست کے بارے میں سوچنے لگا کہ نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ذہن میں بُرے بُرے خیالات آرہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعا مانگی اور آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

ہنوئی رائل سٹی ایک نسبتاً نیا کلب تھا اور ہنوئی کے لوگوں کے لیے اسے ایک عجوبہ ہی کہا جاسکتا تھا۔ عام دنوں میں کرفیو کے سبب دس بجے بند ہوجاتا لیکن ہفتے کی رات دو بجے تک کھلا رہتا۔ موسیقی کے رسیا یہاں آکر اپنی پسندیدہ دھنوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ یہاں مختلف بینڈز اور کچھ مقامی گروپ اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جس کی دیواروں پر ماہرانہ انداز میں تصویر کشی کی گئی تھی۔

میں نے اس سے پہلے نیٹ برگ کو کوئی ساز بجاتے نہیں دیکھا لیکن اس وقت وہ بگل بجا رہا تھا۔ میں اس شخص کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ دیکھنے میں ایک غلیظ بھوکا بلا معلوم ہورہا تھا جس کے ہاتھ چاندی کا کھلونا لگ گیا ہو۔ اس کے بال لمبے اور گھنگرالے تھے اور مدھم روشنی میں بھی صاف نظر آرہا تھا کہ اس نے کئی روز سے شیو نہیں بنایا ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس نے پی رکھی تھی۔

اس جگہ کسی کے لیے جاز بجانا ایک غیر معمولی بات تھی البتہ اس بینڈ میں ایک گنجا شخص ڈرم بجا رہا تھا جبکہ دوسرا کی بورڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے لوگوں سے داد وصول کی اور ایک پراسرار عقبی دروازے سے غائب ہوگئے۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں نیٹ برگ بھی ان لوگوں کے ساتھ نہ چلا جائے۔ کیا پتا اسے یاد بھی نہ رہا ہو کہ اس نے مجھے یہاں بلایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈرم والا اور اس کا ساتھی اپنا سامان ایک ٹیکسی میں رکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھ کر چلّانا اور ہاتھ ہلانا شروع کردیا۔ وہ سمجھے کہ میں کوئی پاگل ہوں۔ میں نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”واہ ..... کیا شاندار شو تھا؟“

”شکریہ۔“ ڈرم والے نے بیزاری سے کہا۔

میں نے اس سے نیٹ برگ کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہال کے ایک کونے کی جانب اشارہ کردیا جہاں لوگوں کا ایک بڑا گروپ بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسی طرف چلا گیا۔ وہ سب نشے میں دھت معلوم ہورہے تھے۔ میری نظر نیٹ پر گئی جو ایک خوب صورت لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ وہ لڑکی اس سے کافی بے تکلف معلوم ہورہی تھی جبکہ باقی لوگ بڑی فحش گفتگو کررہے تھے۔ مجھے دخل اندازی کرنا مناسب نہ لگا اور میں کچھ فاصلے پر سگریٹ سلگا کر کھڑا ہوگیا البتہ میری نظریں انہی لوگوں پر جمی رہیں کہ کہیں نیٹ اٹھ کر نہ چل دے۔ سگریٹ ختم ہوگیا تو میں نے بھی بیزار ہوکر وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں قدم آگے بڑھاتا، نیٹ اچانک ہی میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تم یقیناً براؤن اسٹین ہو؟ میرا نام نیٹ برگ ہے۔“

مجھے حیرت ہورہی تھی کہ وہ اتنی جلدی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس کیسے آگیا۔ میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں خود اپنا تعارف کروانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے تمہاری محفل میں دخل اندازی مناسب نہ سمجھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، یہ فوری نوعیت کا معاملہ ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم اپنی دوست کی گمشدگی کے بارے میں کیا جانتے ہو اور اب تک تم نے اس کی تلاش کے سلسلے میں کیا اقدامات کیے؟“

اس نے قریبی میز سے دو کرسیاں گھسیٹیں اور مجھے

ایک سگریٹ پیش کرنے کے بعد میری کہانی شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیا اور بولا۔ ”میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ میں غیر ضروری ردِعمل کا مظاہرہ کررہا ہوں۔ جب میں اس کی گمشدگی کی اطلاع دینے سفارت خانے گیا تو انہوں نے مجھ سے یہی بات کہی تھی حالانکہ میرا اس سے کوئی خونی یا روحانی رشتہ نہیں اور نہ ہی میں نے اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس کے باوجود میری پریشانی فطری ہے۔ سفارت خانے والوں کا کہنا تھا کہ مجھے انتظار کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود ہی کہیں چلی گئی ہو۔ انہوں نے میری درخواست لے لی اور یقین دلایا کہ اس کے پاسپورٹ نمبر سے پتا چل جائے گا کہ وہ کس ہاسٹل میں مقیم ہے۔“

اس نے غور سے میری بات سنی اور بولا۔ ”گویا تم ان کی بات سے متفق نہیں ہو کہ وہ خود ہی کہیں چلی گئی ہے... کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہانی کی کڑیاں تلاش کرنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ واقعات کو اسی ترتیب سے بیان کروں جس طرح وہ پیش آئے تھے۔ پھر میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”جونا اینڈرسن نے چھ ماہ پہلے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس نے واڈکا میں خواب آور گولیاں ملا کر پوری بوتل حلق میں اتار لی اور اپنی گاڑی ایک درخت سے ٹکرا دی۔ بقول اس کے وہ زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ درخت سے ٹکرانے کی وجہ سے اسے زور کا چکر آیا اور متلی ہونے لگی۔ میں گزشتہ دو سال سے اپنے آبائی شہر میں نہیں ہوں اور اس نے بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنی زندگی سے کیوں اتنی زیادہ غیر مطمئن ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جنہیں کسی کام سے رغبت نہیں ہوتی۔ ہائی اسکول کے زمانے سے ہی وہ ایسی ہے اور اس نے پہلے بھی چند مرتبہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”اس سے پہلے اس نے خودکشی کے لیے کیا طریقے استعمال کیے؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس نے حقیقت میں ایسی کوشش کی تھی یا محض لوگوں کی توجہ حاصل کرنا چاہ رہی تھی؟“

”ایک مرتبہ اس نے بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھالیں۔ دوسری بار اپنی کلائی کاٹ لی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس نے حقیقت میں یہ کوشش کی تھی لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ بہت حساس لڑکی ہے۔ کار والے واقعے کو چھ ماہ ہوچکے ہیں۔ وہ کچھ عرصے اسپتال میں رہی اور صحت یاب ہونے کے بعد گھر واپس آگئی۔ میرا ایک ماہ پہلے اس سے انٹرنیٹ پر رابطہ ہوا تھا۔ میں نے اسے زندہ بچ جانے پر مبارک باد دی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی زندگی بدلنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے اپنے والدین سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کردیا جن سے اس کے تعلقات ایک عرصے سے کشیدہ چلے آرہے تھے۔ اس نے اپنی ملازمت بھی چھوڑ دی اور دنیا کی سیاحت کے لیے نکل پڑی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ کچھ عرصے میرے پاس قیام کرسکتی ہے؟ تو میں نے رضامندی ظاہر کردی۔ ایک مہینے بعد وہ اپنے سفری سامان اور دلکش مسکراہٹ کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔“

”اس کے پاس سفر کے لیے رقم کہاں سے آئی؟“ نیٹ نے پوچھا۔

”اچھا سوال ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے والدین پیسے والے ہیں۔ باپ ماہر نفسیات اور ماں فیملی ڈاکٹر ہے تاہم اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ والدین سے مالی مدد نہ لینے کا تہیہ کرچکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی بچت میں سے یہ اخراجات پورے کررہی ہے۔“

”کیا تم نے اس کے والدین کو اس کی گمشدگی کے بارے میں بتادیا؟“

”ہاں، وہ اس کے بارے میں پریشان تھے لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ایسی حرکتیں کرتی رہتی ہے۔ سفارت خانے والوں کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ کسی بھی وقت منظرِ عام پر آجائے گی۔“

”لیکن تم اس کے برعکس سوچ رہے ہو؟“ نیٹ نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ بہت زیادہ خوش تھی اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت یہاں سے جاسکتی ہے لیکن وہ دو ہفتے سے یہاں رہ رہی تھی اور اسے یہ جگہ پسند آگئی تھی۔“

”تم ایسا کیوں سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں بتائے بغیر کہیں نہیں جاسکتی؟“

”میں تمہیں گزشتہ چند روز میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اس سے تمہیں میرے دعوے کی سچائی کا اندازہ ہوجائے گا۔ یہاں آنے کے ایک ہفتے بعد ہی وہ اس جگہ کو پسند کرنے لگی تھی۔ فرانسیسی طرز کی عمارتیں، پام کے درخت، پھول، یہاں کے کھانے اور لوگوں کا طرزِ زندگی..... ان سب باتوں نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہاں پر ٹیچر کے طور پر ملازمت کرنا چاہتی ہے چنانچہ میں نے اس کے لیے بھاگ

دوڑ کی۔ آج صبح بھی اسے ایک انٹرویو کے لیے جانا تھا اور وہ اس بارے میں بہت پُرجوش تھی۔ مجھے شک ہے کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ ویسے بھی وہ گزشتہ چند روز سے بہت زیادہ گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔"

"ممکن ہے کہ اس کی کوئی ذاتی وجہ ہو؟"

"نہیں، یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی سے خوف زدہ ہے۔ اس نے ہوٹلوں میں جانا چھوڑ دیا تھا اور صرف گھر کے قریب واقع ڈھابے تک چلی جاتی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ گھر کے اندر وہ خوش وخرم نظر آتی اور گھر سے باہر نکلتے ہی اس کی کیفیت بدل جاتی۔"

"کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

"نہیں، وہ میرے لیے بہن جیسی ہے۔"

"کیا وہ بھی تمہیں اسی نظر سے دیکھتی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کے دل میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی میں نے اس کی کسی حرکت سے اندازہ لگایا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم مجھے اس کی گمشدگی کے بارے میں بتاؤ۔"

"بدھ کی سہ پہر اس نے مجھے بتایا کہ وہ رات کے کھانے پر میرے لیے کوئی خاص ڈش بنانا چاہتی ہے۔ جب میں کام سے واپس آیا تو وہ گھر پر موجود نہیں تھی لیکن فریج مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا جو وہ کھانا بنانے کے لیے بازار سے لے کر آئی تھی۔ فریج پر ایک پرچہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ کھانا سات بجے تک تیار ہوجائے گا اور وہ وائن لینے بازار جارہی ہے۔ اس بات کو ڈھائی دن گزر چکے ہیں اور ابھی تک اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ وہ جہاں جہاں جاسکتی تھی، میں نے ان سب سے معلوم کرلیا لیکن کسی کو بھی نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔"

"کیا اس کا سامان گھر میں موجود ہے؟"

"ہاں لیکن وہ اپنا پرس ساتھ لے گئی تھی۔"

"اور اس کا پاسپورٹ؟"

"ہاں، وہ عام طور پر پاسپورٹ اپنے ساتھ ہی رکھتی ہے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ پولیس کی پوچھ گچھ سے محفوظ رہ سکتی ہے۔"

"بظاہر تو یہ سب کچھ بہت پراسرار لگ رہا ہے۔" اس نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا بدھ والے دن کوئی ایسی غیر معمولی بات پیش آئی جس سے کچھ اندازہ لگایا جاسکے کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟"

"ہاں، صبح تین بجے کے قریب مجھے ایک نامعلوم نمبر سے فون موصول ہوا۔ جب میں نے ہیلو کہا تو دوسری جانب سے کوئی آواز نہ آئی۔ صرف اونچی آواز میں موسیقی کا شور سنائی دیا۔ اس کے بعد میں نے کئی بار کال بیک کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے فون نہیں اٹھایا اور اب تو وہ نمبر ہی بند ہوچکا ہے۔"

"کیا میں وہ نمبر دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے مجھ سے موبائل فون لے لیا اور کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہ نمبر کسی کاغذ پر لکھ لے گا لیکن اس کے بجائے اس نے بھویں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ "کیا وہ فیس بک پر ہے؟"

"ہاں۔"

"اوکے براؤن۔ فی الحال مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ اب تم گھر جاؤ اور تھوڑی سی نیند لے لو۔ رات دو بجے تمہیں میرے گھر آنا ہوگا۔ اپنے ساتھ جونا کا لیپ ٹاپ، اپنے پہننے کے لیے ایک فالتو جوڑا اور وائن کی بوتل لیتے آنا۔ میں تمہیں پتا سمجھائے دیتا ہوں۔"

☆☆☆

میں ٹھیک دو بجے نیٹ کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے مجھ پر تھکان طاری تھی۔ گھر جانے کے بعد میں اس گدے پر بیٹھا رہا جس پر جونا سویا کرتی تھی۔ میری نظریں اس امید پر چاروں طرف بھٹک رہی تھیں کہ شاید اس کی گمشدگی کے بارے میں کوئی سراغ مل جائے لیکن وہ جگہ بہت گندی ہورہی تھی۔ گدے کے چاروں طرف جوس کی آدھی خالی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔

میں نے تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے نیٹ کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائی۔ یہ اپارٹمنٹ شہر سے باہر کوئن مائی اسٹریٹ پر واقع تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو جب میں نے اس جگہ کا پتا بتایا تو وہ تھوڑا سا پریشان ہوگیا۔ غالباً سوچ رہا ہوگا کہ رات کے دو بجے مجھے اس دور دراز علاقے میں جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اندر لے گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے پہلا سوال بوتل کے بارے میں کیا جو میں نے اسے پکڑا دی۔ اس نے دو گلاس بنائے اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک گھونٹ لینے کے بعد لیپ ٹاپ مانگا اور میں نے دیکھا کہ یہ جان کر اس کے چہرے پر رونق آگئی کہ جونا ابھی تک فیس بک پر لاگ ان تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا

اگر میں لیپ ٹاپ میں کچھ تلاش کرنا چاہوں۔"

"نہیں بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔"

وہ پندرہ منٹ تک لیپ ٹاپ میں کھویا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر لیپ ٹاپ بند کیا اور بولا۔ "تم ایک منٹ بیٹھو۔ میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور فوراً ہی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی اور اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پوچھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں؟

"بھوتان۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ تم نے جو نامعلوم فون ریسیو کیا، وہ کسی شخص نے ویت نامی سم کے ذریعے بھوتان کلب سے کیا تھا۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"کیونکہ ہنوئی میں صرف تین کلب ہیں جو رات گئے تک کھلے رہتے ہیں اور بھوتان بھی انہی میں سے ایک ہے جو بدھ کی رات کو بھی تین بجے تک کھلا ہوا تھا کیونکہ یہ کافی مشہور کلب ہے۔ اس لیے میرا اندازہ ہے کہ وہ وہیں گئے ہوں گے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ کوئی مغربی شخص تھا؟"

"کیا تم نے فون نمبر پر غور کیا تھا؟ اس میں کئی چار کے ہندسے ہیں جنہیں یاد رکھنا بہت مشکل ہے جبکہ ویت نامی ایسے نمبر پسند کرتے ہیں جنہیں آسانی سے یاد رکھا جا سکے اور ان میں زیادہ تر تین، چھ یا نو کے ہندسے ہوں۔"

"ایک منٹ، تم نے کہا تھا گئے ہوں گے...."

"میں تمہیں بعد میں سمجھا دوں گا۔ فی الحال ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ اپنا گلاس جلدی سے ختم کرو۔"

اس نے ایک تھیلے میں کچھ ضروری چیزیں رکھیں اور تھوڑی دیر بعد ہم اس کی موٹر بائیک پر اپنی منزل کی جانب سفر کررہے تھے۔ وہ موٹر سائیکل بھی اس کی طرح گندی تھی اور مسلسل دھواں چھوڑ رہی تھی۔ ہم بڑی سڑک سے اتر کر ایک مارکیٹ سے گزر رہے تھے۔ میں نے ایسی جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہاں کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی تھوک مارکیٹ تھی جہاں سے چھوٹی مارکیٹوں اور دکانوں کو سامان سپلائی کیا جاتا تھا۔ میں نے کئی عورتوں کو دیکھا جو اپنی سائیکل پر لٹکی ہوئی ٹوکریوں میں سامان بھر رہی تھیں۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ آلوؤں کے ڈھیر کے ساتھ ایک دس سالہ لڑکا بیٹھا ہوا تھا جو ہمیں دیکھ کر مسکرادیا۔ نیٹ نے اس کے قریب موٹر سائیکل روکی اور بولا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ لڑکے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے اس مارکیٹ کے بیچ میں کھڑا ہونا بہت عجیب لگ رہا تھا۔ چند بوڑھی عورتوں نے میری جانب اشارہ کیا اور قہقہے لگانے لگیں جس کا میں نے بالکل برا نہیں منایا کیونکہ مجھے احساس تھا کہ راستہ روکے کھڑا ہوں۔ کئی بوڑھے آدمی میرے پاس سے

گزرتے ہوئے چلائے۔ مجھے ویت نامی زبان نہیں آتی لیکن اتنا ضرور سمجھ گیا کہ وہ میرے راستہ روکنے پر اعتراض کررہے تھے۔

میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ نیٹ اور اس لڑکے کے درمیان کیا بات ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھی ہمارے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا۔ میں نے کئی ویت نامیوں کو تین کی تعداد میں ایک موٹر سائیکل پر سفر کرتے دیکھا تھا لیکن میرے ساتھ یہ پہلا اتفاق تھا۔ موٹر سائیکل رک گئی تو وہ لڑکا ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کون تھا؟''

''اس کا نام کین ہے۔ وہ چار بجے تک واپس آجائے گا۔ کیا خیال ہے اندر چلیں؟'' اس نے کلب کے داخلی دروازے پر جھلملاتی ہوئی روشنیوں کی جانب اشارہ کیا۔

وہ فحاشی کا اڈا معلوم ہورہا تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں سیڑھیاں چڑھتے ہی ہوگیا۔ دوسری منزل کی گیلری میں ایک جوڑا دنیا و مافیہا سے بے خبر ناشائستہ حرکات میں مصروف تھا۔ ہمیں دیکھ کر بھی انہوں نے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی۔ یہ کلب ایک ویئر ہاؤس میں واقع تھا اور وہاں کرفیو کے قوانین کی کوئی پابندی نہیں ہورہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کلب کی انتظامیہ اپنا کاروبار چلانے کے لیے بہت سے لوگوں کو رشوت دیتی ہوگی۔ ہم بار کی جانب بڑھے، نیٹ نے مصروف نظر آنے والے بارٹینڈر کو اپنے فون پر تصویریں دکھائیں اور ان کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ڈرنک کا آرڈر دیا اور بولا۔ ''ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

وہ کم بولنے کا عادی تھا۔ اس کی نظریں وھسکی کے گلاس پر تھیں لیکن وہ کسی گہری سوچ میں غرق نظر آنے لگا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور ممکنہ مجرموں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا ان میں سے کسی ایک نے جونا کے ساتھ زیادتی کی یا اسے قتل کردیا؟ لیکن اس جرم کا ارتکاب کرنے والا کوئی مسافر نہیں تھا ورنہ اسے یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ یہ یہیں کا رہنے والا کوئی شخص ہے۔

میرے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب نیٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور ایک خوب صورت ویت نامی عورت کی کلائی پکڑی۔ اس کی انگلیوں میں ایک پڑیا دبی ہوئی تھی جس میں سے سفید پاؤڈر گر رہا تھا۔ اس کے برابر میں خاکی نیکر پہنے ایک مدہوش شخص کھڑا ہوا تھا۔ نیٹ نے میز پر سے وھسکی کی بوتل اٹھا کر دیوار پر دے ماری جس کی آواز سے رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدم تھم گئے۔ وہ شخص لڑکی کو گھسیٹتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بھاگا لیکن میں نے اس کا تعاقب کیا اور ہم اس لڑکی کو گھیرنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ لڑکی بے خوف نظر آرہی تھی اور مجھے لگا کہ کہیں ہم پر غیر قانونی حرکت کرنے کا الزام نہ آجائے۔

''تم کیا کررہی تھیں؟'' نیٹ نے لڑکی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے کہا۔

وہ خاصی نڈر اور بے باک معلوم ہورہی تھی لیکن جب نیٹ نے پولیس کا نمبر ملایا تو وہ پریشان نظر آنے لگی۔ نیٹ نے پولیس والوں کو بتا دیا کہ یہاں ایک لڑکی غیر قانونی منشیات فروخت کررہی ہے۔ اس لڑکی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔ کیا تم نے اس شخص کے ہاتھ منشیات فروخت کی تھی؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے فون پر ایک تصویر اسے دکھائی۔

''یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں؟ یہاں بہت سے لوگ آتے رہتے ہیں۔''

''یہ اس لڑکی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔'' نیٹ نے اسے جونا کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے یہ لڑکی یاد ہے۔ وہ منشیات کے زیر اثر تھی اور اس نے ڈانس فلور پر قے کردی تھی۔''

''اور یہ شخص؟''

''مجھے یاد آگیا۔ اسے بہت ساری پڑیاں درکار تھیں۔ شاید کسی پارٹی کے لیے مانگ رہا تھا۔''

''کیا اس کی کمر پر سفری تھیلا تھا؟''

''ہاں۔''

''وہ لوگ یہاں سے کب گئے تھے؟''

''ساڑھے چار بجے .....''

نیٹ نے فوراً ہی اس لڑکی کی کلائی چھوڑ دی اور مجھے لے کر کلب سے باہر آگیا۔ اس نے ایک فون کال کی۔ وہ ویت نامی زبان میں بات کررہا تھا۔ میری سمجھ میں صرف ایک بس اسٹیشن کا نام آسکا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے بھوک لگی ہے اور تم بھی بھوکے ہوگے۔ چلو کچھ کھاتے ہیں۔'' ہم کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ وہی لڑکا موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا ایک گلی سے نمودار ہوا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ نیٹ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے یہ موٹر سائیکل بہت پسند ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ہم اس بس اسٹاپ پر کیوں آئے ہیں اور جونا کے ساتھ کون شخص کلب آیا تھا؟ یہ لڑکا کون ہے؟''

''فی الحال اتنے سوالات ہی کافی ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جس شخص کے بارے میں پوچھ رہے ہو، وہ جونا کا سابق بوائے فرینڈ ہے تاہم اس نے ابھی تک اس حقیقت کو قبول نہیں کیا ہے۔ وہ فیس بک کے ذریعے جونا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جب اس نے فیس بک کے ذریعے جونا سے پیغام رسانی کی تو وہ خوف زدہ ہوگئی اور اس نے ایسی جگہوں پر جانا چھوڑ دیا جہاں غیر ملکی قیام کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایک خط کے ذریعے اس سے خاص طور پر کہہ چکی تھی کہ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے۔ جونا نے الزام لگایا کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ اس سے وفادار نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کبھی تمہارے سامنے ایلیکس نامی کسی شخص کا ذکر نہیں کیا ہوگا؟''

''نہیں۔''

''وہ دونوں چار سال اکٹھے رہے۔ ایلیکس اس سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا لیکن ان دونوں کے درمیان پیغامات سے پتا چلتا ہے کہ وہ کوئی مستقل مزاج شخص نہیں تھا اور منشیات کا عادی ہوجانے کے بعد شاید جونا کے بارے میں اس کی نیت بدل گئی تھی۔ ہم اس بس اسٹیشن پر اس لیے آئے ہیں کہ وہ اپنے سفری بیگ کے ساتھ تین بجے تک کلب میں موجود تھا اور یہاں سے بسیں صبح پانچ بجے چلنا شروع ہوتی ہیں۔ میرا معاون جسے تم لڑکا کہہ رہے ہو، ایک ڈرائیور کا پتا لگانے میں کامیاب ہوگیا ہے جس نے تصویروں سے انہیں شناخت کرلیا ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ مائی چاؤ کی طرف گئے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ اب ہمیں مائی چاؤ جانے والی بس میں سوار ہونا ہوگا جو ایک گھنٹے کے اندر روانہ ہوجائے گی۔ نیٹ نے کافی منگوائی اور میں ایلیکس کی منصوبہ بندی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جونا کو لے کر وہاں کیوں گیا تھا اور جونا نے مجھے ایلیکس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ یہ سوالات مسلسل میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔

اس چھوٹی سی بس میں گنجائش سے زیادہ مسافر سوار تھے۔ مجھے بس میں بیٹھتے ہی نیند آگئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی جاگنا پڑ گیا جب مجھے محسوس ہوا کہ ایک بوڑھی عورت کا سر میرے کندھوں پر رکھا ہوا تھا۔ وہ زور زور سے خراٹے لے رہی تھی اور میں اس خوف کی وجہ سے حرکت نہیں کررہا تھا کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ نیٹ نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا تم جاگ گئے۔ دیکھو کتنا خوب صورت نظارہ ہے۔''

واقعی خوب صورت منظر تھا لیکن وہ جگہ بالکل الگ تھلگ معلوم ہورہی تھی۔ ایک بار پھر میں سوچنے لگا کہ اس کا سابق محبوب ایلیکس اسے کس نیت سے یہاں لایا تھا؟ ممکن ہے کہ یہ جھوٹ ہو۔ لیکن مجھ سے جھوٹ بول کر جونا کو کیا فائدہ ہوتا؟ میری دوست انہی دھند سے ڈھکی پہاڑیوں اور گہرے سبز پانیوں کے درمیان کہیں ہوگی۔ اسے اس کی مرضی کے خلاف یہاں لاکر رکھا گیا ہے لیکن کہاں؟ اس شخص کا اگلا قدم کیا ہوسکتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر اہم سوال یہ تھا کہ ہم اس بارے میں کیا کرنے والے ہیں؟

ایک تنگ پہاڑی میں کئی موڑ کاٹنے کے بعد بس ایک چھوٹے سے گاؤں میں رک گئی اور بس کے رکتے ہی اس بوڑھی عورت کی بھی آنکھ کھل گئی جو میرے کندھے کو تکیہ بنائے سو رہی تھی۔ اس نے مجھے چونک کر دیکھا اور ہنس پڑی۔ نیٹ کے لیے اس سے متعارف ہونے کا یہ ایک اچھا بہانہ تھا۔ اس نے عورت سے کچھ سوالات کیے تو اس نے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے مکانات کی طرف اشارہ کردیا جو وہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر تھے۔

میرا خیال تھا کہ بس سے اترتے ہی نیٹ کوئی عملی قدم اٹھائے گا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کردیں جو ایک غار کے دہانے پر ختم ہورہی تھیں۔ وہ وہاں لکڑی کی بنی ہوئی پرانی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر میری بھی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کچھ پوچھوں۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور تھیلے میں سے رات کی بچی ہوئی وھسکی کی بوتل نکال لی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس افراتفری میں اسے یہ بوتل یاد رہے گی۔

میں نے اپنے طور پر اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں حیران تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے زبان کھولی تو اس کے لہجے میں دھمکی نمایاں تھی۔

''تم جانتے ہو کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ کیا تم اس سے انکار کرسکتے ہو؟''

''نہیں، میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔''

''اس نے تمہارے جسم پر جو تبصرہ کیا، تم اتنے معصوم نہیں کہ اسے نہ سمجھ سکو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم وہ تمہارے جسم کو پسند کرتی ہے۔''

''یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں اسے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پہلا ثبوت وہ تقریباً آدھی دنیا کا فاصلہ طے کرکے تم

سے ملنے کے لیے آئی جبکہ اس نے تمہیں کافی عرصے سے نہیں دیکھا تھا لیکن ایک بڑے بحران کے بعد اسے تمہاری یاد آگئی۔ ثبوت نمبر دو۔ تم نے بتایا کہ جس روز وہ غائب ہوئی، اس نے رات تک کے کھانے کے لیے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ثبوت نمبر تین۔ کالج کے دنوں میں تم اس کے گرد منڈلایا کرتے تھے۔"

"میں نے اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کر چکے ہو۔ مجھے اس کا یقین ہے کیونکہ تم نے اس کی کالج لائف کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ تمہاری وجہ سے اس کا سابق دوست غصے میں آگیا۔ فیس بک پر ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں اس نے تمہارے بارے میں سخت الفاظ استعمال کیے۔ تمہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"دیکھو نیٹ! شاید تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تمام سوالوں کے جوابات مل گئے ہیں اور تم نے اب تک جو میری مدد کی ہے اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اندھیرے میں رکھو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہم آبادی میں جا کر انہیں تلاش کرنے کے بجائے گزشتہ دو گھنٹے سے یہاں بیٹھ کر وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ تم نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ کہاں پر ہے لیکن کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے تاکہ ہم آبادی میں جا کر اسے یہاں سے نکال سکیں؟"

"تم نے مجھ سے مدد کرنے کے لیے کہا تھا۔ ضروری نہیں کہ میں تمہیں ہر بات بتاؤں۔ اگر تم مجھے حقائق کی روشنی میں مزید سوچنے کی اجازت دو گے تو ہم بہت جلد کوئی منصوبہ بنا سکیں گے۔"

"معافی چاہتا ہوں۔" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا کہ اسے تلاش کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے اگر وہ یہاں ہے تو کیا ہمیں اس علاقے میں اسے تلاش نہیں کرنا چاہیے؟

"تم خود کیوں نہیں چلے جاتے؟ مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ویسے بھی تمہیں ویت نامی زیادہ اچھی بولنی نہیں آتی اس لیے کوئی تم پر شک نہیں کرے گا۔"

"ہم دونوں کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے اس لیے اعصاب جواب دیتے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تم مجھے ایسا احمقانہ مشورہ نہ دیتے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چاولوں کے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ گوکہ اس نے مجھے اپنی مہارت سے متاثر کیا تھا لیکن بہرحال وہ ایک اجنبی تھا لہٰذا میں نے خود کچھ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اسے بتا دیا کہ آبادی کا ایک چکر لگا کر تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔ اس نے میرے جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ مجھے کم تر سمجھ رہا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ میں نے اس کے رویے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور آبادی کی جانب چل دیا۔

میرے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا۔ جب میں قصبے میں داخل ہوا تو دوپہر ہو چلی تھی اور سڑکوں پر کافی چہل پہل تھی۔ بوڑھے مرد شطرنج کھیلتے ہوئے سبز چائے سے شغل فرما رہے تھے۔ کچھ بچے ایک شٹل کاک سے کھیل رہے تھے اور عورتوں کا ایک گروپ موٹیل کے باہر چہل قدمی کر رہا تھا۔ نیٹ کی باتیں میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں لیکن میں اسے غلط ثابت کرنے کا تہیہ کر چکا تھا اور پرعزم تھا کہ جونا کا سراغ لگا لوں گا۔ شاید وہ بھی یہی چاہتا ہو لیکن میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میرے لیے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ پوری توجہ جونا پر مرکوز رکھوں۔

میں نے دھند میں گھری پہاڑ کی چوٹیوں کی طرف دیکھا اور مجھے لگا کہ نیٹ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وہ کسی بھی جگہ ہو سکتی ہے اور اس کا سراغ ملنا آسان نہیں۔ بہرحال اگر میں اس ملک میں ایلیکس کی طرح نووارد ہوتا، تب بھی غیر محتاط انداز میں وہاں چہل قدمی نہ کرتا۔ میں یہاں کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔

میں نے تمام ہوٹل دیکھ ڈالے جو اس چھوٹے سے شہر کے لحاظ سے کوئی مشکل کام نہ تھا اور آخری ہوٹل میں پہنچ کر امید کی کرن نظر آئی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا موٹا شخص مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا اور اس کے کہنے پر میں نے کافی کا کپ خرید لیا۔ جب میں نے اسے جونا کی تصویر دکھائی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مجھے وہ بھی نشے میں لگ رہا تھا۔ بہرحال، اس نے جونا کو پہچان لیا اور بولا۔ "یہ جوڑا ہنی مون منانے آیا تھا اور وہ دونوں ایک منٹ کے لیے بھی کمرے سے باہر نہیں نکلے۔ ان کے کمرے سے چیخنے اور رونے کی آوازیں آتی تھیں۔ ہنی مون کے دوران ہی عورت، مرد کو سمجھ لیتی ہے۔ کل وہ لوگ کنٹری ہاؤس کے لیے روانہ ہو گئے۔"

میں نے جیب سے علاقے کا نقشہ نکالا جو میں نے بس اسٹاپ سے خریدا تھا اور اس سے کہا کہ وہ اس مکان کی نشاندہی کر دے۔ وہ جگہ بالکل الگ تھلگ دور دراز علاقے

میں تھی اور وہاں ان کا شور سننے والا کوئی نہیں تھا۔ مجھے ورزش کرنے کی عادت نہیں ہے اس لیے واپسی میں غار کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میں غار کے دروازے کی جانب تھا، وہاں نیٹ موجود نہیں تھا البتہ شراب کی خالی بوتل زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ مجھے بالکل حیرت نہ ہوتی اگر وہ غار کے اندر کہیں سو رہا ہوتا اور فوراً ہی میری رائے اس کے بارے میں تبدیل ہونے لگی۔ بلندی سے مجھے وہ بل کھاتی سڑک صاف نظر آ رہی تھی جس کی نشاندہی ہوٹل والے نے میرے نقشے پر کی تھی۔ اس سڑک کے ساتھ ساتھ کئی بنگلے بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک میں جونا کو رکھا گیا تھا جس کی زندگی پر ایسے ہی سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے جو مجھے اس وقت آسمان پر نظر آ رہے تھے۔

تیز بارش شروع ہو گئی اور میں اس سے بچنے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ ویت نام کے لوگ اس موسم کے عادی ہیں۔ انہوں نے بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی مناسب انتظام کر رکھا ہوتا ہے یا پھر وہ اس کی پروا نہیں کرتے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اس بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں جونا کو رکھا گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ گرج چمک اور تیز بارش کے باوجود ایک شخص چاول کے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے میرے جسم کو بھگو رہے تھے اور مجھے ان مسافروں سے حسد محسوس ہو رہا تھا جو بانس کے بنے ہوئے ان بنگلوں میں آرام کر رہے تھے۔

میں جھاڑیوں کے عقب میں واقع ایک گندے نالے میں اتر گیا جہاں سے میں کھڑکی کے ذریعے جونا کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ میز پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ خاصی مطمئن نظر آ رہی تھی اور اسے دیکھ کر پہلی بار خیال آیا کہ کہیں نیٹ اور میں نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی؟ لیکن جب وہ کرسی سے اٹھی اور میں نے اس کی کلائی میں زنجیر دیکھی تو میں واپس اپنے حواسوں میں آ گیا۔ وہ بستر پر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا اور مسلسل جونا کو دیکھے جا رہا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی ہو۔ میں اسے اشارہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن اچانک ہی ایلیکس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور وہ اس کی چوڑی چھاتی سے جا ٹکرائی۔ میرے ہاتھوں کی گرفت اس زنگ آلود لوہے کے پائپ پر مضبوط ہو گئی جو مجھے سڑک کے کنارے پڑا ہوا ملا تھا۔ میں سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے فلموں سے یہی سیکھا تھا کہ اس مرحلے پر ہوشیار رہنا چاہیے۔ تھوڑی سی ہلچل پیدا کروں اور جب ایلیکس اپنا سر دروازے سے باہر نکالے تو اس پر حملہ کر دوں۔ میں اپنے اس منصوبے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو راہداری میں کھڑا ہوا پایا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت اور شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بھی کتنا بے وقوف تھا کہ یوں بے دھڑک اندر چلا آیا۔ میں نے اسے کوئی موقع دیے بغیر اس کے گھٹنے پر وار کیا جس سے وہ بہ آسانی بچ گیا۔ اس نے فوراً ہی بستر کے برابر میں پڑا ہوا بڑا سا چاقو اٹھا لیا۔ نہ جانے مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ بھی مسلح ہوگا۔ اس کے پہلے دو حملوں نے مجھے پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ میں اس پر دوبارہ غالب آنے کا طریقہ سوچ رہا تھا کہ اچانک میرا پاؤں سیڑھیوں پر پھسلا اور میں لڑھکتا ہوا ایک زوردار آواز کے ساتھ کیچڑ میں جا گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ کی بتیاں بار بار جل بجھ رہی تھیں۔

میں نے سیڑھیوں پر سے اس کا قہقہہ سنا۔ یہ آواز بتدریج قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے جونا کی چیخ بھی سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی میں محتاط ہو گیا۔ یہاں کھڑے رہنے کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا تھا اس لیے میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ میں گہرے پانی میں چل رہا تھا۔ میرے راستے میں آبی مخلوقات، رینگنے والے جانور، سانپ اور چار ٹانگوں پر چلنے والے جانور آئے لیکن میں پناہ کی تلاش میں بھاگتا رہا۔

ہوٹل والے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہاں میری آواز کوئی نہیں سنے گا۔ میں نے مدد کے لیے کسی کو پکارنا چاہا لیکن پھر سوچا کہ اس سے صرف ایلیکس کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے چاول کے اس کھیت کا رخ کیا جہاں کچھ دیر پہلے ایک شخص کو کام کرتے دیکھا تھا۔ شاید کھیت میں کام کرنے والے لوگ مجھے اس سے بچا سکیں یا اگر وہ میری جان لیتا ہے تو کم از کم پولیس کو اس کی اطلاع کر سکیں۔

میں اس سے پہلے کبھی چاول کے کھیتوں کے درمیان سے نہیں گزرا تھا۔ وہاں پانی کی گہری نالیاں تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ چاول کے پودے سر اٹھا رہے تھے۔ درمیان میں چلنے کے لیے تنگ پگڈنڈیاں تھیں۔ میں ان پر چلتے ہوئے کئی مرتبہ پھسلا پھر اپنے پیچھے پانی کے چھینٹوں کی آواز سن کر سمجھ گیا کہ ایلیکس بھی میرے تعاقب میں ہے۔ میں نے یہ جاننے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ وہ کتنی دور ہے۔ وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔

اس کے ہاتھوں کا گھیرا میری گردن کے گرد تنگ ہو گیا۔ میں اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا گھیرا مزید سخت ہوتا اور میں اپنے آخری وقت کے بارے میں سوچتا، اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں آزاد ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایلیکس زمین پر گرا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی نیٹ برگ روایتی ویت نامی کسان کے روپ میں کھڑا تھا۔ اس نے انہی کی طرح سر پر نکونا ہیٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی لوہے کا پائپ تھا جو بھاگتے ہوئے میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

''بہتر ہے کہ پانی سے باہر آجاؤ۔ یہاں سانپ بھی ہوتے ہیں۔'' اس نے مجھے ہوشیار کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

میں تھوڑی دیر پہلے ہی ٹیرس پر آکر بیٹھا ہوں اور ہم دھوپ کی تمازت کے ساتھ ساتھ بیئر سے بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مائی چاؤ میں ہونے والی کارروائی کو چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں لیکن جونا ابھی تک بستر میں ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اسے کسی اسپتال یا ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جایا جائے گا اور ہم تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس کی بات مان گئے۔ وہ اپنی زندگی میں بہت دکھ جھیل چکی تھی اس لیے اس کی بات ٹالنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ نیٹ نے مشروب کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''اب وہ کیسی ہے؟''

''کافی بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ منشیات کا اثر زائل ہونے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

''لگتا ہے، تم ابھی تک ان باتوں کو نہیں بھول پائے جو میں نے پہاڑی پر کی تھیں۔''

''میں جانتا ہوں، تم صرف یہ چاہ رہے تھے کہ میں تمہیں تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دوں۔ اسی لیے تم نے مجھے اشتعال دلا کر قصبے میں بھیج دیا تھا لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں پر ہیں؟''

''تمہیں وہ بوڑھی عورت یاد ہے، جو ہمیں بس میں ملی تھی؟''

''ہاں، کچھ کچھ۔''

''میرا اندازہ تھا کہ ایلیکس کسی ہوٹل یا موٹیل میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ اگر وقتی طور پر اسے ایسا کرنا پڑا تو اس کا قیام بہت مختصر ہوگا اور وہ جلد ہی کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے گا۔ میں نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھ لیا کہ آج کل یہاں مکانوں کا کرایہ کیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس علاقے میں لوگ اپنے مکان سیاحوں کو عارضی قیام کے لیے کرائے پر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ عورت سمجھی کہ ہمیں بھی ایسے ہی کی تلاش ہے چنانچہ اس نے ان بنگلوز کی طرف اشارہ کیا جہاں سے تمہاری دوست بازیاب ہوئی ہے۔''

''کیا وجہ تھی کہ تم نے ایک ساتھ وہاں جانے کے بجائے مجھے تنہا بھٹکنے پر مجبور کر دیا؟ میں تو تقریباً مارا گیا تھا۔''

''مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ اگر احمقانہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ساتھ چلے جاتے تو ایلیکس کوئی بھی خطرناک حرکت کر سکتا تھا اور ہم دونوں مارے جاتے۔ یہ بھی میرے منصوبے میں شامل تھا کہ تم وہاں جاؤ اور میں تمہاری حفاظت کے لیے آس پاس موجود رہوں۔ اس طرح میں نہ صرف تمہیں بچانے میں کامیاب رہا بلکہ ایلیکس پر بھی قابو پا لیا اور اب وہ جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔''

''ایک دو باتیں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ مثلاً یہ کہ ایلیکس کو جونا کے ٹھکانے کا کیسے علم ہوا؟ اس نے رات تین بجے مجھے فون کیا اور بات کیے بغیر ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ براہِ راست بس اسٹیشن جانے کے بجائے جونا کو لے کر کلب کیوں گیا؟ تمہارے پاس اس کی تصویر کہاں سے آئی وغیرہ وغیرہ۔''

''وہ فیس بک پر جونا کے ساتھ رابطے میں تھا اور اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جونا تمہارے پاس ٹھہری ہوئی ہے جس پر اس نے ناراضی کا اظہار کیا اور دھمکیاں دینے لگا۔ وہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا شخص ہے اور اس کے لیے تمہارا گھر ڈھونڈنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ تمہارے علاقے کا چکر لگانے لگا اور جونا اس کے ڈر سے گھر میں محصور ہو کر رہ گئی۔ اس روز موقع ملتے ہی وہ جونا کو کسی بہانے سے وہاں سے لے گیا اور اسے نشہ آور دوا کھلا دی۔ وہ اسے کلب لے کر اس لیے گیا کہ مائی چاؤ جانے والی بس صبح پانچ بجے روانہ ہوتی تھی۔ اسے وقت گزارنے کے لیے کسی پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ اس نے تمہیں ٹیلی فون اس لیے کیا کہ وہ گھر پر تمہاری موجودگی کا یقین کر لینا چاہتا تھا۔ ہر مجرم کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے اور ایلیکس نے بھی فون کر کے یہ غلطی کی ورنہ اس تک پہنچنا آسان نہ ہوتا۔ اس کی تصویر میں نے فیس بک سے لی تھی۔ فیس بک سے مجھے بہت مدد ملی اور باقی کام میں نے اندازوں اور قیاس آرائی کی بنیاد پر کیا۔''

میں نے مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ جانتا تھا کہ اس کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوگا۔ وہ ایسا شاطر کھلاڑی تھا جسے کبھی مات نہیں ہوتی۔

تعاقب

سکندر علیم

خواہشات کی تکمیل اور تعیشات کا حصول انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے... ہر شخص اپنی زندگی کو ہر شے سے آراستہ دیکھنا پسند کرتا ہے... مگر اپنے خوابوں اور تمناؤں کا محل دوسروں کے گھروندوں کو مسمار کر کے تعمیر نہیں کیا جاتا... ایک ایسے ہی فریبی کی داستان جو دنیاوی آسائشات کی خاطر رعنائیوں سے بھرپور انسانوں کی زندگی میں زہر گھولتا چلا گیا...

اس بھونرے کی فریب کاریاں جو ہمیشہ ایک نئے تعاقب کی تلاش میں رہتا تھا...

جیب لیمن دونوں ٹانگیں میز پر رکھے چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں تھے۔ خالی بیٹھنا اسے کبھی اچھا نہیں لگا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اگر فوری طور پر کوئی کام نہ ملا تو بلوں کی ادائیگی بھی مشکل ہو جائے گی۔ اچانک ہی ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک عورت ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ اس نے خوب صورت لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور دیکھنے میں کسی بڑے گھر کی لگ رہی تھی۔

اس عورت نے ناگواری سے اس عمارت کی جانب دیکھا جس میں لیمن کا دفتر تھا۔ اسے لگا کہ جیسے وہ کسی غلط جگہ پر آگئی ہو۔ اس عمارت کی حالت خاصی خستہ تھی اور دیکھنے والوں پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا ارادہ بدلتی، لیمن تیزی سے سیڑھیوں کی جانب لپکا اور جیسے ہی اس نے عمارت کا صدر دروازہ کھولا، اس وقت وہ عورت ٹیکسی میں بیٹھنے ہی والی تھی۔

لیمن اس کے قریب جا کر بولا۔ ”کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں؟ میرا نام جیب لیمن ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تمہارے کسی کام آسکوں۔“ پھر وہ عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کی ظاہری حالت پر نہ جاؤ، میرا دفتر کافی کشادہ اور آرام دہ ہے۔“

عمارت سے زیادہ اس کی اپنی ظاہری حالت اس عورت کو متاثر نہیں کر سکی۔ وہ مضبوط جسم کا تیس سالہ شخص تھا جس کے چہرے سے بدصورتی ٹپک رہی تھی۔ بظاہر اس میں ایسی کوئی خوبی نہیں تھی جو صنفِ نازک کو متاثر کر سکے جبکہ اس کے مقابلے میں نوجوان عورت غیر معمولی حد تک حسین تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں اور ٹھوڑی کا چھوٹا سا گڑھا خوب صورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ لیمن نے مسکراتے ہوئے اسے اوپر آنے کی دعوت دی تو وہ تیار ہوگئی۔ وہ کافی فاصلہ طے کر کے آئی تھی۔

لیمن کا دفتر کافی بہتر حالت میں تھا۔ اس نے حال ہی میں ایک نیا قالین خریدا تھا جس سے کمرے کی شکل نکل آئی تھی۔ میز پر لیمن کی تصویر رکھی ہوئی تھی جس میں وہ پولیس کی وردی میں تھا جبکہ دیوار پر لگی دوسری تصویر میں اس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ یہی تصویر اس عورت کی توجہ کا مرکز بن گئی اور اس نے پوچھا۔ ”کیا تم نے بھی جنگ میں حصہ لیا تھا؟“

”ہاں، شروع سے آخر تک میں محاذ پر رہا۔“

”میرا شوہر بھی جنگ لڑ چکا ہے۔ وہ فوج میں کپتان تھا۔“

”لیکن میں سارجنٹ سے آگے نہ بڑھ سکا۔“ لیمن نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

اس نے عورت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی نشست پر بیٹھ کر اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس عورت کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی اور جس انداز میں اس نے اپنے شوہر کا ذکر کیا تھا، اس سے لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں متفکر ہے۔

”مجھے یقین ہے کہ تم اپنے شوہر کے بارے میں کوئی بات کرنے آئی ہو۔“ لیمن نے نرم لہجے میں کہا۔

”ہاں، تمہارا خیال درست ہے۔“ وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”وہ دو ہفتے سے لاپتا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ میرے لیے اس کی جدائی ناقابلِ برداشت ہے۔“

”میں اندازہ کر سکتا ہوں۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ”تم مجھے اس کا نام بتا سکتی ہو؟“

”ڈیل فورڈ اور میں لیزا فورڈ ہوں۔“

”یقیناً تم نے اس کے لاپتا ہونے کی اطلاع پولیس کو ضرور دی ہوگی؟“

”بالکل۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ اسے تلاش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا۔ ان کا کہنا ہے کہ اسے تلاش کرنے کی ساری کوششیں بے سود رہی ہیں۔“ وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”میری مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں رات کو سو نہیں سکتی اور یہی سوچتی رہتی ہوں کہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میری ایک پڑوسن مسز رابرٹ نے تمہارے بارے میں بتایا۔ وہ تمہاری بہت تعریف کر رہی تھی۔“

”یہ امر میرے لیے قابلِ اطمینان ہے۔“ لیمن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسے وہ کیس اچھی طرح یاد تھا۔ ماریا رابرٹ بھی اسی کرسی پر بیٹھی تھی جہاں اس وقت لیزا براجمان تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر کے بارے میں پریشان تھی جسے ایک رات کچھ لوگوں نے اس کے گھر پر بُری طرح مارا تھا۔ لیمن نے ان لوگوں کا سراغ لگا کر انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا لیکن یہ کیس بالکل مختلف تھا۔ اس نے بڑے صبر اور سکون کے ساتھ لیزا کی بیان کردہ تفصیل سنی۔ اس کا تعلق ایک دولت مند گھرانے سے تھا اور وہ پہلی ہی ملاقات میں ڈیل فورڈ پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ وہ نسلاً انگریز تھا لیکن اس کا خاندان کئی سال پہلے امریکا آکر آباد ہوگیا تھا۔ لیزا اس کی محبت میں اتنی پاگل ہوئی کہ بہت جلد اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ڈیل کے بقول اس نے فوج میں خدمات انجام دی تھیں اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اسٹاک بروکر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ بہت جلد وہ نیویارک کی کاروباری دنیا میں قدم جمالے گا۔ لیزا کے کہنے پر اس کے باپ نے ڈیل کو وال اسٹریٹ کے کچھ لوگوں کے نام تعارفی خطوط دینے کے علاوہ اسے ایک معقول رقم بطور قرض بھی دی جسے ڈیل قسطوں میں ادا کر رہا تھا۔

”تم مسز رابرٹ کی پڑوسن ہو؟ وہ تو بہت اچھا علاقہ ہے۔“ لیمن نے کہا۔

”ہاں۔“ لیزا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھ رہی تھی کہ یہ مکان ہماری ذاتی ملکیت ہے لیکن پولیس نے دورانِ تفتیش بتایا کہ ڈیل نے اسے کرائے پر لیا تھا۔ یہ میرے لیے ڈیل کی گمشدگی کے بعد دوسرا بڑا صدمہ ہے۔“

”کرائے نامے میں کیا شرائط رکھی گئی تھیں؟“

”یہ مکان ایک سال کے لیے کرائے پر لیا گیا اور اس کا کرایہ ایڈوانس میں ادا کیا گیا تھا۔“

”تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”صرف دس مہینے۔“ لیزا نے کہا۔ ”اور ہم دونوں بہت خوش تھے۔ ڈیل بڑا مہربان اور محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا۔ وہ مجھ پر مرتا تھا۔ جہاں جہاں اس نے سرمایہ کاری کی تھی، وہاں سے اسے معقول منافع مل رہا تھا۔ تم مسٹر رابرٹ سے بھی معلوم کر سکتے ہو۔ وہ بینک منیجر ہے اور اس نے ہمیشہ ڈیل کے مالی معاملات کی تعریف کی۔“ وہ دوبارہ اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”مجھے یہ پریشانی ہے کہ وہ بہت کامیاب شخص تھا اور ایسے لوگوں کے بہت سے دشمن پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کاروباری حریف نے...“

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن وہ یہ سمجھنے پر مجبور تھی کہ اس کے شوہر کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ البتہ لیمن کا دماغ بالکل مختلف سمت میں سوچ رہا تھا۔ اس نے لیزا سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکال کر اسے پکڑا دی اور بولی۔ ”یہ آرمی یونیفارم میں ہے۔ ویسے تو میرے پاس شادی کی تصویر بھی ہے لیکن یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ ڈیل نے یہ تصویر اس وقت دی تھی جب ہمیں ملتے ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے۔“

لیمن نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ خاصا قبول صورت شخص تھا اور اس کے پاس ہر وہ چیز تھی جس کی تمنا کی جا سکتی تھی۔ خوب صورتی، ذہانت، کامیاب کاروبار اور شاندار بیوی۔ اس کے باوجود لیمن کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

”کیا میں یہ تصویر اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟“ اس نے لیزا سے پوچھا۔

”ہاں، تم جب تک چاہو اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ میں بعد میں لے لوں گی۔“

”یقیناً تم اس کیس کے سلسلے میں میری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہو؟“

”ہاں۔“ لیزا نے کہا۔ ”میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ لیمن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی ہے۔“

”سب سے پہلے میں تمہارا مکان دیکھنا چاہوں گا۔“

”پولیس نے اس کے اسٹڈی روم کی تلاشی لی ہے لیکن انہیں وہاں سے کچھ نہیں ملا۔“

لیمن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”دوبارہ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

☆☆☆

لیزا کا مکان نسبتاً چھوٹا تھا لیکن اس میں بھی چار ملازم کام کر رہے تھے۔ لیمن نے ان سب سے فرداً فرداً بات کی اور انہوں نے ایک ہی کہانی سنائی۔ ان کے مطابق وہ ہمدرد، مہربان اور نرم مزاج مالک تھا اور اس کے لیے کام کر کے انہیں خوشی ہوتی تھی۔ ان میں سے تین شروع سے ہی ان کے ساتھ تھے لیکن چوتھی لڑکی چند ماہ پہلے ہی آئی تھی۔ لیمن نے پوچھا کہ اس سے پہلے والی خادمہ کہاں چلی گئی؟

”وہ بہت بیمار رہنے لگی تھی۔“ لیزا نے کہا۔ ”ملی کو عجیب و غریب بیماری لاحق ہوگئی تھی لہٰذا ڈیل نے اصرار کیا کہ وہ اپنے علاج پر توجہ دے۔ وہ نوکروں کے ساتھ بھی اپنے گھر والوں جیسا سلوک کرتا تھا۔“

”ملی کو کیا ہوگیا تھا؟“ لیمن نے کہا۔

”سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس کی بیماری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

”کیا وہ زندہ ہے؟“

”مجھے امید ہے کہ وہ خیریت سے ہوگی لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ ڈیل ایک دفعہ اسے دیکھنے اسپتال گیا تھا کیونکہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ مجھے بری خبروں سے دور رکھتا تھا لہٰذا اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ شاید وہ اس دنیا میں نہ ہو۔“

”اوہ۔“ لیمن نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے کس اسپتال میں داخل کروایا گیا تھا؟“

”مجھے یہ بھی معلوم نہیں لیکن وہ کوئی اچھا اسپتال ہی ہو گا۔ ڈیل کبھی اس معاملے میں غفلت نہیں کر سکتا۔“

''ملی تمہارے پاس کہاں سے آئی تھی؟''

''دیگر ملازموں کی طرح اسے بھی ہم نے ایک ایجنسی کی معرفت حاصل کیا تھا۔ میں تمہیں اس کا نام اور پتا دے سکتی ہوں۔ میں وہاں اپنے شوہر کے ساتھ جا چکی ہوں۔''

لیمن نے ڈیل کی اسٹڈی دیکھنے کی خواہش کی تو لیزا اسے مکان کے عقبی حصے میں واقع ایک بڑے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک میز، بڑی کرسی، دو چھوٹی کرسیاں، کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف اور ایک چھوٹی میز تھی جس پر برانڈی کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ میز پر ان کی شادی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے وہ تصویر اٹھا کر دیکھی جس میں ڈیل نے اپنی دلہن کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور کیمرے کی جانب دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کتابوں پر نظر دوڑائی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ ڈیل کیتھولک خیالات کا حامی تھا۔ اس کے بعد میز کی باری آئی۔ لیمن نے ایک ایک دراز کھول کر ان میں رکھے ہوئے خطوط اور کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ لیزا بڑے غور سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس نے اکتاہٹ کے عالم میں کہا۔

''پولیس یہاں کی مکمل تلاشی لے چکی ہے۔''

''پھر بھی ہمیں دیکھ لینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ کوئی چیز ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہو۔'' لیمن نے جھک کر میز کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟''

''میں کسی خفیہ دراز کی کھوج میں ہوں۔ اس طرح کی میزوں میں عام طور پر ایسی ایک دراز ضرور ہوتی ہے۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''نہیں۔ میں کبھی یہاں نہیں آئی۔ یہ میرے شوہر کی پرائیویٹ جگہ ہے۔''

لیمن نے میز کے کناروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''عام طور پر کسی جگہ ایک اسپرنگ لگا ہوتا ہے جس کو دبانے سے خفیہ دراز باہر آجاتی ہے لیکن کسی دوسرے شخص کے لیے اس کا پتا لگانا بہت مشکل ہے۔''

اچانک ہی اس کا ہاتھ ایک چھوٹے سے کلپ سے ٹکرایا اور ایک دراز باہر آگئی۔ لیزا نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس دراز میں صرف چاندی کا ایک کیس رکھا ہوا تھا۔ جب لیمن نے اسے باہر نکالا تو لیزا پہچان گئی اور بولی۔ ''یہ میں نے اسے شادی کے موقع پر تحفے میں دیا تھا۔ وہ اس میں اپنے بزنس کارڈ رکھا کرتا تھا اور ہمیشہ باہر نکلتے وقت اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔''

لیمن نے وہ کیس کھول کر دیکھا۔ اس میں تقریباً نصف درجن کارڈ رکھے ہوئے تھے جن پر ڈیل کا نام اور پتا چھپا ہوا تھا۔ لیزا یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی اور بولی۔ ''ڈیل کام پر جاتے وقت اسے اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں گیا؟''

لیمن کے پاس اس کا جواب تھا لیکن وہ اس مرحلے پر لیزا کو کچھ نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ اس نے کیس اپنی جگہ پر رکھ کر دراز بند کر دی اور دوسری دراز تلاش کرنے لگا لیکن جب اسے کچھ نہ ملا تو اس نے اسٹڈی میں تلاشی کا کام ختم کر دیا اور لیزا اسے کہا کہ وہ اس کا بیڈ روم دیکھنا چاہتا ہے۔ لیزا کسی اجنبی کو اپنے کمرے میں لے جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی لیکن جانتی تھی کہ یہ بھی ضروری ہے۔ لیمن نے کمرے میں جا کر الماری کھولی اور درازوں کی تلاشی لینے لگا۔ پھر وہ ملحقہ ڈریسنگ روم میں گیا اور اس نے ڈیل کی کپڑوں کی الماری کھول کر دیکھی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں گنتی کے چند کپڑے ہینگر پر لٹکے ہوئے تھے۔ وفا شعار بیوی نے فوراً صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنا مہربان شخص ہے۔ گزشتہ دنوں ایک آدمی دروازے پر آیا جو بے گھر لوگوں کے لیے کپڑے جمع کر رہا تھا۔ ڈیل نے اسے اپنے ڈھیر سارے کپڑے دے دیے اور کہا کہ مستحق لوگوں کو ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ تو اور کپڑے بھی خرید سکتا ہے۔''

''تمہارا شوہر بہت ہی غیر معمولی شخص معلوم ہوتا ہے۔'' لیمن نے کہا۔

''ہاں، وہ ایسا ہی ہے۔'' لیزا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایسا آدمی تھا۔''

''ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو۔'' لیمن نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات تو میں تمہیں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ زندہ ہے اس لیے تمہیں اس کا سوگ منانے کی ضرورت نہیں۔''

لیزا کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''ڈیل زندہ ہے... کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟''

''ہاں، مجھے سو فیصد یقین ہے۔''

☆☆☆

لیمن نے ڈیل کی گمشدگی کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا تھا، اس کے مطابق لاپتا شخص کی تلاش شروع ہو گئی۔ وہ اور اس کا معاون اسٹین مختلف خطوط پر کام کر رہے تھے۔ اسٹین سرخ بالوں اور سرخ داڑھی والا نوجوان شخص تھا۔ وہ ایسے کیسوں کو ترجیح دیتا جس میں مار دھاڑ کے مواقع میسر آئیں۔ اس لیے نیویارک کے اسپتالوں سے معلومات اکٹھی کرنے میں اسے کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔ شام کو جب وہ دونوں معلومات کے تبادلے کے لیے ملے تو اسٹین نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے مسٹر لیمن۔ میں خالی ہاتھ واپس آیا ہوں۔''

''مجھے پہلے سے معلوم تھا۔''

''پھر مجھے کیوں بھیجا؟'' اسٹین چڑتے ہوئے بولا۔

''میں اپنے شبہے کی تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔''

''کیا تمہیں کوئی کامیابی ہوئی؟'' اسٹین نے پوچھا۔

''کوئی بڑی کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن میرا ایک اندازہ درست ثابت ہوا۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ڈیل فورڈ کی تصویر نکالی اور اسے اسٹین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے دفتر میں میری یونیفارم والی تصویر دیکھی ہے۔ تمہیں ان دونوں میں کوئی خاص فرق محسوس ہو رہا ہے؟''

اسٹین نے تصویر کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''یہ شخص تمہارے مقابلے میں زیادہ ہینڈسم نظر آرہا ہے۔''

''فضول باتیں چھوڑو اور اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ کہ دونوں تصویروں میں کیا فرق ہے؟''

''تمہاری تصویر آؤٹ ڈور میں کھینچی گئی تھی جبکہ یہ اسٹوڈیو کی معلوم ہوتی ہے۔''

''اس کے علاوہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے۔'' لیمن نے کہا۔ ''میں نے اپنی یونیفارم پہن رکھی ہے جبکہ ڈیل نے کہیں سے کرائے پر وردی حاصل کی تھی۔''

اسٹین حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''جب تم اسپتالوں کے چکر لگا رہے تھے تو میں ڈیل کے سروس ریکارڈ کی چھان بین میں لگ گیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ کبھی بھی فوج میں نہیں رہا۔ مجھے اس پر اسی وقت شک ہو گیا تھا جب میں نے اس کی شادی کی تصویر دیکھی۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی ایکٹر کسی فلم یا ڈرامے میں لیڈنگ رول کر رہا تھا اور یہی کچھ اس تصویر میں بھی نظر آرہا ہے۔ دونوں تصویروں میں اس کا چہرہ فطری تاثرات سے خالی ہے اور بناوٹی پن نمایاں ہے۔''

''یہ تم مجھے کیا بتا رہے ہو مسٹر لیمن؟''

''ہم ایک دھوکے باز کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اسے جو کچھ یہاں سے چاہیے تھا، وہ لے کر بھاگ گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ملازمہ ہماری مدد کر سکتی ہے جو کچھ عرصے قبل اس کی ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم کسی اسپتال کے ذریعے اس تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''لیکن میں تو شہر کے تقریباً سارے ہی اسپتال دیکھ چکا ہوں۔''

''تم صرف ان اسپتالوں میں گئے ہو جہاں قوانین اور ضوابط کے مطابق علاج کیا جاتا ہے اور ان اسپتالوں میں پڑھا لکھا تربیت یافتہ عملہ موجود ہے جبکہ میرا اشارہ ان اسپتالوں کی جانب ہے جہاں غیر قانونی کام کیا جاتا ہے۔''

اسٹین الجھتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، مسٹر لیمن۔''

''تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ ہم کل صبح ان اسپتالوں کا دورہ شروع کریں گے۔''

دوسری صبح انہوں نے ان اسپتالوں کا رخ کیا جو غیر

معیاری ہونے کے علاوہ اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے۔ ایک اسپتال تاریک تہ خانے میں واقع دو کمروں پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا ایک غیر استعمال شدہ گودام میں قائم تھا۔ ان میں سے کسی اسپتال میں ملی ہوپر نامی مریضہ کا علاج نہیں ہوا تھا۔

سہ پہر کے قریب وہ اپنے مطلوبہ اسپتال تک پہنچ گئے۔ یہ ان اسپتالوں سے قدرے مختلف تھا جہاں وہ پہلے جا چکے تھے۔ گو کہ وہ بھی ایک پسماندہ علاقے میں تھا لیکن دوسرے اسپتالوں کے مقابلے میں منظم اور صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔ اسے ایک فربہ شخص ڈاکٹر ولیم زینڈر غیر قانونی طریقے سے چلا رہا تھا۔ جب لیمن نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو وہ رکھائی سے بولا۔

”ہمارے یہاں اس نام کی کوئی مریضہ نہیں آئی۔“

لیمن نے جرح کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تم نے ریکارڈ دیکھے بغیر کیسے بتادیا؟“

”میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“

”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم یہ ریکارڈ دیکھیں؟“

”مجھے اس پر شدید اعتراض ہے مسٹر لیمن! ہمارا ریکارڈ خفیہ ہے۔“

”تب مجھے پولیس سے کہنا پڑے گا کہ وہ میری خاطر یہ ریکارڈ چیک کریں۔ اس طرح وہ یہ بھی جان جائیں گے کہ اس اسپتال میں غیر قانونی اسقاط حمل بھی کیا جاتا ہے۔“

”یہ انتہائی بھیانک الزام ہے۔“ ڈاکٹر چلاتے ہوئے بولا۔

”یہ کام میں پولیس پر چھوڑتا ہوں۔ وہ خود ہی اس کی تحقیقات کرے گی۔“

”وہ پہلے ہی اس تفتیش کا آغاز کر چکے ہیں۔“ اسٹین نے کہا۔ ”ہم صرف وہ پہلو دیکھ رہے ہیں جو ابھی تک ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔“

”اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ تم ہم میں سے کس کو ریکارڈ دیکھنے کی اجازت دیتے ہو۔“

ڈاکٹر زینڈر بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے مہمان اپنے مقصد کے بارے میں پُرعزم تھے۔ گو کہ وہ اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے پولیس کو رشوت دیتا تھا لیکن اگر انہوں نے بڑے پیمانے پر تحقیقات شروع کردی اور غیر قانونی آپریشن کا پتا چل گیا تو انہیں خریدنا مشکل ہو جائے گا اور نہ ہی وہ لیمن اور اسٹین کی زبان بند رکھ سکے گا چنانچہ اس نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”شاید اس نام کی مریضہ یہاں آئی تھی۔ لگتا ہے کہ اس کا نام میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔“

”اپنی یادداشت پر زور دے کر بتاؤ کہ کیا اس مریضہ کے علاج کے اخراجات ڈیل فورڈ نامی شخص نے ادا کیے تھے؟“

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ڈیل کی تصویر نکالی اور اسے ڈاکٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟“

”ہاں، لیکن اس نے اپنا نام مسٹر کولن بتایا تھا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی شخص ہے؟“

”ہاں میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔“

لیمن نے اس سے تصویر واپس لے لی اور پوچھا۔ ”کیا لڑکی کا آپریشن کامیاب رہا تھا؟“

”بالکل۔“ ڈاکٹر نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”میرے سبھی آپریشن کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ لڑکی ڈسچارج ہونے سے پہلے کچھ عرصے یہاں رہی تھی۔“

”اور یہ کب کی بات ہے؟“ لیمن نے کہا۔

”تقریباً دو ہفتے ہوگئے ہیں۔“

”یہ بالکل وہی وقت ہے جب ڈیل فورڈ غائب ہوا تھا۔“ اسٹین نے اپنی نوٹ بک میں لکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے ملی ہوپر کے ڈسچارج ہونے کا انتظار کیا اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ فرار ہوگئے۔“

لیمن نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ ملی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی تھی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”مس ہوپر میں خون کی کمی کے علاوہ اور بھی مسائل تھے لہٰذا میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ہر قیمت پر حاملہ ہونے سے بچے۔“

”مجھے شبہ ہے کہ اسے کبھی یہ اختیار ملا ہو۔“ لیمن نے کہا۔

☆☆☆

وہاں سے واپسی پر ٹیکسی میں سفر کرتے ہوئے لیمن نے اسٹین کو بتایا کہ اس کا اندازہ کیوں غلط تھا۔ ”کوئی شخص اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا کہ لیزا جیسی خوب صورت اور دولت مند بیوی کو چھوڑ کر ایک بیمار ملازمہ کے ساتھ فرار ہو جائے جو اسے وقتی طور پر مسرت آمیز لمحات کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ وہ دونوں سے کھیلتا رہا کیونکہ دونوں عورتیں ہی اس کے مردانہ حسن کا شکار ہو چکی تھیں۔“

”تمہیں پہلی بار یہ اندازہ کب ہوا کہ وہ بھگوڑا ہے؟“

”یہ حقیقت ہے کہ اس نے مکان کرائے پر لیا تھا

جبکہ اس کی بیوی یہی سمجھتی رہی کہ اس نے یہ مکان خرید لیا ہے اور اس کے باپ کی دی ہوئی رقم کا کچھ حصہ اس کی خریداری میں چلا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے یہ رقم بھی اپنے کسی دوسرے مقصد کے لیے بچا کر رکھ لی تھی۔“

”اس کے کاروباری معاملات کا کچھ پتا چلا؟“

”پولیس ان کی چھان بین کر رہی ہے۔ وہ دن زیادہ دور نہیں جب کاغذات کی مدد سے وہ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ ڈیل ایک ذہین دھوکے باز ہے۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے کیونکہ وہ یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کوئی شوہر اس طرح اپنی خوب صورت بیوی اور گھر کو چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جاتے وقت ڈیل وہ سب کچھ لے گیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ اسی لیے پولیس کو اس کی اسٹڈی میں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس کی وجہ سے اس پر شک کیا جائے۔ وہ صرف خفیہ دراز میں کارڈ کیس چھوڑ کر گیا جو اس کی بیوی نے شادی کے موقع پر تحفے میں دیا تھا جس کی اسے اب ضرورت نہیں تھی۔“

”یہ کارڈ ویسے بھی اس کے لیے بیکار ہو گئے کیونکہ وہ دوسری جگہ جا کر نیا نام اختیار کرلے گا۔“

”واؤ! تم تو اب ایک سراغ رساں کی طرح سوچنے لگے ہو۔“ لیمن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”کیا اسے کپڑوں اور دیگر سامان کی ضرورت نہیں ہو گی؟“ اسٹین نے پوچھا۔

”اس کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکا ہے۔“ لیمن نے کہا۔ ”اس نے اپنے ایک ساتھی کو گھر پر بلایا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ بے گھر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ اس طرح اس نے بہ آسانی اپنا سامان اسمگل کر دیا اور اس کی بیوی کو ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہوا۔“

اسٹین بولا۔ ”مجھے اس کی بیوی اور نوجوان ملازمہ دونوں سے ہمدردی ہے۔ نہ جانے وہ لڑکی کس حال میں ہے؟“

”وہ یقیناً دوسری ملازمت تلاش کر رہی ہو گی۔ اسی لیے ہم اس ایجنسی کے دفتر جا رہے ہیں جن کے توسط سے اسے ڈیل کے گھر ملازمت ملی تھی۔“

ڈینی ایجنسی کا دفتر میڈیسن اسکوائر کی ایک بڑی عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ اس ایجنسی کا مالک الیگزینڈر ڈینی چالیس سال کا ایک خوش مزاج شخص تھا۔ جب لیمن نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ تھوڑا سا پریشان نظر آنے لگا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

کھڑکی

”میں دسویں منزل کے کمرا نمبر دس سے بول رہا ہوں... جلدی آؤ... میری بیوی خودکشی کرنا چاہتی ہے!“

ہوٹل کا منیجر یہ سن کر بوکھلا گیا۔ ”یس... سر... میں ابھی پولیس اور فائر بریگیڈ کو فون کرتا ہوں... وہ یہ خودکشی نہیں ہونے دیں گے۔“

”پولیس کے بچے!“ دوسری طرف سے شاید دانت پیس کر کہا گیا۔ ”جلدی میرے کمرے میں آؤ، کھڑکی نہیں کھل رہی... دیر ہوئی تو وہ ارادہ بدل لے گی۔“

(کراچی سے سکندر علی کا تحفہ)

”مجھے امید ہے کہ مسز فورڈ کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہو گا۔“

”ہم بھی یہی توقع کر رہے ہیں۔“ لیمن نے کہا۔ ”لیکن اس وقت ہم ملی ہوپر کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ دوبارہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے تمہارے پاس آئی ہوگی۔“

”ہاں، یہ درست ہے کہ اس کا نام ہمارے پاس درج ہے لیکن ابھی تک ہم اس کے لیے کسی ملازمت کا بندوبست نہیں کر سکے۔ مجھے مستقبل قریب میں بھی اس کا امکان نظر نہیں آتا۔ میں نے اس بارے میں اس سے بات بھی کی تھی لیکن اس کا مسئلہ ابھی برقرار ہے۔ ایسی صورت میں اسے کون ملازمت دے گا۔“

”کیا تم اس کی خراب صحت کے بارے میں بات کر رہے ہو؟“

”نہیں مسٹر لیمن! اس کا رویّہ میرے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ جب وہ پہلی بار میرے پاس آئی تو اس وقت ایک ذہین اور خوش مزاج لڑکی تھی جسے دیکھ کر کوئی بھی ملازمت دینے کے لیے تیار ہو جاتا چنانچہ مسٹر فورڈ اور مسز فورڈ فوراً اسے اپنے ساتھ لے گئے لیکن یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ اس نے وہ ملازمت چھوڑ دی۔“

”کیا تمہارے پاس اس کا پتا ہے؟“ اسٹین نے پوچھا۔

”ہاں، میں دیکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک

رجسٹر کھولا اور اس کے صفحات پلٹنے لگا۔ پھر ایک صفحے پر اس کی انگلی رک گئی اور وہ بولا۔ ''یہ رہا۔ میں تمہیں ایک کاغذ پر لکھ دیتا ہوں۔''

ملی ہوپر ایک بورڈنگ ہاؤس کے چھوٹے سے کمرے میں کرائے پر رہتی تھی۔ وہ لمبے قد اور گوری رنگت کی تھی لیکن اس کے خوب صورت چہرے پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ بورڈنگ ہاؤس کی مالکن نے دو اجنبی لوگوں کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں دی لہٰذا انہیں لاؤنج میں بیٹھ کر ہی اس سے بات کرنا پڑی۔ لیمن نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں مسٹر ڈیل فورڈ کی تلاش کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔''

''اب میں وہاں کام نہیں کرتی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''کوئی بات نہیں لیکن تم ہماری مدد تو کرسکتی ہو۔''

ملی نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس پر ہمیں بہت افسوس ہے۔''

''میں اپنی دیکھ بھال خود کرسکتی ہوں۔ مجھے عنقریب دوسری ملازمت مل جائے گی۔''

''میں تمہارے حالات کی بات نہیں کررہا۔ شاید مجھے یہ بتادینا چاہیے کہ میں ڈاکٹر زینڈر سے مل چکا ہوں۔''

یہ سن کر ملی کا چہرہ سکڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ اس کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہنا مشکل ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ گر جاتی، اسٹین نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا اور اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ جب اس کی حالت کچھ سنبھل گئی تو اس نے بولنا شروع کیا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے کہیں اور لے کر چلا جائے گا۔ وہ ایک شاندار شخص تھا اور میں کبھی یہ یقین نہیں کرسکتی تھی کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے سکتا ہے لیکن اس نے ایسا کر دکھایا۔ پھر ایک کے بعد ایک واقعہ ہوتا چلا گیا اور وہ میری عزت سے کھیلنے لگا۔ ایک دن ہم ہونے والے بچے کے بارے میں گفتگو کررہے تھے کہ اس کا ذہن بدل گیا اور وہ بولا کہ مجھے اس مصیبت سے نجات حاصل کرلینا چاہیے اور اس کے بعد وہ مجھے لے کر کہیں چلا جائے گا۔ سب لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے تھے لیکن یہ وہاں سے نکلنے کا ایک بہانہ تھا۔ مجھے مسز فورڈ کو دھوکا دیتے ہوئے افسوس ہورہا تھا کیونکہ ان کا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر بولی۔ ''ہر لڑکی موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے مسٹر لیمن۔''

''میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا بلکہ اس نے تم سے فائدہ اٹھایا۔''

اس کے کندھے جھک گئے اور وہ بولی۔ ''یہ بات اب میری سمجھ میں آئی ہے۔''

''کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ تمہیں کہاں لے کر جائے گا؟'' اسٹین نے کہا۔

''بالٹی مور۔''

''اور تم نے اس کی بات کا یقین کرلیا؟''

''بالکل۔'' وہ بولی۔ ''وہ کئی مرتبہ مکان دیکھنے وہاں جاتا رہا تاکہ ہم اس میں رہائش اختیار کرسکیں۔ اس کی بیوی یہی سمجھتی تھی کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں واشنگٹن جاتا ہے لیکن وہ کبھی بالٹی مور سے آگے نہیں گیا۔''

''بہت بہت شکریہ مس ہوپر... تم نے ہماری بہت مدد کی۔'' لیمن اٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے باہر نکل کر اسٹین سے کہا۔ ''ہمیں فوراً ٹرین پکڑنی ہے۔''

''لیکن ہم کہاں جارہے ہیں؟'' اسٹین نے پوچھا۔

''بالٹی مور۔''

☆☆☆

ٹرین کا سفر خاصا تکلیف دہ تھا جو انتہائی سست رفتاری سے شور مچاتی منزل مقصود کی جانب بڑھ رہی تھی لیکن اسٹین کو سب سے زیادہ تکلیف اس بات پر ہورہی تھی کہ وہ محض ایک مفروضے کی بنیاد پر سفر کررہے تھے۔ ان کے پاس ڈیل فورڈ کی بالٹی مور میں موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور اگر ہوتا تب بھی وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کس نام سے رہ رہا ہوگا۔ اس لیے اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

لیمن نے اس کا ذہن پڑھ لیا اور بولا۔ ''اس نے ملی سے ایک بات سچ کہی تھی کہ وہ بالٹی مور شفٹ ہورہا ہے۔''

''پھر وہ اس کے پیچھے کیوں نہیں گئی؟''

''تم نے اس کی حالت دیکھی ہے۔ اس کے پاس توانائی ہے اور نہ ہی ذرائع کہ وہ ڈیل کی تلاش میں بالٹی مور جاتی اور اگر وہ اسے ڈھونڈ بھی لیتی تو اس سے کیا فائدہ ہوتا؟ وہ پہلے ہی اسے مسترد کرچکا تھا اور ملی اپنے چہرے پر دوسرا تھپڑ کھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ملی کو استعمال کیا اور چھوڑ کر چلا گیا۔''

''وہ بالٹی مور کے چکر کیوں لگاتا رہا؟'' اسٹین نے پوچھا۔

''اسے کسی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ اپنی نئی فراڈی اسکیموں کے لیے سرمایہ کار تلاش کررہا تھا؟''

لیمن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''صرف سرمایہ کار ہی نہیں بلکہ اس کی نظر اگلی بیوی پر بھی تھی۔''

''لیکن وہ تو پہلے ہی لیزا سے شادی کرچکا ہے۔''

''غالب امکان یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی شادی کرچکا تھا اور نیا گیم کھیلنے کی خاطر اسے چھوڑ کر چلا آیا۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈیل فورڈ اس کا فرضی نام ہے لہٰذا اس نام سے ہونے والی شادی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ وہ شخص بیک وقت دو بیویاں رکھنے والا دھوکے باز ہے۔ لیزا فورڈ ہی اس کی واحد شکار نہیں بلکہ ماضی میں وہ دوسری عورتوں کو بھی بے وقوف بنا چکا ہے۔''

''لیکن ہم اس تک کس طرح پہنچیں گے؟'' اسٹین نے پوچھا۔

''اس کے لیے ہمیں ان مقامات پر جانا ہوگا جہاں اس کے ملنے کے امکانات ہوسکتے ہیں۔ وہ بالٹی مور میں ایک نئے نام سے اپنی نئی زندگی شروع کرے گا اور اس کا صرف ایک ہی مطلب نکلتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ دوبارہ شادی کرنے والا ہے۔''

بالٹی مور پہنچ کر سب سے پہلے لیمن نے مقامی اخبارات خریدے جن میں ہونے والی شادیوں کے اعلانات اور خبریں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں سے تین نام انہیں امید افزا لگے۔ چنانچہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گرجا گھروں کی جانب روانہ ہوگئے جہاں سے شادیوں کے پروگرام کا پتا چل سکتا تھا۔ پہلی دو جگہوں پر انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ وہاں کسی شادی کی رسم ادا ہونے کا امکان نہیں تھا البتہ تیسری جگہ انہیں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے گرجا کے مہتمم آرتھر سے رچرڈ کلبرن اور ڈورس کی شادی کے بارے میں پوچھا تو وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''مجھے ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ڈورس اپنے شوہر کی وفات کے بعد بہت تنہا اور غم زدہ تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ان دونوں کو ملانے میں تھوڑا بہت میرا بھی حصہ ہے۔''

''گزشتہ چند ماہ سے مسٹر کلبرن اکثر و بیشتر اتوار کو گرجا آیا کرتے تھے۔ انہیں بالٹی مور میں مکان کی تلاش تھی۔ میں نے انہیں مسز ڈورس سے ملوایا کیونکہ ان کے کئی مکان کرائے پر چل رہے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ ایک دوسرے پر فریفتہ ہوگئے اور انہوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔''

لیمن نے اپنی جیب سے ڈیل کی تصویر نکالی اور بولا۔ ''کیا تم اس شخص کی بات کررہے ہو؟''

''ہاں، یہی ہے۔'' آرتھر تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس کا نام کلبرن نہیں بلکہ ڈیل فورڈ ہے۔ یہ شخص دو ہفتے قبل نیویارک میں اپنی نوجوان بیوی لیزا کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اسی نے ہمیں اس کی تلاش پر مامور کیا ہے۔''

آرتھر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے لیے یہ ایک حوصلہ شکن خبر تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر یہ سچ نکلا تو ڈورس کی زندگی تو تباہ ہو جائے گی۔''

''اگر اس شخص سے اس کی شادی ہو جاتی تو یہ زیادہ تباہ کن ہوتا کیونکہ کچھ عرصے بعد یہ اس کی ساری دولت سمیٹ کر کسی دوسرے شہر جا کر ایک نئی عورت سے شادی کر لیتا۔''

''اس عفریت کو روکنا ضروری ہے۔'' آرتھر غصے سے بولا۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' لیمن نے اسے یقین دلایا۔ ''ہمیں صرف اس کا پتا چاہیے۔''

رچرڈ کلبرن ایک معقول ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شادی کے بعد وہ اپنی دلہن کے گھر شفٹ ہو جاتا۔ لیمن نے اسٹین کو عقبی حصے کی طرف جانے کی ہدایت کی تاکہ اگر کلبرن عقبی دروازے سے نکلنے کی کوشش کرے تو اسٹین اس کا

بادشاہ کی پسند

ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی میری پسند کا پھل لائے گا اسے اس کے برابر ہیرے اور جواہرات انعام میں دوں گا اور اگر پسند نہ آیا تو وہی پھل لانے والے کو نگلنا بھی پڑے گا۔ ایک مسلمان بیر لایا جو بادشاہ کو پسند نہ آئے تو اس نے بیر آسانی سے نگل لیے۔

ایک ہندو سیب لایا وہ بھی بادشاہ کو پسند نہ آیا اور بادشاہ نے ہندو کو سیب نگلنے کا حکم دیا۔ ہندو زور زور سے رونے لگا اور پھر اچانک ہی ہنسنے لگا۔ بادشاہ نے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔

''روتا اس لیے ہوں کہ میں یہ سیب نگل نہیں سکتا اور ہنسا اس لیے ہوں کہ باہر ایک سردار جی تربوز لا رہے ہیں۔''

(پیر بابا سے صبا گل کی سوغات)

راستہ روک سکے۔ اس نے استقبالیہ سے کلبرن کے کمرے کا نمبر معلوم کیا جو دوسری منزل پر تھا پھر وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر گیا اور دروازے پر دستک دی۔ اس کے بغل میں وہ اخبار دبا ہوا تھا جس میں کلبرن اور ڈوریس کی شادی کی خبر شائع ہوئی تھی۔

کلبرن نے دروازہ کھولا اور ناگواری سے کہا۔ ”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”میں تمہیں شادی کی مبارک باد دینے آیا تھا۔“ لیمن مکاری سے بولا۔ ”میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔ کیا تم نے اس تقریب میں لیز افورڈ کو مدعو کیا ہے؟“

کلبرن ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں نے کبھی اس عورت کا نام نہیں سنا۔“

”یہ عورت تمہاری بیوی ہے۔“

”لگتا ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام رچرڈ کلبرن ہے اور میں تمہیں اس کا دستاویزی ثبوت دے سکتا ہوں۔“

”اب میں سمجھا کہ تم نے آرتھر اور ڈوریس کو کس طرح بے وقوف بنایا۔ تم جیسے جعلساز، دھوکے باز اور چالاک شخص کے لیے اس طرح کی دستاویزات حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔“

کلبرن سختی سے بولا۔ ”تم کون ہو اور میرے ذاتی معاملات میں کیوں مداخلت کر رہے ہو؟“

”میرا نام جیب لیمن ہے اور مجھے اس شخص کی تلاش پر مامور کیا گیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے ڈیل کی تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

کلبرن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ شکست خوردہ انداز میں پیچھے کی طرف ہٹا پھر اس نے اچانک ہی لیمن کو زور سے دھکا دیا اور سیڑھیوں سے اترتا ہوا عقبی دروازے کی جانب بڑھا جہاں اسٹین اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ جیسے ہی کلبرن دروازے سے باہر آیا، اسٹین اچانک ہی اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”مسٹر لیمن جانتے تھے کہ تم بھاگنے کے لیے یہی راستہ اختیار کرو گے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے یہاں کھڑا کر دیا۔“

”میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ وہ غرایا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا ورنہ ملی ہوپر کی نظروں میں گر جاؤں گا۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“ کلبرن نے کہا۔

”وہی نوجوان خادمہ جس کی تم نے زندگی برباد کی اور اسے ابارشن پر مجبور کیا پھر دھوکا دے کر چلے آئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس جیسی کتنی عورتیں تمہاری زندگی میں آ چکی ہیں؟“

کلبرن اس کی طرف جھپٹا اور اسے دھکا دے کر نکلنے کی کوشش کی لیکن اسٹین سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اسٹین نے اس کے چہرے پر پے در پے کئی مکے مارے تاہم وہ اس کی گرفت میں نہ آ سکا۔ اسی دوران اسے اپنی جیب سے پستول نکالنے کا موقع مل گیا اور اس نے اسٹین کے سر کا نشانہ لے لیا۔

اس اثنا میں لیمن بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اپنا پستول نکال کر اس پر تان لیا اور بولا۔ ”ہتھیار پھینک دو، ورنہ گولی مار دوں گا۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔“

جیسے ہی کلبرن نے پلٹ کر دیکھا، اسٹین کو موقع مل گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور کلبرن کے ہاتھ سے پستول گر گیا۔ اس کے بعد اسٹین نے پے در پے کئی گھونسے اس کے چہرے اور جسم پر مارے۔ کلبرن اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔

”شاباش۔“ لیمن نے اسٹین کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”یہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔“

☆☆☆

ڈیل کی گرفتاری کی خبر اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کی اور لوگ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ لیزا سے شادی سے پہلے اس کی دو بیویاں اور تھیں اور اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو ڈوریس اس کی چوتھی بیوی ہوتی۔ اس کے فراڈ کی کہانیاں پڑھ کر مین ہٹن کے سرمایہ کاروں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈیل اپنی چرب زبانی سے انہیں اس حد تک بے وقوف بنا سکتا ہے کہ وہ اس کی فراڈ اسکیموں میں سرمایہ کاری کرنے پر تیار ہو گئے۔ اخبارات نے مجرم کا تعاقب کرنے اور اس کی دھوکا دہی کا پردہ چاک کرنے پر لیمن اور اسٹین کی کوششوں کو سراہا اور اس کارنامے کی بدولت ان کی شہرت دور تک پھیل گئی۔ روزانہ نئے کلائنٹ ان کے دفتر کے چکر لگانے لگے۔ لکڑی کی سیڑھیوں پر ان کے قدموں کی آواز سن کر لیمن کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اس نے اسٹین سے کہا۔ ”گاہکوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اب ہمیں سیڑھیوں کے لیے ایک قالین ضرور خرید لینا چاہیے۔“

اسٹین نے مسکرا کر تائید میں سر ہلا دیا۔

ریگینالڈ نے اپنا وائن کا گلاس اپنی بیوی کی جانب بلند کیا اور بولا۔ ”اس شاندار ڈنر کے نام جو تم نے تیار کیا ہے مائی ڈیئر کمبرلی۔“

”ہاں... لیکن اس کا بیشتر کریڈٹ الفرڈ کو جاتا ہے لیکن بے شک میں نے اس کی مدد ضرور کی ہے۔“ کمبرلی نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا اور مسکرا دی۔ ”اس ایک اور سال کے جشن میں جو تمہاری رفاقت میں نہایت عمدگی سے بیت گیا پیارے شوہر صاحب۔“

ڈھونگ

بابر نعیم

نت نئے تجربات سے گزرنے کا خیال انسان کو عملی اقدام پر مجبور کر دیتا ہے۔ دو میاں بیوی کے درمیان طے پا جانے والے منصوبے کا دلچسپ احوال...

اعتماد سے کھیلی جانے والی بازی کے دلچسپ اتار چڑھاؤ

"تمہیں وائن کیسی لگی؟" ریگینالڈ نے پوچھا۔

"شاندار۔"

اس نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور روسٹ بیف کو چھری سے کاٹنے لگا۔ "گھر پر اس پُرسکون ڈنر کے لیے اتفاق کرنے کا شکریہ۔"

"یہ ایک زبردست آئیڈیا تھا ہنی۔ نئے سال کی شب جو پیچیدہ پارٹیاں ہم اٹینڈ کیا کرتے ہیں، اس کی دھکم پیل سے بچنے کے لیے یہ ایک عمدہ تبدیلی ثابت ہوئی ہے۔"

"ہاں، واقعی ایسا ہی ہے۔" ریگینالڈ نے لقمہ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "اور یہ روسٹ بیف زبردست ہے۔"

"شکریہ۔"

"اب میں ایک نئی روایت شروع کرنا چاہتا ہوں۔ نئے سال کی اس شب ہم میں سے ایک اپنے سالِ نو کے عزم کا اعلان کرے۔" ریگینالڈ نے کہا۔

"لیکن ڈیئر کیا یہ ایک بُرا شگون نہیں ہوگا؟"

"لوگ تو یہی کہتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ تم بتاؤ کیا کرنا چاہو گی؟"

"چونکہ یہ آئیڈیا تمہارا ہے تو میرے خیال سے پہل تم ہی کو کرنی چاہیے۔" کمبرلی نے کہا۔

"ویری ویل، میرا سالِ نو کا عزم یہ ہے کہ تمہیں قتل کردوں۔"

کمبرلی کی مسکراہٹ ایک شیطانی ہنسی میں بدل گئی۔ "واقعی؟ اور، میرا عزم یہ ہے کہ میں تمہیں قتل کردوں۔"

"اور تم اس وحشیانہ عمل کے ارتکاب کے لیے کیا تجویز پیش کرتی ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی گن ہے؟ یا شاید تمہارا خیال ہے کہ تم اپنے خالی ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ سکتی ہو۔ کم آن مائی ڈیئر، تمہارے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہے۔" ریگینالڈ نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔

"میں اپنا کام دکھا چکی ہوں۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہ روسٹ بیف میں شامل ہے۔"

"کیا؟"

"زہر!"

"تم نے مجھے زہر دیا ہے؟" ریگینالڈ ہنسنے لگا۔

"تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ تم دس منٹ میں مرنے والے ہو۔ تب ہم دیکھیں گے کہ یہ کس حد تک مذاق تھا۔"

"تمہیں زہر کہاں سے ملا... الفرڈ سے؟"

کمبرلی کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ "تم نے بھی مجھے زہر دیا ہے؟"

"وہ تمہاری وائن میں تھا۔"

"اُف خدایا! نہیں۔"

"لیکن الفرڈ نے مجھے زہر کا تریاق بھی دیا تھا۔ اس لیے کہ کہیں اتفاق سے میں غلط گلاس سے نہ پی لوں۔" یہ کہہ کر ریگینالڈ اس کیبنٹ کی جانب لپکا جس میں کراکری رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک دراز کھولی تو چونک پڑا۔ "وہ کہاں گیا... تریاق تم نے لیا ہے؟" وہ گھورتے ہوئے کمبرلی کی جانب پلٹا لیکن وہ میز پر موجود نہیں تھی۔

وہ گھبراہٹ میں کیبنٹ کی اشیا کو الٹ پلٹ کررہی تھی۔ "میرا تریاق بھی غائب ہے۔ شٹ! اب میں کیا کروں؟"

ریگینالڈ نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "ہمارے پاس صرف آٹھ منٹ ہیں۔"

کمبرلی نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ "میں خود کو... بہت کمزور... محسوس کررہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

"وہ کمینہ، ہم نے اس پر اعتبار کیوں کیا؟"

"تم نے اسے ہماری وصیت میں کیوں شامل کیا؟ ایڈیٹ کہیں کے۔"

"وہ گزشتہ پندرہ سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ہماری فیملی کے ایک فرد کی طرح ہے۔"

"ہاں اور فیملی کا فرد جو تمہیں مار ڈالنا چاہتا ہے۔" کمبرلی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"لعنت ہو۔" ریگینالڈ کے گھٹنوں کی طاقت جواب دے گئی اور وہ بھی فرش پر گر پڑا۔

اتنے میں ڈائننگ روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور الفرڈ اندر داخل ہوا۔ وہ کمبرلی کے قدیم خاندانی ورثے میں ملنے والی بیش قیمت کراکری کے ایک کپ میں چائے پی رہا تھا۔ ان کے بٹلر کی حیثیت سے اسے علم تھا کہ اس کراکری کو کبھی استعمال میں نہیں لایا جائے گا۔

ان دونوں کو فرش پر گرے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ "اوہ مائی گاڈ! تم دونوں کو کیا مشکل درپیش آگئی ہے؟"

ریگینالڈ بھرائی ہوئی آواز میں اس پر چیخا۔ "ہم مر رہے ہیں... کمینے۔"

"لیکن تم یہی تو چاہتے تھے... ایک دوسرے کو مار ڈالنا۔ میں نے بس اس معاملے میں تمہاری مدد کی ہے۔" الفرڈ نے کہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا، یہ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔" کمبرلی نے اپنے شوہر کو مخاطب کر کے کہا۔

"اوہ، کیسا زبردست کام ہوگیا۔" الفرڈ اور آگے بڑھ آیا۔ "اب مجھے تم دونوں کی چھوٹی چھوٹی شکایتیں کبھی سننے کو نہیں ملیں گی اور نہ ہی تمہیں تمہارے پیڈی کیورز یا ڈنر پارٹیوں پر لے جانے کے لیے کبھی ڈرائیونگ کی زحمت اٹھانا پڑے گی اور نہ ہی کبھی زبردستی تمہاری..." الفرڈ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا اور چکنا چور ہوگیا۔

ریگینالڈ نے نظریں اٹھا کر الفرڈ کی جانب دیکھا۔

"کیا بات ہے الفرڈ... کمزوری محسوس ہو رہی ہے؟"

"میرا پیٹ... اس میں مروڑ ہو رہا ہے۔" اس کی ٹانگیں بے جان سی ہوگئیں اور وہ گھٹنوں کے بل فرش پر گر پڑا۔ ہارڈ ووڈ کے فرش پر ہڈیوں کے ٹکرانے سے چرچراہٹ کی آواز گونجی۔

"اوہ۔" ریگینالڈ نے کہا۔ "مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔" ریگینالڈ کی آواز میں اب توانائی تھی۔

"ہاں۔" کمبرلی بولی۔ "یہ شرم کی بات ہے۔" پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ الفرڈ ناقابلِ یقین نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ریگینالڈ بھی کھڑا ہوگیا اور اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون پر سے گرد جھاڑتے ہوئے بولا۔ "یہ فرش کتنا گندا ہو رہا ہے، الفرڈ۔ مجھے تمہارے کام سے مایوسی ہوئی ہے۔"

الفرڈ نے فرش پر کروٹ بدلی اور ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن... کس طرح؟"

"تم دیکھ سکتے ہو۔" ریگینالڈ نے کہا۔ "میں تمہیں ہماری وصیت میں شامل کرنا چاہتا تھا لیکن کمبرلی کو تحفظات درکار تھے۔"

"یہ بات درست ہے۔" کمبرلی نے کہا۔ "میں تم پر اعتبار نہیں کرتی الفرڈ۔ ہمیں تمہاری جوا کھیلنے کی عادت اور اس کے باعث تمہاری مشکلات کے بارے میں سب کچھ علم تھا۔"

"لہٰذا۔" ریگینالڈ نے کہا۔ "ہم نے تمہاری وفاداری کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے باقاعدگی سے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کردیا اور یہ لڑائیاں روز بروز مزید تلخ ہونے لگیں۔ ہم تمہیں اس بارے میں قائل کرنا چاہتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔"

"پھر میں نے تم سے مدد طلب کی۔" کمبرلی نے کہا۔ "اور جب میں نے تمہیں بتایا کہ میں ریگینالڈ کو قتل کرنا چاہتی ہوں تو تم نے فوراً ہی مجھ سے کہا کہ تم اس کام کے لیے

چھوٹے میاں

منے میاں بیمار پڑے تو ان کے ابا نے بڑی مشکل سے انہیں ڈاکٹر کے ہاں چلنے پر رضامند کیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ شروع کیا۔ سینے پر آلہ لگایا اور کہا۔

"بیٹا ذرا دس تک گنتی تو گنو۔"

ننھے میاں گھبرا کر بولے۔

"ابا جان! آپ تو کہتے تھے کہ اسپتال جا رہے ہیں لیکن آپ تو مجھے اسکول میں لے آئے ہیں۔"

برجستہ

بیوی نے شوہر سے سو روپے مانگے تو شوہر نے انتہائی غصے بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہیں ہر وقت بس روپوں کی ضرورت رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ تمہیں روپوں سے زیادہ عقل کی ضرورت ہے۔"

بیوی برجستہ بولی۔ "تمہارے پاس جو چیز ہے، میں وہی مانگوں گی نا۔"

ریلوے اسٹیشن

ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹرین آکر رکی۔

مسافر نے دوسرے مسافر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں جناب، یہ کون سا اسٹیشن ہے؟"

دوسرے مسافر نے جواب دیا۔ "جناب! یہ اسٹیشن نہیں، میرا کندھا ہے۔"

اسے بھی پڑھیئے

☆ گدھے کے سر سے سینگ کیسے غائب ہوئے تھے؟

گھوڑے کے مقابلے میں الیکشن میں کھڑا ہوگیا تھا۔

☆ بیوی اور محبوبہ میں فرق بیان کریں۔

محبوبہ کو لارا لگایا جاسکتا ہے لیکن بیوی کو نہیں۔

☆ بہتی گنگا میں ہاتھ کیسے دھوئے جاسکتے ہیں؟

جب لب سڑک کسی منچلے کو لڑکی چھیڑنے پر جوتے پڑ رہے ہوں تو آپ بھی اپنا حصہ ڈال لیجیے۔

(ریاض بٹ، حسن ابدال)

ایک ایسا زہر حاصل کر سکتے ہو جس کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ تم نے مجھ سے اس کے تریاق کا وعدہ بھی کیا... کہیں ایسا نہ ہو کہ میں حادثاتی طور پر اس میں سے کچھ زہر کھالوں۔"

"اور مجھے بھی اسی مدد کی پیشکش کرتے ہوئے تمہاری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔" ریگینالڈ نے کہا۔ "تم ہی نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں کمبرلی کی وائن میں زہر ملا دوں اور تم نے کمبرلی سے کہا کہ وہ میرے روسٹ بیف میں زہر شامل کردے اور تمہیں یہ علم تھا کہ ہم نے اپنی اپنی تریاق کی بوتلیں ڈائننگ روم میں چھپا رکھی ہیں۔"

"سو تم نے تریاق کی وہ بوتلیں چوری کرلیں۔" کمبرلی نے کہا۔ "تمہارا خیال تھا کہ ہم دونوں مرجائیں گے اور اپنی تمام جائداد تمہارے لیے چھوڑ جائیں گے۔"

الفرڈ کو بولنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ "تم نے ایک دوسرے کو زہر نہیں دیا؟ یہ سب کچھ ایک ڈھونگ تھا؟"

"عمدہ اداکاری تھی نا؟" ریگینالڈ نے کہا۔

"میرے خیال سے ہمیں ہالی ووڈ کے لیے تیاری پکڑنی چاہیے۔" کمبرلی نے کہا۔

"ہمیں علم تھا کہ ہمارے مرنے کے جشن کے موقع پر تم اپنی اسپیشل چائے کے کپ سے ضرور لطف اندوز ہوگے اور اگر تم نے خود ہمیں زہر دینے کا فیصلہ کیا ہوتا..." یہ کہتے ہوئے ریگینالڈ نے اپنی جیب میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر لہرائی اور بولا۔ "جو بوتلیں ہم نے چھپائی تھیں اور جنہیں تم نے چرا لیا تھا، ان میں صرف پانی تھا، تریاق نہیں۔"

الفرڈ نے کپکپاتی انگلی سے ریگینالڈ کے ہاتھ میں دبی ہوئی بوتل کی جانب اشارہ کیا اور گھگیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پلیز، مجھے تریاق دے دو۔ پلیز، میں تم سے بھیک مانگتا ہوں۔ میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں کچھ نہیں کر سکتا الفرڈ... تمہارا کیا خیال ہے ہنی؟" ریگینالڈ نے کمبرلی سے پوچھا۔

کمبرلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"درحقیقت مجھے حیرت ہے کہ تم نے اس بات پر غور کیوں نہیں کیا کہ تمہاری مرغوب چائے کی پتیاں آج شب قدرے نم کیوں ہو رہی تھیں۔"

الفرڈ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نہ نکل سکی۔ ریگینالڈ نے جھک کر اپنا کان الفرڈ کے منہ سے لگا لیا۔

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو، اولڈ مین؟"

الفرڈ نے کھانستے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور بہ مشکل تمام یہ الفاظ ادا کر سکا۔ "تمہیں اس کی پاداش میں جیل جانا پڑے گا۔"

یہ سن کر ریگینالڈ اور کمبرلی دونوں ہنس دیے۔

پھر کمبرلی بولی۔ "نہیں، ہمیں جیل نہیں جانا پڑے گا۔ یہ تم تھے جس نے زہر خریدا تھا۔"

"اور تمہاری خودکشی حقیقت میں کسی کے لیے باعثِ حیرت نہیں ہوگی۔" ریگینالڈ نے کہا۔ "میں گزشتہ کئی ہفتوں سے اپنے پوکر کے ساتھیوں کو یہ بتاتا چلا آرہا ہوں کہ آج کل تم بہت زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو اور مایوسی کی باتیں کیا کرتے ہو جیسے زندگی سے عاجز آچکے ہو۔"

اتنے میں ڈائننگ روم کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور دو دراز قامت نقاب پوش اندر در آئے۔ "کیا الفرڈ اسمتھ بٹلر یہیں رہتا ہے؟" ان میں سے ایک نقاب پوش نے پوچھا۔

"تمہیں میرے مکان میں گھسنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" ریگینالڈ نے للکارتے ہوئے کہا۔

تب ایک نقاب پوش کی نگاہ فرش پر پڑے ہوئے الفرڈ پر چلی گئی۔ "یہی ہے۔" اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے ساتھی نے یہ سنتے ہی ایک پستول نکالا... اور الفرڈ کی جانب بڑھ گیا۔

ریگینالڈ اور کمبرلی خوف زدہ ہو کر ایک طرف دبک گئے۔

پستول بردار نقاب پوش نے الفرڈ کے پاس پہنچ کر پستول کی نال الفرڈ کی کھوپڑی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "الفرڈ اسمتھ! یہ تمہارے ڈھائی لاکھ ڈالر قرض نہ ادا کرنے کا خمیازہ ہے جو تم جوئے میں ہار چکے تھے اور ہماری مہلت کے باوجود وقت پر ادا کرنے سے قاصر رہے۔"

"نہیں پلیز!" الفرڈ گھگیایا، اس کا پورا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔

ریگینالڈ اور کمبرلی پر سکتہ سا طاری تھا۔

اس نقاب پوش نے الفرڈ کی پیشانی پر نزدیک سے ایک فائر کردیا پھر جس تیزی سے وہ دونوں نقاب پوش ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تھے، اسی تیزی سے وہاں سے نکل گئے۔

یہ ہولناک منظر دیکھتے ہی ریگینالڈ اور کمبرلی دونوں بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑے۔
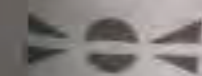
وہ ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ اچانک اس نے کہا۔ "مسٹر گلبرٹ! یہ ضروری ہے، اسے کرنا ہے۔" وہ بولتے ہوئے کچھ دیر کے لیے چپ ہوئی پھر اس نے یہی جملے دہرائے تو ٹیکسی ڈرائیور نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"سوری میم... کیا تم مجھ سے مخاطب ہو؟"

"نہیں۔" اس کا لہجہ سرد ہوگیا۔ "مجھے خود کلامی کی عادت ہے۔"

چند لمحے بعد ٹیکسی فلاڈلفیا کی پارکس اسٹریٹ پر رکی

لمحہ بہ لمحہ خوف و دہشت کی گونج میں مدغم ہوتے اسرار در اسرار...

راستوں کا انتخاب انسان کی اپنی مرضی و منشا پر منحصر ہوتا ہے... بعض لوگ ابتدا ہی سے اُن دشوار اور ناہموار راستوں کو منتخب کر بیٹھتے ہیں... جن پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ سمجھتے ہیں کہ اب منزل قریب ہے... نیت اور فطرت سے مغلوب طمع و ہوس کے اندھیروں میں گم ہو جانے والوں کا سنسنی خیز و پُرتجسس فسانۂ حیرت...

دوسرے سائے

مریم کے خان

اور وہ ٹیکسی سے اُتر کر ایک عمارت کی طرف بڑھی۔ اس کے تیسرے فلور پر وکیل گلبرٹ کارلائل کا دفتر تھا۔ گلبرٹ کی سیکریٹری نے اسے دیکھا تو فوری اپنے باس کو اطلاع دی اور گلبرٹ نے اسے اندر بلوا لیا۔ اس نے گرم جوشی سے عورت کا استقبال کیا۔ ”مسز ارنسٹ... کیسی ہو تم... اور مسٹر ارنسٹ کیسے ہیں؟“

”مجھے گلوریا کہلوانا پسند ہے۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ تقریباً پینتیس برس کی خوب صورت لیکن سخت نقوش کی حامل عورت تھی۔ البتہ اس کا جسم بہت متناسب تھا۔ اس نے اعلیٰ طبقے کی عورتوں کے جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ فیروزی رنگ کا اسکرٹ، اوپر سفید شرٹ پر فیروزی رنگ کا ہی کوٹ تھا۔ وہ گلبرٹ کے سامنے میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”ارنسٹ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کے بعد زیادہ سے زیادہ تین ہفتے کا وقت ہے۔“

”کینسر بڑا خوفناک مرض ہوتا ہے۔“ گلبرٹ نے سر ہلایا۔ ”پھر عمر کا بھی اثر ہے۔ جوانی میں رائن نے بہت محنت کی تھی۔ بہرحال گلوریا، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

جواب میں گلوریا نے اپنے بڑے بریف کیس سے ایک خاکی لفافہ نکال کر گلبرٹ کی طرف بڑھایا۔ ”یہ رائن کا اجازت نامہ ہے... اس کے دو ملین ڈالرز اسٹاک کی فروخت کے لیے۔“

گلبرٹ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”وہ اسٹاک فروخت کرنا چاہتا ہے... لیکن کیوں؟“

گلوریا نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”اس لیے کہ رقم کی ضرورت ہے۔ اس کے علاج اور دیکھ بھال پر بھی اچھی خاصی رقم خرچ ہو رہی ہے۔“

گلبرٹ مطمئن نہیں تھا۔ اس نے اجازت نامہ دیکھا اور بولا۔ ”تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟ تمہارا کہنا ہے کہ بس تین ہفتے کی بات ہے۔“

”ہاں، تین ہفتے بعد سب میرا ہو گا لیکن اس وقت نقد رقم کی اشد ضرورت ہے جو صرف اسٹاک فروخت کرنے سے مل سکتی ہے۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ وراثت کی قانونی کارروائی خاصی طویل ہو گی۔ مجھے سب کچھ ملتے ملتے بھی مہینوں لگ سکتے ہیں اور میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتی۔ اس لیے رائن اپنے شیئرز فروخت کرنے کے لیے تیار ہے۔“

گلبرٹ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”مسز... سوری گلوریا... شیئرز کی فروخت کے لیے یہ نہایت نامناسب وقت ہے۔ اسٹاک کی قیمت گزشتہ دو سال میں سب سے نچلے حصے میں آ چکی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ابھی ان کی فروخت میں عجلت نہ کی جائے...“

گلوریا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”مسٹر گلبرٹ! تم اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔ مجھے اسٹاک کی نہیں ڈالرز کی ضرورت ہے۔“

گلبرٹ نے گہری سانس لی۔ ”تم جانتی ہو رائن کے پاس دس ملین ڈالرز سے زیادہ مالیت کے شیئرز ہیں اور یہ سب براہِ راست سرمایہ کاری کی صورت میں ہیں؟“

گلوریا نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں اور یہی تو مسئلہ ہے۔ اگر یہ اوپن شیئرز ہوتے تو ایک دن میں بک جاتے مگر اب ان کو بیچنا مسئلہ ہے۔“

”مسئلہ نہیں ہے ان کی قیمت زیادہ ملتی ہے اور ان کی قدر بھی ہوتی ہے۔ سب سے بڑھ کر آپ کو ان پر نفع ملتا ہے۔“ گلبرٹ نے کہا اور اٹھ کر ایک کیبنٹ تک آیا۔ اس کی اوپری دراز کھول کر اس نے اندر موجود فولڈرز دیکھے اور پھر ایک فولڈر نکالا۔ یہ رائن ارنسٹ کا فولڈر تھا۔ گلبرٹ نے ایک کاغذ نکالا جس پر رائن ارنسٹ کے دستخط تھے۔ اس نے اجازت نامے پر موجود دستخط کا اس سے موازنہ کیا اور بولا۔ ”دستخط تو مسٹر ارنسٹ کے لگ رہے ہیں۔“

گلوریا اٹھ کر میز تک آئی اور اس نے گلبرٹ کے بڑے سے جدید ڈیجیٹل فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا اور بولی۔ ”میری رائن سے بات کراؤ۔ ہاں رائن...! میں گلبرٹ کے دفتر میں ہوں... اسے شک ہے کہ اجازت نامے پر دستخط تمہارے نہیں ہیں... ہاں لو بات کرو۔“

اس نے ریسیور گلبرٹ کی طرف بڑھا دیا، اس نے ریسیور لیا۔ ”مسٹر ارنسٹ! کیا حال ہیں آپ کے... درد کیسا ہے؟“

”میں بہتر ہوں، اب درد نہیں ہے۔“ رائن ارنسٹ کی بھاری آواز آئی۔

”مسٹر ارنسٹ! میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں لیکن کیا مہربانی کر کے آپ تصدیق کریں گے کہ یہ اجازت نامہ آپ نے جاری کیا ہے جس کی رو سے آپ کے دو ملین ڈالرز کے اسٹاک فروخت کرنے ہیں؟“

”میں تصدیق کرتا ہوں۔ یہ دستخط میرے ہیں۔“

”شکریہ مسٹر ارنسٹ... لیکن آج کل اسٹاک کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، شیئرز کی قیمت بہت نیچے جا چکی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں اس صورت میں بھی انہیں فروخت کر دیا جائے؟“

”ہاں، میں یہ چاہتا ہوں۔“ رائن نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون لائن منقطع ہو گئی۔ گلبرٹ نے دوبارہ نمبر ملایا اور لائن ملتے ہی کہا۔

”مسٹر ارنسٹ! کیا آپ ایک بار پھر تصدیق...“

”سوری... میں مسٹر ارنسٹ کا ڈاکٹر جان ولیم بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے بات کاٹ کر کہا گیا۔ ”وہ بہت کمزور ہیں اور زیادہ دیر بات نہیں کر سکتے۔“

”ابھی مسٹر ارنسٹ نے ایک اہم معاملے میں فیصلہ کیا ہے جس کا تعلق ان کے بزنس سے ہے۔ کیا ان کی دماغی حالت ایسی ہے کہ وہ اس قسم کا کوئی فیصلہ کر سکیں؟“

”بالکل، دماغی لحاظ سے وہ پوری طرح چاق و چوبند ہیں۔ مسئلہ ان کے جسم کا ہے، وہ بہت کمزور ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تمہاری مدد کا شکریہ مسٹر ولیم۔“ گلبرٹ نے کہا اور فون رکھ کر گلوریا کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔

”اب تم مطمئن ہو نا؟“

گلبرٹ نے مذکورہ اسٹاک کی فائلیں جو اس کی تحویل میں تھیں، نکالیں اور گلوریا کو دکھا کر بتایا۔ ”انہیں کیش ہونے میں تین سے چار دن لگ سکتے ہیں۔“

”تین چار دن مسئلہ نہیں ہیں، بات اس سے آگے نہ جائے۔“ گلوریا نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”میں چار دن بعد آؤں گی۔“

نصف گھنٹے بعد اس کی ٹیکسی فلاڈلفیا سے کچھ دور واقع وینے نامی قصبے کے ساتھ واقع خوب صورت پہاڑی ولا میں داخل ہو رہی تھی۔ جدید اور قدیم طرزِ تعمیر کی آمیزش سے یہ حسین عمارت پتھروں اور ماربل کی مدد سے بنائی گئی تھی۔ اس کے اوپر کھپریل کی مخروطی چھتیں تھیں۔ ولا کے چاروں طرف خوب صورت سرسبز پہاڑی تھی اور عقبی ڈھلان کا جنگل بھی ولا میں شامل تھا۔ ڈرائیو وے بلندی پر تھا اس لیے داخلی دروازہ اصل میں پہلے فلور پر تھا۔ یہاں سے سیڑھیاں دوسرے فلور اور گراؤنڈ فلور کی طرف جا رہی تھیں۔ گراؤنڈ فلور سے نیچے موجود ایک سیڑھی تہ خانے کی طرف جا رہی تھی۔ تہ خانے کا ایک راستہ عقبی ڈھلان کے جنگل میں کھلتا تھا۔ گلوریا گراؤنڈ فلور پر آئی جہاں وسیع و عریض نشست گاہ اور لاؤنج تھا۔ وہ بار کے کاؤنٹر پر رکھی بوتل سے مشروب گلاس میں نکالنے والی تھی کہ اوپر سے گلاس کھنکنے کی آواز آئی۔ گلوریا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ریلنگ سے ڈاکٹر جان ولیم جھکا کھڑا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور اس نے دوسرا گلاس گلوریا کو تھما دیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”اس کی حالت کیسی ہے؟“

”ویسی ہی ہے۔“ جان نے جواب دیا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ان میں پرانی بے تکلفی ہے اور وہ صرف رائن ارنسٹ کے حوالے سے نہیں مل رہے تھے۔ گلوریا نے اپنا گلاس خالی کر کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

”میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“

وہ دونوں پہلے فلور پر واقع رائن ارنسٹ کے کمرے میں آئے جہاں اس کا بستر مشینوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی ناک سے آکسیجن کی نلکی لگی تھی اور ایک طرف دل کی دھڑکن بتانے والی مشین لگی تھی۔ لیکن سب سے انوکھی چیز کھانے والی ٹیبل پر رکھا ایک انوکھا اہرام نما آلہ تھا۔ نیچے سے یہ چوکور تھا اور اوپر جاتے ہوئے بتدریج پتلا ہو کر نکیلا ہو گیا تھا۔ اس کے وسط میں ایک آنکھ نما اسکرین تھی جس پر پتلی جیسا دائرہ پنڈولم کی طرح مسلسل دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا اور اس حرکت کے دوران ٹک ٹک کی واضح آواز بھی آ رہی تھی۔ گلوریا نے کبیدہ نظروں سے اس آلے اور اپنے شوہر کو دیکھا جو ساکت لیٹا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ کم سے کم ستر برس کا تھا۔ سر پر مختصر بال اور ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو مکمل طور پر سفید تھی۔ جھریوں سے اس کا چہرہ اور گردن کا نظر آنے والا حصہ بھرا ہوا تھا۔ گلوریا نے سوالیہ نظروں سے جان کی طرف دیکھا۔ ”تم نے اس سے کیسے کہلوایا؟“

”بہت آسانی سے... یہ میرے ٹرانس میں ہے۔“

جان کہتے ہوئے اس کے سرہانے آیا اور مدھم آواز میں بولا۔ ”رائن! تم میری آواز سن رہے ہو؟“

”سن رہا ہوں۔“ اس نے مخصوص بھاری آواز میں کہا۔

”کیا تم دہراؤ گے کہ تم نے کیا کہا تھا؟“

رائن رک رک کر دہرانے لگا جو اس نے گلبرٹ سے کہا تھا اور گلوریا دم بخود سن رہی تھی۔ جان فخر سے مسکرا رہا تھا۔ جب رائن خاموش ہوا تو گلوریا نے کہا۔ ”مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رائن جیسا مضبوط آدمی ایسے بے بس ہو سکتا ہے۔“ گلوریا کہہ کر

باہر نکل آئی۔ جان اس کے پیچھے آیا۔ اس نے گلوریا کو روکتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

''تمہیں اس شخص سے ہمدردی ہورہی ہے جس نے اپنی دولت کے بل بوتے پر تمہیں مجھ سے چھین لیا۔'' اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ ''مجھے اس کی دولت سے غرض نہیں ہے لیکن اسے اس طرح اپنا غلام بنا کر مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔''

''پلیز جان! تم بھول رہے ہو وہ میرا شوہر ہے اور اس نے بے شک مجھے اپنی دولت کے بل بوتے پر حاصل کیا ہے لیکن اس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اور اب بھی اس کی دولت مجھے ملے گی۔''

''کون سی دولت... جس کی تم وارث نہیں ہو؟'' جان کے لہجے میں زہر آگیا۔ ''اس نے تمہارے حق میں وصیت نہیں کی ہے اور تمہیں خود کو اس کا وارث ثابت کرنا ہوگا اور اس کے لیے عدالت جانا ہوگا۔ رائن کے دوسرے رشتے دار اس کے مرتے ہی گِدھوں کی طرح جمع ہوجائیں گے اور ان کے ہوتے تمہیں اس کی دولت اتنی آسانی سے نہیں مل سکتی۔''

گلوریا دوبارہ نیچے آگئی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ جان بھی اس کے پیچھے آیا۔ اس نے کہا۔ ''گلوریا! یہ میرا نہیں تمہارا خیال تھا اور اس کا فائدہ بھی تمہیں ہوگا۔ پھر تم ایساری ایکٹ کیوں کررہی ہو جیسے اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہے؟ حالانکہ میں نے صرف تمہاری خاطر یہ سب کیا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ جرم ہے۔''

گلوریا کے تاثرات ذرا نرم ہوئے...... ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کا فائدہ بھی مجھے ہوگا لیکن اس کے باوجود مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''دیکھو، وہ دو ہفتے سے زیادہ نہیں جیے گا۔'' جان نے اسے سمجھایا۔ ''اس لیے تم فضول سوچوں میں الجھنے کے بجائے جلد از جلد اس سے ساری رقم نکلوانے کی کوشش کرو۔''

''میں نے گلبرٹ کو اسٹاک فروخت کرنے کا کہہ دیا ہے۔ جیسے ہی یہ کام ہوتا ہے، تم رائن سے باقی شیئرز کی فروخت کے اجازت نامے پر دستخط کرالینا۔ ویسے تم نے یہ کرایا کیسے؟ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں گلبرٹ دستخط کو جعلی نہ قرار دے دے۔''

''وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ دستخط سو فیصد رائن کے ہیں۔''

ڈاکٹر جان ولیم تقریباً چالیس برس کا خوبرو شخص تھا۔ طویل قامت اور ورزشی جسامت کی وجہ سے عورتوں کے لیے اس میں بہت کشش تھی۔ جوانی میں وہ اور گلوریا آپس میں دوست تھے پھر وہ محبت کرنے لگے۔ اس وقت جان میڈیکل کی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی جان اپنی تعلیم مکمل کرکے کام شروع کرے گا، وہ شادی کرلیں گے لیکن اس سے پہلے ہی ان کے درمیان رائن ارنسٹ آگیا۔ اس نے نہ جانے کہاں گلوریا کو دیکھ لیا اور پھر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے اپنی دولت سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور بالآخر گلوریا نے اس کا پروپوزل قبول کرلیا۔ جان بے چارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ دس برس بعد رائن ارنسٹ بسترِ مرگ پر تھا۔ جان اور گلوریا کی ملاقاتیں اس کی شادی کے ایک سال بعد ہی شروع ہوگئی تھیں۔ گلوریا رائن سے مطمئن نہیں تھی جس نے اسے کسی خوب صورت کھلونے کی طرح اپنے عالی شان ولا میں سجالیا تھا۔ وہ شادی کو ایک کاروباری تعلق سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔

جان اپنی ناراضی بھول گیا تھا اور گلوریا کی توجہ پر خوش تھا۔ پھر رائن کو کینسر کا انکشاف ہوا، اسے بلڈ کینسر تھا۔ دو سال تک مسلسل اس کا علاج ہوتا رہا۔ بار بار اس کا خون تبدیل ہوا اور بالآخر ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔ رائن نے اپنے آخری ایام اسپتال کے بجائے اپنے گھر میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اسے تمام آلات سمیت گھر منتقل کردیا گیا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس مقرر کی گئی تھی۔ اگاتھا رات کے وقت رائن کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس کا علاج بند کردیا گیا تھا اور اب وہ صرف درد کش گولیوں پر گزارہ کر رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر دن میں ایک بار اسے دیکھنے آتا تھا مگر یہ رسمی دورہ تھا۔ وہ یا کوئی دوسرا بڑا ڈاکٹر اب رائن ارنسٹ کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ جان ولیم اس وقت آتا تھا جب گھر میں صرف گلوریا ہوتی تھی۔ جان ولیم نے بعد میں نفسیاتی علاج میں بھی مہارت حاصل کی تھی اور وہ اس مقصد کے لیے دوائیں اور ہپناٹزم کی تکنیک استعمال کرتا تھا۔ اس نے یہ آلہ بھی ایجاد کیا تھا۔

جب پہلی بار گلوریا کو پتا چلا کہ وہ ہپناٹزم کرسکتا ہے تو اسے تعجب ہوا۔ اس نے جان سے پوچھا۔ ''تم یہ کس طرح کرلیتے ہو؟''

اس پر جان نے پیشکش کی کہ وہ اسے عملی طور پر کرکے دکھا سکتا ہے لیکن گلوریا نے معمول بننے سے انکار کردیا۔ پھر جان نے اسے چھپ کر ایک مریض کو ہپناٹائز کا سیشن

دیکھنے کا موقع دیا۔ یہ نوجوان اور خوب صورت عورت تھی جو اپنے ماضی کے خوابوں سے پریشان تھی۔ گلوریا کو یقین دلانے کے لیے کہ وہ عورت ہپناٹائز ہوچکی ہے، جان نے اسے بے لباس ہونے کا حکم دیا اور اس نے بلا جھجک تعمیل کی پھر اس نے جان کے حکم پر کپڑے پہنے اور اس کے حکم پر وہ سب بھول بھی گئی۔ گلوریا حیران رہ گئی کہ کسی انسان کے ذہن پر اس حد تک قابو پایا جاسکتا ہے کہ وہ دیے جانے والے ہر حکم کی تعمیل کرے۔ چاہے یہ اس کی فطرت اور مزاج کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جان حسبِ معمول شام کے قریب رخصت ہوگیا کیونکہ چھ بجے نرس اگاتھا آجاتی تھی۔ وہ صبح چھ بجے تک ہوتی تھی۔ جانے سے پہلے جان نے رائن کو ٹرانس سے نکال دیا اور اب وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اگاتھا کے آنے کے بعد وہ کچھ دیر تو چپ رہا پھر اس نے درد سے چلانا اور رونا شروع کردیا۔ اگاتھا نیچے لاؤنج میں بیٹھی ہوئی سویٹر بن رہی تھی اور رائن کی چیخوں اور شور سے پریشان گلوریا ٹہل رہی تھی۔ اس نے اگاتھا کی طرف دیکھا۔

''پلیز اوپر جاؤ اور اسے دیکھو۔''

''مسز ارنسٹ! میرے دیکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' اگاتھا نے غصے سے سویٹر لپیٹ دیا اور سلائیاں اس میں گھسا دیں۔ ''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں، اسے اسپتال منتقل کردو۔ پتا نہیں تم نے اسے گھر میں کیوں رکھا ہے؟''

''یہ رائن کا اپنا فیصلہ ہے۔ اسے اسپتال کے خیال سے وحشت ہوتی ہے اور اس نے سختی سے اسپتال جانے سے انکار کردیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ گھر میں مرنا چاہتا ہے۔''

اگاتھا ایڑیاں بجاتی ہوئی اوپر پہنچی جہاں رائن ارنسٹ بستر پر تکلیف سے سر پٹخ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''میرے خدا... یہ درد... اف یہ درد... میری جان بھی نہیں لیتا۔''

''مسٹر ارنسٹ! آپ پُرسکون ہو جائیں۔ پلیز آپ...'' اگاتھا نے کہنا چاہا تو رائن اس پر برس پڑا۔

''تم منحوس صورت بڈھی نرس... تم یہاں کس لیے آئی ہو؟ دفع ہوجاؤ اور اس کتیا کو بھیجو جو میری دولت پر عیش کررہی ہے لیکن دن میں ایک بار بھی یہاں آکر نہیں جھانکتی اور تم جیسی بدصورت عورت کو مجھ پر مسلط کردیا ہے۔'' رائن کہتے ہوئے ہانپنے لگا۔ اسی لمحے گلوریا اس کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ دروازہ کھلا ہوا تھا رائن نے اسے دیکھ لیا اور چلایا۔ ''گلوریا... یہاں آؤ۔''

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی اور اپنے کمرے میں آکر دروازہ بند کرلیا لیکن جب رائن کی کراہتی آواز بدستور اس کے کانوں تک آتی رہی تو وہ واش روم میں آگئی اور پھر اس نے ٹب کا شاور کھول لیا۔ شاور کے شور میں رائن ارنسٹ کی آواز دب گئی تھی۔

☆☆☆

چار دن بعد گلوریا ٹیکسی کرکے گلبرٹ کے دفتر پہنچی۔ اس نے بتایا۔ ''کام ہوگیا ہے۔''

''گڈ...'' گلوریا خوش ہوگئی۔

گلبرٹ نے اسے فروخت کے کاغذات دکھائے۔ ان کے ساتھ بینک ڈرافٹ بھی تھے جو ڈرافٹ جاری کرنے والے بینک کی کسی بھی برانچ سے کیش کرائے جاسکتے تھے۔ تمام کاغذات چیک کراکے گلبرٹ نے کہا۔ ''باقی شیئرز بھی کیش کرانے ہیں؟''

''بالکل... ایک دو دن میں میں تمہیں رائن کا اجازت نامہ لادوں گی۔''

گلبرٹ نے سر ہلایا اور لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا لیکن جب گلوریا نے لفافہ پکڑا تو اس نے گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اس نے کہا۔ ''گلوریا! یاد رکھنا اگر اس دوران میں مسٹر ارنسٹ کا انتقال ہوجاتا ہے تو فروخت کی ساری کارروائی رک جائے گی اور تمہیں اگلے اسٹاک صرف وراثت میں ملیں گے۔''

گلوریا کے ماتھے پر شکنیں آگئیں لیکن پھر اس نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھتی ہوں مسٹر گلبرٹ۔''

آدھے گھنٹے بعد وہ اس بینک میں موجود تھی جہاں کے بینک ڈرافٹ تھے۔ یہ دو ملین ڈالرز کی خطیر رقم تھی۔ گلوریا ایک الگ کمرے میں بیٹھی تھی۔ چند منٹ بعد ایک بینک آفیسر نے گارڈز کے ہمراہ آکر اسے رقم کا سیل بند تھیلا دیا۔ ''مسز ارنسٹ... دو ملین ڈالرز ایک بڑی رقم ہے۔ کیا آپ کو گارڈز کی ضرورت ہے؟''

''نہیں، میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔'' گلوریا نے جواب دیا اور اپنے پرس سے ایک چھوٹا ریوالور نکال کر اسے دکھایا۔ ''میرا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔''

بینک آفیسر نے مطمئن ہوکر سر ہلایا۔ ''کیا آپ اس بینک میں اکاؤنٹ کھلوانا پسند کریں گی؟ ہم اپنے گاہکوں کی بہترین خدمت کرتے ہیں اور ان کے مفادات کا پورا خیال

رکھتے ہیں۔''

''کیوں نہیں... ابھی میرے پاس مزید رقم آنے والی ہے۔'' گلوریا نے کہا، آفیسر خوش ہوگیا۔

''کتنی رقم مسز ارنسٹ؟''

''تقریباً آٹھ ملین ڈالرز اور میں یقیناً اس رقم کا بڑا حصہ بینک میں رکھنا پسند کروں گی۔''

آفیسر کے تاثرات پہلے ہی نیاز مندانہ تھے لیکن آٹھ ملین ڈالرز کا سن کر وہ جیسے گلوریا کے سامنے بچھ جانے کو تیار ہوگیا... اس نے اپنی جیب سے کارڈ نکال کر دیا۔ ''آپ جب چاہیں، مجھے کال کرلیں۔ اس رقم کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''شکریہ۔'' گلوریا نے کارڈ لے لیا۔ ''یہ رقم مجھے نقد ہی چاہیے۔''

آفیسر نے سر ہلایا اور دروازہ بند کرکے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد گلوریا نے سیل اتار کر تھیلا کھولا اور اس میں سے گڈیاں نکال کر اپنے بریف کیس میں منتقل کرنے لگی۔ بریف کیس خاصا بڑا تھا اس لیے ساری گڈیاں آگئیں۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ولا کے سامنے ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ گیراج میں دو شاندار کاریں اور ایک ویگن موجود تھی لیکن گلوریا کے ساتھ کچھ مسئلہ تھا، وہ ڈرائیونگ نہیں کر پاتی تھی اس لیے آمدورفت کے لیے ٹیکسی استعمال کرتی تھی۔ وہ اندر آئی اور اس نے خاموشی سے دروازہ بند کرکے دبے قدموں گراؤنڈ فلور کا رخ کیا۔ وہاں آخر میں آتش دان کے اوپر برما ٹیک کا خوب صورت ریک لگا ہوا تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ اس نے آتش دان کے پاس رکھی برما ٹیک کی ہی رائٹنگ ٹیبل کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک خفیہ بٹن دبایا تو آتش دان کے اوپر لگا ہوا ریک سرک گیا اور اس کے پیچھے موجود تجوری ظاہر ہوگئی۔

جس وقت وہ چابی سے تجوری کھول رہی تھی، اسی لمحے اوپر سیڑھیوں پر ڈاکٹر جان نمودار ہوا اور گلوریا کو دیکھ کر چونک گیا وہ جلدی سے آڑ میں ہوگیا۔ اس وقت گلوریا نے اپنا بریف کیس اٹھا کر اسے تجوری میں رکھا اور اس کا دروازہ بند کرکے تالا لگا دیا۔ پھر اس نے دوبارہ نیچے آکر میز تلے لگا ہوا بٹن دبایا تو ریک سرک کر دوبارہ تجوری کے سامنے آگیا۔ جان وہاں سے دبے قدموں واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد گلوریا اوپر آئی تو جان نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ''تم کہاں گئی تھیں؟''

''رقم لینے۔'' گلوریا نے کہا۔

''رقم لے لی؟''

''ہاں، میں نے بینک میں اکاؤنٹ کھول کر وہیں جمع کرادی ہے۔'' گلوریا نے جھوٹ بولا لیکن جان نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا کہ اس نے گلوریا کو خود خفیہ تجوری میں بریف کیس رکھتے ہوئے دیکھا تھا اور یقیناً بریف کیس خالی نہیں تھا ورنہ اس کے تجوری میں رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بجائے جان نے کہا۔

''تب کیا خیال ہے، اس سے باقی شیئرز کے لیے بھی اجازت نامے پر دستخط کرا لیے جائیں؟ ڈاکٹرز نے دو ہفتے دیے ہیں لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس وقت کومے میں چلا جائے یا دنیا سے گزر جائے۔''

''بالکل، یہ کام ہوجانا چاہیے۔'' گلوریا نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''آج میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ میں کیسے اسے کوئی کام کرنے کو کہتا ہوں تو یہ کرتا ہے۔''

رائن ارنسٹ اس وقت بھی ٹرانس میں تھا۔ اس کے سامنے وہی اہرام نما آلہ رکھا تھا اور اس سے ٹک ٹک کی آواز ابھر رہی تھی۔ جان نے اجازت نامہ کلپ بورڈ پر لگا کر اسے رائن کے ہاتھ کے پاس رکھا اور پھر اس کی انگلیوں میں پین تھما کر بولا۔ ''رائن! تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''سن رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اس کاغذ پر اپنے دستخط کرو۔''

رائن نے بند آنکھوں کے ساتھ پین سے بالکل درست جگہ اپنا دستخط کردیا۔ گلوریا حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ پہلے اجازت نامے پر دستخط اس کے سامنے نہیں ہوئے تھے اس لیے اسے شبہ تھا کہ شاید یہ کام جان نے خود کیا تھا اور وہ اجازت نامہ گلبرٹ کو دیتے ہوئے ڈر رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ گلبرٹ کتنا باریک بین اور محتاط وکیل ہے۔ وہ ہر پہلو پر نظر رکھتا تھا مگر دستخط اصلی تھے اور پھر رائن ارنسٹ نے تصدیق بھی کی تھی کہ اسی نے اجازت نامہ جاری کیا تھا۔ اس سے کام آسان ہوگیا۔ اب رائن نے اس کے سامنے اجازت نامے پر دستخط کیے تھے اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ گلوریا کو حیرت تھی کہ اس نے بغیر دیکھے درست دستخط کیسے کردیے تھے۔ جان نے کلپ بورڈ سے اجازت نامہ گلوریا کو تھمایا۔ ''تمہارا کام ہوگیا... اب یہ بتاؤ کہ مجھے کیا ملے گا؟''

جان کے معنی خیز سوال پر گلوریا کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے

بولی۔ ''جو تم چاہو۔''

جان اس کے اشارے پر کھنچا چلا آیا مگر ابھی وہ محبت کے ابتدائی مراحل میں تھے کہ رائن ارنسٹ کے کمرے کی طرف سے تیز بیل کی آواز آئی جو رہ رہ کر بج رہی تھی۔ جان پریشان ہوکر اٹھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ گلوریا بھی اپنا لباس درست کرتی ہوئی اس کے پیچھے آئی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو جان، رائن کی گردن پر انگلی رکھ کر نبض دیکھ رہا تھا جبکہ دل کی دھڑکن بتانے والے مشین پر لکیر سیدھی آرہی تھی اور ایک مستقل ٹون کی آواز آرہی تھی۔ رائن کا دل رک گیا تھا۔ جان نے جلدی سے اس کے منہ سے سانس کی نلکی الگ کی اور اس کی ناک دباتے ہوئے اس کے منہ سے منہ ملا کر سانس دی اور پھر سینے پر مکے مارنے لگا۔ چند بار یہ مشق دہرانے سے جب رائن کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تو وہ دونوں ہاتھ اس کے سینے کے مقام پر رکھ کر بار بار دباؤ ڈالنے لگا۔ یہ دل کا مساج تھا جس سے بعض اوقات رکا ہوا دل بھی چل جاتا ہے مگر رائن پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور سرخی مائل آنکھیں نیم وا تھیں۔ گلوریا منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ جان نے اس کی طرف دیکھا اور مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ مرچکا ہے۔''

چند منٹ بعد وہ دونوں لاؤنج میں تھے اور وہسکی سے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ جان نے کہا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا، گلبرٹ نے بتایا تھا کہ رائن کی موت کی صورت میں شیئرز فروخت کرنے کی کارروائی رک جائے گی اور پھر مجھے وراثت کے ذریعے یہ سب حاصل کرنا ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے، آٹھ ملین ڈالرز تمہارے ہاتھ سے گئے؟'' جان نے دوبارہ گلاس میں شراب ڈالی۔ وہ عام طور سے اتنی نہیں پیتا تھا کیونکہ ہر اچھے ڈاکٹر کی طرح اس کا بھی یقین تھا کہ شراب کی زیادتی خطرناک ہوتی ہے۔ گلوریا نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں یہ رقم کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی... پلیز کچھ کرو جان۔''

اس نے گلوریا کو دیکھا۔ ''تم جانتی ہو میں رائن کا باقاعدہ ڈاکٹر بھی نہیں ہوں اور نہ اس کے علاج کا مجاز ہوں۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے، میں جس ڈاکٹر سے چاہوں اپنے شوہر کا علاج کراؤں۔''

''نہیں، میں کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

''جان! یہ تمہاری نہیں، ہماری مشکل ہے۔''

''نہیں، یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تم نے میری مدد مانگی اور میں نے مدد کی۔ مجھے اس کا صلہ نہیں چاہیے تھا لیکن اب یہ ایک دوسرا معاملہ بن گیا ہے۔ اب میں نے تمہاری مدد کی اور بات کھل گئی تو میرا لائسنس بھی کینسل ہوگا اور میں جیل جاؤں گا۔''

''پلیز جان۔'' گلوریا اس کے پاس آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ جان کو کس طرح راضی کیا جاسکتا ہے اور اس نے راضی کرلیا۔ کچھ دیر بعد جان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن مجھے کچھ سوچنے دو۔''

''سوچو لیکن یہ کام ہونا چاہیے۔ میں رائن کی موت کا اعلان دو ہفتے سے پہلے نہیں کرسکتی۔''

''اس بار تو چار دن میں رقم مل گئی۔''

''دو ملین ڈالرز کے مقابلے میں آٹھ ملین ڈالرز زیادہ بڑی رقم ہے اور اسے کیش کرانے میں وقت بھی زیادہ لگے گا۔''

''دو ہفتے۔'' جان نے پُرخیال انداز میں کہا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''تہ خانے میں ایک بڑا فریج ہے۔''

''ہاں، اس میں کچن کا سامان رکھا ہے۔''

جان سیڑھیوں سے نیچے تہ خانے میں آیا۔ یہاں سیڑھیاں گھومتی ہوئی جہاں نکل رہی تھیں وہیں ایک بڑا سا ڈیپ فریزر رکھا ہوا تھا۔ جان نے اسے کھولا تو اس میں اوپر تک مختلف چیزوں کے پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے گلوریا کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''تم سچ میں یہ کرنے جا رہے ہو؟''

''لاش محفوظ رکھنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ اس طرح سے لاش زیادہ عرصے محفوظ رہے گی۔ جب اسے باہر نکالیں گے تو کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوسکتی ہے۔''

''نہیں ہوگی... میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے پتا ہے کہ فریز کی ہوئی لاشیں برسوں محفوظ رہ سکتی ہیں بشرطیکہ انہیں نمی سے بچایا جائے۔''

گلوریا نے فریزر کی طرف دیکھا جس میں دروازے پر سائیڈوں اور چیزوں پر برف کی تہ جمی ہوئی تھی۔ ''اس میں تو نمی ہی نمی ہے۔''

"دو ہفتے کی بات ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں تھرمو اسٹیٹ بالکل آخر پر رکھنا ہوگا تاکہ فریزر انتہائی ٹھنڈا رہے۔ اس سے لاش بالکل محفوظ رہے گی۔ ایک بار اس میں ڈالنے کے بعد دوبارہ اسے نہیں کھولنا۔ اس وقت ہی کھولنا جب لاش کو دوبارہ پہلے والی حالت میں لانا ہو۔"

گلوریا اس کے لیے تیار نہیں تھی مگر اس کے ذہن میں آٹھ ملین ڈالرز حاصل کرنے کی اور کوئی تدبیر نہیں آرہی تھی۔ مجبوراً اسے جان کی بات ماننا پڑی۔ پہلے انہوں نے فریزر سے سامان نکال کر اتنی جگہ بنائی کہ رائن کو اس میں لٹا سکیں پھر جان اوپر آیا۔ اس نے رائن کے جسم سے مشینوں کے تار اور دوسری چیزیں الگ کیں اور اسے صرف لباس میں نیچے لانے لگا۔ رائن بیمار ہونے کے باوجود اچھا خاصا وزنی تھا اور جان اسے اٹھا نہیں سکتا تھا اس لیے وہ اسے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹتے ہوئے نیچے لے جانے لگا۔ گلوریا سے دیکھا نہیں گیا۔ وہ لاؤنج میں آگئی۔ اس کے سامنے جان رائن کی لاش کھینچ کر تہ خانے میں لے جانے لگا تو اس کی آستین ریلنگ کے لٹو میں پھنس گئی۔ جان اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا ورنہ وہ نیچے گرتا اور آستین پھٹ جاتی۔ اس نے گلوریا کو آواز دی۔

"یہاں آؤ، میری مدد کرو۔"

"میں نہیں کرسکتی... میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتی۔" وہ دور سے بولی۔

"خدا کے لیے گلوریا... کیا حماقت ہے؟ پلیز! اس کی آستین نکالو ورنہ یہ پھٹ گئی تو بعد میں شبہ ہوسکتا ہے کہ کس وجہ سے پھٹی ہے جبکہ یہ خود سے بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔"

بادلِ ناخواستہ گلوریا آگے آئی اور اس نے ڈرتے ڈرتے ریلنگ میں پھنسی رائن کی آستین آزاد کرائی اور جان اسے کھینچ کر تہ خانے کی طرف لے جانے لگا۔ اسی لمحے کال بیل بجی۔ گلوریا نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کون آگیا؟"

جان نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ "اگا تھا ہو گی... تم جاؤ اور اسے کہو کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں کہوں؟"

"نہیں تو میں کہوں؟" جان نے بھنا کر کہا۔

مجبوراً گلوریا اوپر آئی۔ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا تو جان رائن کی لاش تقریباً سیڑھیوں پر لے جا چکا تھا۔ بس اس کے موزوں میں ملفوف پاؤں نظر آرہے تھے۔ جیسے ہی پاؤں بھی غائب ہوئے، اس نے دروازہ کھول دیا۔ اگا تھا اندر آنے لگی تو وہ اس کی راہ میں آگئی۔ "وہ... اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اگا تھا نے چونک کر اسے دیکھا۔ "مسٹر ارنسٹ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں، وہ ٹھیک ہے لیکن اب تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اگا تھا نے کہا۔ "لیکن میری آج کی فیس ادا کرنی ہوگی۔"

"وہ ہو جائے گی۔" گلوریا نے کہا۔ "اور ہاں... کل سے تمہیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اگا تھا نے کسی قدر تعجب سے اسے دیکھا۔ "او کے لیکن پھر مسٹر ارنسٹ کی دیکھ بھال..."

"میں نے سوچا تو مجھے تمہارا مشورہ ٹھیک لگا... میں اسے اسپتال منتقل کررہی ہوں۔"

"ان کے لیے یہی بہتر رہے گا مسز ارنسٹ۔" اگا تھا نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے گلوریا نے سکون کا سانس لیا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے تہ خانے میں آگئی۔ وہاں جان، رائن کو فریزر میں سیدھا لٹا چکا تھا۔ فریزر سات فٹ لمبا اور اس کی چوڑائی دو فٹ سے زیادہ تھی۔ رائن کی لاش بہت آرام سے اس میں آگئی تھی۔ جان نے اسے بالکل سیدھا لٹایا تاکہ اسے بعد میں نکالنے میں کوئی دشواری نہ ہو اس کے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ دیے تھے۔ گلوریا سیڑھیوں پر ہی تھی اور وہیں سے دیکھ رہی تھی۔ جان نے فریزر بند کیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ جان مسکرایا۔

"اب یہ دو ہفتے تک یہاں مزے سے رہے گا، جب تم نے اس کی موت کا اعلان کرنا ہو تو میں اسے یہاں سے نکال لوں گا اور اوپر لے جا کر لٹا دوں گا۔ صرف دو گھنٹے میں اس کا جسم اصل حالت میں آجائے گا اور پھر میں اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کردوں گا اور اسے تدفین سے پہلے اسپتال کے مردہ خانے منتقل کردیا جائے گا۔ اگر لاش پر کوئی ایسا نشان رہ گیا جو فریزنگ سے آتا ہے تو وہ وہاں مٹ جائے گا یا کم سے کم کوئی ہم پر شبہ نہیں کرے گا۔"

گلوریا مطمئن ہوگئی۔ جان اس کام سے فارغ ہوکر اوپر خود کو صاف کرنے چلا گیا۔ گلوریا نیچے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کل ہی گلبرٹ کے پاس جائے گی اور اس سے کہے گی کہ وہ جلد از جلد ان اسٹاکس کو بھی

فروخت کردے۔ جیسے ہی رقم اس کے پاس آئے گی، وہ رائن کی لاش فریزر سے نکلوا دے گی۔ ایک بار وہ یہاں سے نکل گیا تو گلوریا کے ذہن سے بوجھ اتر جاتا۔ اسٹاک کے علاوہ رائن ارنسٹ کی ملکیت میں یہ پہاڑی ولا تھا اور اس کی مالیت بھی کم و بیش ایک ملین ڈالرز تھی۔ اگرچہ گلوریا دس ملین ڈالرز کی مالک بن جاتی لیکن وہ اس ولا کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اسے ولا سے محبت تھی۔ اس نے دس سال یہاں گزارے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس ولا کی ملکیت کے حصول کے لیے عدالت جائے گی اور اب اس کے پاس دولت تھی۔ وہ کوئی اچھا وکیل کرکے ولا بھی حاصل کرلے گی۔ اس کے بعد وہ اور جان یہاں عیش سے رہیں گے۔ اگر جان اس سے شادی نہ بھی کرتا تو اسے پروا نہیں تھی۔ وہ تھا تو اس کا۔

اگلے دن گلوریا صبح سویرے گلبرٹ کے دفتر پہنچ گئی اور اس بار اس نے بنا کسی شک کے رائن کا اجازت نامہ قبول کرلیا۔ البتہ اس نے گلوریا سے کہا کہ وہ دو ہفتے سے پہلے ان کے کیش ہونے کی امید نہ رکھے کیونکہ اسٹاک کی مالیت زیادہ تھی اور یہ مختلف کمپنیوں کے شیئرز تھے۔ اسے بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی، تب کہیں یہ دو ہفتے میں جا کر کیش ہوسکیں گے۔ گلوریا کے پاس اب صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ دو ہفتے کوئی بڑا عرصہ نہیں ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائے گا اور پھر جان نے اسے یقین دلایا تھا کہ دو ہفتے میں رائن کی لاش کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ جب وہ اسے فریج سے نکالیں گے، تب وہ بالکل ایسی تازہ ہوگی جیسے اس کا چند گھنٹے پہلے انتقال ہوا ہو۔ وہ واپس گھر آئی تو شام ہورہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گھر میں اکیلی تھی اور اسے خوف محسوس ہوا۔ صبح تک جان اس کے ساتھ رہا تھا پھر وہ اپنے کلینک چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد گلوریا بھی باہر نکل گئی تھی اور وہ جان بوجھ کر دیر سے آئی تھی۔

گلوریا کا بیڈروم رائن کے کمرے سے کچھ فاصلے پر تھا اور وہاں جاتے ہوئے اسے خوف آرہا تھا۔ وہ نیچے لاؤنج میں آگئی۔ وہ سوچ رہی تھی اگر یہ ولا اسے مل گیا تو ضروری نہیں ہے وہ یہاں رہے، وہ شہر میں کوئی اپارٹمنٹ بھی لے سکتی تھی۔ اسے یہ ولا اچھا لگتا تھا مگر اسے یہاں ڈر لگ رہا تھا۔ گلوریا کاؤنٹر پر اپنے لیے سوڈا نکال رہی تھی کہ اچانک اسے تہ خانے کی طرف سے عجیب سی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر سیڑھیوں تک آئی۔ آواز یقینی طور پر

نیچے سے آئی تھی اور اسے محسوس ہوا جیسے رائن کے کراہنے کی آواز ہو۔ وہ بے دھیانی میں تھی اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ آواز ایسی ہی تھی۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ سیڑھیوں سے نیچے جاتی۔ وہ کچھ دیر کھڑی سنتی رہی لیکن کوئی آواز نہیں آئی لیکن جیسے ہی وہ جانے کے لیے مڑی پھر وہی آواز آئی اور اس بار گلوریا نے صاف سنا۔ یہ بالکل ایسی آواز تھی جیسے رائن تکلیف سے کراہتے ہوئے نکالتا تھا۔ وہ پلٹ کر اندھا دھند بھاگی اور اوپر آ کر اس نے اپنا کمرا بند کر کے جان کو کال کی۔

''پلیز جان... تم فوراً یہاں آجاؤ۔''

''کیا ہوا گلوریا؟''

''وہ زندہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے گلوریا کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ جان آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ گلوریا کو لے کر تہ خانے میں آیا۔ وہ اس وقت بھی سیڑھیوں سے نیچے نہیں آئی تھی۔ جان نے فریزر کھول کر رائن کی لاش دیکھی اور گلوریا سے کہا۔

''اسے دیکھو، یہ سو فیصد مردہ ہے۔ کوئی شخص چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت فریزر میں گزار کر کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟''

''میں نے اپنے کانوں سے اس کے کراہنے کی آواز سنی تھی۔''

جان نے ایک بار پھر رائن کی سرد ترین گردن پر نبض تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی پتھر کی طرح اکڑی ہوئی تھی اور اس کا منہ اور پپوٹے اتنی سختی سے بند تھے کہ کوشش کے باوجود نہیں کھلے۔ جان نے فریزر بند کیا اور ربر کے دستانے اتار کر گلوریا کے ساتھ اوپر آیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم نے کوئی اور آواز سنی ہوگی یا پھر وہم ہوا ہوگا۔ بہر حال رائن زندہ نہیں ہے۔''

''پلیز جان! میری بات کا اعتبار کرو۔''

''سنو گلوریا... کل میرے کئی اہم اپائنٹمنٹ ہیں اور مجھے کل کے دن کے لیے تازہ دم ہونا ہے۔ اس لیے اب یہ فضول بحث بند کرو۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' گلوریا نے اسے تیاری کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں واپس جا رہا ہوں۔''

''پلیز نہیں... تم یہیں رکو۔ میں آج رات اکیلی نہیں رہ سکتی۔'' گلوریا نے اس کے بازو کو تھام لیا۔ ''پلیز...''

جان نے اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لی۔

''او کے...''

جان نے سونے سے پہلے ولا کے سوئمنگ پول میں تیراکی کی۔ پھر وہ سونے کے لیے بستر پر آ گیا۔ اس نے اہرام نما آلہ سامنے ریک پر رکھ کر آن کر دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ گلوریا نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''میں سونے جا رہا ہوں۔ میں خود کو ہپناٹائز کر رہا ہوں۔ اب میں صبح چھ بجے ہی بیدار ہوں گا۔ اس طرح مجھے بہت اچھی اور گہری نیند آتی ہے۔ صبح میں تازہ دم اٹھتا ہوں۔''

''اس دوران میں کچھ ہوا تو...''

''کچھ نہیں ہوگا اور مجھے اٹھانے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میرا دماغ حکم کے مطابق مجھے چھ بجے ہی اٹھائے گا۔ اس سے پہلے قیامت بھی آجائے، تب بھی میں بیدار نہیں ہوں گا۔''

''اس طرح میں اکیلی رہوں گی۔'' گلوریا نے کہا۔

''تمہیں روکنے کا فائدہ...؟''

جان نے شانے اچکائے اور بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ گلوریا کو نیند نہیں آ رہی تھی، وہ کرسی پر آ بیٹھی۔ باہر موسم خراب ہو رہا تھا۔ بادل آئے ہوئے تھے اور رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ گلوریا کو اونگھ آ گئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ اسی لمحے بجلی چمکی تھی اور اس کی گڑگڑاہٹ سنائی دی تھی لیکن اسے لگا جیسے پھر وہی کراہنے جیسی آواز آئی ہو۔ وہ اپنا گاؤن لپیٹتی ہوئی نیچے آئی۔ لاؤنج میں آ کر اس نے تہ خانے کی سیڑھیوں کے پاس رک کر سنا مگر کوئی آواز نہیں تھی۔ چند لمحے بعد نیچے سے کراہنے کی آواز آئی۔ گلوریا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن وہ ہمت کر کے سیڑھیوں سے نیچے آئی۔ آخری سیڑھی پر اس نے رک کر فریزر کی طرف دیکھا۔ وہ بند تھا۔ گلوریا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اچانک بہت تیز اور واضح آواز آئی۔ رائن کی آواز... اس نے کراہنے کے ساتھ کہا تھا۔ ''گلوریا... میری مدد کرو۔''

اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ پلٹ کر اندھا دھند بھاگی۔ اوپر آ کر اس نے جان کو جھنجوڑا، اسے آوازیں دیں لیکن وہ بے سدھ پڑا رہا۔ گلوریا نے اسے گالی دی اور پھر اٹھ کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ اس ساری رات وہ جاگتی رہی۔ صبح چھ بجے جان اپنے وقت پر بیدار ہوا تو گلوریا نے اسے رات کی بات بتائی لیکن اس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کلینک جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ گلوریا اتنی خوف زدہ تھی کہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے

گی۔ جان نے اسے پیشکش کی۔ ''تب میرے اپارٹمنٹ چلو... جب تک یہ معاملہ نہیں نمٹ جاتا، تم وہیں رہو۔''

گلوریا مان گئی۔ اس نے اپنا کچھ مختصر سامان سمیٹا اور جان کے ساتھ ولا سے روانہ ہو گئی۔ اس نے پہلے گلوریا کو اپنے اپارٹمنٹ چھوڑا اور پھر کلینک چلا گیا۔ آنے والے ایک ہفتے وہ وہیں رہی۔ جان صبح چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ اس کے بعد اس کا وقت گلوریا کے لیے ہوتا تھا۔ ان چند دنوں میں وہ بہت خوش رہی اور اپنی ساری پریشانی بھول گئی لیکن کبھی کبھی خیال آتا کہ رائن کی لاش فریزر میں بند اس کی منتظر ہے۔ ویک اینڈ پر جان کو خیال آیا اور اس نے گلوریا سے کہا۔ ''چل کر ایک نظر دیکھنا چاہیے کہیں کوئی غیر متوقع بات نہ ہوئی ہو۔''

''کیسی غیر متوقع بات؟''

''اگر شارٹ سرکٹ ہی ہو گیا تو فریزر بند ہونے سے سارا پلان فیل ہو جائے گا۔''

گلوریا مان گئی۔ وہ ڈنر کے بعد ولا پہنچے۔ جان نے نیچے جا کر فریزر کھولا۔ فریزر اپنا کام کر رہا تھا اور رائن کی لاش ویسی ہی موجود تھی۔ اس پر جمی برف کی تہ میں کسی قدر اضافہ ہو گیا تھا۔ گلوریا ذرا فاصلے سے دیکھ رہی تھی۔ جان نے تمسخرانہ انداز میں رائن کی نقل اتاری۔ ''گلوریا! تم کہاں ہو... میرے پاس آؤ؟''

''پلیز ایسا مذاق میں بھی مت کرو۔'' اس نے جھرجھری لی۔

جان کا موڈ اچھا ہو رہا تھا۔ اس نے مذاق جاری رکھتے ہوئے جھک کر رائن سے کہا۔ ''تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''ہاں... سن رہا ہوں۔'' رائن کی مخصوص کراہتی ہوئی بھاری آواز آئی تو گلوریا کے ساتھ جان بھی اچھل پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رائن کا منہ بند تھا لیکن اس کی آواز آئی تھی۔ گلوریا کانپتی آواز میں بولی۔

''دیکھا، میں نے کیا کہا تھا کہ یہ زندہ ہے۔''

''یہ بکواس ہے۔'' جان نے رائن کی گردن ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''یہ ناممکن ہے۔''

''ہم دونوں نے اس کی آواز سنی ہے۔''

''مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ مر چکا ہے۔''

''سنو، اس نے تمہاری آواز سن کر جواب دیا ہے۔ یہ تمہارے ٹرانس میں تھا... اس سے پوچھو۔''

جان کو پسینا آ گیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور پھر رائن سے پوچھا۔ ''کیا تم میرے ٹرانس میں ہو؟''

''میں تمہارے ٹرانس میں ہوں۔'' اس کی آواز آئی۔ رائن کا منہ بند تھا مگر آواز آ رہی تھی۔

''تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''میں تمہارے ٹرانس میں تھا پھر میں مر گیا۔'' کہتے ہوئے رائن کا لہجہ بھیانک ہو گیا۔ گلوریا منہ پر ہاتھ رکھے پیچھے ہٹی۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا۔ جان کی حالت بھی خراب تھی لیکن اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

''اب تم کہاں ہو؟''

''میں ایک تاریک جگہ ہوں۔''

''تم کیا دیکھ رہے ہو؟''

''بہت دور روشنی ہے، میں وہاں جانا چاہتا ہوں لیکن میں جا نہیں سکتا۔ میں تمہارے ٹرانس میں ہوں۔ میں دو دنیاؤں میں پھنس گیا ہوں۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے آزاد کر دو... مجھے جگا دو۔''

''پلیز! اسے آزاد کر دو۔'' گلوریا نے گھگیا کر کہا۔

مگر جان نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے فریزر کا دروازہ بند کر دیا اور گلوریا کو لے کر اوپر آ گیا۔ اس نے گلوریا سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی غلطی ہوئی ہے۔ رائن زندہ ہے لیکن ہم اس کی زندگی کا ادراک نہیں کر پا رہے ہیں۔''

''جو تم نے اور میں نے سنا ہے، اس کے بعد بھی تم اسے زندہ تسلیم کر رہے ہو؟''

''دیکھو، اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ اس کا منہ بند ہے، اس کے باوجود وہ بول رہا ہے۔ شاید اس میں کہیں زندگی باقی ہے۔''

''وہ مر چکا ہے۔ وہ اپنے منہ سے کہہ رہا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔'' گلوریا کا لہجہ ہذیانی ہو گیا۔ ''اسے آزاد کر دو۔''

''نہیں، ہمیں اس معاملے میں جلد بازی سے گریز کرنا چاہیے۔'' جان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم یہیں رکو۔''

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں ابھی آتا ہوں۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' جان نے گلوریا کو تسلی دی اور نیچے تہ خانے میں آیا۔ فریزر کا دروازہ کھول کر اس نے اپنی جیب سے چھوٹا سا وائس ریکارڈر نکالا اور اسے آن کرتے ہوئے رائن سے سوال کیا۔ ''رائن! میں تم سے کچھ پوچھوں گا۔''

''پوچھو، میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔''

"کیا تمہیں درد محسوس ہو رہا ہے؟"
"نہیں، میں مر چکا ہوں اور دنیا کا کوئی درد اب باقی نہیں ہے لیکن یہاں خوف اور گھبراہٹ ہے۔ یہ دنیا کی ہر اذیت اور تکلیف سے کہیں بڑھ کر ہے۔"
"کیسا خوف اور گھبراہٹ؟"
"یہاں دوسرے بھی ہیں۔"
"کون دوسرے؟"
"میں نہیں جانتا لیکن وہ میرے پاس آ رہے ہیں۔ پلیز! اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک آئیں، مجھے جگا دو... مجھے آزاد کردو۔"
جان نے ریکارڈر بند کیا اور اسے ریورس کر کے دوبارہ چلایا۔ اس میں رائن کی آواز بھی ریکارڈ ہوئی تھی۔ جان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ ماہر نفسیات تھا اور اس کے لیے یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ اس نے کئی بار ریکارڈنگ سنی۔ وہ سمجھ نہیں پایا کہ دوسرے کون ہیں؟ اس نے رائن سے اس سلسلے میں سوالات کیے مگر وہ کوئی وضاحت نہیں کر پایا کہ وہ کون تھے؟ وہ کیوں اس کے پاس آ رہے تھے اور وہ کیا چاہتے تھے؟ رائن ان سے خوف زدہ کیوں تھا؟ وہ اوپر آیا تو گلوریا صوفے پر بیٹھی ہوئی کانپ رہی تھی۔ اس نے جان سے کہا۔ "میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔"
"ڈیئر... یہ ایک عظیم تجربہ ہے۔"
"بھاڑ میں گیا تمہارا عظیم تجربہ۔" گلوریا نے چلا کر کہا۔ "وہ مر چکا ہے اور میں مزید کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے آزاد کردو تاکہ ہماری جان بھی چھوٹ جائے۔"
"میں ایسا ہی کروں گا۔" جان نے اسے یقین دلایا اور اس کا کوٹ اس کے شانوں پر ڈالا۔ "ہمیں واپس جانا ہے۔"
وہ واپس جان کے اپارٹمنٹ پہنچے جہاں جان نے گلوریا کو ایک سکون آور دوا کی گولی دی تو وہ کچھ دیر بعد سو گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے اور جان جا چکا تھا۔ گلوریا کا سر بھاری تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنے لیے کافی بنائی اور پھر تیار ہو کر ولا کی طرف روانہ ہوئی۔ سارے راستے وہ سوچتی رہی تھی جیسے دل ہی دل میں کوئی پختہ فیصلہ کر رہی ہو۔

☆☆☆

جان صبح جلدی اٹھ گیا تھا۔ وہ تیار ہو کر روانہ ہوا لیکن اس کا رخ کلینک کی طرف نہیں بلکہ ولا کی طرف تھا۔ اس کے پاس باہر کے دروازے کی ایک چابی موجود تھی۔ وہ اندر آیا اور اس نے تہ خانے کا رخ کیا۔ فریزر کا دروازہ کھول کر اس نے ریکارڈر آن کیا اور رائن سے کہا۔ "کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"
"ہاں، میں سن رہا ہوں۔" رائن بولا۔
"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"
"زیادہ خوف اور زیادہ گھبراہٹ۔" اس نے جواب دیا۔
"دوسرے کہاں ہیں؟"
"وہ میرے بہت پاس آ چکے ہیں۔" رائن نے کہا۔ "پلیز! مجھے آزاد کردو اس سے پہلے کہ وہ میرے پاس آ جائیں اور مجھ پر حاوی ہو جائیں۔"
جان نے اس کی التجا نظر انداز کر کے اگلا سوال کیا۔
"یہ کیا چاہتے ہیں؟"
"یہ میری مدد سے اس دنیا میں آنا چاہتے ہیں کیونکہ میں اس وقت دونوں دنیاؤں کے درمیان ایک واسطہ ہوں۔"
"وہ اس دنیا میں کیوں آنا چاہتے ہیں؟"
"کیونکہ وہ روشنی کی طرف نہیں جا سکتے، ان کا مقدر تاریکی ہے اس لیے وہ دنیا میں آنا چاہتے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے آزاد کردو... اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔"
جان کے لیے یہ اہم بات نہیں تھی کیونکہ وہ روحانیت کا قائل نہیں تھا۔ اس کے خیال میں منطق سے سب ثابت کیا جا سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے نیا تجربہ تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس کی وجوہات کا پتا بھی چلا لے گا اور اگر وہ کامیاب رہا تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ وہ ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔ وہ ابھی رائن سے سوالات کر رہا تھا کہ اسے اپنے پاس آہٹ محسوس ہوئی اور اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر دیکھتا، لگاتار دو فائر ہوئے۔ دونوں گولیاں رائن کے چہرے پر لگیں۔ فریزر کی دیوار پر جما ہوا خون بکھر گیا تھا۔ فائر کرنے والی گلوریا تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود چھوٹے سے ریوالور سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے جان کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولی۔ "اب یہ یقیناً مر چکا ہے۔"
وہ پلٹ کر سیڑھیوں سے اوپر آ گئی۔ جب جان اس کے پیچھے اوپر آیا تو وہ اپنے لیے گلاس میں شراب انڈیل رہی تھی مگر وہ بالکل پرسکون تھی۔ البتہ جان ہیجان میں تھا، وہ بولا۔ "کیا تم جانتی ہو تم نے کیا کیا ہے؟ اب لاش پر گولیوں کے نشانات پر کیا جواب دو گی؟"
"کسی کو جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔ "تم جنگل میں ایک قبر کھودو گے۔ ہم اس

میں رائن کو دفن کریں گے۔"
"جنگل میں قبر؟" جان بولا۔ "دوسروں کو کیا جواب دیں گے؟"
"کسی کو جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ہفتے بعد ہمیں آٹھ ملین ڈالرز مزید مل جائیں گے۔ وہ لے کر ہم ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جائیں گے۔"
"اگر لاش مل گئی تو..." جان کسی قدر پرسکون ہونے لگا۔
"تم گہرا گڑھا کھودو گے اور یہ جنگل دس ہیکٹر رقبے پر ہے۔ یہ ولا کا حصہ ہے لیکن اس پر کسی قسم کی تعمیرات کی اجازت نہیں ہے جس سے ماحول متاثر ہو۔ اس لیے امکان بہت کم ہے کہ لاش دریافت ہوگی اور دس ملین ڈالرز کے ساتھ ہم کہیں بھی جا کر شناخت بدل کر رہ سکتے ہیں۔"
"ہم..." جان نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں اس میں شامل نہیں ہوں۔"
"تم اس میں شروع سے اب تک شامل ہو۔" گلوریا نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہے؟"
"میں انکار کردوں گا... ہر بات سے۔"
"کیا تم ایسا کر سکو گے؟"
جان کا انکار کمزور تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہو چکا ہے اور اگر بات پولیس تک گئی تو وہ برابر کا مجرم ٹھہرے گا۔ اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اب شامل رہے اور گلوریا کو مزید کوئی حماقت نہ کرنے دے۔ اس کا تحقیق کا ارادہ ناکام ہو گیا تھا مگر وہ گلوریا کی دولت میں حصے دار بن سکتا تھا۔ وہ اسے انکار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ جس طرح اسے گلوریا کی ضرورت تھی، اسی طرح اسے بھی جان کی ضرورت تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"
"گڈ! اب ہمیں رات میں یہ کام نمٹا لینا ہے۔ تم سورج ڈوبتے ہی گڑھا کھودنا شروع کر دینا اور کم سے کم چھ فٹ گہرا ہو ورنہ کسی جانور نے سونگھ کر لاش کھود کر نکال لی تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"
"میں سمجھتا ہوں۔" جان نے کہا۔
یہ طے کرنے کے باوجود کہ انہوں نے کیا کرنا ہے، وہ سارا دن پریشان اور مضطرب رہے۔ آج جان بھی اپنی حد بھول کر پیتا رہا۔ شام کے وقت موسم پھر خراب ہونے لگا۔ آسمان پر گہرے بادل جمع ہو رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہوگی۔ جان فکر مند ہو گیا لیکن گلوریا کے خیال میں یہ اچھا تھا۔ اس موسم میں یہاں کسی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور کوئی جان کو قبر کھودتے بھی نہ دیکھ پاتا۔ سورج ڈوبتے ہی جان نے کپڑے بدلے اور اپنا سوٹ اتار کر صرف نیکر میں روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس فی الحال یہی ایک سوٹ تھا اور وہ اسے مٹی سے بچانا چاہتا تھا۔ تہ خانے کے عقبی جنگل میں کھلنے والے دروازے سے وہ بیلچہ لے کر باہر نکلا۔ گلوریا لاؤنج میں تھی۔ موسم کی خرابی نمایاں ہو رہی تھی۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گلوریا نے اوپر جا کر کھڑکی سے دیکھا تو جان کچھ دور ایک جگہ گڑھا کھود رہا تھا۔ بجلی اب اتنے تواتر سے چمک رہی تھی کہ باہر روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی مگر ولا کی تیز روشنیاں جنگل کو منور کر رہی تھیں۔
گلوریا نیچے آئی، اچانک بادل گڑگڑائے اور اسے لگا جیسے نیچے تہ خانے سے رائن کی آواز آئی ہو۔ اس نے اپنا وہم سمجھا تھا لیکن وہ تہ خانے کی سیڑھیوں کے پاس سے گزری تو اسے اندر روشنی میں دیوار پر سائے سے بنتے محسوس ہوئے۔ وہ چونک گئی پھر تھوڑا آگے آئی اور سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "نیچے کون ہے؟"
"میں ہوں۔" رائن کی مخصوص آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی دیوار پر اس کا سایہ نمودار ہوا۔ گلوریا کی چیخ

قائد کی باتیں

1- قائداعظم کی مادری زبان گجراتی تھی۔
2- قائداعظم نے 1929ء میں غازی علم دینؒ کے مقدمے کی پیروی کی۔
3- قائداعظم نے 10 اکتوبر 1913ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔
4- قائداعظم کے انتقال پر 40 دن قومی پرچم سرنگوں رہا۔
5- قائداعظم پر 26 جولائی 1943ء میں رفیق صابر نے قاتلانہ حملہ کیا۔
6- قائداعظم کے پاسپورٹ کا نمبر 400878 جو کہ 4 جولائی 1936ء کو جاری ہوا۔
7- قائداعظم کی نماز جنازہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھائی۔
8- قائداعظم نے مئی 1939ء میں اپنا وصیت نامہ تحریر کروایا۔

نکلی اور وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹی۔ سایہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور گلوریا پیچھے ہٹ رہی تھی۔ وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پاس تھی۔ رائن کی کراہنے جیسی آواز آرہی تھی۔ پھر وہ سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر گولیوں کے نشانات تھے اور اس پر جم جانے والی برف پگھل رہی تھی۔ وہ بہت مشکل سے لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

گلوریا نے خود سے کہا۔

”نہیں، یہ تم نہیں ہو۔“

”ہاں، یہ میں نہیں ہوں... یہ دوسرے ہیں جو مجھے باہر لائے ہیں... میں مر چکا ہوں... اب یہ مجھے استعمال کر رہے ہیں۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو، تم مرے نہیں ہو۔“ گلوریا پیچھے ہٹنے لگی۔

”میں مر چکا ہوں... میں کہہ رہا تھا کہ مجھے آزاد کر دو، مجھے بیدار کر دو۔“

گلوریا نے کوٹ سے ریوالور نکالا اور رائن پر فائر کیا۔ گولی اس کے سینے میں اتر گئی مگر وہ رکا نہیں۔ ”بیکار ہے گلوریا... میں مر چکا ہوں۔ اب تم مجھے مزید نہیں مار سکتیں۔“

رائن قریب آرہا تھا۔ گلوریا نے پے در پے فائر کیے مگر رائن نہیں رکا۔ نزدیک آکر اس نے گلوریا کا ریوالور والا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے موڑ کر اس کے سر کی طرف لے جانے لگا۔ گلوریا مزاحمت کر رہی تھی اور ریوالور کی نال کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر رائن کے ہاتھوں میں جیسے شیطانی طاقت تھی۔ رفتہ رفتہ ریوالور کی نال گلوریا کے سر کی طرف ہو گئی۔

☆☆☆

جان زیرِ لب رائن اور گلوریا کو برا بھلا کہتے ہوئے بیلچہ چلا کر مٹی کھود رہا تھا۔ یہ ایک پیالے نما جگہ تھی اور یہاں پہلے سے گڑھا تھا۔ اسے امید تھی کہ اسے زیادہ دیر نہیں کھودنا پڑے گا۔ یہاں مٹی بھی نرم تھی، آسانی سے نکل رہی تھی۔ بادلوں کی گرج چمک کے ساتھ ہوا بہت تیز تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ اچانک اسے لگا جیسے ولا میں فائر ہوا ہو۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ چند لمحے بعد پے در پے کئی فائر ہوئے تو وہ بیلچہ پھینک کر ولا کی طرف بھاگا۔ تہ خانے والے راستے سے وہ اندر آیا اور جب فریزر کے پاس پہنچا تو چند لمحے کے لیے خود منجمد ہو گیا۔ فریزر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس سے رائن کی لاش غائب تھی۔ وہ سیڑھیوں پر بھاگا کہ اوپر ایک فائر اور ہوا۔ وہ بھاگتا ہوا ہال میں آیا تو اس نے اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پاس گلوریا کو تڑا مڑا پڑے پایا۔ اس کے سر کے پاس ماربل فرش پر خون پھیلا ہوا تھا۔ جان نے اسے دیکھا۔ گلوریا کا ریوالور اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور وہ مردہ لگ رہی تھی۔

”میرے خدا۔“ جان نے کہا۔ اسی لمحے اسے سیڑھیوں کے اوپر کسی کی حرکت کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ رائن تھا۔ جان چلایا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟“

رائن نے سر گھما کر اسے دیکھا اور عجیب کراہتے انداز میں ہنسا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ مجھے آزاد کر دو... اب دوسرے مجھے استعمال کر رہے ہیں... وہ یہاں آچکے ہیں۔“

”رک جاؤ، میں تمہارا ماسٹر ہوں۔“ جان نے کہا۔ ”میں تمہیں جاگنے کا حکم دیتا ہوں۔“

رائن پھر ہنسا۔ ”اب بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”میں پانچ تک گنوں گا اور تم جاگ جاؤ گے... ایک... دو... تین۔“

رائن کی شیطانی ہنسی تیز ہونے لگی۔ ”اب کچھ نہیں ہو سکتا... بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”چار... پانچ۔“ جان نے گنتی مکمل کی۔ رائن نے اسے دیکھا اور پھر اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گیا۔ جان واش روم میں آیا۔ اس نے جلدی سے اپنا جسم صاف کیا، اوپر آکر کپڑے پہنے پھر اس نے گلوریا کے پرس سے تجوری کی چابی نکالی اور آتش دان کے اوپر لگا ریک کا خفیہ بٹن دبا کر کھولا۔ تجوری میں بریف کیس اسی طرح رکھا ہوا تھا جس میں دو ملین ڈالرز کی رقم تھی۔ جان نے ایسی تمام جگہوں سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے جہاں اس کے نشان اسے پکڑوا سکتے تھے۔ عام جگہوں کی اسے پروا نہیں تھی۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ گلوریا کا پرانا دوست ہے اور اکثر اس کے گھر آتا تھا، اس لیے انگلیوں کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ رائن کی اوندھے منہ پڑی لاش کے پاس سے ہوتا ہوا وہ باہر آیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کے خیال میں یہ بہت اچھا ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بتا دے گی کہ رائن گولیاں لگنے سے پہلے مر چکا تھا اور گلوریا نے خودکشی کر لی۔ اس کا کہیں نام نہیں آئے گا۔

گھر پہنچ کر اس نے غسل کیا اور پھر نوٹوں کی گڈیاں نکال کر انہیں صوفے پر سجا دیا اور دیکھنے لگا۔ وہ خوشی سے پاگل اور بے قابو ہو رہا تھا۔ دو ملین ڈالرز بہت بڑی رقم تھی

اور وہ ٹھاٹ سے رہ سکتا تھا۔ اب اسے اس اپارٹمنٹ میں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس سے کہیں بہتر جگہ لے سکتا تھا۔ وہ شہر میں زیادہ اچھی جگہ اپنا شاندار کلینک قائم کر سکتا تھا جہاں اونچے طبقے کے لوگ آتے اور وہ ان سے کئی گنا زیادہ فیس لے سکتا تھا۔ پھر اسے کم فیس کے بدلے سارا سارا دن لوگوں سے سر کھپانا نہیں پڑتا اس سے زیادہ اسے چند لوگوں سے مل جاتا۔ اس نے اہرام نما آلہ نکالا اور اسے سامنے میز پر رکھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ حرکت کرتی آنکھ نے اسے مسمرائز کر کے سلا دیا۔ کچھ دیر بعد بالکونی کی طرف سے کھلنے والا سلائڈنگ ڈور سرکا اور تیز ہواؤں سے صوفے پر رکھے نوٹ اڑنا شروع ہو گئے۔ ذرا دیر میں پورے کمرے میں نوٹ ہی نوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ پھر اہرام نما آلہ خود بہ خود ہوا میں بلند ہو کر سوتے ہوئے جان کے اوپر آیا۔ اس کی نوک کا رخ نیچے کی طرف تھا اور اچانک ہی وہ تیزی سے نیچے گرا اور جان کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔ جان کی آنکھیں اور منہ کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

گلوریا کراہ کر اٹھی۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے بیٹھ کر اپنی کنپٹی پر ہاتھ لگایا۔ گولی اس کے سر میں نہیں گھسی تھی بلکہ کنپٹی کو چھو گئی تھی۔ کھال پر خراش آئی تھی مگر سر محفوظ رہا تھا۔ خراش سے کچھ خون بھی نکلا تھا۔ بالکل آخری وقت میں اس نے ریوالور کی نال کا رخ موڑ دیا تھا اسی لیے بچ گئی تھی۔ وہ اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر تک آئی۔ اس نے برانڈی کا ایک گلاس لیا تو اس کی حالت بہتر ہو گئی۔ کچن میں سنک سے پانی لے کر اس نے زخم صاف کیا اور لاؤنج میں آئی۔ پھر اسے جان کا خیال آیا، اس نے باہر نکل کر دیکھا، اس کی کار غائب تھی۔ وہ پورے ولا میں کہیں نہیں تھا۔ جنگل میں کھدی ہوئی قبر ایسے ہی نیم کھدی حالت میں تھی اور داخلی دروازے کے سامنے رائن کی گل سڑ جانے والی لاش پڑی تھی۔ اچانک اسے کچھ خیال آیا اور وہ جلدی سے خفیہ تجوری تک آئی۔ اسے کھولا اور اندر سے بریف کیس غائب پا کر اس نے گہری سانس لی۔ جان اسے مردہ سمجھ کر رقم لے کر فرار ہو گیا تھا۔ گلوریا نے ٹیکسی کے لیے کال کیا، اپنا حلیہ بہتر کیا اور زخم پر چپکنے والی پٹی لگا کر اس نے ہیٹ پہن لیا۔ اس سے زخم چھپ گیا تھا۔ دو پین کلرز لینے سے اس کی حالت بہتر ہوئی۔ اسے ابھی رائن کی لاش ٹھکانے لگانی تھی لیکن اس سے پہلے جان سے اپنی رقم واپس لینی تھی۔ پھر اس نے ریوالور میں مزید گولیاں ڈالیں اور باہر آگئی۔ ٹیکسی آگئی تھی۔ اس نے جان کے اپارٹمنٹ کا پتا بتایا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ٹیکسی رکی تو گلوریا کو پتا چلا کہ وہ منزل پر پہنچ گئی ہے۔ کرایہ دے کر وہ نیچے اتر آئی۔ موسم اب بھی خراب تھا۔ گرج چمک کے ساتھ ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ جان کا اپارٹمنٹ سترھویں منزل پر تھا۔ گلوریا نے فٹ پاتھ پر قدم رکھا تھا کہ کوئی چیز اس کے سامنے گری اور اس نے دیکھا، وہ سو ڈالر کا ایک نوٹ تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایسے کئی نوٹ ہوا کے دوش پر اڑتے دکھائی دیے۔ وہ تیزی سے اندر لپکی۔ لفٹ کا بٹن بار بار دباتی رہی پھر لفٹ میں گھس کر اس نے عجلت میں سترھویں منزل کا بٹن دبایا۔ کچھ دیر بعد وہ اوپر تھی۔ پرس سے جان کے اپارٹمنٹ کی چابی نکال کر وہ لپکی اور چابی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس نے جان کو آواز دی مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ بیڈ روم میں آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ بیڈ خالی تھا مگر اس کی ریشمی چادر پر خون کا دھبا تھا۔ پورے کمرے میں نوٹ بکھرے ہوئے تھے اور یہی اڑ کر باہر بالکونی میں جا رہے تھے۔ گلوریا نے تیزی سے بالکونی کا دروازہ بند کیا لیکن جان کہاں تھا اور چادر پر یہ خون کا دھبا کہاں سے آیا تھا؟ اس نے پھر جان کو آواز دی۔ وہ دوسرے کمرے میں آئی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ عقب میں کوئی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو جان لاؤنج کی طرف کھلنے والے دروازے پر کھڑا ہوا تھا اور اس کے سینے میں اہرام نما آلہ پیوست تھا۔ اس کی صورت بگڑی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ گلوریا کی طرف بڑھا تو وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی۔ جان اس کی طرف بڑھتے ہوئے بھیانک کھرکھراتی آواز میں بولا۔

”گلوریا... رائن کو میں نے ہپناٹائز کیا تھا۔ اسے میں نے آزاد کر دیا۔“

”مجھ سے دور رہو۔“ گلوریا دیوار سے جا لگی۔

”تم... تم مر چکے ہو؟“

”ہاں میں مر چکا ہوں۔ اب دوسرے مجھے چلا رہے ہیں۔ میں نے رائن کو آزاد کر دیا تھا لیکن مجھے کون آزاد کرائے گا؟“

کہتے ہوئے جان نے اچانک ہی گلوریا کا گلا دبوچ لیا اور اس کی آخری چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

قسط :54

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے ، یہ تو بس ہو جاتی ہے ۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے ۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے ۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
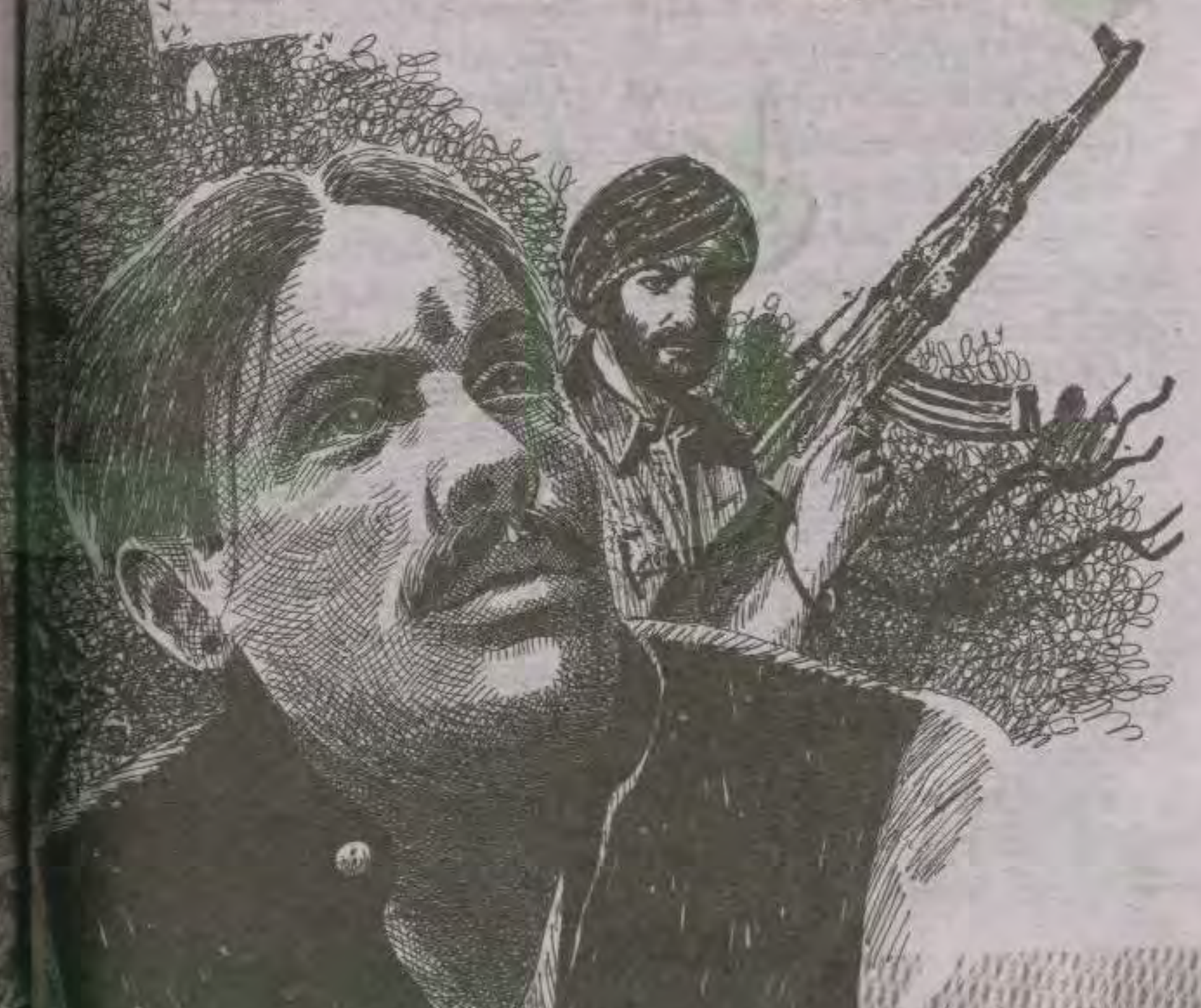
...سوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر تحصیل ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا

ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی [illegible] بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر [illegible] شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار [illegible] اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیو یار [illegible] جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سرا [illegible] گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں [illegible] ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شالنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے [illegible] علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ [illegible] ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شاز مین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے تاہم [illegible] ہے۔ شاز مین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ را والے شاز مین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے [illegible] میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سنتھیا، شاز مین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ [illegible] کو... مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شاز مین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شاز مین [illegible] خودکشی کر لیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو [illegible] ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان [illegible] شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہ دونوں اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہریار دلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار [illegible] کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ سلو اور شہریار ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا [illegible] بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جاوید علی، ورائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو سینیورا کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو [illegible] اور شہریار اندر اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر شہریار اور سلو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتے ہیں اور اسے اغوا کر لیتے ہیں لیکن ان کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے اور انہیں پریم ناتھ کو گاڑی میں چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ ادھر ماہ بانو [illegible] چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ ادھر شہریار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ بھائی جی ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ وہ لوگ اشوک کو قتل کر دیں۔ اسلم، ماہ بانو کا سراغ لگاتے لگاتے اس بات کا پتا لگا لیتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں کہیں رکھا گیا ہے۔ وہ جنگل میں نکل پڑتا ہے۔ ادھر شہریار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو را کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم انہیں عارضی طور پر عائشہ نامی عورت کے گھر پناہ لینی پڑتی ہے۔ ادھر اسلم، ماہ بانو کو قید کرنے والوں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی ماہ بانو کے ساتھ قید کر لیا جاتا ہے۔ اسلم ایڈی کی مدد سے قید سے نکل جاتا ہے اور مارک اور دیگر افراد پر قابو پا کے ماہ بانو کو وہاں سے نکال لاتا ہے۔ شہریار، سلو اور ڈاکٹر فرحان ممبئی... جاتے ہیں اور بھائی جی کے ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں اور اشوک کو مارنے کا پروگرام بناتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں تاہم وہاں موجود پولیس انہیں گھیر لیتی ہے اور ان کی گاڑی کا پولیس کی گاڑی سے خطرناک تصادم ہوتا ہے جس میں دونوں گاڑیوں کے سواروں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

آرلینڈو کے خوب صورت ائرپورٹ پر نظر آنے والا وہ مسافر شخصیت کے اعتبار سے بہت شاندار لگ رہا تھا۔ وہ لمبے قد اور مضبوط جسامت کا مالک تھا اور اس کی گوری رنگت پر نیوی بلیو کلر کا تھری پیس سوٹ خوب بچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نیلگوں پتلیاں نیوی بلیو کلر کے انعکاس کی وجہ سے کچھ اور بھی نیلی لگ رہی تھیں اور ایک مشرقی ملک کا باشندہ ہونے کے باوجود وہ کسی طور یہاں موجود امریکیوں سے زیادہ مختلف نہیں لگ رہا تھا۔ یہ شخص مشابرم خان تھا جسے اس وقت دیکھ کر گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ ایک عام سا شخص ہے اور ماضی میں ڈرائیور کی معمولی ملازمت کرتا رہا ہے۔ اس کی واجبی سی تعلیم بھی یہاں کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں رکاوٹ نہیں بن پا رہی تھی کہ وہ ایک ایسے خاندان کا حصہ تھا جو نسلوں سے باہر کی دنیا سے پہاڑوں پر آنے والوں کی مہمان داری اور راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے اور جہاں کے بچے بچے کو انگریزی بولنے میں زبردست مہارت حاصل تھی کیونکہ یہ زبان انہوں نے براہِ راست غیر ملکیوں سے سیکھی تھی اس لیے لب و لہجے پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔

یہاں آنے سے پہلے وہ دبئی سے ہوتا ہوا آیا تھا اور شخصیت کی گرومنگ کے سارے مراحل بھی وہیں طے پائے تھے۔ اس وقت اسے دیکھ کر کسی بزنس ایگزیکٹو کا خیال آتا تھا۔ اپنے مختصر سامان سمیت باہر نکلنے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو اس ہوٹل کا پتا بتایا جہاں اس کے لیے پہلے سے کمرا بک تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے سب سے پہلے گلے میں موجود ٹائی کو یوں کھینچ کر نکالا گویا پھانسی کا پھندا ہو اور اب تک وہ طوعاً و کرہاً اسے برداشت کرتا رہا ہو۔ ٹائی سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس نے ذہن نشین کیا ہوا ایک نمبر ڈائل کیا اور "ہیلو" کے جواب میں صرف ایک مختصر جملہ بولا۔

"آئی ایم ہیئر۔"

"اوکے... آدھے گھنٹے بعد۔" دوسری طرف سے بھی انتہائی مختصر جواب دیا گیا جسے سن کر اس نے مطمئن انداز میں سر کو جنبش دی اور انٹرکام اٹھا کر پہلے روم سروس کو دس منٹ بعد اپنے کمرے میں کھانا پہنچانے کا حکم دیا اور پھر خود غسل خانے کا رخ کر لیا۔ پھرتی سے غسل کرنے کے بعد وہ ایک آرام دہ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہن کر باہر نکلا تو خود کو کافی پرسکون محسوس کر رہا تھا ورنہ سوٹ میں اسے اپنا جسم رسیوں سے جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آزادی اور سکون کے اس احساس کے ساتھ ابھی وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی "روم سروس" کی مہذبانہ صدا بھی سنائی دی۔ اس نے ویٹر کو اندر آنے کی اجازت دے دی اور خود بے نیازی سے ایک تپائی پر رکھا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ ویٹر نے بھی اس کی بے نیازی دیکھ کر خاموشی سے ایک جانب رکھی میز پر کھانا لگایا اور واپس جانے سے قبل مہذب لہجے میں پوچھا۔ "اور کوئی خدمت سر۔"

"نو تھینکس۔" اس نے اخبار کے پیچھے سے ہی جواب دیا اور جب یہ محسوس ہوا کہ ویٹر واپس جا چکا ہے تو اخبار واپس تپائی پر ڈال کر خود کھانے کی میز کے سامنے پہنچ گیا۔ کھانے میں اس نے اپنے لیے ویجی ٹیبل نوڈلز اور سی فوڈ پر مشتمل ایک ڈش منگوائی تھی۔ فلائٹ پر وہ صرف ایک چیز سینڈوچ اور کافی کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھا پی سکا تھا وہ بھوک کی شدت کے باعث اس پھیکے اور بدذائقہ محسوس ہونے والے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

اس جیسے آدمی کے لیے زندگی میں آنے والی یہ تبدیلیاں بہت بڑی تھیں۔ اب تک وہ دوسروں کا خدمت گار رہا تھا اس لیے کسی سے خدمت لینا بہت دشوار لگ رہا تھا۔ بیرون ملک سفر اور اعلیٰ ہوٹلوں میں قیام کے مواقع بھی اسے زندگی میں پہلی بار ہی میسر آئے تھے۔ پہلے دبئی اور اب یہاں آکر وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے مسلسل عالمِ خواب میں ہو لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے اس طویل سفر کا مقصد ایک پل کے لیے بھی فراموش نہیں ہوا تھا اور وہ ان تعیشات کو اوپری دل سے برتتے ہوئے بس اس بات کے لیے بے چین تھا کہ کسی طرح موقع ملے اور وہ اس مشن پر کام شروع کر دے جس کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ جب ہی تو اس نے ہوٹل پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اور آدھے گھنٹے کے انتظار کو بیکاری میں نہ گزارنے کے باوجود پوری شدت سے اپنے ملاقاتی کا منتظر تھا۔

کھانا کھانے کا کام بھی اس نے دس منٹ میں نمٹا لیا تھا اور چائے یا کافی کے پروگرام کو اپنے مہمان کی آمد تک موخر کر دیا تھا۔ ویٹر کے جھوٹے برتن سمیٹ کر لے جانے کے بعد بچ جانے والے چند منٹ اس نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے گزارے اور بالآخر ٹھیک تیسویں منٹ پر ابھرنے والی دستک کی آواز کو سن کر لپک کر دروازے تک پہنچا۔

"مجھے مصطفیٰ خان کہتے ہیں۔" دروازہ کھولنے پر ایک مہذب اور خوش شکل شخص نے اپنا تعارف کروایا تو مشابرم خان پوری گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ اندر لے آیا۔

"بڑا اشتیاق تھا مجھے کہ شہریار صاحب کے اتنے قریبی دوست سے مل سکوں۔" مصطفیٰ خان کا ہاتھ تھامے تھامے ہی اس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو اس کے لہجے میں واضح اداسی گھلی ہوئی تھی۔ مصطفیٰ خان فوراً ہی اس کی کیفیت سمجھ گیا۔ مشابرم خان کو اس تک بھیجنے سے پہلے ذیشان نے اسے اس کے جو کوائف فراہم کیے تھے، اس میں اس بات کا بھی تذکرہ تھا کہ خان، شہریار کا بے حد وفادار اور چاہنے والا ملازم ہے اور اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب مشابرم خان سے مل کر اسے خود یہ بات سمجھ آرہی تھی کہ ذیشان نے غلط نہیں کہا تھا۔

اس نے خاموش تسلی کے طور پر آہستہ سے مشابرم خان کا شانہ تھپتھپایا اور پھر اس کے روبرو بیٹھ کر براہِ راست گفتگو کا آغاز کر دیا۔ کسی تکلیف دہ موضوع پر گفتگو کرنے سے بہتر تھا کہ وہ اصل موضوع پر گفتگو کرتے۔

"یہ تو تم پہلے سے ہی جانتے ہو کہ تمہیں یہاں بلانے کا مقصد ماہ بانو کی تلاش کرنا ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں تمام ممکنہ سہولیات اور معلومات میں فراہم کروں گا۔ تمہیں

میرے ایک آدمی کا تعاون بھی حاصل رہے گا لیکن میں خود براہِ راست تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا کیونکہ اس معاملے میں انوالو ہو کر میں خود کو منظر پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اور میرے چند ساتھی یہاں دوسرے کئی اہم کام انجام دے رہے ہیں اور اس معاملے میں ہماری براہِ راست مداخلت سے گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ پہلے ہی مجھے شک ہے کہ ماہ بانو کے اغوا والے واقعے کے بعد میری خفیہ نگرانی کی جا رہی ہے۔ شاید وہ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں اس کے لیے کیا کرتا ہوں اسی لیے میں نے بہتر سمجھا کہ خود براہِ راست ملوث ہونے کے بجائے کسی انجان آدمی کو جس سے میرا تعلق ثابت نہ ہو، یہ کام سونپ دیا جائے۔

''اسی احتیاط کی وجہ سے میں نے تمہیں اپنے گھر کے بجائے ہوٹل میں ٹھہرایا ہے اور یہاں سیدھا اپنی گاڑی میں آنے کے بجائے گاڑی ایک شاپنگ مال کی پارکنگ میں چھوڑ کر خود ٹیکسی سے تم تک پہنچا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طریقے سے میں نے نگرانی کرنے والوں کو ناکام کر دیا ہے اور اب یہ چاہتا ہوں کہ جلد از جلد تمہیں تفصیلات سے آگاہ کر کے خود واپس لوٹ جاؤں۔'' سنجیدگی سے گفتگو کرتا ہوا مصطفیٰ خان اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ شہریار کا قریبی دوست تھا۔

ابتدائی تمہیدی گفتگو کے بعد مصطفیٰ خان اسے دیگر تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے نقشوں کی مدد سے مشابرم خان کو آگاہ کیا کہ جنگل میں داخل ہونے کے راستے کون کون سے ہیں اور اسے کس مقام پر ماہ بانو کی موجودگی کا شک ہے۔ مشابرم خان نہایت توجہ اور سنجیدگی سے ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔ آخر میں مصطفیٰ خان نے اسے اپنے ایک ساتھی سے رابطے کے بارے میں بتایا جو اس کا اس مشن میں ساتھ دیتا۔

''میرا وہ معاون اس مشن کے لیے تمہیں اسلحے سمیت دیگر ضرورت کی اشیا بھی فراہم کرے گا۔ کتنی ہی قیمتی شے درکار ہو، اسے بتاتے ہوئے جھجکنا مت اور یہ یاد رکھنا کہ تمہیں ہر قیمت پر ماہ بانو اور اسلم کو تلاش کرنا ہے۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ گزرتا وقت کہیں نقصانات کو بڑھا نہ دے۔'' مصطفیٰ خان خاصا مضطرب محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی اپنی مجبوریاں نہ ہوتیں تو وہ خود اس کام کے لیے نکل کھڑا ہوتا لیکن جانتا تھا کہ جو کچھ وہ یہاں رہ کر کر رہا ہے، وہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے اس لیے خود پر ضبط کیے رہا تھا۔

''آپ تسلی رکھیں سر۔ میں اپنی طاقت و بساط کے مطابق جو کچھ کر سکا، ضرور کروں گا۔ اس کام میں اگر میری جان بھی چلی جائے تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی۔'' مشابرم خان نے نہایت عزم و خلوص سے یقین دہانی کروائی تو مصطفیٰ خان خوش دلی سے واپسی کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''تم صرف دو آدمی وہاں جا کر کیا کر سکو گے؟''
جاوید علی کے مطالبے پر ملک سبحان نے اسے یوں گھورتے ہوئے سوال کیا جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں یا وہ کوئی بالکل ناقابلِ فہم بات کر رہا ہو۔

''یہ ہمارا مسئلہ ہے ملک! ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں، یہ تو وقت بتائے گا۔ تم صرف اتنا کرو کہ ہمیں خفیہ طریقے سے سرحد کے اس پار آنند فروٹ فارم تک پہنچا دو۔ ہم اس کام کا تمہیں معقول معاوضہ دیں گے اور جو رسک ہو گا، وہ صرف ہمارے لیے ہو گا۔ تمہارا کام صرف ہمیں وہاں لے جانا اور واپس لانا ہے۔ واپسی کے لیے بھی حالات خراب ہونے کی صورت میں تم پابند نہیں ہو گے اور تمہیں آزادی ہو گی کہ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس آ جاؤ۔ ہم زندگی کی پروا کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ مشن مکمل ہو گیا تو ہمارے لیے یہی بہت ہو گا۔ موت کا کیا ہے، وہ تو ایک دن آنی ہی ہے اگر شہادت کی صورت میں آ جائے تو یہ ہمارے لیے خوش نصیبی ہو گی۔'' اس نے ملک سبحان کے حیرت بھرے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا، اس کی تائید اس کے ساتھ کھڑے سلمان کے چہرے کے تاثرات سے بھی ہو رہی تھی۔ یہ عزم اور حوصلہ دیکھ کر ملک سبحان کے لیے مزید بحث کرنا ممکن نہیں رہا۔

''ٹھیک ہے، مجھے آدھا گھنٹا دو۔ میں تیاری کر کے تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔'' اس نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تو وہ دونوں بھی آگے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ جس کام کے لیے جا رہے ہیں، وہ کسی بھی لمحے خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ خطرہ انہیں اپنی جان کا نہیں تھا بلکہ وطن کی عزت و آن کا تھا۔ اگر وہ بھارتی سرزمین پر کوئی کارروائی کرتے ہوئے پکڑے جاتے تو یہ پاکستان کے لیے بہت برا ہوتا۔ بھارتیوں کا مزاج پہلے ہی ایسا تھا کہ وہ پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر بدنام کرنے کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی ڈراما کرتے رہتے اور ان ڈراموں کو سچ ثابت کرنے کے لیے الٹے سیدھے احمقانہ ثبوت بھی فراہم کرتے رہتے تھے۔ ان حالات میں اگر وہ

دونوں ان کے ہاتھ لگ جاتے تو انہیں تو بہت بڑا جیتا جاگتا ثبوت مل جاتا اور وہ دونوں یہ سب نہیں چاہتے تھے۔ اپنی تیاریاں کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کے پاس کوئی ایسی شے موجود نہ ہو جو ان کے پاکستانی ہونے کا ثبوت بن سکے۔

اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اتنی احتیاط برتی کہ سلمان نے اپنی شرٹ کے کالر کے ساتھ چسپاں وہ ٹیگ بھی نکال پھینکا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شرٹ کس کمپنی کی برانڈ ہے۔ اسلحہ ان کے پاس پہلے ہی اتفاق سے روسی ساختہ تھا اور روس کے پاکستان کے مقابلے میں بھارت سے زیادہ قریبی تعلقات تھے۔ اپنے پاس موجود ٹرانسمیٹر انہوں نے یہیں چھوڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا بلکہ وہ اپنے ساتھ کوئی بھی مواصلاتی آلہ نہیں لے کر جا رہے تھے۔ انہیں وہاں جا کر کسی سے کوئی رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہاں جو کچھ کرتے، اللہ کی مدد اور اپنے زورِ بازو پر کرتے۔ زندہ یا مردہ واپس آنا ان کی قسمت پر منحصر تھا۔ کسی صلے یا ستائش کی بہرحال انہیں چاہ نہیں تھی۔ ملک سبحان کے دیے گئے آدھے گھنٹے میں انہوں نے نہ صرف اپنی تیاری مکمل کی بلکہ اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے چوکی کی صورتِ حال سے بھی آگاہی حاصل کی۔ وہاں خاموشی تھی اور کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میجر اسد کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ مستقل اپنے دفتر میں ہے اور ایک بار بھی وہاں سے باہر نہیں نکلا۔ جاوید علی نے اپنے ساتھیوں کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیے بغیر محض اتنا بتایا کہ ممکن ہے، اگلے چند گھنٹوں تک وہ ان سے رابطے میں نہ رہیں اس لیے ایسی صورت میں انہیں خود حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی صوابدید پر فیصلے کرنے ہوں گے۔ ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو نمٹاتے ہوئے آدھا گھنٹا بڑی سرعت سے گزر گیا۔ ملک سبحان آدھے گھنٹے بعد حسبِ وعدہ ان کے سامنے حاضر ہو گیا۔

''سفر کی تیاری ہو گئی ہے۔ آپ لوگ تیار ہیں؟'' اس وقت وہ بہت بدلا ہوا آدمی محسوس ہو رہا تھا۔ شخصیت اس کی پہلے ہی شاندار تھی، اب ایک عجیب سا وقار بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''ہم تیار ہیں۔'' اس کے بدلاؤ کو محسوس کرتے ہوئے جاوید علی نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ وہ لوگ اس وقت ملک سبحان کے ہی ایک ٹھکانے پر موجود تھے۔

''تو ٹھیک ہے پھر آپ میرے ساتھ آ جائیں۔'' وہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر باہر نکل گیا۔ باہر اس کا جواں سال بیٹا ملک عرفان دو ہیوی بائیکس کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک بائیک پرانے ماڈل کی لیکن اچھی حالت میں تھی جبکہ دوسری بالکل نئی نویلی تھی۔

''ان میں سے ایک بائیک میری اور دوسری میرے بیٹے کی ہے۔ میرا بیٹا عادتوں میں مجھ پر گیا ہے اس لیے اس کے شوق بھی میری طرح کے ہیں اور یہ میری ہر بات فوراً سمجھ بھی جاتا ہے۔ آپ کا کام جلدی مانگتا ہے اس لیے ہم نے ان بائیکس پر سفر کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم اس مشن میں شروع سے آخر تک آپ کے ساتھ رہیں گے کیونکہ یہ صرف آپ کے نہیں، ہمارے وطن کا بھی معاملہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ساری زندگی اس وطن میں عیش کرنے کے بعد کم از کم ایک بار تو اس کا حق ادا کر دوں۔ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں ہے کہ میرے اندر یہ خواہش آپ لوگوں کے عزم کو دیکھ کر ابھری ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ جب پیسے کی خاطر اتنی بار جان داؤ پر لگائی جا سکتی ہے تو ایک بار کسی بڑے مقصد کے لیے بھی سہی۔'' بائیکس کے پاس رک کر ملک سبحان نے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو وہ دونوں اللہ کی کرشمہ سازی پر انگشتِ بدنداں رہ گئے۔ وہ مالک و مختار کیسے کیسے کمال دکھاتا ہے کہ ایک اسمگلر پل بھر میں مجاہد کا کردار ادا کرنے کو تیار ہو گیا اور ساتھ ہی اپنے اس بیٹے کو بھی لگا لیا جسے شاید مستقبل میں اس کے دھندے کی باگ ڈور سنبھالنی تھی اور وہ اس مقصد کے لیے تربیت کے مراحل سے بھی گزر رہا تھا۔

''آپ کا جذبہ قابلِ ستائش ہے لیکن ہمیں بہت سی احتیاطیں بھی برتنی ہوں گی۔ سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو بطور پاکستانی شناخت نہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے شناختی کاغذات سمیت جسم پر موجود لباس اور جوتوں تک کا دھیان رکھنا ہو گا۔ اور ہاں، ان بائیکس کے استعمال کے بارے میں بھی سوچنا پڑے گا۔'' اس کے جذبے کو سراہتے ہوئے جاوید علی نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

''فکر مت کرو۔ میں ان ساری باریکیوں کو سمجھتا ہوں اس لیے ہر بات کا دھیان رکھا ہے۔۔۔ اور رہی یہ بائیکس تو یہ تو خود اسمگلنگ کا ہی مال ہے جس کی رجسٹریشن کسی بھی شخص کے نام نہیں ہے۔'' ملک سبحان نے ان کی تسلی کروائی۔ اس کا بیٹا اس دوران میں خاموشی سے کھڑا رہا تھا اور اس کی توجہ بھی اپنی بائیک پر ہی مبذول تھی۔ ویسے بھی انہوں نے اسے اس کے باپ کی نسبت کم آمیز ہی پایا تھا۔

''تو ٹھیک ہے پھر اللہ کا نام لے کر سفر شروع کرتے

ہیں۔" جاوید علی نے بالآخر سفر کے آغاز کی منظوری دے دی۔ پرانی بائیک پر ملک سبحان کے ساتھ وہ خود بیٹھا جبکہ نئی پر عرفان کے ساتھ سلمان۔ دونوں باپ، بیٹے نے بیک وقت بائیکس اسٹارٹ کیں اور جب سفر شروع ہوا تو انہیں اندازہ ہوگیا کہ دونوں میں سے ایک بھی دوسرے سے کم نہیں ہے۔ ملک سبحان کی ڈھلتی جوانی میں کسی طور بھی جواں بیٹے سے کم جوش نہیں تھا اور نہ ہی بیٹا اپنے تجربہ کار باپ سے مات کھا رہا تھا۔ جاوید علی نے دل ہی دل میں دونوں کو داد دیتے ہوئے ملک کے بائیکس پر سفر کے فیصلے کو سراہا۔ ان دونوں نے اتنی عقل مندی کی تھی کہ پیٹرول کے بھرے ہوئے کین بھی اپنی اپنی بائیک کے ساتھ لٹکا لیے تھے اس لیے کسی مرحلے پر پیٹرول ختم ہونے پر پھنس نہیں سکتے تھے۔

ان کے سفر کا بیشتر حصہ تنگ، ویران اور غیر ہموار راستوں پر مشتمل تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں کہیں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا ورنہ ملک سبحان کے مطابق کبھی کبھار ان راستوں پر بھی انہیں سرحدی محافظوں کی گشتی پارٹی کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ وہ لوگ اپنے طور پر ایسی کسی پارٹی سے نمٹنے کے لیے ہر لمحہ..... پوری طرح تیار تھے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور پورا سفر بخیر و عافیت طے ہوگیا۔

"اب ہم آنند فروٹ فارم سے بمشکل دس منٹ کے فاصلے پر ہیں۔" ویران اور بنجر راستوں کا لینڈ اسکیپ جب دھیرے دھیرے ہریالی میں بدلنا شروع ہوا تو ملک سبحان نے اسے آگاہ کیا۔ ویسے ہریالی کا اندازہ بھی انہوں نے بس ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نظر آنے والے سایوں کو دیکھ کر ہی لگایا تھا ورنہ اب رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔

"بس تو پھر فارم ہاؤس سے کچھ فاصلے پر کسی محفوظ جگہ پر رک جانا۔ بائیکس کسی جگہ چھپا کر باقی کا فاصلہ ہم پیدل ہی طے کریں گے۔"

اس نے فوراً ہی ملک سبحان کو ہدایت کی جس کے جواب میں اس نے محض سر کو اثبات میں جنبش دی۔ دو تین منٹ بعد اس نے بائیک کو ایسی جگہ روک لیا جہاں بہت سی خودرو جھاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے بیٹے نے بھی اس کی تقلید کی۔

"ہم بائیکس ان جھاڑیوں میں چھپا کر آگے جا سکتے ہیں۔ اچھا ہے کہ ہماری کارروائی کے دوران ان کے انجن کو بھی ٹھنڈا ہونے کا موقع مل جائے گا۔" ملک سبحان نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے، تم لوگ یہ کام کرو۔" جاوید علی نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اندھیرے کی وجہ سے منظر واضح نہیں تھا، صرف ڈھلتے چاند اور چمکتے ستاروں کی مدھم روشنی میں بصارت پر زور دے کر ہی تھوڑا بہت دیکھا جا سکتا تھا اور اس تھوڑے بہت سے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ گرد و پیش میں کوئی آبادی نہیں ہے۔ آبادی ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے روشنی کی کوئی جھلک ضرور دکھائی دے جاتی۔ اس نے ملک سبحان سے اس بابت دریافت کیا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔ یہ علاقہ غیر آباد ہے۔ البتہ فارم ہاؤس کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں سے کچھ لوگ فارم پر کام کاج کے لیے جاتے ہیں لیکن وہ گاؤں بھی وہاں سے زیادہ قریب نہیں ہے۔" اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف ملک نے اسے جواب دیا۔ وہ اس علاقے سے اس حد تک آشنا تھا کہ اندھیرے کے باوجود کہیں کسی جگہ رک کر سمت کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور وہ سیدھے یہاں تک آ گئے تھے۔

"تم دونوں چاہو تو یہاں رک کر ہمارا انتظار کر سکتے ہو۔ ہم نے صرف راہنمائی کے لیے تمہاری خدمات طلب کی تھیں، اس سے آگے کے مراحل میں تم ہمارا ساتھ دو، یہ ضروری نہیں ہے۔ آگے جان کا خطرہ ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔" فارم ہاؤس کے لیے پیدل سفر پر روانہ ہونے سے قبل جاوید علی نے ملک سبحان سے کہا۔

"پروا نہیں، میں سب آگا پیچھا سوچ کر ہی آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہوا ہوں اور اپنے بیٹے کے ساتھ بھی میں نے زبردستی نہیں کی ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد میرے ساتھ آنے کے لیے راضی ہوا ہے۔" ملک نے اپنی گمبھیر آواز میں جواب دیا تو اس کے پاس مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی اور انہوں نے خاموشی سے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ علاقہ سنسان تھا، اس کے باوجود وہ احتیاط سے پیش قدمی کر رہے تھے۔ آخرکار دس منٹ بعد وہ ایک ایسی چار دیواری تک پہنچ گئے جس کے اندر کہیں جلتی لائٹوں کی ہلکی سی روشنی کو وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتے تھے۔

"ہمیں دیوار پھاند کر اندر جانا ہوگا۔" جاوید علی نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں لیکن ہو سکتا ہے کہ یہاں کوئی الارم سسٹم نصب ہو اور ہمارے کوشش کرتے ہی اندر والے ہوشیار ہو جائیں۔" سلمان نے خدشہ ظاہر کیا۔

"جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا، ویسے مجھے امید ہے کہ یہاں کوئی الارم سسٹم نہیں ہوگا۔ یہ ایک فارم ہاؤس ہے جہاں پھلوں کی کاشت کی جاتی ہے اور پھل بہرحال اتنی قیمتی شے نہیں ہوتے کہ ان کی حفاظت کا اتنا خیال رکھا جائے۔ یوں بھی یہ فارم ہاؤس آبادی سے کافی فاصلے پر ہے اس لیے یہاں چوری چکاری کا خطرہ نہیں ہے۔ باقی رہیں یہاں جاری مجرمانہ سرگرمیاں تو اس کا تو یہاں آس پاس آباد لوگ اندازہ بھی نہیں لگا پاتے ہوں گے... یا اگر کسی کو علم بھی ہوگا تو وہ ان لوگوں سے ڈر کر مزید دور رہنے کو ترجیح دیتا ہوگا۔" اس نے سلمان کے اندیشوں کی مخالفت کرتے ہوئے دلائل دیے۔

"تو پھر ٹھیک ہے، اندر چلتے ہیں۔"

"وہ تو جانا ہی ہے لیکن پہلے میری کچھ باتیں غور سے سن لو۔ ہمارے پاس بڑے ہتھیار موجود ہیں لیکن ہمیں آخری حد تک ان کے استعمال سے بچنا ہوگا۔ کسی بھی شخص سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں اسے حتی الامکان خاموشی سے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرنا ورنہ زیادہ سے زیادہ چھوٹے ہتھیاروں کا استعمال کرنا تاکہ آواز زیادہ دور تک نہ جا سکے۔ یہاں سے سرحد بہت زیادہ دور نہیں ہے اس لیے خدشہ ہے کہ بلند آوازیں سرحد پر ڈیوٹی دیتے سپاہیوں تک پہنچ جائیں گی اور وہ صورتِ حال جاننے کے لیے اس طرف آنے کی کوشش کریں گے... اور ظاہر ہے یہ ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔" اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ کسی منجھے ہوئے سپہ سالار کی طرح اپنے ساتھیوں کو بریفنگ دے رہا تھا۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو بتایا کہ وہ چار دیواری کے کس حصے سے فارم ہاؤس میں داخل ہوگا اور وہاں موجود مرکزی عمارت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

ان کے درمیان اندھیرے میں ایک دوسرے کی شناخت کے لیے الو کی آواز کا کوڈ بھی طے ہوا اور یہ بھی طے پا گیا کہ ہر ایک اپنے اپنے حصے کا کام مکمل کر کے نکلنے سے قبل دوسرے ساتھیوں کو کس طرح سگنل دے گا۔ واپسی میں انہیں اکٹھے ہو کر یہاں سے نکلنے کے بجائے اپنے اپنے طور پر روانہ ہونا تھا اور اس جگہ تک پہنچنا تھا جہاں انہوں نے بائیکس چھپائی تھیں۔ ان کے درمیان یہ بھی طے پایا تھا کہ وہ اس جگہ رک کر دس منٹ سے زیادہ پیچھے رہ جانے والے ساتھی کے انتظار کا خطرہ نہیں مول لیں گے۔ خصوصاً ملک سبحان اور عرفان کو جلد از جلد ہر حال میں وہاں سے نکل جانے کا حکم تھا کیونکہ وہ دو ایسے افراد تھے جن کے شناختی کاغذات موجود نہ ہونے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا اور انڈین حدود میں بھی کئی ایسے افراد موجود تھے جو صرف صورت دیکھ کر انہیں پہچان سکتے تھے۔

یہ ساری ہدایات جاری کرتے ہوئے جاوید علی اس حد تک سنجیدہ تھا کہ کسی میں اس سے اختلاف کی جرأت نہیں ہو سکی اور اس نے ون ٹو تھری اسٹارٹ کہہ کر انہیں حرکت میں آنے کا اشارہ دے دیا۔ وہ چاروں ہی اپنے اپنے طور پر کارروائی کے لیے تیار تھے اور ان کے ضروری سامان سے بھرے بیگ ان کی پشت پر لدے ہوئے تھے۔

فارم ہاؤس کی چار دیواری قدِ آدم اونچی تھی اور ان کے لیے اس کے پار پہنچ جانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا لیکن جب جاوید علی نے اس کی منڈیر پر اپنے ہاتھ جمانے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ اس پر کانچ کے نکیلے ٹکڑے لگائے گئے ہیں جو بے احتیاطی پر انہیں زخمی کر سکتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنا اپر اتارا اور اس کی دوہری تہ بنا کر اسے دیوار پر رکھنے کے بعد دوسری طرف اترنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھیوں نے بھی یہی طریقہ کار استعمال کیا ہوگا۔ اپر کو دیوار پر چھوڑنے کے بجائے اس نے دوبارہ پہن لیا اور دبے قدموں مرکزی عمارت کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں خاموشی کا راج تھا اور اردگرد کسی ذی نفس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن انہیں تو اپنے طور پر احتیاط کرنی ہی تھی۔ محتاط قدموں سے چلتا ہوا وہ مختلف درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔

فارم ہاؤس کے مرکز میں قائم عمارت کے اندر جلتی مدھم روشنیاں اسے سمت کے تعین میں مدد فراہم کر رہی تھیں اور قوتِ شامہ بتا رہی تھی کہ اس وقت وہ کن پھل دار درختوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ یہ درخت ترتیب سے قطار در قطار لگائے گئے تھے اس لیے اندھیرے کے باوجود اس کے کہیں ٹکرانے کا امکان نہیں تھا۔ مرکز میں تعمیر شدہ عمارت اور اطراف میں موجود درختوں کے درمیان اچھی خاصی زمین خالی پڑی تھی اور کہیں کوئی ایسی آڑ نہیں تھی جو یہ درمیانی حصہ عبور کرتے ہوئے تحفظ فراہم کر سکے۔ واحد رات کا اندھیرا ہی تھا جو کچھ آڑ فراہم کر رہا تھا لیکن اندر موجود افراد میں سے اگر کوئی نگرانی کا فریضہ انجام دے رہا تھا تو اندھیرے میں متحرک جسم کو محسوس کر سکتا تھا۔ جاوید علی نے اللہ کا نام لیا اور درختوں کی آڑ سے نکلتے ہی زمین پر لیٹ گیا۔ اب وہ کرالنگ کرتا ہوا عمارت کے سامنے کے

حصے کی طرف جارہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ملک سبحان دائیں پہلو اور اس کا بیٹا عرفان بائیں پہلو سے آئے گا جبکہ سلمان کو عقب سے آنا تھا۔ یہ طے شدہ پروگرام تھا جس پر ہر ایک لازماً عمل کرتا۔

اس نے احتیاط کے باوجود بہت تیزی سے حرکت کی تھی، اس لیے امید تھی کہ اپنے ساتھیوں میں سب سے پہلے وہی وہاں پہنچا ہوگا۔ عمارت کا دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور اندر سے بند تھا۔ اس نے نپے تلے انداز میں دروازے کو دھکا دے کر اس بات کا اندازہ کرلیا تھا کہ قوت کے بل پر اس دروازے کو کھولنا ممکن نہیں ہوگا اس لیے ایسی کوئی کوشش فضول ہوگی۔ سامنے کی دیوار میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی جس پر وہ زور آزمائی کرکے اندر تک رسائی حاصل کرپاتا۔ ہاں، دروازے سے اوپر ایک روشن دان ضرور بنایا گیا تھا لیکن اس کا قطر اتنا نہیں تھا کہ وہ اس سے گزر کر اندر جاسکتا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پہلو کی کسی دیوار تک جاکر کوشش کرے لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس قسم کے مشن میں ترتیب و تنظیم ضروری ہوتی ہے اور ہنگامی حالات کے علاوہ کسی کا اپنے طے شدہ کردار سے ہٹ کر کام کرنا نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ صبر سے اپنی جگہ جما رہا البتہ اتنی کوشش ضرور کی کہ دروازے کی کسی جھری میں سے اندر جھانک سکے لیکن ایسی کوئی جھری نہ مل سکی۔ اس کے اندر کی بے چینی اسے یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑے رہنے کی بھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

اندر سے ہلکی ہلکی آوازیں ابھرنا شروع ہوئیں تو یہ بے چینی کچھ اور سوا ہوگئی۔ اس نے اپنے بیگ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ لمبی رسی برآمد کی جس کے ایک سرے پر بڑا سا ہک بندھا تھا۔ ہک کو گھما کر پھینکنے پر وہ پہلی ہی کوشش میں روشن دان میں پھنسانے میں کامیاب ہوگیا۔ رسی کے سہارے پھر روشن دان تک رسائی حاصل کرنا بھلا کیا مشکل تھا۔ اسے تو اس سے کہیں بلند مقامات پر اس طرح چڑھنے کی تربیت دی گئی تھی اور یہاں تو دروازے کی وجہ سے ایک اضافی فائدہ یہ مل گیا تھا کہ اسے ہوا میں جھولتے رہنے کے بجائے دروازے کی کنڈی پر پیر ٹکانے کی جگہ مل گئی تھی اور یہ سہارا بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ اس نے روشن دان سے جھانکا تو اندر کا منظر دیکھ کر چونک گیا۔ وہ یقینی طور پر ملک سبحان تھا جسے ایک رائفل بردار نے اپنی زد میں لے رکھا تھا۔ ملک شاید اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور کسی کھڑکی وغیرہ کے ذریعے اندر تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ ملک سے کوئی بے احتیاطی ہوئی یا اندر والے ویسے ہی ہوشیار تھے کہ اندر گھستے ہی وہ پکڑا گیا۔ اس پر رائفل تان کر کھڑا شخص تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک آدمی اور نظر آرہا تھا۔

"چھیتی بول کون ہے تُو... تیرے نال ہور کون کون ہے؟" رائفل کی نال ملک سبحان کی ٹھوڑی سے لگائے کھڑا آدمی اس سے غضب ناک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"میں موت کا فرشتہ ہوں اور میرے ساتھ تیری موت ہے۔" ملک سبحان نے بے خوف لہجے میں جواب دیا جس پر اس نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا اور بولا۔

"بندوق کی نال تیری ٹھنڈی وچ لگی ہے ہور تو مینوں مرن دی دھمکیاں دے رہا ہے۔"

"اوشوکے! چھیتی چھت پر جا ہور دیکھ کہ آس پاس اس کا کوئی سنگی ساتھی تو نہیں چھپا ہوا۔ اور ہاں، پہلے اس جیرے کو بھی اٹھا دے۔ ماں کا...... پوری بوتل چڑھا کر سو رہا ہے اس لیے ابھی تک آنکھ نہیں کھلی ہے۔" پہلے مذاق اڑانے والے کو شاید بروقت ملک سبحان کی خوداعتمادی کھٹک گئی تھی چنانچہ فوراً ہی یہ ہدایات جاری کرنے لگا۔ اب جاوید کے پاس مزید انتظار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں وہ اپنا بریٹا تو نکال ہی چکا تھا چنانچہ ملک سبحان کو کور کیے کھڑے شخص کا نشانہ باندھا اور قریب تھا کہ گولی چلا دیتا کہ وہ شخص ایک زوردار ہائے کے ساتھ رائفل سمیت فرش پر گر گیا۔ جاوید علی نے دیکھا کہ اس کے بائیں پہلو میں ایک لمبے پھل کا چاقو دستے تک دھنسا ہوا ہے۔ چاقو پھینکنے والا کون تھا، یہ تو وہ نہیں دیکھ سکا لیکن سمت کا اندازہ ضرور لگالیا کہ وہ بائیں جانب سے آیا ہے اور اس طرف سے ملک عرفان کو آنا تھا۔ یعنی بیٹے نے پھرتی اور ہوشیاری سے کام لے کر باپ کو مشکل میں ڈالنے والے کو نہایت خاموشی سے زیر کرلیا تھا۔

باقی کے واقعات اس سے بھی زیادہ تیزی سے پیش آئے تھے۔ رائفل کی نال خود پر سے ہٹتے ہی ملک سبحان کسی چیتے کی پھرتی سے حرکت میں آیا تھا اور زخمی ہوکر نیچے گر جانے والے شخص کو پیروں تلے روندتا ہوا اس کے ساتھی پر جھپٹ پڑا جو ابھی تک شاید اسی تذبذب میں کھڑا تھا کہ اسے حکم دینے والا کس کے کارنامے کی بدولت یوں خاک چاٹنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ ملک سبحان کے تیز رفتار حملے نے اس بے چارے کو اس مسئلے پر زیادہ غور کرنے کا بھی موقع نہیں دیا اور لمبا چوڑا ملک اس پر چھا گیا۔ دو چار پٹخنیوں میں ہی اس نے اس بے چارے کے ہاتھ پیر چلانے کی

معمولی کوشش کو بھی ناکام بنا دیا اور وہ بھی اپنے ساتھی کے قریب ہی چت پڑا نظر آنے لگا۔

"ملک! میرے لیے دروازہ کھولو۔" صورتِ حال قابو میں دیکھ کر جاوید علی نے اسے حکم دیا اور خود نیچے چھلانگ لگا دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ جاوید تیزی سے اندر داخل ہوا۔ پہلو میں چاقو کا وار کھانے والا تو بس آخری سانسیں گن رہا تھا البتہ اس کا ساتھی صرف بے ہوش تھا۔

"عرفان! تم باہر ہی ٹھہر کر نظر رکھو۔ ہم اندر دیکھتے ہیں۔" اندر جلتی روشنیوں میں اسے بائیں طرف کی کھڑکی کے ساتھ کھڑے ملک عرفان کی جھلک نظر آگئی تھی اس لیے بلند آواز میں اسے حکم دیا اور خود تیزی سے نظر آنے والے ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے یاد تھا کہ قریب المرگ شخص نے کسی جیرے کی موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے جاگنے سے پہلے اسے قابو میں کرنا ضروری تھا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا نہیں تھا کہ ایک گولی کان پھاڑ دھماکے کے ساتھ سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب سے گزر کر اس کے پیچھے والی دیوار میں پیوست ہوگئی۔ وہ خودکار ردِعمل کے طور پر فوراً ہی نیچے گر گیا، نظریں البتہ اس کی دروازے کی جانب ہی تھیں جہاں اس نے سانولی رنگت کے ایک جوان العمر آدمی کو شارٹ گن کے ساتھ کھڑا دیکھ لیا تھا۔ فائر کرنے کے بعد اس نے تیزی سے خود کو آڑ میں کرنے کی کوشش کی لیکن قدموں کی لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ تیزی سے حرکت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ یقیناً شراب کی اس بوتل کا کمال تھا جو اس نے رات سونے سے پہلے چڑھالی تھی۔ بہرحال، وہ اپنی شراب نوشی کے باوجود اس اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ ملک سبحان کی، جواب میں چلائی گئی گولی کے اپنے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہونے سے قبل ہی آڑ میں چھپنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس بار اس نے صرف گن کی نال باہر نکال کر فائر کیا تھا۔ ایک بار پھر وہی کان پھاڑ آواز گونجی اور گولی کسی نامعلوم سمت میں غائب ہوگئی۔ ظاہر ہے، یہ اندھا دھند فائر تھا جو محض اتفاقاً ہی کسی کو نشانہ بنا سکتا تھا اور اس شخص کو تو اپنے نشانہ لے کر کیے گئے پہلے فائر میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس بار بھی ملک سبحان نے جوابی فائر کیا جو پہلے والے کی طرح بے نتیجہ ہی رہا۔ جاوید علی نے اس دوران میں اپنی پوزیشن تبدیل کرلی تھی۔ وہ موجودہ صورتِ حال پر سخت تشویش کا شکار تھا۔ اس کی خواہش کے برخلاف وہاں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ملک سبحان کے چھوٹے پسٹل سے ہونے والے فائروں کی تو پھر بھی خیر تھی کہ اس کی آواز زیادہ بلند نہیں ہوتی لیکن شارٹ گن کی دھماکے دار آواز تو ویرانے میں خاصی دور تک جانے کا امکان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ اس تنہا شخص پر قابو پانے میں کامیاب ہوجائیں گے لیکن کسی کے متوجہ ہوکر اس طرف نکل آنے کی صورت میں بڑی گڑبڑ ہوسکتی تھی۔ انہیں ابھی اپنا اصل کام مکمل کرنا تھا اور پھر سرحد پار واپس بھی جانا تھا۔

"بس اب گن چھوڑ کر اپنے ہاتھ سر پر رکھ لو اور کوئی الٹی سیدھی حرکت کیے بغیر سیدھے ادھر چلو۔" خاموشی کا ایک معمولی سا وقفہ آیا تھا جس میں انہوں نے سلمان کی غراتی ہوئی آواز سنی اور پھر وہ شرابی جیرے کو اپنے بریٹا کی زد میں لیے دروازے میں نمودار ہوا۔ اسے عقبی سمت سے یہاں داخل ہونا تھا اور اس سمت جانے کے لیے اسے دوسروں کے مقابلے میں کافی لمبا چکر کاٹنا پڑا ہوگا اس لیے وہ دیر سے وہاں پہنچا تھا لیکن اس پر دیر آید درست آید والی بات صادق آئی تھی۔ تاخیر کے باعث ہی وہ مصیبت بننے والے جیرے کو پیچھے سے آکر آسانی سے قابو کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"اس سے پوچھو کہ اشوک کا مال کہاں رکھا ہے... اور ہاں، اگر یہ بتانے میں ایک پل کی بھی دیر لگائے تو اسے گولی مار دینا۔ ہم خود مال تلاش کرلیں گے۔" جاوید علی نے سفاک لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی ملک سبحان کو بھی اشارہ کیا کہ وہ اوپر جاکر ارد گرد نظر رکھے تاکہ فائر کی آواز سن کر اگر کوئی اس طرف آنکلے تو بروقت پتا چل جائے۔

"اپنے کو مت مارنا صاحب... ہم تو یہاں خالی نوکر ہے۔" سلمان کی بریٹا کا دباؤ جیرے کی کھوپڑی پر بڑھا تو وہ گڑگڑانے لگا۔

"جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔" اس کی فریاد پر کان دھرے بغیر جاوید علی نے اسے حکم دیا۔ ویسے یہ اندازہ تو وہ خود بھی لگا چکا تھا کہ یہاں موجود تینوں افراد لڑائی بھڑائی کے فن اور اسلحہ شناسی میں کچھ تھوڑی بہت شدبد تو ضرور رکھتے ہیں لیکن انہیں مہارت حاصل نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ چھوٹے بدمعاش تھے جنہیں آنند نے فارم ہاؤس کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ اشوک کے اسلحے کی بھاری تعداد میں یہاں موجودگی کی کسی کو خبر ہوگی اور سرحد پار سے کوئی جان ہتھیلی پر رکھ کر کارروائی کے لیے بھی دوڑا آئے گا اس لیے مزید پہرے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی اور سب کچھ معمول کے مطابق دکھانے کے لیے ان تین گھامڑوں پر ہی اکتفا کرلیا گیا تھا جو یقیناً اپنا

دفاع بھی ڈھنگ سے کرنے کے اہل نہیں تھے۔

"مال نیچے تہ خانے میں رکھا ہے۔ تہ خانے کا راستہ ادھر اس کمرے میں سے ہے۔" جیرے نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب اگل دیا تو اس نے سلمان کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ فوراً ہی سلمان کا ہاتھ حرکت میں آیا اور جیرے کی آنکھوں کے آگے ستارے ناچ گئے۔ اگلے ہی لمحے وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح زمین بوس تھا۔ وہ دونوں تیزی سے حرکت میں آئے اور جیرے کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں تہ خانے کا راستہ تلاش کر کے نیچے اتر گئے۔ وہاں اندھیرا تھا اس لیے انہیں اپنے بیگ سے ٹارچیں نکال کر روشن کرنی پڑی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ وہاں موجود پیٹیوں کو صاف دیکھ سکتے تھے۔ پیٹیوں کا انداز ایسا ہی تھا جیسے عموماً پھلوں کی پیٹیاں ہوتی ہیں لیکن پہلی پیٹی کو کھول کر دیکھنے کی کوشش میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف ظاہری طور پر ہی پھلوں کی پیٹیوں سے مشابہ ہیں ورنہ خاصی مضبوط ہیں۔ اتفاق سے انہوں نے جو پہلی پیٹی کھولی، اس میں سے ایک مشین گن اور اس کے راؤنڈز مل گئے۔ کچھ سوچ کر جاوید علی نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس کام میں جت گیا جس کے لیے وہ لوگ اتنا خطرہ مول لے کر یہاں آئے تھے۔ چند منٹوں کا یہ کام کتنا نازک اور محنت طلب تھا، یہ اس کے پسینا پسینا ہوتے وجود سے ظاہر تھا۔ اس کام کے دوران سلمان نے ذرا بھی مداخلت نہیں کی تھی اور دونوں ٹارچیں اپنے ہاتھ میں سنبھالے اسے روشنی فراہم کرتا رہا تھا۔

"الحمدللہ۔" آخرکار جاوید علی کے لبوں سے نکلا تو سلمان نے بھی سکون کا سانس لیا۔ بظاہر تو اس ساری کارروائی کے دوران اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن حقیقتاً اعصاب اس کے بھی تنے ہوئے تھے۔

"اب یہاں سے نکل چلو۔ میں نے صرف دس منٹ کا وقت رکھا ہے۔" جاوید علی نے آہستہ سے کہا اور وہ دونوں ہی تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ اوپر ان تینوں میں سے ایک مردہ جبکہ دو بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ انہیں وہاں سے نکال پاتے۔ البتہ جاوید نے دونوں کے پہلو میں ایک ایک زوردار لات رسید کر کے ایک کوشش ضرور کی تھی کہ وہ ہوش میں آ جائیں۔ کوشش کامیاب رہی یا نہیں، یہ دیکھنے کے لیے رکنے کا ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

باہر نکل کر سلمان نے حلق سے الو کے مانند بلند آواز نکالی۔ یہ ملک سبحان اور فرقان کے لیے واپسی کا سگنل تھا۔ سگنل دینے کے بعد وہ دونوں ٹھہرے بغیر تیزی سے وہاں سے نکل گئے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اب انہیں اسی جگہ ایک دوسرے سے ملنا تھا جہاں انہوں نے موٹر سائیکلیں چھپائی ہوئی تھیں۔ باہر ہنوز اندھیرے کا راج تھا لیکن ان کی آنکھیں اس اندھیرے سے شناسا ہو گئی تھیں چنانچہ انہوں نے چاند تاروں کی مدھم روشنی میں بھی واپسی کا سفر بخیر وخوبی طے کر لیا اور اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں بائیکس چھپائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بائیکس جھاڑیوں سے باہر نکالیں اور اندھیرے میں ان دونوں باپ بیٹے کو دیکھنے کی سعی کرنے لگے جن کا کوئی نام ونشان ہی نہیں تھا اور یہ ذرا پریشانی کی بات تھی۔ وہ دونوں چست و توانا اور ان راستوں سے واقف تھے اس لیے ان کا اب تک یہاں نہ پہنچنا ناقابلِ فہم تھا۔ انہیں تو ان سے بھی پہلے یا کم از کم ساتھ ساتھ پہنچ جانا چاہیے تھا اور اب تو وقت بھی زیادہ نہیں رہا تھا۔ دو تین منٹ اور گزرتے تو وہاں دھماکے شروع ہو جاتے اور جتنی بڑی مقدار میں وہاں اسلحہ و بارود موجود تھا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ دھماکے کتنی شدید نوعیت کے ہوں گے۔ فارم ہاؤس کی حدود میں تو کسی کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات میں اگر ملک سبحان اور عرفان وہیں موجود تھے تو یہ ایک انتہائی تشویشناک بات تھی۔

"اب ہم مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔" وقت کے ایک ایک سیکنڈ کی گنتی کرتے سلمان نے مضطرب لہجے میں کہا تو جاوید علی کو اس سے اتفاق کرنا پڑا۔

"ہاں، ہمیں چلنا ہو گا لیکن ان دونوں کا کیا ہو گا؟ ہم ان کے لیے بائیک بھی نہیں چھوڑ کر جا سکتے۔ بے شک یہ اسمگل شدہ ہیں لیکن کھوج لگانے والے کھوج لگا لیں گے کہ یہ کس کے استعمال میں رہی ہیں۔ لے جانے کی صورت میں وہ دونوں بعد میں آئے تو انہیں پریشانی ہو گی۔" اس کے پیشِ نظر وہاں سے روانگی کے فیصلے کے علاوہ اور بھی مسائل تھے۔

"ایسا کرتے ہیں کہ ہم فی الحال یہاں سے نکل جاتے ہیں پھر آگے کہیں جا کر ان کا انتظار کر لیں گے۔ وہ تجربہ کار اسمگلرز ہیں اور غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کے طریقوں سے اچھی طرح واقف بھی۔ وہ اپنے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیں گے۔" سلمان نے تجویز پیش کی جو حالات کے حساب سے مناسب ہی تھی۔ بوجھل دلوں کے ساتھ دونوں نے ایک ایک بائیک سنبھالی۔ دل میں بھی

دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ دونوں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے ہیں لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ان کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔ زیادہ امکان تو اسی بات کا تھا کہ جب وہ دونوں تہ خانے میں تھے، اسی وقت کچھ پیش آیا تھا... لیکن کیا؟ یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کیونکہ انہیں کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ جن لوگوں نے ان دونوں باپ بیٹے کے لیے مسئلہ پیدا کیا تھا، انہیں بعد میں ان دونوں کی راہ بھی تو روکنی چاہیے تھی لیکن وہ تو بہت آرام سے نکل گئے تھے اور واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔

مختلف سوچوں میں گھرے ان کا سفر جاری تھا کہ پہلا کان پھاڑ دھماکا سنائی دیا اور زمین اس بری طرح سے لرزی کہ ان کی بائیکس لہرا کر رہ گئیں۔ اگرچہ عام بائیکس ہوتیں تو شاید بے قابو ہو کر لڑھک ہی جاتیں لیکن خیر گزری کہ ذرا سی لرزش کے سوا ان کا کچھ نہیں بگڑا لیکن دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر پھیلتا ہی چلا گیا اور بالکل ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی جنگی میدان میں ہیں جہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پہلے دھماکے نے انہیں ہوشیار نہ کر دیا ہوتا تو ان کے لیے اپنی بائیکس کو کنٹرول میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ اصل مقام سے بہت دور نکل آئے تھے اور براہِ راست کسی نقصان کی زد میں نہیں آ سکتے تھے لیکن سائیڈ ایفیکٹس کا نشانہ بن سکتے تھے۔ مجبور ہو کر انہیں رکنے کا فیصلہ کرنا پڑا ورنہ حادثے سے بھی دوچار ہو سکتے تھے۔ اپنی جگہ رکے رکے انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں دور بہت دور آگ کے شعلے بھڑکتے نظر آ رہے تھے اور ان شعلوں کی شدت بتا رہی تھی کہ آنند فارم ہاؤس، جہاں پاکستان کو سازش کا نشانہ بنانے کے لیے جمع کیا گیا اشوک کا اسلحہ رکھا تھا، اب خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہے گا۔ اپنی اس کامیابی کے لیے اللہ کا احسان محسوس کرتے ہوئے انہوں نے کچھ اور ایسی آوازیں سنیں جو دھماکوں کی آوازوں سے ہٹ کر تھیں۔ انہیں اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ سرحدی محافظ حرکت میں آ گئے ہیں۔ اب ان کا یہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اب دھماکوں کی شدت کم ہو جانے کے باعث زمین کی لرزش بھی کم ہو گئی تھی اور وہ ملک سبحان اور عرفان کے انتظار کی آخری کوشش بھی کر چکے تھے چنانچہ بائیکس اسٹارٹ کیں اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

جس راستے پر وہ سفر کر رہے تھے، یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا اور زمین کچی پکی ناہموار تھی۔ ان کے ذہنوں میں ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہ راستے سے بھٹک نہ جائیں کیونکہ اپنے طور پر انہوں نے کوشش تو پوری کی تھی کہ راستہ ذہن نشین کر لیں لیکن اندھیرے میں اور وہ بھی کسی باقاعدہ راستے پر سفر نہ کرنے کے باعث اس کوشش کے سو فیصد کامیاب ہونے کا امکان کم تھا۔ وہ بھٹک جاتے تو سرحدی محافظوں کے ہتھے بھی چڑھ سکتے تھے۔ انہی اندیشوں کے تحت سفر کرتے بالکل اچانک ہی ان کی آنکھوں پر تیز روشنی پڑی۔ روشنی پڑتے ہی وہ کسی خودکار ردِعمل کے تحت دائیں بائیں مڑ گئے۔ جواب میں فوراً ہی پیچھے سے فائر آیا اور گولیاں ان کے آس پاس سے سنسناتی ہوئی گزرنے لگیں۔ جاوید علی دائیں طرف مڑا تھا اور یہاں زمین کچھ زیادہ ہی ناہموار تھی اور اس کی بائیک بری طرح اچھلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے ہیڈ لائٹ بند کر دی تھی اس لیے زیادہ امکان یہی تھا کہ فائرنگ کرنے والے اسے دیکھ نہیں پا رہے ہوں گے لیکن وہ بائیک کی آواز سے بھی سمت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ دوسرے ان کے پاس یقیناً بڑی تعداد میں اسلحہ موجود تھا جب ہی وہ بنا رکے اندھا دھند فائرنگ کیے جا رہے تھے۔ ایسی شدت کی فائرنگ میں کوئی بھی گولی اسے چاٹ سکتی تھی یا بائیک کی پیٹرول ٹنکی یا ٹائر کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی بات پیش آتی، نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا چنانچہ اس نے بائیک روک دی اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جہاں اس نے بائیک روکی وہاں بڑے بڑے چٹانی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ بائیک کو زمین پر لٹا کر وہ ان پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے دبک گیا۔ دوسری طرف سلمان بھی یقیناً اسی جیسی مشکل کا شکار تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ ابھی تک اس کے کانوں نے کوئی انسانی چیخ نہیں سنی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس کی طرح سلمان بھی ابھی تک محفوظ ہے۔ اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے اپنا لائحہ عمل طے کرنا شروع کر دیا۔ یہ طے تھا کہ بھاگتے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ وہ ابھی تک بھارت کی سرزمین پر موجود تھے اور بھارتی تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ بھی بہت سی وجوہات کی بنا پر ان پر سبقت رکھتے تھے۔ بھاگنے کی صورت میں وہ بہرطور پکڑے جاتے اور زندہ ان درندوں کے ہاتھ آنا کسی طرح ان کے اور ملک کے مفاد میں اچھا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے مارو یا مر جاؤ کے اصول پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا اسلحہ اور پشت پر لٹکا بیگ بالکل محفوظ تھا۔ اپنی دور مار رائفل کو تھپکتے ہوئے وہ حرکت میں آ گیا اور سانپ کی تیزی سے رینگتا ہوا واپس اسی سمت جانے لگا

جہاں سے ایک بڑی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر ان لوگوں نے اپنی سمت بدلی تھی۔ وہاں سے اب بھی مسلسل فائرنگ کی جارہی تھی لیکن بدلے ہوئے انداز سے اس بات کا اندازہ ہورہا تھا کہ وہ لوگ اب گاڑی تک محدود نہیں ہیں اور اردگرد پھیل کر فائرنگ کررہے ہیں۔ روشنی اب ان کی طرف بھی نہیں تھی جو ظاہر ہے انہوں نے اس خدشے کے تحت بجھادی تھی کہ روشنی میں خود ان کو ہی نشانہ نہ بنالیا جائے۔

رینگتے رینگتے جاوید علی اتنے فاصلے پر پہنچ گیا کہ اسے تاروں کی روشنی میں وہاں کھڑی جیپ اور اس کے ڈرائیور کا ہیولا نظر آنے لگا۔ اس نے پیٹ کے بل زمین پر پڑے پڑے فاصلے کا تعین کیا۔ اس کی دور مار رائفل یہاں سے جیپ کے ڈرائیور اور فیول ٹینک دونوں کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ اسے بس انتخاب کرنا تھا۔ اس نے ڈرائیور کا انتخاب کیا کیونکہ فیول ٹینک میں گولی لگنے کے بعد وہ ایک دھماکے سے پھٹتا اور پھر آگ جیپ کو لپیٹ میں لے کر سارے ماحول کو روشن کردیتی۔ موجودہ صورتِ حال میں ان کے لیے اندھیرا ایک محفوظ پناہ گاہ تھا۔ رائفل کی لبلبی دبانے پر گولی جیٹ کی سی رفتار سے ڈرائیور کی طرف بڑھی اور اس نے پھرتی سے اپنی پوزیشن تبدیل کرلی۔ ڈرائیور کی چیخ ضرور نکلی ہوگی لیکن فائرنگ کے شور میں سنائی نہیں دی۔ دوسرا فائر کرتے ہوئے اس کے دل میں ایک بار پھر خدشات جاگ اٹھے۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ ڈرائیور کی طرح ہی سلمان کی چیخ بھی فائرنگ کی آواز میں ہی دب گئی ہو۔ اسی وقت اس کے کانوں نے مشین گن کی آواز کو الگ سے شناخت کیا اور ڈھیروں ڈھیر سکون دل میں اتر آیا۔ فارم ہاؤس سے اٹھائی گئی مشین گن سلمان کے پاس تھی اور اس کی آواز گونجنے کا مطلب تھا کہ سلمان بخیر وعافیت تھا اور حرکت میں آچکا تھا۔ وہ خود پہلے سے زیادہ جوش وخروش سے جگہ بدل بدل کر فائر کرنے لگا۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ فائرنگ کی شدت میں کچھ اور اضافہ ہوگیا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر یہ فائر ان کی طرف نہیں آرہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے دشمن مشکل میں پڑ گئے ہوں۔

اس نے صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اور پیش رفت کی اور پہلے سے زیادہ بہتر پوزیشن میں آکر فائر کرنے لگا۔ اسی وقت فضا میں الو کی کریہہ آواز بلند ہوئی اور اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ان کے مددگار بن کر بھارتیوں کے مقابلے میں اترنے والے ملک سبحان اور عرفان ہیں۔ تین مختلف جہتوں سے فائر آنے کی وجہ سے بھارتیوں کا ناطقہ بند ہوگیا تھا اور وہ بوکھلائے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ ان کی تعداد میں بھی خاصی کمی ہوگئی تھی کیونکہ اب وہ پہلے کی طرح شدت سے فائرنگ نہیں کررہے تھے۔ صورتِ حال کی اس تبدیلی کو محسوس کرکے جاوید علی نے جیپ کے فیول ٹینک کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ فیول ٹینک میں گولی لگی اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ وہ فائر کرتے ہی تیزی سے پلٹ گیا تھا اور اس مقام کی طرف جارہا تھا جہاں بائیک چھوڑی تھی۔ بائیک لے کر وہ واپس وہیں پہنچا تو فائرنگ کا سلسلہ رک گیا تھا۔ جلتی ہوئی جیپ کی وجہ سے ماحول خاصا روشن تھا اور اس روشنی میں وہ ملک سبحان کو دیکھ سکتا تھا۔ ملک نے بھی اسے دیکھ لیا اور لپک کر اس کے قریب آیا۔

"عرفان اور سلمان کہاں ہیں؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"عرفان، سلمان کو لینے اس طرف گیا ہے۔ سلمان کے پاؤں میں گولی لگی ہے اس لیے وہ خود سے بائیک چلا کر لانے کے لائق نہیں ہے۔" ملک سبحان نے اسے آہستہ سے بتایا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں سے ان دونوں کی آمد متوقع تھی۔

"تم دونوں یہاں تک کیسے پہنچے؟" ملک کی تقلید میں خود بھی اسی سمت دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"فارم ہاؤس کی وین میں۔ مجھے چھت پر جانے پر وہ وین گیٹ کے پاس کھڑی نظر آگئی تھی اور مجھے لگا کہ اگر ہم اس وین کو لے کر آگے نکل جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ شکر ہے میری چھٹی حس کا یہ اشارہ کام دے گیا اور بروقت ہم آپ لوگوں کی مدد کرنے میں کامیاب رہے۔"

"ہاں لیکن ابھی ہم خطرے کی حد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ یہاں اتنی شدت سے فائرنگ ہوئی ہے جسے سن کر بی ایس ایف والے ادھر کا رخ ضرور کریں گے۔ اتنی تاخیر بھی شاید انہیں اس لیے ہوگئی ہے کہ انہیں فارم ہاؤس میں ہونے والے دھماکوں نے پہلے ہی الجھا رکھا ہوگا۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ ہمیں یہاں سے فوری طور پر نکلنا ہوگا۔ آپ بائیک مجھے چلانے دیں کیونکہ میں آپ سے زیادہ ان راستوں سے واقف ہوں۔" دوسری طرف سے آتے عرفان اور سلمان کو دیکھتے ہوئے ملک سبحان نے مضطرب لہجے میں اس کے خیال کی تائید کی تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ جلتی جیپ کی روشنی میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ ملک عرفان کے پیچھے بیٹھے سلمان کی دائیں ٹانگ زخمی ہے جسے کسی کپڑے سے باندھ کر خون روکنے کی عارضی

کوشش کی گئی ہے۔ اسے سلمان کی بہادری پر فخر محسوس ہوا کہ وہ زخمی ہونے کے باوجود مسلسل مشین گن جیسے ہتھیار کو استعمال کرتا رہا تھا۔

"فارم ہاؤس کی وین آگے کھڑی ہے لیکن میں اسے اس لیے استعمال نہیں کررہا کہ اس کی رفتار ان بائیکس کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔" ملک سبحان نے بائیک کو اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے اسے بتایا تو اس نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان باپ بیٹے کی رائیڈنگ کی مہارت کے تو وہ یہاں آتے ہوئے ہی قائل ہوگئے تھے لیکن واپسی کے سفر میں وہ جس رفتار سے بائیکس کو دوڑا رہے تھے، اس نے ظاہر کردیا تھا کہ یہ مہارت سے بھی آگے کمال کو پہنچی ہوئی رائیڈنگ تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ مکھن میں سے بال کی طرح یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن کچھ دیر میں یہ غلط فہمی دھری رہ گئی۔ بہت رفتار سے عقب میں آتے وہ لوگ جو مسلسل انہیں رک جانے کا حکم دے رہے تھے، یقیناً بی ایس ایف سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ابھی ان کا درمیانی فاصلہ کافی زیادہ تھا اور وہ عقب سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں نہیں آرہے تھے لیکن بہرحال یہ اندازہ تھا کہ بھارتیوں کے مقابلے میں ان کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ ایک تو وہ بھارتی سرزمین پر تھے، دوسرے بائیک جیسی کھلی سواری پر بھی جو کسی قسم کا تحفظ دینے میں قطعی ناکام رہتی۔ بھارتیوں کے مقابلے میں انہیں واحد ایڈوانٹیج یہ حاصل تھا کہ اب آگے بہت تنگ راستہ شروع ہورہا تھا جس پر سے بائیک تو آسانی سے گزر سکتی تھی لیکن کسی بڑی گاڑی کا گزرنا مشکل تھا لیکن اگر وہ لوگ کسی دور مار ہتھیار کا استعمال کرتے تو ان کی بائیکس نشانہ بھی بن سکتی تھیں۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک ہی تدبیر آئی۔

"اسپیڈ تھوڑی سی کم کرلو۔" اس نے ملک سبحان کو حکم دیا۔ اس حکم پر ممکن ہے ملک کو حیرت ہوئی ہو لیکن اس نے عمل ضرور کیا۔ اس دوران میں جاوید علی اپنی پشت پر بندھے بیگ سے ایک ہینڈ گرینیڈ نکال چکا تھا۔ گرینیڈ نکال کر اس نے جسم کو ذرا ترچھا کرکے اپنے عقب میں دیکھا۔ تعاقب میں آنے والی گاڑی اتنی دور تھی کہ اسے ہینڈ گرینیڈ کا نشانہ بنانا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسا چاہتا بھی نہیں تھا۔ اسے تو بس تھوڑی سی مہلت درکار تھی۔

"میں گرینیڈ پھینکنے لگا ہوں۔" دانت سے پن کھینچنے سے قبل اس نے ملک سبحان کو آگاہ کیا تا کہ وہ نتیجے میں زمین میں پیدا ہونے والی لرزش کے لیے ذہنی طور پر تیار رہے اور بائیک پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ ملک عرفان اور سلمان والی بائیک ان سے بہت آگے سفر کررہی تھی اور ان کے رفتار کم کرنے کی وجہ سے یہ درمیانی فاصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔ سلمان کی زخمی ٹانگ کی وجہ سے وہ خود دل سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ وہ لوگ جلد از جلد یہاں سے نکل کر پاکستان کی سرزمین پر پہنچ جائیں تا کہ سلمان کو طبی امداد مل سکے۔ گولی لگی زخمی ٹانگ کے ساتھ وہ بے چارہ نہ جانے کس اذیت سے بائیک جیسی سواری پر سفر کررہا تھا۔

اس نے ہینڈ گرینیڈ پھینکا تو کان پھاڑ دھماکے کے ساتھ ہی زمین بھی بری طرح لرزی اور ملک سبحان کے ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود بائیک بری طرح لہرا گئی لیکن خیر گزری کہ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

"بائیک روکو۔" اسے امید تھی کہ ہینڈ گرینیڈ نے پیچھے آنے والوں کی بصارت کو دھوکے میں ڈالنے کا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کیا ہوگا چنانچہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل پیرا ہوگیا۔ ملک سبحان نے اس بار بھی بنا حیل وحجت کے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ بائیک رکتے ہی وہ فوراً نیچے اتر گیا۔

"اب تم جاؤ۔" اترتے اترتے ہی اس نے ملک کو حکم دیا لیکن اس بار اس نے ذرا تذبذب کا مظاہرہ کیا۔

"میں نے کہا ہے جاؤ۔" اس نے کچھ ایسے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا کہ ملک سبحان نہ چاہنے کے باوجود اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوگیا۔ اس کے روانہ ہونے سے قبل ہی وہ حرکت میں آچکا تھا اور راستے سے ذرا ہٹ کر پیچھے کی طرف جارہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام سے بھی گزر گیا جہاں ہینڈ گرینیڈ کے گرنے سے زمین میں اچھا خاصا گہرا گڑھا بن گیا تھا۔ اس دوران میں تعاقب میں آنے والی گاڑی نے بھی اچھا خاصا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ وہ ایک جانب اوندھا ہو کر اس طرح لیٹ گیا کہ صرف اس کا سر زمین سے تھوڑا اٹھا ہوا تھا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک اور ہینڈ گرینیڈ موجود تھا۔ گہرے رنگ کے لباس اور رات کے اندھیرے نے اسے چھپا کر رکھنے میں بے حد معاونت کی تھی۔ تعاقب میں آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دھماکے کے بعد بند ہوگئی تھیں لیکن فائرنگ کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ٹارگٹ واضح نہ ہونے کے باعث وہ ہیجانی کیفیت میں بس اندھا دھند فائرنگ کررہے تھے۔ خود اس کے پاس ایسا کوئی موقع نہیں

تھا۔ اسے ایک ہی وار کرنا تھا اور بہت سوچ سمجھ کر جچا تلا۔

وہ گاڑی کی آواز سے اس کے اور اپنے مابین کم ہونے والے فاصلے کا پورا پورا حساب رکھ رہا تھا۔ بالآخر تاروں کی چھاؤں میں اسے گاڑی کا ہیولا نظر آ گیا اور دل ہی دل میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ آر یا پار کے لیے تیار ہو گیا۔ گاڑی اور اس کے درمیان شاید چند گز کا فاصلہ ہو گا، جب اس نے اپنی پوری توجہ مرکوز رکھتے ہوئے دستی بم کی پن کھینچی اور اسے پوری قوت سے گاڑی پر اچھال دیا۔ دستی بم کے اپنے ہاتھوں سے نکل کر گاڑی تک پہنچنے کا مختصر پل اس نے گویا پل صراط پر کھڑے شخص کی سی وحشت سے گزارا اور اگلے ہی پل سنائی دینے والے کان پھاڑ دھما کے کے ساتھ دونوں بازوؤں میں اپنا سر اور چہرہ چھپاتا ہوا زمین سے بالکل چپک گیا۔ زمین اپنے سینے پر اترنے والی اس آفت پر بری طرح تڑپی و مچلی اور ایک پل کے لیے اسے لگا کہ شاید اب اس کا وجود زمین کے سینے پر نہیں ٹھہر سکے گا لیکن دہشت کا یہ پل فوراً ہی گزر گیا اور اسے احساس ہوا کہ چند سنگ ریزوں کے وجود سے ٹکرانے اور جسم کے تھوڑا اتھل پتھل ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوا ہے۔ البتہ مقابل کا بہت کچھ بگڑ گیا ہے اور وہ خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گئے ہیں۔ وہ دل میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور پوری قوت سے آگے کی طرف دوڑ پڑا۔

ملک سبحان کو چلے جانے کا حکم دینے کے بعد اسے اندازہ نہیں تھا کہ اب وہ خود یہ درمیانی فاصلہ کیسے طے کرے گا؟ لیکن اس بات کی خوشی ضرور تھی کہ اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر اپنے ساتھیوں کو وہاں سے نکلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اب پیچھے بہت دور تک ان کا راستہ بالکل صاف تھا اور کسی گاڑی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن یہ بھی معلوم تھا کہ ہونے والی ہنگامہ آرائی جلد دوسروں کو بھی اس راہ پر لگا دے گی۔ اس وقت کے آنے سے پہلے وہ جتنی دور نکل سکتا تھا، نکل جانا چاہتا تھا۔ ابھی اس نے دوڑتے ہوئے چند گز کا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ملک سبحان اپنی بائیک سمیت آ ٹکرایا۔

"تم ابھی تک یہیں ہو؟" اس نے بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے ذرا خفگی کا اظہار کیا۔

"مجھے لگا کہ مجھے آپ کے لیے رکنا چاہیے۔" ملک نے انکساری سے جواب دیا اور بائیک بھگا دی۔ اب وہ پہلے ہی کی طرح تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ اس بار جاوید علی نے اسے کچھ نہیں کہا۔ اگر ملک دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ اس وقت اس کے چہرے پر بڑی نرم اور خوب صورت سی مسکراہٹ ہے جو حقیقتاً قریب آتی وطن کی مٹی کی سوندھی خوشبو کو فضا میں سونگھ کر اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھری تھی۔

☆☆☆

شہریار نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ سامنے سے آتی موبائل میں موجود پولیس والوں سے نمٹنے کا واحد طریقہ اسے یہ سوجھا تھا کہ وہ اپنی والی جیپ کی رفتار مزید بڑھا کر اسے پولیس موبائل سے ٹکرا دے اور تصادم سے قبل وہ اور سلو جیپ سے چھلانگ لگا دیں لیکن اتنی رفتار سے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانا بھی کوئی مذاق نہیں۔ سب سے زیادہ تو آدمی کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور حرکت کے طے شدہ قوانین کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے ورنہ نتیجہ اپنے گوشت پوست کے جسم کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ اسے اور سلو کو بھی یہ سب معلوم تھا لیکن پل بھر میں ہونے والے فیصلے پر عمل کرنے میں دونوں ہی نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس اعتماد کے پیچھے اس بھرپور تربیت کا بھی ہاتھ تھا جو شہریار نے عمر فاروق اور سلو نے را سے حاصل کی تھی لیکن اس سے بڑھ کر یہ یقین کارفرما تھا کہ وہ حق کے لیے کام کر رہے ہیں اور حق کی راہ میں چاہے جتنی بھی مشکلات آئیں، بہرحال حق چھا جانے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ دونوں اپنی اپنی جانب سے سڑک کے دائیں بائیں کودے تو حقیقت میں معلوم نہیں تھا کہ فضا میں معلق جسم کو کیا سہنا پڑے گا لیکن دونوں ہی اس اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ شہریار جس جانب کودا، وہاں بہت سارے چھوٹے چھوٹے پھول دار پودے لگے ہوئے تھے۔ اس کا حرکت کرتا ہوا بدن ان پودوں پر گرا۔ اسے زوردار جھٹکا تو ضرور لگا لیکن وہ کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہا۔ البتہ پھولوں کے ساتھ موجود کانٹوں نے ضرور کئی جگہ خراشیں ڈال دیں۔ دوسری طرف سلو ایسی زمین پر گرا تھا جو نئے پودے کاشت کرنے کے لیے گوڈی کر کے نرم کی گئی تھی۔ اس زمین پر گرنے سے اسے کوئی ظاہری چوٹ تو بالکل ہی نہیں آئی لیکن گرنے سے لگنے والے جھٹکے نے بازوؤں اور دائیں شانے کو ضرور متاثر کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس قسم کی بند چوٹ فوری طور پر تو تنگ نہیں کرتی لیکن بعد میں آدمی کو خاصی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کے لیے ساری اہمیت ابھی کی تھی۔ فی الحال تو دونوں کے لیے سب سے زیادہ خوش کن بات یہ تھی کہ جیپ اور پولیس موبائل کے تصادم کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا۔ دونوں

گاڑیوں کی رفتار بے حد تیز ہونے کی وجہ سے تصادم بھی بے حد شدید ہوا تھا اور گاڑیاں گویا ایک دوسرے میں گھسنے کے بعد الٹ گئی تھیں۔ منظر پر ایک نظر ڈال کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ سوار افراد کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر حادثے میں کوئی ایک آدھ فرد زندہ بھی بچ گیا تھا تو وہ یقینی طور پر شدید زخمی ہی ہو گا اور اس وقت تک باہر نکلنے کے لائق نہیں ہو گا جب تک کوئی باہر سے اس کی مدد نہ کرے۔

ان دونوں کے لیے یہ مختصر مہلت غنیمت تھی اس لیے وہ خود کو سنبھال کر تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اشوک کے گھر سے بھی کچھ لوگ ان کے تعاقب میں آ رہے ہوں گے۔ وہ افراد شہریار کی برق رفتار ڈرائیونگ کا مقابلہ نہ کر سکنے کے باعث پیچھے ضرور رہ گئے تھے لیکن چند منٹوں کے فرق سے ہی سہی، انہیں یہاں پہنچ تو جانا ہی تھا اس لیے بہتر تھا کہ وہ جلد از جلد اس جگہ سے غائب ہو جائیں۔

شہریار نے اشارے سے سلو کو اپنی جانب بلایا اور پھر وہ دونوں دائیں طرف دوڑتے چلے گئے۔ دائیں طرف کا یہ حصہ کچھ اس طرح تھا کہ چند فٹ تک زمین کو پودوں اور چھوٹی قامت کے درختوں سے بھر کر گرین بیلٹ کی سی شکل دے دی گئی تھی اور اس سے آگے نسبتاً کم کشادہ سروس روڈ کے پار اپار ٹمنٹس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

وہ دونوں سروس روڈ پر پہنچے تو ایک بلڈنگ سے موٹر سائیکل سوار برآمد ہوتا ہوا نظر آیا۔ وہ جوان العمر آدمی تھا اور موبائل فون کان سے لگائے پورے انہماک سے کسی سے محوِ گفتگو تھا۔ شاید اپنی اسی مصروفیت کی وجہ سے اس نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بھی دھیمی رکھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ان دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا اور یکدم ہی اس کے سامنے جا پہنچے۔ وہ یکدم اپنے سامنے دو مسلح افراد کو پا کر بھونچکا رہ گیا اور موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شاید لمحہ بھر کے لیے اس نے اس بات پر غور بھی کیا کہ ان کے اشارے پر رکنے کے بجائے موٹر سائیکل بھگا لے جائے لیکن پھر اندازہ لگا لیا کہ موٹر سائیکل کی رفتار گولی کی رفتار سے زیادہ نہیں ہو سکتی چنانچہ عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موٹر سائیکل روک لی۔

"نیچے اترو۔" سلو نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے غراتی آواز میں حکم دیا جس کی اس بے چارے نے فوری طور پر بجا آوری کی۔ اس کے موٹر سائیکل چھوڑتے ہی سلو نے اس کی جگہ سنبھال لی اور شہریار پھرتی سے اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل فوراً ہی ہوا ہو گئی اور اس کا مالک بے چارہ صدمے کی سی کیفیت میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ عام حالات میں وہ دونوں یا کم از کم شہریار تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح کسی سڑک چھاپ غنڈے کی طرح وہ کسی عام شہری سے چھین جھپٹ کرے گا لیکن مجبوری نے یہ بھی کروا دیا تھا اور وہ دونوں اس کوشش میں تھے کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جائیں۔ انہوں نے اپنے جسموں پر موجود پولیس والوں کی قمیصیں بھی راستے میں ہی اتار پھینکی تھیں چنانچہ چلتی جیپ سے زمین پر چھلانگ لگانے کے نتیجے میں لگنے والی دھول مٹی بھی کسی حد تک دور ہو گئی تھی اور اندر سے ان کی اجلی قمیصیں نکل آئی تھیں۔ البتہ پینٹوں پر کچھ داغ دھبے نظر آ رہے تھے اور ہاتھ بھی بالکل صاف نہیں تھے خاص طور پر شہریار کی ہتھیلیوں وغیرہ پر آنے والی خراشوں سے نکل کر جم جانے والا خون نمایاں تھا اور ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ لوگ اسی حلیے میں شہر بھر میں گھومنے پھرنے کے بجائے اپنے حلیے کو مزید معقول بنانے کی کوشش کریں۔ وہ تو شکر ہوا تھا کہ کوئی ان کے تعاقب میں نہیں لگا تھا۔

یقیناً پیچھے آنے والے سڑک پر متصادم کھڑی گاڑیوں کو دیکھ کر ان میں الجھ گئے ہوں گے اور پہلی نظر میں تو انہوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ دونوں گاڑیوں کے سوار ہی کام سے گئے۔ یہ تو انہیں قریب جا کر جائزہ لینے پر اندازہ ہوا ہو گا کہ جیپ خالی ہے اور پرندے اڑ چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ اس شخص تک بھی پہنچ گئے ہوں جس کی موٹر سائیکل انہوں نے چھینی تھی۔ اس شخص سے انہیں موٹر سائیکل کا نمبر بھی پتا چل گیا ہو گا اور یہ انتظام بھی کیا جا رہا ہو گا کہ جگہ جگہ ناکے لگا کر موٹر سائیکل کا نمبر ہر ایک تک پہنچا دیا جائے۔ ان حالات میں ان کا دیر تک اس موٹر سائیکل کو استعمال کرنا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ چنانچہ مناسب فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ایسی جگہ موٹر سائیکل چھوڑ دی جہاں سے انہیں کوئی دوسری سواری آسانی سے مل جائے۔ موٹر سائیکل چھوڑ کر دوسری سواری تلاش کرنے کے مختصر عرصے میں شہریار نے عبدالرحمان سے رابطہ کیا۔

"ارے ہیرو! کدھر ہو تم لوگ؟" دوسری طرف سے عبدالرحمان نے فوراً ہی چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ یقیناً اشوک کے قتل کی خبر اس تک پہنچ گئی تھی اسی لیے وہ اتنا خوش تھا۔ شہریار نے مختصراً اسے اپنے حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ فی الحال وہ کس جگہ موجود ہیں۔

"پھر تو کوئی فکر والی بات ہی نہیں ہے۔ تم آٹو رکشا یا

ٹیکسی پکڑو اور مون ہوٹل پہنچ کر اس کے منیجر سے ملو۔ میں اسے تم دونوں کے بارے میں بتادوں گا۔ آگے وہ خود سب سنبھال لے گا۔'' عبدالرحمان نے گویا چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ذرا پھرتی سے کام لو استاد... اتنا بڑا حادثہ ہوا ہے، ابھی پورے شہر میں آگ بھڑک اٹھے گی اور کسی کے لیے کہیں آنا جانا ممکن نہیں رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' شہریار نے اس کے مشورے کے جواب میں مختصراً کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس پل اسے احساس ہوا کہ شہر کی فضا بدل رہی ہے اور لوگ بدحواس سے نظر آرہے ہیں۔ تیزی سے بند ہوتی دکانیں، سڑکوں سے غائب ہوتی گاڑیاں اور عجلت میں پیدل ہی کسی نہ کسی سمت بھاگتے افراد نشاندہی کررہے تھے کہ اشوک کے قتل کی خبر نیوز چینلز سے نشر کی جاچکی ہے اور لوگ اس خبر کے ردِعمل سے خوف زدہ ہو کر اپنی جانوں اور املاک کو محفوظ کرنے کی فکر میں ہیں۔ وہ ایک آٹو رکشا کو تقریباً زبردستی روک کر اس میں سوار ہوئے تو وہاں پہلی گولی چلنے کی آواز سنائی دی جس پر مزید بھگدڑ مچ گئی۔

''کدھر جانا مانگتا ہے صاحب، ابھی اپن کوئی سواری نہیں پہنچائے گا۔ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اپن دھندا بند کر کے ابھی اپنے گھر جائے گا۔'' رکشے والے نے ان کے اس طرح اپنے رکشے میں آگھسنے کا سخت برا مانا اور بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ بولتا چلا گیا۔ اس کی بات ختم ہونے تک باقاعدہ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی بھاگنے والی لوگوں کی چیخ و پکار اور گاڑیوں کے چلاتے ہارنز نے فضا کو مزید سنگین بنادیا تھا۔ یہ سنگینی یقینی طور پر رکشے والے پر بھی اثر انداز ہورہی تھی اور وہ کمانے دھمانے کی فکر چھوڑ کر اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا اسی لیے اسے یہ زبردستی کے سوار ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے۔

''مون ہوٹل چلو۔'' رکشا ڈرائیور کے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سلو نے سرد لہجے میں اسے حکم دیا اور ساتھ ہی پسٹل نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ سرد مہر لہجے کو تو شاید رکشا ڈرائیور نظر انداز بھی کر دیتا لیکن گردن سے لگے سرد لوہے کو کیسے نظر انداز کرسکتا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ اس سرد لوہے کی اگلی ہوئی چھٹانک بھر کی گولی آدمی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرد کر دیتی ہے۔ اس کی گھگی سی بندھ گئی۔

''جلدی چلو۔'' سلو ایک بار پھر غرایا تو وہ بے چون و چرا کے رکشے کو حرکت میں لے آیا۔ لیکن لوگوں پر طاری عجلت اور دہشت نے ٹریفک کو عجیب بے ڈھب کر دیا تھا اور جلد از جلد نکلنے کے چکر میں گاڑیاں پھنس کر رہ گئی تھیں۔ ادھر سے آگے کہیں جلاؤ گھیراؤ بھی شروع ہوگیا تھا۔

''روڈ جام ہے صاحب! ادھر سے آگے جاتے تو راستہ نہیں ملے گا۔'' رکشے والے نے فریادی لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔ سلو اسے پسٹل کی پہلی جھلک دکھانے کے بعد پسٹل واپس اندر رکھ چکا تھا لیکن اس کا رعب تو اپنی جگہ قائم تھا۔

''دیکھو، سڑک سے ہٹ کر کہیں اندر کی گلیوں وغیرہ سے راستہ جاتا ہو تو وہاں سے نکال لو۔'' اس بار شہریار نے اسے ذرا نرم لہجے میں کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا کوشش میں مصروف ہوگیا۔ بے ترتیب ہوجانے والے ٹریفک میں سے رکشے کو نکالنے کے لیے راستہ بنانا کچھ آسان نہیں تھا۔ بے چارہ ڈرائیور خاصی دیر کی کوشش کے بعد اس میں کامیاب ہوسکا اور رکشے کو ایک چوڑی گلی میں لے گیا۔ گلی کا رخ کرنے والے وہ لوگ تنہا نہیں تھے۔ سڑک کی صورتِ حال سے مایوس ہو کر بہت سے لوگوں نے اس طرف کا رخ کیا تھا لیکن بہرحال وہاں سڑک جیسی خراب صورتِ حال نہیں تھی۔ خصوصاً اس اعتبار سے بھی کہ وہاں جلاؤ گھیراؤ کرنے والوں نے ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ ان کا باقی راستہ آرام سے کٹ گیا۔

''صاحب! آپ بولو تو ادھر ہی اتار دوں؟ ادھر اتر کر آپ اس سائڈ والی گلی میں جاؤ گے تو مون ہوٹل کا پچھلا دروازہ مل جائے گا۔ سڑک پر لے جانے میں خطرہ ہے۔ سامنے سے گولیاں چلنے کی آواز آرہی ہے۔'' رکشے والے نے رکشا روکا اور ایک بغلی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، ہم یہیں اتر جاتے ہیں۔'' شہریار نے کہا اور اپنی قمیص کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ایک ساتھ اتنے سارے نوٹ دیکھ کر رکشے والے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''رکھ لو۔ یہ تمہاری خدمت کا انعام ہے۔ تم نے اتنے خراب حالات میں ہمیں ہماری منزل تک پہنچایا اس کے لیے تم ایسے ہی انعام کے حق دار ہو۔'' شہریار نے نرمی سے کہتے ہوئے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں تھمادی پھر ذرا تنبیہ کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''یاد رکھنا کہ آج کے دن کی کوئی بات تمہیں بھول کر بھی یاد نہیں کرنی ہے اور نہ ہی

کسی کو ایک لفظ بھی بتانا ہے ورنہ تمہارے ساتھ کچھ برا ہوا تو اس کے ذمے دار تم خود ہوگے۔''

''جو حکم مائی باپ۔'' رکشے والے نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس دوران میں سلو لاتعلق سا بیٹھا رہا تھا۔

''گڈ۔'' شہریار نے اس کا شانہ دھیرے سے تھپتھپایا اور پھر وہ اور سلو رکشے سے اتر گئے۔ رکشے والے نے پھرتی سے اپنا رکشا اسٹارٹ کر کے موڑ لیا اور وہ دونوں اس گلی میں داخل ہوگئے جس میں ہوٹل مون کا عقبی دروازہ تھا۔ عقبی دروازہ بند تھا جس کے ساتھ ہی ایک کال بیل لگی ہوئی تھی۔ کال بیل کا بٹن دبانے پر فوراً ہی ایک گارڈ نمودار ہوا۔

''منیجر سے ملنا ہے۔ ہمیں عبدل نے بھیجا ہے۔'' گارڈ کی سوالیہ نظروں کے جواب میں شہریار نے بارعب لہجے میں بتایا تو وہ کچھ مرعوب نظر آنے لگا۔ ویسے بھی یہاں عبدالرحمان کو سب عبدل بھائی پکارتے تھے اور اگر کوئی صرف عبدل کہہ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس میں کوئی خاص بات ہے۔

''آپ لوگ ایک منٹ ٹھہریں۔ میں منیجر صاحب کو خبر کرتا ہوں۔'' مرعوبیت کے باوجود گارڈ نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا اور عقبی دروازے میں کھلنے والا وہ جالی دار چوکھٹا خلا بند کر دیا جس سے جھانک کر وہ ان سے گفتگو کررہا تھا۔ انہیں مشکل سے ایک منٹ ہی وہاں انتظار میں کھڑا رہنا پڑا ہوگا کہ دروازہ ان کے لیے کھل گیا۔

''اندر تشریف لائیے۔ منیجر صاحب آپ لوگوں کا انتظار کررہے ہیں۔'' اس بار گارڈ کا لہجہ بے حد مؤدب تھا۔ وہ دونوں دروازے سے گزر کر اندر داخل ہونے لگے تو بیپ ہوئی جو اس بات کی نشاندہی کررہی تھی کہ دروازے میں میٹل ڈیٹیکٹر نصب ہے جس نے ان کے پاس موجود اسلحے کی موجودگی کا اعلان کر دیا ہے لیکن گارڈ نے اس بیپ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور اسی عزت و احترام سے لے کر آگے بڑھ گیا جس کا اس نے دروازہ کھولتے وقت مظاہرہ کیا تھا۔ مختلف راہداریوں سے گزر کر منیجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ یہ ہوٹل خاصا بڑا ہے اور یقینی طور پر شہر کے بہترین ہوٹلوں میں شمار کیا جاتا ہوگا۔

''آپ اندر چلے جائیں۔ منیجر صاحب آپ کا انتظار کررہے ہیں۔'' ایک کمرے کے سامنے رک کر اس کے دروازے پر آہستہ سے دستک دیتے ہوئے گارڈ نے ان سے کہا اور خود ہی دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ ان کے اندازے کے برخلاف وہ کمرا کسی دفتر کے بجائے سٹنگ روم کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ بیش قیمت سنگل صوفے پر براجمان منیجر نے فوراً ہی کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ خوب صورتی سے سجے اس کمرے سے منیجر کی شاندار پرسنالٹی خوب میچ کررہی تھی۔ اس نے بیش قیمت ٹو پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے فریم لیس گلاسز سے لے کر پیروں میں موجود جوتوں تک ہر شے اتنی نفیس تھی کہ وہ خود کو ملی ہوئی پوسٹ کے لیے بالکل صحیح انتخاب محسوس ہورہا تھا۔

وہ بھائی جی سے ملاقات کرچکے تھے۔ ممبئی کا نامی گرامی غنڈا ہونے کے باوجود وہ اپنے رکھ رکھاؤ سے کوئی نواب محسوس ہوتا تھا۔ ایسے شخص نے اگر اپنے ایک شاندار ہوٹل کے منیجر کے طور پر سامنے موجود شخص کا انتخاب کیا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ گرم جوشی سے اپنا استقبال کرنے والے منیجر سے مصافحہ کر کے نشست سنبھالنے تک وہ دونوں بہت کچھ سوچ چکے تھے۔ مزید سوچنے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ کمرے کی دیوار پر نصب بڑی سی ایل ای ڈی اسکرین نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اسکرین پر سفید کرتے پاجامے میں ملبوس پُروقار شخصیت رکھنے والے بھائی جی کو دکھایا جارہا تھا۔ بھائی جی کے اردگرد جو منظر تھا، اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی تقریب میں شریک ہے۔

''مجھے اشوک صاحب کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ بے شک ہم کاروباری حریف تھے لیکن انسانیت کے ناتے ان کا قتل میرے لیے بہت بڑا دھچکا ثابت ہوا ہے۔ میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اس لاقانونیت کا خاتمہ کرے اور جلد از جلد اشوک صاحب کے قاتلوں کو تلاش کر کے انہیں ان کے انجام تک پہنچائے کیونکہ اگر یہ قاتل گرفتار نہ ہوئے تو ان کے حوصلے اور بھی بلند ہوجائیں گے اور وہ کھلے عام قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیں گے۔ عام آدمی کو تو یہاں پہلے ہی کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے، قاتلوں کا حوصلہ بڑھا تو وہ حکومتی ایوانوں میں بیٹھے خواص تک بھی جا پہنچیں گے۔'' بھائی جی اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بڑا پُرجوش بیان دے رہا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ ہی ہوٹل مون کا منیجر بھی دلچسپی سے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے سر! اشوک صاحب کے قتل میں کن لوگوں کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟'' ایک شوخ و چنچل نظر آنے والی رپورٹر نے بھائی جی سے سوال کیا جسے سن کر بھائی جی کے چہرے کے تاثرات مزید گمبھیر ہوگئے اور وہ بولا تو اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ سنجیدگی تھی۔

''ایک بزنس مین اپنے لیے کتنے دوست اور دشمن

بنتا ہے، اس سے تو خود وہ یا اس کے قریبی لوگ ہی واقف ہو سکتے ہیں۔ اشوک صاحب سے میرا تعلق اس نوعیت کا نہیں تھا کہ میں ان کے اس قسم کے رازوں سے واقف ہو سکوں اس لیے آپ کو چاہیے کہ میرے بجائے ان کے قریبی ساتھیوں سے یہ سوال کریں۔ میں تو اس صورتِ حال میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اخلاقی تقاضے پورے کروں اور وہ میں کر رہا ہوں۔ آپ سب نے دیکھ ہی لیا ہے کہ میں نے اس سانحے کی اطلاع ملتے ہی اپنی سجائی ہوئی محفل کا اختتام کر دیا ہے اور اب اس کوشش میں ہوں کہ اپنے معزز مہمانوں کو بہ حفاظت ان کے گھروں تک پہنچانے کا انتظام کر سکوں۔ شہر کے بگڑے ہوئے حالات میں یہ کام آسان نہیں ہوگا اور یقیناً مجھے کئی افراد کو یہاں مون ہوٹل میں ٹھہرا کر ان کی میزبانی کرنی ہوگی۔" بھائی جی کے الفاظ نے انہیں چونکا دیا۔ اس بات کا مطلب تھا کہ وہ اسکرین پر جو مناظر دیکھ رہے ہیں، وہ مون ہوٹل ہی کے ہیں اور بھائی جی بذاتِ خود وہاں موجود ہے۔ عبدل کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بھائی جی کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوگا۔

"کہنے والے تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اشوک صاحب کی موت کا آپ کو سب سے زیادہ فائدہ ہوگا کیونکہ اس شہر میں آپ کے سب سے بڑے حریف وہی تھے؟" ایک رپورٹر نے ذرا تند لہجے میں یہ سوال کیا جس کو سن کر بھائی جی کے ماتھے پر ناگواری کی لکیر سی نظر آئی لیکن جب اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا تو حسبِ معمول لہجہ دھیما ہی تھا۔

"میں کچھ بھی کہنے والوں کی زبان نہیں پکڑ سکتا لیکن اس بات کا مطالبہ ضرور کرتا ہوں کہ حکومت اس معاملے کی تحقیق و تفتیش کروائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ فی الوقت میں اپنی صفائی میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایک فرد کے چلے جانے سے کچھ نہیں بدلتا۔ آج اگر اشوک صاحب نہیں رہے ہیں تو ان کا کوئی قریبی ساتھی ان کی جگہ لے لے گا اور ظاہر ہے وہ بھی میرا حریف ہی ہوگا اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ اشوک کے جانے سے میرا کوئی فائدہ ہے۔ حریف کی صورت اور نام بدل جانے سے میری پوزیشن پر بھلا کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہم کل بھی ایک دوسرے کے مخالف تھے، آج بھی ہیں اور آنے والے کل میں بھی رہیں گے۔" اس آخری وضاحت کو پیش کرنے کے بعد بھائی جی میڈیا والوں کے سوالات کا سامنا کرنے کے لیے مزید وہاں نہیں رکا اور "ایکسکیوز می" کہتا ہوا منظر سے ہٹ گیا۔

اس کے منظر سے ہٹتے ہی اسکرین پر ایک بریکنگ نیوز دکھائی جانے لگی۔ یہ بریکنگ نیوز ان کے لیے بھائی جی کے بیان سے بھی زیادہ تہلکہ خیز تھی کیونکہ اس میں جو سی سی ٹی وی فوٹیج دکھائی جا رہی تھی، اس میں ان دونوں کو دکھایا جا رہا تھا۔ فوٹیج بہت زیادہ صاف نہیں تھی پھر بھی یہ امکان تھا کہ جن جن افراد نے انہیں موجودہ حلیوں میں دیکھا تھا، وہ انہیں شناخت کر سکتے تھے۔ فوٹیج کو دکھاتے ہوئے بتایا جا رہا تھا کہ یہ فوٹیج اس عمارت کے عقبی حصے میں نصب خفیہ کیمرے سے حاصل کی گئی ہے جس سے پہلی بار اشوک صاحب پر گولی چلائی گئی تھی اور وہ خوش قسمتی سے بچ گئے تھے لیکن قاتلوں نے مستقل مزاجی سے ان کا پیچھا کیا اور پولیس والوں کے بہروپ میں اپنا کام کر گزرے۔

اسکرین پر بار بار اشوک کے گھر کے سامنے کے مناظر دکھائے جا رہے تھے اور ایک ایک سیکنڈ کے حساب کتاب کے ساتھ بتایا جا رہا تھا کہ قاتلوں نے کب اور کیسے اشوک کو نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں نہ صرف وہ ہلاک ہو گیا بلکہ آگے جا کر فرار کی کوشش میں دہشت گردوں نے کئی اور افراد کی زندگیوں کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ کمرے میں موجود وہ تینوں نفوس اتنے انہماک سے یہ سب دیکھ رہے تھے کہ نیوز اینکر کی آواز کے سوا وہاں کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس سکوت کو انٹرکام کی گھنٹی نے توڑا۔ منیجر نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور مؤدبانہ سے لہجے میں دوسری طرف کی بات سننے کے بعد صرف "اوکے سر" کہہ کر ریسیور واپس رکھ دیا۔

"آپ دونوں کے لیے عبدل بھائی کا پیغام ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ دونوں نہا دھو کر فریش ہو جائیں اور کچھ کھا پی لیں۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جی خود آپ سے ملاقات کریں گے۔" ریسیور رکھنے کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا اور احترام کے ساتھ پیغام پہنچایا۔ وہ اتنا کمپوزڈ بندہ تھا کہ سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنے کے بعد بھی کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان سے اس طرح کا برتاؤ کیا تھا جو انہیں کرائے کے قاتل سمجھنے کی صورت میں اصولاً اسے روا رکھنا چاہیے تھا۔ وہ مستقل انہیں معزز مہمانوں کی طرح ہی ٹریٹ کر رہا تھا۔

"ہمارے ہوٹل کا یہ وی آئی پی سویٹ آپ دونوں ہی کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں آپ کو اپنی ضرورت کی ہر شے مل جائے گی۔ اگر کوئی کمی محسوس ہو تو مجھے انفارم کر دیجیے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ فوراً اسے پورا کر دوں۔" وہ بڑی ذمے داری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر! ہم دیکھ لیتے ہیں۔" شہریار نے پہلی بار لب کشائی کی۔

"میرا نام اختر حسین ہے۔ یہاں زیادہ تر لوگ مجھے حسین کہتے ہیں۔" اس نے فوراً ہی اپنا تعارف کروایا۔ اصولاً تعارف کا یہ مرحلہ ملاقات کی ابتدا میں طے ہوتا ہے لیکن وہ لوگ آتے ہی خبروں میں مصروف ہو گئے تھے اس لیے کسی کو اس کا خیال نہیں آیا تھا۔

"ٹھیک ہے مسٹر حسین! فی الحال آپ ہماری طرف سے فارغ ہیں۔ ہمیں کوئی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ سے رابطہ کر لیں گے۔" شہریار نے اسے مہذبانہ انداز میں وہاں سے رخصت کیا۔ جاتے جاتے وہ بتا گیا تھا کہ انٹرکام پر ڈبل تھری پریس کرنے پر براہِ راست اس سے رابطہ ہو جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد انہوں نے پورے سویٹ کا جائزہ لیا۔ لیونگ روم کے علاوہ وہاں دو بیڈ رومز موجود تھے اور ہر بیڈ روم کے ساتھ چمکتے دمکتے جدید سہولیات سے آراستہ باتھ رومز بھی موجود تھے۔ یہ باتھ رومز اتنے بڑے تھے کہ انہیں حریری پردوں سے دو حصوں میں منقسم کر کے ایک حصے کو چھوٹے سے ڈریسنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی جہاں موجود الماری میں ہر طرح کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ جوتوں کے جوڑے، شیونگ بکس اور مردانہ ضروریات کی بہت سی چیزیں موجود تھیں۔ لباس اور جوتے دیکھ کر انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ انہی کے سائز کے مطابق ہیں جس کا مطلب تھا کہ ان کی یہاں رہائش کا پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا تھا اور اسی اعتبار سے انتظامات بھی کر دیے گئے تھے۔

ان دونوں نے ہی غسل خانوں کا رخ کیا اور طویل باتھ لے کر باہر نکلے تو نہ صرف تازہ دم ہو چکے تھے بلکہ اپنے اس حلیے سے بھی نجات حاصل کر چکے تھے جو انہوں نے اشوک کو قتل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ غسل سے فارغ ہوتے ہی انہیں انٹرکام پر اطلاع دی گئی کہ کھانا تیار ہے اور سٹنگ روم میں لگایا جا چکا ہے۔

وہ دونوں سٹنگ روم میں پہنچ گئے جس کے ایک حصے میں چار افراد کی گنجائش والی ڈائننگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔

کمرے میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا لیکن ڈائننگ ٹیبل پر کھانا قرینے سے چنا نظر آ رہا تھا۔ یہ کئی طرح کی ڈشز تھیں جن کی سجاوٹ ہوٹلوں کے رواج کے مطابق اتنی عمدگی سے کی گئی تھی کہ آدمی خود بخود اشتہا محسوس کرنے لگے۔ ان دونوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا شروع کیا۔ حیرت انگیز طور پر یہاں اونچی دکان اور پھیکا پکوان والا معاملہ نہیں تھا بلکہ ہر شے بہت مزیدار تھی۔ ان دونوں نے خوب ڈٹ کر کھانے سے انصاف کیا کیونکہ فی الحال انہیں کوئی مشن درپیش نہیں تھا جس کی فکر میں وہ اپنے معدوں پر بوجھ ڈالنے سے گریز کرتے۔ شہریار نے البتہ سلو کی نسبت ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھا اور کوشش کی کہ اپنی مقررہ خوراک سے زیادہ تجاوز نہ کرے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر نیوز دیکھنے لگے۔ وہاں وہی خبریں مختلف انداز میں بار بار دکھائی جا رہی تھیں لیکن وہ بھائی جی کی آمد تک فقط وقت گزاری کے لیے انہیں ہی دیکھے جا رہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر اس دوران میں کوئی بیرا کھانے کی میز سمیٹنے کے لیے بھی وہاں نہیں آیا تھا۔ شاید کوشش کی جا رہی تھی کہ ان کا زیادہ افراد سے سامنا نہ ہو اسی لیے کھانا بھی اس وقت لگوایا گیا تھا جب وہ غسل میں مصروف تھے۔

آخر خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ بھائی جی اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے عبدالرحمان بھی موجود تھا۔ شہریار اور سلو نے کھڑے ہو کر ان دونوں کا استقبال کیا۔ آپس میں مصافحے کے بعد چاروں نے نشستیں سنبھال لیں اور سب سے پہلے بھائی جی نے مسکراتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"بہت خوب، بہت ہی عمدہ۔ تم دونوں کی بہادری نے ثابت کر دیا کہ میں نے تم سے ڈیل کر کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنا کام انجام نہ دینے کے باوجود بعد میں تم لوگوں نے جس پھرتی اور بہادری کا مظاہرہ کیا، اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ سچ پوچھو کہ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا اور میں اس غم میں مبتلا تھا کہ اتنی اچھی منصوبہ بندی کے باوجود صرف ایک اتفاق کی وجہ سے اشوک بچ گیا۔ میں نے جب سنا تھا کہ اشوک کے بجائے ایک کیمرامین نشانہ بن گیا ہے تو مجھے لگا تھا کہ قسمت کی دیوی اشوک کے ساتھ ہے لیکن تم نے ثابت کر دیا کہ آدمی باہمت اور باعزم ہو تو سامنے والے کی اچھی قسمت بھی دھوکا دے جاتی ہے۔" وہ بہت خوش تھا اور خوب کھل کر ان دونوں کی تعریف کر رہا تھا۔

"آپ کو مبارک ہو کہ آپ اپنے دشمن سے نجات پانے میں کامیاب ہو گئے اور وہ بھی اس خوبی سے کہ آپ کے اور آپ کے تمام اہم آدمیوں کے پاس جائے واردات سے دور کہیں اور موجود ہونے کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج رات دی جانے والی پارٹی خاص اسی

مقصد کے لیے رکھی گئی ہو گی۔'' شہریار نے اس کی بات کے جواب میں بولنا شروع کیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نام ونشان بھی نہیں تھا اور وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے لیکن پولیس اور پبلک دونوں کے لیے یہ کوئی چونکانے والا نکتہ ثابت نہیں ہوگا کیونکہ میرا اور اشوک کا یہ معمول رہا ہے کہ ہم اپنے بہت سے اہم پروگرام اور پارٹیز ایک ہی دن رکھتے ہیں تاکہ پریس اور میڈیا ہمیں بیک وقت توجہ دینے پر مجبور ہوجائے اور خبروں میں کسی ایک کا نام دوسرے سے نمایاں نہ رہنے پائے۔'' بھائی جی نے اطمینان سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''لیکن آج تو آپ اشوک سے اس معاملے میں شکست کھا گئے۔ آج تو ہر طرف وہی چھایا ہوا ہے۔'' سلو نے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے ساختگی سے تبصرہ کیا۔ اسکرین پر اس وقت اشوک کی لاش کے کلوز اپ دکھائے جا رہے تھے البتہ آواز بند ہونے کی وجہ سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

''یہ آخری موقع ہے جو اشوک کو یوں اہمیت مل رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں لوگ اس کا نام تک بھول جائیں گے اور پورے ممبئی میں بس بھائی جی کا نام چلے گا۔'' عبدالرحمان نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے فوراً سلو کی بات کا جواب دیا۔ خوش وہ ویسے ہی بہت نظر آرہا تھا۔

''لیکن تم لوگوں کی طرف سے تو یہ بیان دیا گیا ہے کہ اشوک کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور جلد ہی کوئی اور اس کی جگہ لے لے گا۔'' سلو نے اعتراض کیا۔

''اسے وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے کہا گیا ہے لیکن آنے والے وقت میں پورا ممبئی دیکھے گا کہ کیسے اشوک کا گینگ ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا ہے اور اس کے آدمی کتے کی موت مارے جاتے ہیں۔ پناہ بس صرف انہیں ملے گی جو بھائی جی کے تابع دار ہوجائیں گے، باقی کو ممبئی میں جگہ ملی بھی تو زمین کے اندر ملے گی۔ زمین کے اوپر تو بس وہی رہ سکے گا جو بھائی جی کے نام کی مالا جپے گا۔'' عبدالرحمان نے آگے کا پروگرام بتایا۔ بھائی جی کے ہونٹوں پر پھیلی دھیمی سی مسکراہٹ سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے اس خاص چیلے کے ایک ایک لفظ سے متفق ہے۔

''اوہ...... پھر تو تم اپنی ممبئی پر حکمرانی کی پیشگی مبارک باد قبول کرلو... جانے جب یہ نوبت آئے تب ہم کہاں ہوں۔'' سلو نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہریار اس وقت گفتگو میں خاص دلچسپی نہیں لے رہا تھا اس لیے خلافِ معمول خود بولنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے برخوردار! تم کچھ چپ چپ سے ہو۔ کوئی الجھن یا پریشانی ہے تو ہمیں بتاؤ۔ ہمیں بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ ہمارے جس دوست نے ہمارا اتنا بڑا کام کیا، وہ خود اس طرح الجھا ہوا بیٹھا رہے۔'' بھائی جی جیسا زیرک آدمی اس کی خاموشی کو محسوس نہ کرے، یہ کیسے ممکن تھا چنانچہ بڑی محبت سے پوچھنے لگا۔ یہ اور بات کہ شہریار اس محبت بھرے لہجے سے دھوکا کھانے والا نہیں تھا اور جانتا تھا کہ بھائی جی اس دنیا کا آدمی ہے جہاں محبت سے زیادہ مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے چنانچہ بغیر لاگ لپیٹ کے اپنے دل میں موجود شکوہ سنا ڈالا۔

''ہمیں یہ اطلاع فراہم کی گئی تھی کہ جس عمارت سے میرا ساتھی اشوک پر گولی چلائے گا، اس کے عقبی دروازے پر کوئی کیمرا نصب نہیں ہے لیکن اب جو حقائق سامنے آرہے ہیں، اس سے پتا چل رہا ہے کہ وہ اطلاع غلط تھی اور ظاہر ہے یہ بات ہمارے مفاد میں ٹھیک نہیں ہے۔ ٹی وی چینلز پر تصویریں دکھائی جا رہی ہیں۔ تصویروں کی مدد سے کسی نے شناخت کر کے اگر ہماری نشاندہی کردی تو ہم کتنی مشکل میں پڑ جائیں گے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اب اس اسٹیج پر جبکہ کامیابی بس دو قدم کے فاصلے پر رہی ہے، میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔''

''تم بیکار میں فکرمند ہو رہے ہو میرے دوست۔ ذرا ٹیلی ویژن پر چلنے والی تصویریں دیکھو اور پھر آئینہ دیکھو۔ تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارے سارے خدشات بے بنیاد ہیں۔'' بھائی جی نے مسکراتے ہوئے اس کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی۔

''وہ سب ٹھیک ہے لیکن آپ سیکرٹ ایجنٹس کو نہیں جانتے۔ ان میں ایسے ایسے ماہر موجود ہوتے ہیں جو میک اپ کے پیچھے موجود آدمی کا اصل چہرہ بھی کھنگال ڈالتے ہیں اور ہمیں تو نہ جانے کتنے لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ ان دیکھنے والوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے ہمیں اس ہوٹل تک بھی آتے ہوئے دیکھا ہوگا اور کچھ نہیں تو ہوٹل کے عملے میں سے ہی چند افراد اس بات کے گواہ ہیں کہ ہم یہاں مقیم ہیں۔ ان میں سے کوئی بے شک مخبری نہ کرے لیکن باتوں باتوں میں اپنے کسی عزیز یا رشتے دار یا دوست کے سامنے تذکرہ تو کرسکتا ہے کہ اشوک کی موت کے ذمے دار افراد ہوٹل مون میں ٹھہرے ہوئے ہیں... اور یہ بات م

ش مند آدمی جانتا ہے کہ کوئی راز اگر ایک بار لیک ہوجائے تو پھر راز نہیں رہتا... سفر کرتا ہوا ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچنے سے اسے روکنا ہوتا ہے۔'' شہریار اس کی تسلی سے مطمئن نہیں ہوا۔

''تم نے میرے بارے میں درست اندازہ نہیں لگایا ہے برخوردار! یہاں دور دور تک کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ میرے خلاف مخبری کرسکے۔ پورا ممبئی جانتا ہے کہ ہوٹل مون بھائی جی کی ملکیت ہے اور اگر کسی نے تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا بھی ہوگا تو وہ اپنی زبان کھولنے کی غلطی نہیں کرے گا کیونکہ اس غلطی کا انجام وہ خود اچھی طرح جانتا ہوگا۔ رہی ہوٹل کے عملے کی بات تو ان کی طرف سے تو میں تمہیں دو سو فیصد ضمانت دے سکتا ہوں جن لوگوں نے تمہیں یہاں دیکھا ہے، وہ میرے اتنے اعتماد کے بندے ہیں کہ میری مرضی اور اجازت کے بغیر کہیں زبان کھولنا تو دور کی بات ہے، وہ مجھ سے پوچھے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے۔ اور بالفرض کسی طرح پولیس یا خفیہ اداروں تک یہ بات پہنچ بھی جاتی ہے کہ تم لوگ ہوٹل مون میں چھپے ہوئے ہو تو کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں ہوسکتی کہ تمہیں بازیافت کروانے کے لیے یہاں ریڈ کرسکے اس لیے تم اپنی سیکیورٹی کی طرف سے پورا اطمینان رکھو۔'' بھائی جی نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں یقین دہانی کروائی اور بے پروائی سے سگار کے کش لینے لگا۔ اس کے زیرِ استعمال یہ سگار سو فیصد امپورٹڈ تھا اور اس کی خوشبو اتنی شاندار تھی کہ اردگرد موجود افراد میں سے کوئی ناگواری محسوس نہیں کرسکتا تھا۔

''بھائی جی نے جو کچھ بولا سو فیصد کھرا ہے پھر بھی اگر تم لوگوں کا من نہیں مانتا تو اپن اس بات کا بندوبست کردیتا ہے کہ تم کو ادھر سے کہیں اور شفٹ کردے تاکہ تمہاری سالی ٹینشن ہی ختم ہوجائے۔'' عبدالرحمان نے بہت دیر بعد اس گفتگو میں حصہ لیا اور ایک تجویز پیش کی۔ اس کی یہ تجویز سن کر بھائی جی کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے اور وہ پہلے ہی کی طرح اطمینان سے سگار سے شغل کرتا رہا جس کا مطلب تھا کہ اس کے دستِ راست عبدل نے جو تجویز پیش کی ہے، اس سے اسے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شہریار نے چند سیکنڈ کے لیے اس تجویز پر غور کیا اور پھر فیصلہ سنا دیا کہ وہ لوگ یہاں سے شفٹ ہونا پسند کریں گے۔ یہ فیصلہ اس نے کسی عقلی دلیل کی بنیاد پر نہیں کیا تھا، بس اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہاں رکنا مناسب نہیں ہے اور اس نے اپنی چھٹی حس پر بھروسا کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ دس منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔'' اس کا فیصلہ سن کر عبدالرحمان نے کہا اور پھر وہ اور بھائی جی وہاں سے رخصت ہوگئے۔ اس موقع پر بھائی جی نے مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی تھی اور ایک دم سے لاتعلق ہوگیا تھا۔

''یہ لوگ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہیں عمارت کے عقبی راستے پر کیمرے کی موجودگی کے بارے میں معلوم تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر ہم سے یہ بات چھپائی کیونکہ ان کا مفاد اسی میں تھا کہ ہماری تصویریں منظر پر آجائیں اور لوگوں پر یہ ثابت ہوجائے کہ اشوک کے قتل میں ملوث افراد کا بھائی جی کے گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ان دونوں کی روانگی کے بعد سلو نے ذرا غصے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں لیکن جان بوجھ کر جتایا نہیں۔ ابھی ہمیں ان لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے اس لیے ضروری ہے کہ اختلافات کو بڑھنے نہ دیں۔'' شہریار نے رسان سے اسے جواب دیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے اپنی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ فنگر پرنٹس کے سلسلے میں انہوں نے پہلے ہی حتی الامکان احتیاط کی تھی۔ اشوک کو انجام تک پہنچانے کے لیے استعمال ہونے والے لباس البتہ ابھی ویسے ہی پڑے تھے چنانچہ ان دونوں ملبوسات اور ان کے ساتھ حلیے کی تبدیلی کے لیے استعمال ہونے والی دیگر اشیا کو ایک باتھ روم میں یکجا کر کے انہیں نذرِ آتش کیا گیا اور راکھ فلیش میں بہا دی۔ لگنے والی معمولی چوٹوں کی صفائی اور ان پر جراثیم کش ادویات کا استعمال وہ غسل کے ساتھ ہی کرچکے تھے۔ اس وقت دو دو پین کلرز پانی کے ساتھ نگلیں اور حلیوں میں ممکنہ تبدیلیاں بھی کرڈالیں لیکن یہ بہت معمولی تھیں کیونکہ یہاں ان کے پاس میک اپ کا سامان موجود نہیں تھا اور نہ ہی اتنی مہلت تھی کہ وہ کسی سے فرمائش کرسکتے۔ ان چھوٹے چھوٹے چند کاموں کو نمٹانے میں ہی دس منٹ کا وقت تیزی سے گزر گیا اور انہوں نے بیڈ روم والے حصے میں دستک کی آواز سنی۔ آنے والا ہوٹل کا منیجر تھا۔

''آپ لوگوں کے لیے گاڑی تیار ہے۔'' اس نے انہیں اطلاع دی تو وہ لیونگ روم میں آگئے۔ وہاں پہلے ہی کی طرح ان کی لاعلمی میں ڈائننگ ٹیبل سمیٹنے کا کام کیا جاچکا تھا۔

''گاڑی ہوٹل کے مین گیٹ کے ساتھ ہی لگائی گئی ہے۔ آپ کے حلیے پہلے کے مقابلے میں اتنے مختلف ہیں کہ کسی کے لیے آپ لوگوں کو پہچاننا ممکن نہیں ہوگا۔ آپ

پورے اطمینان سے عام افراد کی طرح جائیں اور گاڑی میں بیٹھ جائیں۔" لیونگ روم میں پہنچ کر منیجر نے انہیں کچھ اور ہدایات دیں اور پھر مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"میں آپ دونوں کو سی آف کرنے کے لیے آپ کے ساتھ باہر تک جانے میں خوشی محسوس کرتا لیکن میرا یہ عمل آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا اور اس خصوصی سلوک کی وجہ سے اردگرد بو سونگھتے پھرتے افراد آپ کی طرف متوجہ ہوجائیں گے۔" مصافحہ کرتے ہوئے اس نے وضاحت کر دی کہ وہ انہیں یہیں سے رخصت کر رہا ہے اور ساتھ ہی وجہ بھی بیان کر دی۔

"اٹس او کے۔ ہم لوگوں کی زندگیوں میں ان فارمیلٹیز کی گنجائش ہوتی بھی نہیں ہے۔" شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور قدم آگے بڑھائے۔

"تعاون کے لیے شکریہ۔ موجودہ حالات میں ہم لوگ خود بھی بہت ٹینس ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اطلاع آئی ہے کہ ویسٹ میں بھائی جی کے ایک ریسٹورنٹ کو آگ لگا دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اشوک کے آدمیوں کا کام ہوگا۔ وہ لوگ دوسری جگہوں پر بھی ایسی کارروائیاں کر سکتے ہیں اس لیے مجھے اپنے اس ہوٹل کی سیکیورٹی کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا ہوگا۔" وہ مہذب آدمی تھا اور یقیناً اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس پوسٹ پر کام بھی کر رہا تھا۔

شہریار نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی کہ وہ اس کی مجبوری کو سمجھتے ہیں اور ان کے دل میں کسی قسم کا شکوہ نہیں ہے۔

وہ اور سلو باہر آگئے۔ وہاں بڑے ہوٹلوں کی سی مخصوص خاموشی اور سکون طاری تھا لیکن سروس بوائے سے لے کر ریسپشنسٹ تک ہر ایک کے چہرے کے گمبھیر تاثرات دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ سب اپنی اپنی جگہ اعصاب زدہ ہیں اور ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار بھی کہ اشوک کی موت کا ردعمل مون ہوٹل پر حملے کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ یقینی طور پر اس ممکنہ حملے کے خطرے کے پیشِ نظر وہاں سیکیورٹی کے معقول انتظامات بھی کیے گئے ہوں گے لیکن اس حقیقت سے بھی نظریں نہیں چرائی جاسکتی تھیں کہ جب ایسا کوئی تصادم ہوتا ہے تو نقصان دونوں طرف کے لوگوں کو ہی اٹھانا پڑتا ہے... ہاں کم یا زیادہ کا فرق البتہ ہوسکتا ہے۔ وہ دونوں آپس میں کوئی بات کیے بغیر سنجیدگی سے چلتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے۔

لابی کی سجاوٹ بہت خوب صورت تھی اور بڑے بڑے آرام دہ اور بیش قیمت صوفے لگائے گئے تھے۔ دیوار پر ایک بڑا ایل سی ڈی بھی موجود تھا جس پر خبریں ہی چل رہی تھیں اور خبروں کا موضوع یقینی طور پر آج کے واقعات ہی تھے لیکن وہاں ان خبروں کو دیکھنے کے لیے زیادہ افراد موجود نہیں تھے۔ پوری لابی میں کل تین افراد صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک لیپ ٹاپ کھولے کچھ کام کر رہا تھا، دوسرے کے سامنے اخبار کا قومی خبروں والا صفحہ کھلا ہوا تھا اور تیسرا اونگھنے کے انداز میں نیم وا آنکھوں سے خبریں دیکھ رہا تھا۔ وہ لابی سے گزرے تو ان تینوں میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

باہر حسبِ اطلاع ان کے لیے ڈرائیور سمیت ایک گاڑی موجود تھی۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آگئی۔ اس لمحے پہلی بار شہریار نے محسوس کیا کہ سلو پُرسکون نہیں ہے اور بار بار عقب نما آئینے میں دیکھنے کے علاوہ پیچھے گردن موڑ کر ایسے دیکھ رہا ہے جیسے اسے اپنے تعاقب کا اندیشہ ہو۔

"اینی پرابلم؟" آخر کار شہریار کو اس سے پوچھنا ہی پڑا۔

"بھٹناگر...... وہاں ہوٹل کی لابی میں، میں نے بھٹناگر کو دیکھا تھا۔" اس نے بے چین سے لہجے میں بتایا تو شہریار کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی حد تک خوف زدہ بھی ہے۔

"کون ہے یہ بھٹناگر؟" اس کے شانے پر دلاسا دینے کے انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سلو سے دریافت کیا البتہ آواز اتنی دھیمی تھی کہ ڈرائیور کے لیے اس کی بات سمجھنا دشوار ہوتا۔

"را کا ایک اہم بندہ۔ مجھے ٹریننگ اسی نے دی تھی۔" سلو نے بتایا تو شہریار کے حلق سے بے اختیار ایک ہلکی سی کراہ نکلی۔ سلو جیسی آفت کو تربیت دینے والا شخص کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہوسکتا تھا۔

"کیا اس نے تمہیں دیکھ لیا تھا؟" وہ بے حد سنجیدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"بظاہر تو اس کی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن اس جیسے آدمی کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں بند بھی ہوتیں تو مجھے یہی شک ہوتا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہوگا۔"

"ان تینوں میں سے کون بھٹناگر تھا؟" اس کا جواب سن کر شہریار کی تشویش کچھ اور بھی بڑھ گئی اور اس نے

دریافت کیا۔ اب اس کی اپنی نظریں بھی عقب نما آئینے اور گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ چند گھنٹے قبل والا ماحول بالکل تبدیل ہوچکا تھا۔ وہاں اب نہ تو گاڑیوں کا ہجوم تھا اور نہ ہی بھاگتے دوڑتے لوگ۔ ہر قسم کی دکانیں، ریسٹورنٹس اور دیگر رات گئے چلنے والے کاروباری مراکز بند ہوچکے تھے اور ایک ہو کا سا عالم تھا۔ ایک آدھ جگہ انہیں جلے ہوئے ٹائرز اور گاڑیوں کے ڈھانچے بھی نظر آئے۔ ان کی گاڑی کے علاوہ سڑک پر سے بس اِکا دُکا گاڑیاں ہی گزر رہی تھیں۔ ایسے میں اگر کوئی ان کے تعاقب میں ہوتا تو اس کا نظر میں آنا لازم تھا اور ابھی تک اس کی نظر میں کوئی مشکوک گاڑی نہیں آسکی تھی۔

"وہ جو اونگھتے ہوئے خبریں دیکھ رہا تھا وہی بھٹناگر تھا۔" سلو نے آہستہ سے بتایا تو وہ یونہی تفہیمی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ سلو کے اندیشے کو وہ نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اگر بھٹناگر کی اس پر نظر پڑی تھی تو اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ اس نے سلو کو شناخت کر لیا ہو کیونکہ ہوٹل سے نکلتے وقت ان دونوں ہی نے بہت معمولی سا میک اپ کر رکھا تھا اور کسی اسپیشل سیکرٹ ایجنٹ کے لیے اتنے معمولی میک اپ کے پیچھے چھپے اصل چہرے تک پہنچنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بھٹناگر تو سلو کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا ہوگا اور یقینی طور پر اس تک رسائی کے لیے سرگرم بھی...

راوالوں نے تو اپنی طرف سے برسوں کی محنت اور سرمایہ کاری کے بعد سلو کی شکل میں پاکستان کے خلاف ایک چلتا پھرتا بم تیار کیا تھا جس کے ذریعے وہ نہ جانے کتنی تباہی مچانے کی آرزو رکھتے تھے لیکن خوش قسمتی سے پہلے ہی مرحلے میں سلو سی ایف پی کی نظر میں آگیا اور ان لوگوں نے اسے ناکام بنانے کے ساتھ ساتھ یہ باور کروانے میں بھی کامیابی حاصل کر لی کہ مچھیروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے نوعمر سلو کو بغیر کسی جرم کے کھلے سمندر سے گرفتار کر کے برسوں اس کی برین واشنگ کی ہی اس لیے گئی تھی کہ وہ اپنے ہی وطن کے خلاف کارروائیاں کرسکے۔ بعد میں حالات نے بھی سلو پر یہ بات ثابت کر دی اور اب وہ پورے خلوص کے ساتھ شہریار کا ساتھ دے رہا تھا۔

راوالے بھی یقینی طور پر اپنے اس مہلک ہتھیار کے کھو جانے کے بعد تشویش میں گرفتار رہے ہوں گے اور انہیں جستجو رہی ہوگی کہ کسی طرح سلو تک رسائی حاصل کرسکیں۔ ان حالات میں اگر بھٹناگر نے اسے ہوٹل کی لابی میں دیکھ لیا تھا تو یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا کہ وہ آسانی سے اسے اپنے ہاتھوں سے نکلنے دیتا۔ وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کر رہا ہوگا۔ لیکن کیا...؟ یہ ابھی تک سامنے نہیں آسکا تھا۔ بظاہر تو کوئی ان کا تعاقب بھی نہیں کر رہا تھا۔

"سامنے ایک پولیس جیپ کھڑی ہے اور اس سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا جا رہا ہے۔" اچانک ہی ڈرائیور نے بلند آواز میں آگاہ کیا تو وہ دونوں ہی چونک گئے۔

"کیا حکم ہے صاحب! بولو رکنا ہے کہ نہیں؟" ڈرائیور نے اطلاع دینے کے ساتھ ہی فوراً ہی دریافت کیا۔ اسی وقت شہریار نے دیکھا کہ ایک گاڑی انہیں اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکلی ہے اور اسے بھی رکنے کا اشارہ کیا جا رہا ہے۔

"گاڑی روک لو۔ اگر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو پھر نکل پڑنا۔" اسے خیال آیا کہ شاید حالات کی وجہ سے شہر میں مختلف جگہ ناکابندی کر کے پولیس اپنی ڈیوٹی پوری کر رہی ہے۔ ایسے میں اگر وہ تھوڑی بہت بات چیت کر کے وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہوجاتے تو اچھا تھا ورنہ پھر مقابلے کا آپشن تو ہر صورت ہی ان کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ڈرائیور جس نے رفتار قدرے دھیمی کر لی تھی، اجازت پاتے ہی پولیس جیپ کے قریب جا رکا۔ جیپ کے باہر کئی پولیس اہلکار موجود تھے جن میں سے دو پہلے رکنے والی گاڑی کے ڈرائیور کے ساتھ مصروف تھے جبکہ دو ان کے قریب چلے آئے تھے۔

"کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟" ایک نے ٹارچ کی روشنی اندر مارتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ مہتا صاحب کے مہمان ہیں سر اور میں ان کے حکم پر ہی ایک جگہ پہنچانے جا رہا ہوں۔" ڈرائیور کے الفاظ بے شک مہذبانہ تھے لیکن لہجے میں وہ کروفر تھا جو کسی بڑے آدمی کے خاص ملازمین کے لہجے میں خود بخود ہی آجاتا ہے اور وہ اپنے صاحب کی حیثیت کے زعم میں خود کو چھوٹے افسروں سے اعلیٰ اور برتر سمجھنے لگتا ہے۔

"اوہو، مہتا صاحب کے مہمان ہیں یہ۔ ذرا خیال سے لے کر جانا۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ آج شہر کے حالات کتنے خراب ہیں۔ کہیں کوئی ان کے ساتھ شرارت نہ کر جائے۔" مہتا کے نام میں کوئی ایسا جادو تھا کہ پولیس والے کا لہجہ خود بخود ہی مؤدبانہ ہوگیا۔

"چنتا مت کرو۔ ایسے شرارت کرنے والوں سے نمٹنے کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔" ڈرائیور نے بے نیازی سے جواب دیا اور پولیس والے کے پیچھے ہٹنے پر گاڑی آگے بڑھا لی۔ پیچھے کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے

کے لیے تیار بیٹھے سلو اور شہریار کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ خلافِ توقع پولیس والوں نے ان دونوں سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا تھا اور محض ڈرائیور سے بات چیت کر کے ہی آگے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"یہ مہتا کون ہے جس کا نام سن کر پولیس والوں کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی تھی؟" گاڑی آگے بڑھی تو شہریار نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

"فیڈرل لاء منسٹر ہیں۔ یہ گاڑی بھی انہی کی ہے۔ اپنے بھائی جی کے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ رہتے تھے دہلی میں لیکن ادھر ممبئی میں بھی ان کی ایک کوٹھی ہے۔ عبدل بھائی نے آپ لوگوں کے لیے اسپیشلی ان کی کوٹھی سے گاڑی منگوائی تھی۔" ڈرائیور نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا تو شہریار اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے سمجھ آگئی تھی کہ یہ ڈرائیور کے بیان سے زیادہ مہتا کی گاڑی کا اثر ہوگا جو پولیس والوں نے بغیر چیکنگ اور تفتیش کے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ پولیس والے ان معاملات میں بہت ہوشیار اور باخبر ہوتے ہیں اور بڑے آدمیوں کی گاڑیوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ اس نے دل میں عبدل کی دوراندیشی کو بھی سراہا جس نے شہر کے مخدوش حالات میں ان کے لیے ایسا عمدہ انتظام کیا تھا۔ ان کا باقی سفر اطمینان سے گزرا۔ تعاقب کی طرف سے سو فیصد یقین ہو گیا کہ کوئی پیچھے نہیں ہے ورنہ سنسان سڑکوں پر نظروں میں ضرور آجاتا۔

"صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم تھوڑی سی نیند لے لیں تاکہ آئندہ کی کارروائی کے لیے فریش ہو سکیں۔ اب تک تو تمہیں یہ اطمینان بھی ہو گیا ہوگا کہ بھٹناگر نے ہوٹل کی لابی میں تمہیں نہیں دیکھا اگر دیکھا ہوتا تو اس کے آدمی ضرور ہمارا تعاقب کرتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم بھی اسے اپنے ذہن سے جھٹک دو اور ریلیکس ہو جاؤ۔" ڈرائیور انہیں ایک چھوٹے بنگلے میں پہنچا کر چلا گیا تو شہریار، سلو سے مخاطب ہوا۔ سلو کو بہت زیادہ بولنے کی عادت تو یوں بھی نہیں تھی لیکن اس وقت اس پر جو گمبھیر سنجیدگی طاری تھی، وہ شہریار کو بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی اس لیے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔ اس کی بات سن کر سلو کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تاہم اس نے اختلاف نہیں کیا اور فوراً ہی اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کی بطور خواب گاہ بنگلے پر موجود واحد ملازم نے نشاندہی کی تھی۔ شہریار بھی سر جھٹک کر اپنے لیے مخصوص خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

وہ تینوں ممکنہ تیز رفتاری سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ زخمی ایڈی، اسلم کے شانے پر لدا ہوا تھا اور ماہ بانو اپنے پیر کی موچ کے باوجود اسلم کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔ دیکھا جائے تو ان تینوں میں سے کوئی بھی اتنی مشقت کا اہل نہیں تھا لیکن جنگل میں پھیلنے والی آگ کا خوف ان کے قدموں کو رکنے نہیں دے رہا تھا۔ آگ ابھی ان سے بہت دور تھی لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس عفریت کو انہیں آدبوچنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔ اذیت ناک موت سے دوچار ہونے کا خوف انہیں نہایت تکلیف میں بھی قدم آگے بڑھاتے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"مجھے یہیں چھوڑ دو دوست۔ میرا بوجھ تمہاری رفتار کو کم کر رہا ہے۔ تم کیوں میرے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہو؟" اسلم کے شانے پر لدے ایڈی نے کراہتے ہوئے ایک بار پھر اس سے استدعا کی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں جانتے بوجھتے کسی بے گناہ انسان کو اس آگ کا شکار ہونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہارے دونوں ساتھی خود ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ورنہ میں تو انہیں بھی اپنے ساتھ ہی رکھتا۔ سمجھ لو کہ ہمارا جینا مرنا ساتھ ہے۔ اگر ہم اس مصیبت سے نکل سکے تو ساتھ نکلیں گے ورنہ ایک ساتھ ہی موت ہمارا مقدر بنے گی۔ اب تم دوبارہ مجھ سے ایسا مطالبہ مت کرنا۔" اسلم نے بالکل قطعی لہجے میں اسے جواب دیا اور آگے کا سفر جاری رکھا۔

"اب اور کتنا چلنا ہوگا؟" اس کا ہاتھ تھام کر چلتی ماہ بانو نے نقاہت زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ایک تو اس کی حالت ایسی تھی، اس پر سے پاؤں کی موچ نے بھی نڈھال کر دیا تھا... سو بے حد صابر ہونے کے باوجود اسے اپنا حوصلہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ہمت کرو۔ بس کچھ دیر اور لگے گی پھر ہم ان شاء اللہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" اسلم نے اسے تسلی دی لیکن حقیقتاً وہ خود اندر سے خاصا پریشان تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نقشے اور کمپاس کی موجودگی کے باوجود وہ کہیں غلطی کر بیٹھے ہیں اور جنگل سے باہر نکلنے والے راستے تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہے۔

"شش، ذرا ایک منٹ رکو۔" اچانک ہی ایڈی نے اس کے شانے کو دبوچتے ہوئے سرگوشی میں کہا تو وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے ایک آواز آ رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ یہ

ایک سے زیادہ بائیکس کی آوازیں ہیں۔" لمحہ بھر کے لیے اپنی توجہ کسی خاص سمت میں مرکوز رکھنے کے بعد ایڈی نے سرگوشی میں ہی بتایا تو اسلم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے یاد آگیا کہ ایڈی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق زیرِ زمین خفیہ لیبارٹری تک پہنچنے کے لیے ہنری اور طارق بائیکس کا استعمال کرتے تھے۔ وہ خود بھی اپنی سماعت پر زور دینے لگا اور اس بار اس نے جنگل کے شور میں مشینی آوازوں کو الگ سے شناخت کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر یہ واقعی ہنری اور طارق ہیں تو ہم کوشش کر کے نہ صرف انہیں ان کے انجام تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ ان سے بائیکس حاصل کر کے خود نسبتاً آسانی سے یہاں سے باہر بھی نکل سکتے ہیں۔" وہ پُرجوش ہو گیا اور آواز کی سمت قدم بڑھا دیے۔ اس بار ماہ بانو بھی ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے شانہ بشانہ تھی۔

"ایسا کرو کہ تم مجھے یہیں اتار دو تاکہ تیزی سے وہاں تک پہنچ سکو۔ بعد میں تم مجھے یہاں سے لے جا سکتے ہو۔" ایڈی نے تجویز پیش کی جو موجودہ حالات میں اسلم کو مناسب معلوم ہوئی۔ زخمی ایڈی کی وجہ سے اس کی رفتار میں واقعی کمی ہو رہی تھی۔ اگر وہ وقت پر ہنری اور طارق تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو یہ نقصان بہت بڑا ہوتا۔ ویسے بھی فی الحال وہ جنگل کے جس حصے میں تھے، وہ آگ کی زد سے بہت دور تھا۔ اگر اسے کامیابی حاصل ہو جاتی تو وہ ایڈی کو یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم دونوں یہاں ٹھہرو... میں دیکھتا ہوں کہ مجھ سے کیا ہو پاتا ہے۔" اس نے ایڈی کو نیچے اتار دیا اور بیک وقت اس سے اور ماہ بانو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں، میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔" ماہ بانو نے وہاں رکنے سے صاف انکار کر دیا۔

"میں نے کہا نا کہ تم دونوں یہیں رکو۔ تمہارے پیر میں موچ ہے۔ تم زیادہ رفتار سے میرے ساتھ نہیں دوڑ سکو گی۔" اسلم نے سختی سے انکار کر دیا اور مزید کچھ سنے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی رائفل اس کے شانے سے لٹکی ہوئی تھی جبکہ پسٹل ماہ بانو کے پاس ہی تھا۔

"وہ میرا شوہر ہے ایڈی اور میں اس موقع پر اس کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔" دور ہوتے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے یاسیت بھرے لہجے میں اپنی خواہش بیان کی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ تم میں ہمت ہے تو اس کے پیچھے چلی جاؤ اور میری فکر مت کرو۔ میں بہت سخت جان ہوں۔ مشکل وقت پڑا تو اس سے نمٹ ہی لوں گا۔" ایڈی نے نہایت بردباری سے اسے جواب دیا تو ماہ بانو نے شفقت آمیز انداز میں اس کے سنہری بالوں والے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے پاس موجود ایک چھری اسے تھما کر آگے بڑھ گئی۔ یہ پھل کاٹنے والی چھری تھی جو اس نے روانہ ہوتے وقت اپنے پاس چھپالی تھی۔

اسلم اس سے کافی آگے نکل چکا تھا اور اب نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ محض اندازے سے اس کے نقشِ قدم پر آگے بڑھتی رہی۔ چند منٹ بعد ہی اس نے گولی چلنے کی آواز سنی اور اس آواز نے اس کے لیے سمت کا تعین کرنا آسان کر دیا۔ اپنے پاؤں کے درد کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ ایک مقام پر پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ یہاں سے اسے اسلم اور پروفیسر ہنری صاف نظر آرہے تھے۔ پروفیسر کی خاص بناوٹ کی بائیک ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا تھے۔ پروفیسر عمر میں اسلم سے خاصا بڑا تھا لیکن اس کی فٹنس کمال کی تھی۔ اسلم بھی کسی سے کم نہیں تھا لیکن گزشتہ کئی روز کی مشقت نے اسے کمزور کر دیا تھا پھر لیبارٹری سے نکلنے کی جدوجہد میں بھی اسے بہت کچھ سہنا پڑا تھا اس لیے وہ پروفیسر سے زیر نہیں ہو رہا تھا تو اس پر حاوی بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس کی رائفل جس سے اس نے پروفیسر کی بائیک کو نشانہ بنا کر اسے رکنے پر مجبور کیا تھا، ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور لگتا تھا کہ اس میں گولی نہیں ہے اس وجہ سے اسے ناکارہ پا کر اسلم نے ایک طرف پھینک دیا ہے۔ ماہ بانو کے پاس پسٹل موجود تھا لیکن ایک تو اس کی رینج زیادہ نہیں تھی، دوسرے پروفیسر اور اسلم جس طرح ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، وہ کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ وہ گولی چلاتی اور وہ ہنری کے بجائے اسلم کو لگ جاتی تو پھر کیا ہوتا؟ فی الحال وہ خاموش تماشائی بنے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی اور وہ دونوں تھے کہ وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے اس سے مزید دور ہوتے جا رہے تھے۔

ان دونوں کی یہ لڑائی دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ نظریں گھما گھما کر اردگرد کا بھی جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ایڈی نے دو بائیکس کی آوازیں سنائی دینے کی بات کی تھی لیکن یہاں صرف ہنری اور اس کی بائیک موجود تھی

حالانکہ اصولاً ڈاکٹر طارق کو بھی اس کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ اطراف میں کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر وہ گولی چلتے ہی خود کو کہیں چھپا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا، تب بھی اسے ہنری کی مدد کے لیے تو آنا چاہیے تھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور ماہ بانو اسی ڈر سے اپنی کمین گاہ سے نہیں نکل رہی تھی کہ کہیں طارق اندھیرے کا تیر بن کر اسے نشانہ بنا بیٹھے۔ وہ جس جگہ چھپی ہوئی تھی، وہاں سے آگے جنگل زیادہ گھنا بھی نہیں تھا اور ہنری اور اسلم تقریباً کھلے حصے میں لڑ رہے تھے۔ یہ شاید جنگل میں آمدورفت کے لیے بنایا گیا راستہ تھا جو یہاں پیڑ پودے کم تھے البتہ اس راستے کی دوسری طرف پھر گھنا جنگل تھا۔

اسلم اور ہنری ایک دوسرے پر وحشیانہ حملے کرتے اور ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے کھلے حصے سے ہٹ کر جنگل کے گھنے حصے کی طرف بڑھتے جارہے تھے اور ساتھ ساتھ ماہ بانو کا اضطراب بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ اسلم کی حکم عدولی کر کے محض اس کی مدد کے خیال سے یہاں تک آئی تھی لیکن کچھ کر نہیں پارہی تھی۔ اسے اپنا یہ خاموش تماشائی والا کردار اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ طارق کے ڈر کو ذہن سے جھٹک کر خود میدان میں اترنے کا فیصلہ کرتی، آپس میں برسرِپیکار اسلم اور ہنری نے بیک وقت فلائنگ کک لگائی اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر دور جا گرے اور پھر ماہ بانو کی آنکھوں نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ وہ دونوں گرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے میں کامیاب ہونے کے بجائے زمین میں دھنستے جارہے ہیں۔

''دلدل۔'' اس کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال ابھرا اور وہ ہر خوف اور اندیشے کو بھول کر دیوانہ وار اپنی کمین گاہ سے نکل کر اس سمت بھاگی لیکن ابھی وہ اس دلدل سے کافی فاصلے پر تھی کہ اس کے سر پر کوئی شے بہت زور سے آکر لگی اور زمین و آسمان اس کی آنکھوں کے آگے گھوم کر رہ گئے۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس نے جو آخری منظر دیکھا، وہ اسلم کے وجود کے دلدل میں گم ہونے کا تھا۔

☆☆☆

جاوید علی سمیت کسی کو امید نہیں تھی کہ وہ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھیں گے تو وہاں ان کا استقبال کرنے کے لیے سعید اور خیری کے ساتھ ساتھ میجر ذیشان خود موجود ہو گا۔ وہ چاروں اتنی جدوجہد کے بعد کئی مشکل و جان لیوا مراحل سے گزر کر واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے کہ ان کی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ ذیشان نے انہیں فوری سوال جواب کے مرحلے سے گزارنے کے بجائے پہلے اپنی حالت بہتر کرنے کی مہلت دی اور پھر وہ ایک خیمے میں گرما گرم چائے کی پیالیوں کے ساتھ اکٹھے ہوئے تو سپیدۂ سحر نمودار ہونے ہی کو تھا۔

اس ملاقات میں ملک اور اس کے بیٹے کی شمولیت ضروری نہ سمجھتے ہوئے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی جبکہ سلمان اور جاوید علی، ذیشان کے روبرو تھے۔ ذیشان کے چہرے پر گمبھیر تاثرات تھے اور وہ اس حد تک سنجیدہ نظر آرہا تھا کہ جاوید علی ایک بڑا کارنامہ انجام دینے کے باوجود اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پارہا تھا۔

''تم دونوں مجھے یہاں دیکھ کر حیران تو ہوئے ہو گے؟'' آخرکار ذیشان نے خود گفتگو کا آغاز کیا۔

''یس سر۔'' دونوں ہی دھیمی آواز میں جواباً صرف اتنا کہہ سکے۔

''میری یہاں موجودگی کی وجہ نہیں جاننا چاہو گے؟'' اس نے تلخی سے دریافت کیا۔

''آپ مناسب سمجھیں تو بتا دیں۔'' جاوید علی نے ہمت کر کے جواب دیا۔ اتنا اندازہ تو بہرحال اسے ہو چکا تھا کہ ذیشان کا مزاج برہم ہے۔

''میں خیری کی کال ملنے پر ایمرجنسی میں ہیلی کاپٹر سے یہاں پہنچا ہوں اور وہ مجھے کال کرنے پر اس لیے مجبور ہوا کہ اس کا تم دونوں سے رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ وہ جس مشن پر یہاں آئے تھے، اس کے لیے انہیں لیڈ کرنے والا شخص ہی غیر موجود تھا اور وہ اپنے طور پر کسی پیچیدہ صورتِ حال سے نہیں نمٹ سکتے تھے۔'' ذیشان کے الفاظ سے انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی اہم واقعہ پیش آگیا ہے۔

''آئی ایم ویری سوری سر! ہم اپنے مشن کی تکمیل میں ہی مصروف تھے اس لیے اپنے ساتھیوں سے رابطہ نہیں رکھ سکے لیکن مجھے ان کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا کہ وہ یہاں کے حالات پر اچھی طرح نظر رکھ سکتے ہیں۔'' جاوید علی لیڈر تھا اس لیے جواب دہی کا فریضہ بھی اسے ہی انجام دینا تھا۔

''لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ میجر اسد کی خودکشی کی صورت میں انہیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔'' ذیشان نے گویا ان کی سماعتوں میں بم پھوڑا۔

''کیا... میجر اسد نے خودکشی کر لی؟'' جاوید علی نے حیرت سے یقین نہ کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''ہاں، یہ لو۔ اس کا سوسائیڈ نوٹ پڑھو۔'' ذیشان نے تہ کیا ہوا ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا تو وہ جلدی جلدی

چند سطروں پر مشتمل اس نوٹ کو پڑھنے لگا۔ اپنی اس آخری تحریر میں میجر اسد نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے ایک بڑی رقم کے عوض بھارت سے آنے والے اسلحے کے کنٹینرز کو وہاں سے خاموشی سے گزار دینے کا سودا کیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجنا چاہتا تھا۔ سی ایف پی کی ٹیم کی یہاں آمد کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ زیادہ دیر یہ بات راز میں نہیں رہے گی کہ اس نے اپنے وطن اور وردی سے غداری کی ہے اس لیے اس نے ذلت کا سامنا کرنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ خودکشی کر لے اور ساری جھنجھٹوں سے نجات حاصل کر لے۔

''تمہارے حکم پر خیری مستقل میجر اسد کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے خیمے کے نزدیک ہی موجود تھا اس لیے میجر کے سائیلنسر لگے ریوالور سے خودکشی کرنے کے باوجود اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے جا کر خیمے میں چیک کیا اور میجر اسد کی خودکشی کا علم ہونے پر تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ناکامی کی صورت میں اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے خود یہاں آنے کا فیصلہ کر کے اردگرد سے تم لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ چوکی پر موجود کسی مناسب شخص کو اعتماد میں لے کر فی الحال میجر کی خودکشی کی خبر کو چھپایا جائے۔ صد شکر کہ سعید اور خیری نے یہ کام بخیر و خوبی انجام دے ڈالا۔ خیری یہاں رک کر یہاں کے معاملات کو سنبھالتا رہا جبکہ سعید نے تم دونوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اسے کوئی ٹھوس ثبوت تو نہیں مل سکا لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ تم لوگوں کو آخری بار ملک سبحان کے ساتھ دیکھا گیا ہے اور ملک سبحان اپنے بیٹے کے ساتھ غائب ہے۔ اس کے علاوہ اسے سڑک پر کھڑے کنٹینر اور کلینر کی لاش دیکھ کر بھی بہت سے اندازے لگانے میں کامیابی ہوئی۔

''میری یہاں آمد پر اس نے مجھے صورتِ حال سے باخبر کیا تو مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ تم کیا کرنے نکل کھڑے ہوئے ہو۔ میں بے بس تھا اور تمہاری سلامتی کی دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں کے معاملات البتہ میں نے سنبھال لیے۔ کرنل توحید کی مدد سے فوجی حکام کو میجر اسد کی خودکشی کا معاملہ خفیہ طور پر ہینڈل کر لینے پر رضامند کر لیا گیا۔ اس وقت میجر کی لاش یہاں سے روانگی کے لیے تیار ہے۔ اس کا لکھا سوسائیڈ نوٹ صرف اس کی فیملی کو پڑھوایا جائے گا اور ان سے وہ رقم واپس لی جائے گی جو میجر نے بھارتیوں سے وصول کی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا کیس تھا جس کی بنیاد پر ہم بھارت کو عالمی عدالت میں گھسیٹ سکتے تھے لیکن دو وجوہات نے ہمارے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ اوّل میجر اسد کی خودکشی۔ اپنے خودکشی نوٹ میں اس نے کسی بھارتی ایجنسی یا خاص فرد کا نام ظاہر نہیں کیا ہے اس لیے ہم بطورِ خاص کسی پر الزام عائد نہیں کر سکتے۔ اگر میجر زندہ ہوتا تو اس کے اقبالی بیان کے ساتھ ساتھ ہم اس سے بہت سی دوسری معلومات بھی حاصل کر سکتے تھے۔ دوسرے تم لوگوں کی سرحد پار موجودگی نے بھی ہمارے ہاتھ پیر باندھ دیے ہیں۔ تمہاری وہاں دخل اندازی کے بعد ہمارے پاس کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ ہم اس معاملے کو کسی فورم پر اٹھا سکیں۔

''تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ یہاں بیٹھ کر سرحد کے اس طرف ہونے والے دھماکوں اور گولیوں کی آوازیں سننا کیسا تجربہ تھا۔ ہم صرف اندازے لگا سکتے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور ان اندازوں کی بنیاد پر ہی ہمیں اپنے فیصلے بھی کرنے پڑے۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ کہیں تم لوگ وہاں پھنس نہ جاؤ، کہیں تم میں سے کسی کی جان نہ چلی جائے چنانچہ میں یہاں بیٹھ کر جو کر سکتا تھا، وہ کیا۔ میں نے میجر کے بعد اس چوکی کے انچارج کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے ذریعے اس طرف فائر کروائے۔ اس طرح بھارتی فوجیوں کی توجہ بٹ جاتی اور مجھے لگتا ہے کہ میری یہ حکمتِ عملی تم لوگوں کی وہاں سے کامیاب واپسی میں ضرور مددگار ثابت ہوئی ہو گی اور بھارتی اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہارا تعاقب نہیں کر سکے ہوں گے۔'' بے حد خراب موڈ کے ساتھ ذیشان نے اپنی بات مکمل کی تو نہ چاہتے ہوئے بھی جاوید علی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے بمشکل اس مسکراہٹ کو چھپایا اور لہجے کو بدستور دھیما رکھتے ہوئے عاجزی سے بولا۔

''تھینک یو سو مچ سر! آپ کی اس فہم و فراست نے واقعی ہماری بہت مدد کی ورنہ ایک مرحلے پر مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ اب ہم زندہ واپس نہیں پہنچ سکیں گے اور شاید یہی وہ وقت تھا جب آپ نے یہاں سے فائرنگ شروع کروا کر بھارتیوں کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ ہمارا پوری قوت سے تعاقب کر سکیں۔''

''میں تمہاری وہاں کارروائی کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔'' اس کے چھپانے کے باوجود ذیشان اس کے ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے چمکنے والی مسکراہٹ کو دیکھ چکا تھا لیکن جان بوجھ کر نظرانداز کر گیا اور بارعب لہجے میں اپنی خواہش ظاہر

کی۔ جاوید علی نے سلمان کی مدد سے پورا قصہ گوش گزار کر دیا جسے سنتے ہوئے کہیں کہیں ذیشان کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ ان کے اس کارنامے سے متاثر ہوا ہو لیکن زبان سے اس نے اس کا اظہار نہیں کیا اور پوری بات ختم ہونے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔

''تم نے ایک بار پھر احمقانہ بہادری کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو کچھ تم کر گزرے ہو اس کا نتیجہ الٹ بھی نکل سکتا تھا اور اس کے بعد حالات کیا ہوتے، یہ بھی کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں ہے۔ میں اس سب کے لیے تمہیں ذمے دار سمجھتا ہوں جاوید! یہ ٹھیک ہے کہ سی ایف بی میں فوج جیسی پابندیاں نہیں ہیں اور نہ ہی ہم نے اپنے ورکروں کے لیے کوئی مخصوص ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس بات کے لیے آزاد ہوتا ہے کہ حالات کے مطابق اپنی صوابدید پر اقدامات کرے لیکن تم یہ اقدامات کرتے ہوئے حد سے آگے نکل جاتے ہو۔ جان دینے کی ہمت رکھنا اچھی بات ہے لیکن یوں ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے بھی نہ پھرا کرو۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اور اب ایک بار پھر بتا رہا ہوں کہ تمہاری جان ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔'' آخری الفاظ تک آنے تک ذیشان کا لہجہ نرم ہو چکا تھا۔ جاوید علی کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ اب تک وہ اس پر جس خفگی کا اظہار کرتا رہا ہے، اصل میں اس کے پیچھے اس کی محبت چھپی ہوئی تھی۔ وہ اتنی دیر ان کی سلامتی کی طرف سے پریشان رہا تھا اس لیے ردِعمل میں ایسے رویے کا اظہار کر رہا تھا۔

''میں آپ کے احساسات و جذبات کی قدر کرتا ہوں سر اور مجھے تسلیم ہے کہ میری جان آپ کے لیے قیمتی ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قیمتی صرف وہی آدمی ہوتا ہے جو کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ورنہ بے عمل آدمی کی حیثیت تو راستے کے پتھر سے بھی کم تر ہی ہوتی ہے اور لوگ اسے ٹھوکر مارنے میں بھی اپنے وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔'' بہت مضبوط لہجے میں اپنے عمل کے حق میں دلیل دیتا وہ ذیشان کو بہت اچھا لگا۔

''ٹھیک ہے جوان! تم نے ایک طرح سے فیصلہ سنا دیا ہے کہ تم اپنی روش پر قائم رہو گے سو ہم بھی دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔'' پوری گفتگو کے دوران ذیشان پہلی بار مسکرایا۔

''تھینک یو سر! دعا سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' جاوید علی کے لہجے میں چہکار تھی۔

''اور وہ میں تم سمیت اپنی ٹیم کے ہر ممبر کے لیے کرتا ہوں کیونکہ ہمارا ہر ساتھی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔''

جاوید علی سے یہ جملہ کہتے ہوئے ذیشان کے ذہن میں شہریار کا خیال تھا جس سے فی الحال ان کا رابطہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ دشمنوں کی سرزمین پر کیا کر رہا ہے۔ بس کچھ اندازے ہی تھے جن کی بنیاد پر وہ اس کی کامیابی کے لیے دعا مانگتے رہتے تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ کل بھارت سے نکلنے والے اخبار کی شہ سرخیوں سے خون اور آگ کی برسات ہو رہی ہوگی اور یہ رات جو گزری ہے، بھارت پر خاصی بھاری ثابت ہوئی ہوگی۔'' ان کی گفتگو اتنی طویل ثابت ہوئی تھی کہ سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا۔ ذیشان نے نئے نکلنے والے اس سورج کی روشنی کو محسوس کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں یہ تبصرہ کیا تو جاوید اور سلمان دونوں چونک گئے۔

''کیا مطلب؟'' دونوں نے بیک وقت سوال کیا۔

''کل گزری رات کو ممبئی کا ایک بڑا غنڈا اشوک قتل ہوا ہے۔ وہی اشوک جو اسلحے کی اس کھیپ کو پاکستان اسمگل کرنے میں ملوث تھا۔ اس خبیث کے اپنے انجام تک پہنچنے کے نتیجے میں ممبئی سمیت بھارت کے کئی شہروں میں ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے اور اندازہ ہے کہ بھاری جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' اس نے بتایا تو ان دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ ایک طرف سرحدی گاؤں میں ہونے والی ہنگامہ آرائی تو دوسری طرف شہر میں پھیلی بدامنی، بھارتی سرکار کو واقعی دہری چوٹ لگی تھی۔

''افسوس کہ اس ہنگامہ پرور اور پرجوش رات کی صبح تمہیں چائے کی یہ ٹھنڈی ٹھار پیالیاں ہی مل سکیں۔'' ذیشان نے اچانک ہی موضوعِ گفتگو تبدیل کر کے ان کی توجہ چائے کی ان پیالیوں کی طرف مبذول کروائی جن میں انہیں پیش تو گرما گرم چائے کی گئی تھی لیکن گفتگو کی گرما گرمی میں کوئی بھی اس چائے سے لطف اندوز نہیں ہو سکا تھا اور وہ یونہی رکھے رکھے اپنی گرمی اور تازگی کھو بیٹھی تھی لیکن ان میں سے کسی کے دل میں اس کے لیے ملال تھا نہ پروا۔ اس کا اندازہ اس قہقہے سے ہوا جو ان تینوں نے بیک وقت لگایا تھا۔

☆☆☆

''اب آپ تھوڑی دیر ریسٹ کر لیں تو یہ آپ کی صحت کے لیے اچھا ہوگا چودھری صاحب! میرا کیا ہے۔ میں کوئی بھاگی تو نہیں جا رہی ہوں۔ یہیں آپ کے پاس ہوں اور بعد میں بھی آپ جب چاہیں مجھے کال کر سکتے ہیں لیکن اس وقت اگر آپ نے خود کو نہیں سنبھالا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ میرے ساتھ آنے والی صبح کا سورج نہیں دیکھ سکیں گے۔''

وہ ممبئی فلم نگری سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ آج کل کی سب سے ہٹ ہیروئن کی ہم شکل سمجھی جاتی تھی۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ اس کی شکل ستر سے اسی فیصد اس ہیروئن سے ملتی ہے لیکن جسمانی خوب صورتی کے معاملے میں وہ بیس فیصد نمبر بھی حاصل نہیں کر سکتی اور یہاں یہ حال تھا کہ فلم بین طبقے کا ایک بڑا حصہ اس ہیروئن کی شکل سے زیادہ جسمانی خوب صورتی پر مرتا تھا۔ اس کی پتلی کمر کے بل پر دیکھنے والوں کے دل رک رک جاتے تھے اور سینے کا زیر و بم سانسوں کو تھام لیتا تھا۔ چودھری کے پہلو میں موجود الکا نامی ہیروئن کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی جسامت کو تمام تر کوششوں کے باوجود مطلوبہ معیار کے مطابق نہیں بنا سکی تھی۔ اصل میں وہ پیدا ہی کچھ ایسی بد وضع کاٹھ لے کر ہوئی تھی کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی خود کو بس کسی حد تک قابلِ قبول بنا سکی تھی اور اس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کے اندر اداکاری کی صلاحیت بھی بس برائے نام ہی تھی۔ اپنی اتنی بڑی بڑی خامیوں کے ساتھ اگر وہ ممبئی کی فلم نگری میں موجود تھی تو اس کی پہلی وجہ تو یہی تھی کہ مشہور ہیروئن کی شکل سے مماثلت نے اس کے دل میں فلمی ہیروئن بننے کا شوق بلکہ جنون پیدا کر دیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کا باپ اشوک کے گینگ میں تھا۔ بیٹی کے جنون نے اسے مجبور کیا کہ اشوک کی سفارش سے بیٹی کو ممبئی فلم نگری میں پہنچا دے اور یوں الکا فلمی دنیا میں داخل تو ہو گئی لیکن فلم بینوں کے دل میں اپنی کوئی جگہ نہیں بنا سکی۔ اس کی اب تک کل دو فلمیں ریلیز ہو گئی تھیں اور دونوں کی دونوں ہی بری طرح فلاپ ہو گئی تھیں۔ اس ناکامی کے بارے میں الکا کا خیال تھا کہ اس کے کو اسٹار کا انتخاب درست نہیں کیا گیا تھا۔

آج کل وہ اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح اشوک کی سفارش پر اسے مشہور ہیروز یا کم سے کم بھی اجے دیوگن یا اکشے کمار کے ساتھ کوئی فلم مل جائے تو اس کی قسمت کا بند تالا کھل جائے گا۔

اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ اشوک کی خوشنودی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی اور چودھری کے ساتھ اس خلوت گاہ میں موجود ہونا بھی اسی کوشش کا ایک حصہ تھا۔ اس جیسے اونچے خیالات رکھنے والی لڑکی کے لیے چودھری جیسے ٹھرکی بڈھے کو جھیلنا بہت مشکل کام تھا لیکن روشن مستقبل کے خوابوں نے اسے دل پر جبر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ چودھری نے بھارت میں اپنے قیام کے آخری ایام میں اشوک سے اس مشہور ہیروئن کی رفاقت کی فرمائش کی تھی اور اشوک نے اسے بتایا تھا کہ اس کی پسندیدہ ہیروئن اپنی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں کم از کم بھی پندرہ روز تک ملک سے باہر رہے گی لیکن اسے اس سلسلے میں مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ الکا کی صورت میں اس کے پاس چودھری کی پسندیدہ ہیروئن کا نعم البدل موجود ہے۔ یوں الکا چودھری کے ساتھ تھی اور بمشکل اسے جھیل رہی تھی۔ آخرکار جب اس کا ضبط جواب دے گیا تو وہ چند تلخ جملے کہہ کر اس سے فاصلے پر چلی گئی اور اپنے برائے نام لباس کو درست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''تم نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے سوئٹ ہارٹ۔ نہ تو میں اتنا عمر رسیدہ ہوں جتنا دیکھنے میں لگ رہا ہوں اور نہ ہی اتنا کمزور کہ جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ میرے ساتھ تم اپنی زندگی کے ان تجربات سے گزرو گی جن سے کوئی نوجوان اور توانا آدمی بھی تمہیں آشنا نہیں کروا سکتا۔'' چودھری کو الکا کے یوں پہلو سے اٹھ جانے پر الجھن بھی ہوئی تھی اور اس کی تلخ باتوں پر خجالت بھی چنانچہ بلند و بانگ دعوے کرنے لگا۔

''ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اب میں تھک گئی ہوں اور تھوڑی دیر ریلیکس کرنا چاہتی ہوں۔'' الکا نے بیزاری سے اسے جواب دیا اور اپنے لیے ایک جام تیار کرنے کے بعد اس انداز سے اسے ہونٹوں سے لگایا کہ اس کا جسم آرام دہ کرسی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بکھرا ہوا تھا اور عریاں ٹانگیں میز پر ٹکی چودھری کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ قدرے بدوضع ہی سہی، وہ ایک عورت تھی جو رات کی اس تنہائی میں نشے سے چور چودھری کو خوب ہی اپنی طرف لبھا رہی تھی۔ الکا کی بیزاری اور تلخی کا اسے خیال ہی نہ رہا اور مسہری سے اتر کر ڈگمگاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اسی وقت میز پر پڑا الکا کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں فون اٹھایا اور اسکرین پر کال کرنے والے کا نام دیکھ کر ذرا چونکتے ہوئے یس کا بٹن دبایا۔

''اوہ نو....'' دوسری طرف سے جانے اسے کیا اطلاع دی گئی کہ وہ یک دم سے بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔ دو قدم کے فاصلے پر موجود چودھری کو بھی اس کے تاثرات دیکھ کر اپنے قدم روکنے پڑے۔

''آئی کانٹ بلیو اٹ پاپا!'' اس نے جو اگلا جملہ ادا

کیا، اسے سن کر چودھری کو یہ تو اندازہ ہو گیا کہ فون کرنے والا انکا کا باپ ہے جو اسے کوئی بے حد غیر متوقع اطلاع دے رہا ہے لیکن اصل بات کا اس کے فرشتوں کو بھی گمان نہ گزرا۔ وہ تو جب انکا نے تیزی سے آگے بڑھ کر ٹیلی ویژن آن کیا اور اسکرین پر دکھائے جانے والے مناظر کے ساتھ ساتھ کمرے میں نیوز ریڈر کی آواز پھیلی تو اس پر یہ تلخ حقیقت کھلی کہ ممبئی میں اس کا میزبان اشوک اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ اس خبر کو سن کر وہ حواس باختہ ہو گیا۔ انکا کا اس سے بھی زیادہ برا حال تھا۔ وہ آنسوؤں کے ساتھ باقاعدہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اب جانے یہ اشوک کے مرنے کا غم تھا یا اپنی فلمی دنیا میں جگہ بنانے کے خواب کے چکنا چور ہو جانے کا خیال جو اسے یوں بری طرح رلا رہا تھا۔ حواس باختہ چودھری اسے یوں بلک بلک کر روتا دیکھ کر آگے بڑھا اور ہمدردی سے اسے گلے لگانا چاہا۔

''ڈونٹ ٹچ می۔'' اس نے زور سے چودھری کو دھکا دیا اور خود اس سے بھی زیادہ زور سے چیخی۔ اس کے بعد وہ ہکا بکا چودھری کو مزید کچھ کہنے سننے کا موقع دیے بغیر تیزی سے حرکت میں آئی اور کرسی پر پڑا اپنا گاؤن اٹھا کر پہننے کے بعد میز پر رکھا اپنا پاؤچ اٹھا کر کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ ظاہر ہے وہ جس اشوک کی خوشنودی کے لیے چودھری کی ناگوار قربت کو برداشت کر رہی تھی، جب وہی نہیں رہا تھا تو اسے یہ مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ اس جیسا ہی کچھ حال چودھری کا بھی تھا جو ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا کہ جب اس کا میزبان ہی دنیا سے اٹھ گیا تھا تو ممبئی میں مزید ڈیرا ڈالے رکھنے کا کیا جواز رہ گیا تھا۔ بس اب اسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کہاں کا رخ کرے کیونکہ پاکستان سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق تو وہاں بھی حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے اور اس کے پیچھے طوائف کے قتل کا مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس قسم کے معالات سے نمٹنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اتنے پُرلطف شب و روز گزارنے کے بعد ایسی تلخیوں کا سامنا کرنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسے میں یہی مناسب تھا کہ وہ دبئی کا رخ کرتا جہاں بہت سی ماہ رخوں سے ملاقات کے لیے اس کا دل مچلتا رہتا تھا اور کچھ سے تو وعدے وعید بھی کر کے آیا تھا کہ جلد ایک بار پھر دبئی کا رخ کرے گا اور ان ساری خواہشات کو پورا کرے گا جو اپنی اچانک پاکستان واپسی کی وجہ سے تشنہ چھوڑے جا رہا ہے۔

☆☆☆

شہر یار سونے کے ارادے سے خواب گاہ میں آیا لیکن فوری طور پر سو نہ سکا اور کچھ سوچ کر ٹیلی ویژن کھول لیا۔ وہاں گرما گرم خبروں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا اور سب سے زیادہ ترجیح اشوک کے قتل اور اس کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کو دی جا رہی تھی۔ محتاط اندازے کے مطابق اس خبر کے پھیلنے کے بعد بڑے پیمانے پر جانی، مالی نقصان ہوا تھا۔ اشوک کے حریف اور حلیف گروپوں کے افراد اس خبر کو سن کر آپس میں بھڑ گئے تھے اور متعدد مقامات پر ہونے والے ان جھگڑوں میں بہت سے افراد کے زخمی ہونے کے علاوہ کئی کی جانیں بھی گئی تھیں۔

آج رات شہر میں زخمی اور قتل ہونے والے کئی افراد ایسے بھی تھے جو کسی بھی گروپ سے منسلک نہیں تھے اور اشوک کے قتل کے بعد بھڑکنے والی فسادات کی آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ شہر یار کو ان افراد کے لیے افسوس تھا لیکن یہ وہ بھی جانتا تھا کہ یہ ہمیشہ کا دستور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اور کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ خبروں سے اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ شہر کے حالات اتنے مخدوش ہیں کہ انتظامیہ کو حالات پر قابو پانے کے لیے دو سے تین دن لازماً درکار ہوں گے۔

خبروں سے اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ فسادات کی یہ آگ صرف ممبئی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ دوسرے کئی شہر بھی لپیٹ میں آئے تھے لیکن سب سے زیادہ زور ممبئی میں ہی تھا۔ اسکرین پر چلنے والے کلپ میں اشوک کے گھر کا بیرونی منظر دکھاتے ہوئے بتایا جا رہا تھا کہ نامعلوم دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے اشوک کی آخری رسومات کے لیے فی الحال کسی وقت اور جگہ کا اعلان نہیں کیا گیا ہے اور اشوک کے رفقا آپس میں صلاح مشورے کے بعد ہی شہر کے حالات دیکھتے ہوئے کوئی حتمی اعلان کریں گے۔ میڈیا والوں کے رویے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ شہر کو ایک بڑے غنڈے سے نجات ملی ہے۔ وہ لوگ اشوک کی شخصیت کو بطور ایک بزنس مین اور سماجی کارکن پیش کر رہے تھے۔

خبروں کے اس تسلسل میں ایک خبر یہ بھی نشر کی گئی کہ پولیس نے کسی کی مخبری پر ہوٹل مون پر ریڈ کیا ہے۔ پولیس کے مطابق ایک عینی شاہد نے انہیں اطلاع دی تھی کہ اس نے دو مشکوک افراد کو رکشے سے اتر کر ہوٹل مون کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس اطلاع پر پولیس نے فوری ایکشن لیا اور مون ہوٹل پر ریڈ کر دیا۔

عام حالات میں شاید بھائی جی کی طرف سے اس کی

اجازت نہ دی جاتی اور سخت مزاحمت کا مظاہرہ ہوتا لیکن اس وقت خود کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے پولیس کو تلاشی کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت اسکرین پر جو مناظر دکھائے جارہے تھے، وہ مون ہوٹل کی تلاشی کے بعد پولیس والوں کی ناکام اور مایوس شکلوں کے تھے اور پیش منظر میں مون ہوٹل کا منیجر اپنے مخصوص انداز میں میڈیا کو بیان دے رہا تھا کہ اگرچہ پولیس کی طرف سے ان پر بہت گھناؤنا الزام عائد کیا گیا تھا اور اس طرح پولیس کو تلاشی کی اجازت دینا نہ صرف بھائی جی بلکہ ان معززین کی شان کے خلاف تھا جو مون ہوٹل میں قیام پذیر تھے اور جنہیں اس بے وقت کے ریڈ کے نتیجے میں بے آرام ہونا پڑا تھا... پھر بھی ان کی طرف سے کوئی مزاحمت صرف اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بھائی جی کی طرف سے پولیس کے ساتھ بھرپور تعاون کی ہدایت کی گئی تھی اور انہوں نے ایک قانون پسند اور محبِ وطن بھارتی ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔

منیجر نے دھیمے لہجے میں اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ ممکن ہے آئندہ چند روز میں بھائی جی کی اجازت ملنے پر ہوٹل کی انتظامیہ کی طرف سے پولیس ڈپارٹمنٹ پر ہتکِ عزت کا کیس دائر کیا جائے کیونکہ جس طرح پولیس کو یہاں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے بعد یہ ثابت ہوگیا تھا کہ وہ لوگ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے بس شک کی بنیاد پر ہوٹل میں گھس آئے تھے اور شرفا کا آرام وسکون برباد کیا تھا۔

اس خبر کو سن کر شہریار نے شکر کیا کہ اس نے اپنی چھٹی حس کی پکار کو نظر انداز نہیں کیا اور ہوٹل میں رات گزارنے کے بجائے وہاں سے منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ورنہ وہ کسی بڑی پریشانی کا شکار بھی ہوسکتے تھے۔ اس خبر کے بعد دوبارہ پھر وہی پہلے والی خبریں دہرائی جانے لگیں تو اس کی دلچسپی ختم ہوگئی اور اس نے ٹی وی بند کرنے کے خیال سے ریموٹ ہاتھ میں اٹھایا لیکن بٹن دباتا، اس سے قبل ہی کسی بریکنگ نیوز کا اعلان ہونے لگا۔ وہ بریکنگ نیوز سننے کے لیے رک گیا۔ اگلے ہی لمحے نیوز اینکر پنجاب کے ایک سرحدی گاؤں میں واقع آنند فروٹ فارم پر رات گئے سنائی دینے والے زبردست دھماکوں کی خبر دے رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہاں موجود ان کے نمائندے کے مطابق دھماکے اتنے شدید تھے کہ محسوس ہورہا تھا جیسے فروٹ فارم پر بارود کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہو یا پھر وہاں کئی طاقتور ٹائم بم نصب کردیے گئے ہوں۔

اطلاع کے مطابق دھماکوں کے نتیجے میں بھڑکنے والی شدید آگ پر تاحال قابو نہیں پایا جاسکا تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سرحدی گاؤں میں فائر بریگیڈ، ریسکیو کے دوسرے ایسے اداروں کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔

ٹی وی چینل کے نمائندے نے ساتھ ہی یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا تھا کہ دھماکوں کے بعد بہت دیر تک سرحد کے دونوں طرف فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا اور دو طرفہ فائرنگ کی وجہ سے بھارتی فوج کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نیوز اینکر کے سوالوں کے جواب میں چینل کے نمائندے نے اپنا یہ ذاتی خیال پیش کیا تھا کہ شاید سرحد کی دوسری طرف سے کوئی شرارت کی گئی تھی اور آنند فروٹ فارم پر ہونے والے دھماکے اسی شرارت کا نتیجہ تھے۔

چینل کا نمائندہ یہ رائے نہ دیتا تو شہریار کو حیرت ہوتی کیونکہ بھارتیوں کا تو وتیرہ ہی یہ تھا کہ انہیں اس قسم کے ہر واقعے کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ چینل کے نمائندے سے رابطہ ختم ہوا تو اینکر رات گئے دستیاب اپنے نام نہاد دفاعی تجزیہ کاروں سے ٹیلی فون پر ان کی رائے لینے لگی۔ شہریار ان تجزیہ کاروں کے زریں خیالات سے پہلے ہی واقف تھا اس لیے ٹی وی بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹنے کے بعد اسے یاد آیا کہ خبر میں جس سرحدی گاؤں کا نام لیا گیا تھا، یہ وہی تھا جہاں سے گزر کر اشوک اور چودھری کے درمیان طے پانے والی اسلحے کی ڈیل پاکستان سپلائی ہونی تھی اور صبح وہ اس بارے میں سی ایف پی کو مطلع بھی کرچکا تھا تو کیا واقعی یہ اسی کاری ایکشن تھا اور سی ایف پی کے جیالوں نے بھارتی اسلحہ پاکستان پہنچنے سے قبل ہی بھارتی حدود میں ہی تباہ کردیا تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو یہ بہت بڑی کامیابی تھی اور بھارتیوں کے لیے ایک سبق تھا کہ پاکستان اتنا بھی تر نوالہ نہیں ہے جتنا وہ سمجھتے ہیں۔

اپنے ذہن میں ابھرنے والی اس سوچ نے اسے دل ہی دل میں "وہ مارا" کا نعرہ لگانے پر مجبور کیا اور اس نے خوشی اور طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔ آج کی رات اگر بھارتی سورماؤں کے لیے بھاری تھی تو اس نے بھی بڑی جدوجہد کی تھی اور اب اس کا حق بنتا تھا کہ صبح کے قریب ہی سہی، کچھ دیر کے لیے پرسکون نیند لے۔ تھکن اور طمانیت نے مل کر اسے کچھ زیادہ ہی گہری نیند سلادیا لیکن مشکل سے آدھا گھنٹا ہی گزرا ہوگا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا اور ماحول میں کوئی

ایسی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی جسے محسوس کیا جاسکتا۔ پہلے ہی کی طرح مکمل خاموشی اور سکوت کا راج تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کروٹ بدل کر ایک بار پھر نیند کی وادی میں اتر جائے لیکن کچھ ایسا تھا جس نے اسے اپنے ارادے پر عمل نہیں کرنے دیا اور وہ تھکن اور نیند کے احساس کو ذہن سے جھٹکتا ہوا بستر پر اٹھ بیٹھا۔ سونے سے قبل اس نے پسٹل اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ ہاتھ ڈال کر پسٹل برآمد کیا اور چیمبر میں گولیوں کی موجودگی کی یقین دہانی کرنے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اندر سے ابھرنے والی تنبیہ کی بنیاد پر وہ کوئی وجہ نظر نہ آنے کے باوجود بے حد محتاط تھا۔

سلو کی خواب گاہ اس کے لیے مخصوص خواب گاہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ قدرتی طور پر اس نے سب سے پہلے اسے ہی چیک کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ساتھی کی حیثیت سے اسے سب سے زیادہ اسی کی پروا تھی۔ ہینڈل پر دباؤ ڈالنے پر اسے اندازہ ہوا کہ دروازہ اندر سے لاک نہیں کیا گیا ہے۔ بہت آہستہ سے دروازہ کھول کر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی میں کوئی سر سے پیر تک چادر تانے بستر پر محوِ خواب نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے یہ سلو ہی ہونا چاہیے تھا اور اسے اس کی نیند خراب کرنے کے بجائے خاموشی سے پلٹ جانا چاہیے تھا لیکن اس نے اس کے برخلاف کیا اور تیزی سے کمرے میں داخل ہوگیا۔ اتنے دنوں سے سلو کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ اس کی عادت واطوار سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ بہت بار انہیں ایک ساتھ ایک کمرے میں سونے کا بھی اتفاق ہوا تھا لیکن ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے سلو کو یوں سر سے پیر تک چادر لپیٹ کر سوتے ہوئے دیکھا ہو۔ وہ اپنا چہرہ ہمیشہ کھلا رکھ کر سوتا تھا اور بستر پر جو وجود موجود تھا، اس کا کوئی عضو نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور چادر کھینچ کر ہٹادی۔ فوراً ہی اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ وہاں سلو تو کیا، کوئی دوسرا ذی نفس بھی موجود نہیں تھا اور تکیوں کو اس انداز میں بستر پر رکھ کر چادر اوڑھا دی گئی تھی کہ کسی سوئے ہوئے آدمی کا گمان ہو۔ اس نے پھرتی سے بستر اور اس کے ساتھ رکھی چھوٹی سی میز کا جائزہ لیا۔ وہاں اسلحے سمیت سلو کا کوئی بھی سامان موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جوتے بھی غائب تھے اور ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سلو کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوئی ہے اور وہ جہاں بھی گیا ہے، اپنی مرضی سے گیا ہے... لیکن کیوں اور کہاں؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جواب صرف سلو ہی دے سکتا تھا اور وہ غائب تھا۔

شدید الجھن اور پریشانی کے عالم میں وہ سلو کی خواب گاہ سے نکلا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں بنگلے پر موجود ملازم نے اپنے موجود رہنے کے بارے میں بتایا تھا۔ کچن کے بالکل ساتھ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں ملازم انٹرکام پر ملنے والے احکامات وصول کرسکتا تھا۔ اس کے لیے یہ کمرا یقیناً اس لیے مخصوص کیا گیا تھا کہ وہ بنگلے میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی کھانے پینے سے متعلق وقت بے وقت کی فرمائشوں کو فوری طور پر پورا کرسکے۔ شہریار کو اس بات کی امید کم تھی کہ ملازم سلو کے بارے میں کوئی علم رکھتا ہو لیکن پھر بھی اسے کسی طور تو اسے تلاش کرنے کا آغاز کرنا تھا۔

وہ آہستہ سے ملازم کے کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا لیکن پھر کچھ غیر معمولی پن محسوس کرکے بھڑک کر پلٹنے کی کوشش کی لیکن اسے اس کا موقع نہیں ملا۔ دروازے کے پیچھے چھپے ایک شخص نے جھٹکے سے اس کا پسٹل جھپٹ کر اپنے قبضے میں لے لیا اور دوسرے نے اس کی کھوپڑی پر کسی ہتھیار کی نال ٹکادی۔

"اگر کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔" اسے اپنے ہتھیار کی زد میں لیے کھڑے شخص نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔ شہریار محسوس کرسکتا تھا کہ اس کی پشت پر دو افراد موجود ہیں لیکن وہ دونوں افراد اسے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ البتہ وہ سامنے بستر سے نیچے بے سدھ پڑے بنگلے کے ملازم کو دیکھ سکتا تھا جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہے یا جان کی بازی ہار چکا ہے۔ اس کے اس لحاتی جائزے کے دوران اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاکر ہتھکڑی میں جکڑ دیے گئے تھے اور اب پیروں میں کلپ ڈالا جارہا تھا۔ کھوپڑی سے لگی نال نے اسے کسی مزاحمت کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور وہ بے بسی سے خود کو مزید بے بس ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسے بے بس کرنے کے بعد ان میں سے ایک پشت سے ہٹ کر اس کے سامنے آگیا جبکہ دوسرا بدستور اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنائے پشت پر کھڑا رہا۔ سامنے آنے والا بھی سرتاپا سیاہ لباس میں چھپا ہوا تھا اور چہرے پر موجود نقاب سے صرف اس کی آنکھیں جھلک رہی تھیں۔

"ملازم کو آف کردیا ہے اور ایک ٹارگٹ ہمارے قابو میں ہے... دوسرے کو تلاش کیا جارہا ہے۔" سامنے آنے کے بعد بھی وہ شہریار سے مخاطب نہیں ہوا اور آپریٹس

پر کسی کو اطلاع دینے لگا۔ دوسری طرف سے جانے اسے کیا جواب دیا گیا کہ اس نے ''یس سر'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور اس کی پشت پر کھڑے شخص سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اسے لے چلو۔ سر خود اس سے بات کریں گے۔''

اگلے ہی لمحے شہر یار ان کی نگرانی میں ملازم کے کمرے سے نکل کر کوریڈور میں چل رہا تھا۔ اس کے دونوں پیروں میں ڈالے گئے کڑے آپس میں ایک مختصر زنجیر سے منسلک تھے اور اس زنجیر کے اختصار کی وجہ سے وہ بہت چھوٹے سے قدموں سے تقریباً گھسٹتا ہوا ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔ بھاگنے یا باقاعدہ چلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سست رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی نیند بلاوجہ نہیں ٹوٹی تھی۔ ان لوگوں کے بنگلے میں داخل ہونے کے دوران میں یقیناً کوئی آواز پیدا ہوئی تھی جس نے اس کے شعور تک تو رسائی حاصل نہیں کی تھی لیکن آنکھ کھل گئی تھی اور وہ ان لوگوں کے اپنے کمرے تک پہنچے سے قبل ہی باہر نکل آیا تھا۔ اس موقع پر ان لوگوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اسے چھیڑنے کے بجائے دور سے نظر رکھنے پر اکتفا کیا تھا اور شاید جس وقت وہ سلو کے کمرے میں موجود تھا، اسی دوران میں ملازم سے خاموشی سے نمٹ لیا گیا تھا۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ سلو کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ اسی طرف کا رخ کرے گا اس لیے اسے وہیں گھیرنے اور بے بس کرنے کا انتظام کر لیا گیا۔ سلو کی غیر موجودگی شاید پہلے ہی ان کے علم میں آچکی تھی اس لیے انہوں نے اس کے کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔

اپنی حرکات و سکنات سے ہی کمانڈوز محسوس ہونے والے سیاہ پوش اسے اپنی نگرانی میں لیے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو اسے وہاں ایک آشنا صورت کو دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے مون ہوٹل کی لابی میں دیکھا تھا اور سلو نے اسے بھٹناگر قرار دیا تھا۔ یعنی سلو کا اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا اور ان کی تمام تر ہوشیاری کے باوجود بھٹناگر نے ان تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

''سلو کہاں ہے؟'' اسے بھٹناگر کے روبرو پیش کیا گیا تو اس نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

''کون سلو؟ میں کسی سلو کو نہیں جانتا۔'' شہر یار نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مے بی تم اس شخص کو کسی اور نام سے جانتے ہو لیکن میں تم سے اس لڑکے کے بارے میں جانکاری چاہتا ہوں جو ہوٹل مون سے مہتا صاحب کی گاڑی میں سوار ہو کر تمہارے ساتھ یہاں تک پہنچا ہے؟'' بھٹناگر نے اندر تک [illegible] ہو جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے اپنا مد[illegible] کیا۔ جواب میں شہر یار یوں خاموش رہا جیسے اس کی [illegible] سمجھنے سے قاصر ہو۔

''تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ میں نے خود اسے تمہارے ساتھ دیکھا تھا اور میرے ہی حکم [illegible] راستے میں تم دونوں کو چھیڑنے کے بجائے صرف تمہاری کار [illegible] سے ایک ٹریسنگ ڈیوائس اٹیچ کر کے تمہارے اس ٹھکانے تک [illegible] چلایا گیا تھا۔ اس بنگلے میں تمہارے پہنچنے کے صرف بیس منٹ بعد میرے آدمیوں نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس وقت سے اب تک بنگلا مسلسل ہماری نگرانی میں ہے۔ ہم چاہتے تو فوری طور پر بھی اندر داخل ہو سکتے تھے لیکن تمہارے کمرے کی کھڑکی سے ٹیلی ویژن آن ہونے کا اشارہ ملتا رہا اور ہم نے مناسب سمجھا کہ سب کے سو جانے کا انتظار کر لیں لیکن یہاں ہمیں وہ نہیں مل سکا جس کی تلاش میں ہم یہاں تک آئے ہیں۔ ملازم سے ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ یہاں دو افراد ہی آکر ٹھہرے تھے اور دوسرے کمرے میں موجود سیٹ اپ سے بھی یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ سلیم عرف سلو سب کو دھوکا دے کر نکل گیا۔ اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ کہاں ہے اور ہم اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔''

بھٹناگر کی باتوں نے کئی پوائنٹس پر اس کا ذہن کلیئر کر دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بظاہر ان کا تعاقب نہ کیے جانے کے باوجود ان لوگوں نے یہاں تک رسائی کیسے حاصل کی؟ پولیس والوں کا راستے میں انہیں روکنا اور بغیر کسی حیل و حجت کے آگے جانے کی اجازت دے دینا صرف اس لیے تھا کہ انہیں صرف ڈیوائس گاڑی سے چپکانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ شاید راستے میں کھلی جگہ پر سلو کو پکڑنے کی کوشش اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ کھلے جنگل میں شیر کا شکار کرنے کے مقابلے میں اسے دھوکے سے کسی جگہ گھیر کر شکار کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ وہ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ یہاں آئیں گے اور سوتے میں آسانی سے اس پر قابو پالیں گے... لیکن پنچھی ان کے پہنچنے سے پہلے ہی پنجرے سے اُڑ چکا تھا۔ کہاں؟ یہ تو شہر یار بھی نہیں جانتا تھا لیکن یہ سوال مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ سلو نے اس موقع پر اسے اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟

یہ پُرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

فریب

عکسِ فاطمہ

مغربی معاشرے میں ان کی تہذیب و تمدن سے قطع نظر بدلتے وقت کے ساتھ ہر رت... ہر موسم سے متعلق کوئی نہ کوئی تہوار ایجاد ہو چکا ہے... اپنی مصروفیت زدہ زندگی میں سے چند لمحات اس بہانے وہ تفریح کی نذر کرتے ہیں... بھیس بدل کے ایک چونکا دینے والے روپ بہروپ اختیار کرنے والے جوڑے کا تحیر خیز ماجرا...

اپنی صلاحیتوں پر بھروسا کرنے والے فنکار کی ناکامیاب کوشش

ڈیرک نے ویمپائر کاسٹیوم میں ملبوس جوڑے پر اپنا ریوالور تانتے ہوئے بے ساختہ ایک قہقہہ بلند کیا۔ خود اس کا چہرہ کلاؤن کے میک اپ میں چھپا ہوا تھا۔ ''اپنی جیولری اتار کر مجھے دے دو۔'' ڈیرک نے عورت سے کہا۔ ''اور تم...'' اس نے اپنا ریوالور مرد کی جانب لہراتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنا بٹوا کاؤچ پر اچھال دو۔''

ان دونوں نے بے چون و چرا ڈیرک کے حکم کی تعمیل کر دی۔ ڈیرک نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

ہیلووین کی شب شکار کا انتخاب کرنا بے حد آسان ہوتا تھا۔ وہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر سے اطمینان سے گزرتا چلا جاتا تھا اور کوئی اس پر دھیان نہیں دیتا تھا اور نہ ہی کسی کو کسی کی پروا ہوتی تھی۔ اس شب سب ہی مختلف قسم کے ملبوسات پہنے ادھر سے اُدھر آجا رہے ہوتے تھے۔ بچوں کی ٹولیاں اپنے تحائف وصول کرنے کے لیے گھر گھر گھومتی نظر آتی تھیں۔

پھر موقع ملتے ہی وہ کسی گھر کی ڈور بیل بجادیتا تھا اور جب وہ دروازہ کھولتے تھے تو...

''تمہیں اچھا چکما دیا۔'' وہ اپنا ریوالور دکھانے کے ساتھ ہمیشہ یہی جملہ کہا کرتا تھا۔

وہ اب تک تین گھروں کو لوٹ چکا تھا۔ ان گھروں سے نکلنے سے قبل وہ ان کے مکینوں کے ہاتھ پیر باندھنا اور منہ میں کپڑا ٹھونسنا نہیں بھولا تھا۔ پھر ان گھروں کی روشنی بھی بند کردی تھی۔ یہی اس کا معمول تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے نکلنے کے بعد وہ لوگ کسی قسم کا شور وغل مچائیں یا لائٹیں روشن دیکھ کر بچوں کی ٹولیاں ان گھروں کی جانب متوجہ ہو جائیں۔

اب وہ جس گھر میں داخل ہوا تھا، وہ جوڑا غالباً کسی کاسٹیوم پارٹی میں جانے کے لیے گھر سے نکلنے کی تیاری کررہا تھا۔ وہ جوڑا ویمپائر کا کاسٹیوم پہنے ہوئے تھا۔

ویمپائر! ہاہاہا۔

'وہ کیا کسی کا خون پییں گے، میں تو انہیں نچوڑ کر خشک کردوں گا۔' ڈیرک نے دل ہی دل میں کہا۔' میں انہیں ان کی نقدی اور جیولری سے محروم کردوں گا اور یہ میری اس رات کی کمائی میں ایک اچھا اضافہ رہے گا۔'

عورت نے اپنا نیکلس، بریسلیٹ اور دو انگوٹھیاں اتار کر ڈیرک کے حوالے کردیں۔ ڈیرک نے وہ جیولری اپنے کلاؤن کاسٹیوم کی بڑی سی جیبوں میں سے ایک میں ڈال لی۔ جیب میں رکھنے سے پہلے اس نے ایک تنقیدی نگاہ جیولری پر ڈال لی تھی۔ وہ کوئی بیش قیمت جیولری نہیں تھی۔ البتہ انگوٹھیوں میں سے ایک میں چھوٹا سا ہیرا جڑا ہوا تھا۔

وہ اس شخص کے پرس کی تلاشی لینے لگا۔ اس میں بہت سے کریڈٹ کارڈ موجود تھے لیکن وہ ڈیرک کے کسی کام کے نہیں تھے۔ پھر وہ نقدی دیکھنے لگا۔ ''دو بیس اور ایک دس ڈالر کا نوٹ؟'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔ ''بس تمہارے پاس یہی نقد رقم ہے؟''

''میں اپنے پاس زیادہ نقدی نہیں رکھتا۔'' مرد نے جواب دیا۔

''ہاں لیکن میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس گھر میں زیادہ نقدی موجود ہوگی۔ اور تم...'' ڈیرک نے عورت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارے پاس تو فینسی جیولری سے بھرا ہوا بکس ضرور موجود ہوگا۔''

''ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔''

اتنے میں دروازے کی ڈور بیل بجی اور ساتھ ہی بچوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''کیا مصیبت ہے۔'' ڈیرک بڑبڑایا۔ اس نے تو یہاں آتے ہی باہر کی تمام لائٹس آف کردی تھیں۔ کیا ان بدتمیز بچوں کو اتنی عقل نہیں ہے کہ بیرونی روشنیاں گل ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ گھر میں کوئی موجود نہیں؟

''کوئی آواز مت نکالنا۔'' ڈیرک نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔ اس کی سرگوشی پھنکار کے مانند تھی۔

یہ خاموشی ایک منٹ تک برقرار رہی پھر بچوں کی آوازیں دور ہوتی چلی گئیں۔ وہ کسی اور گھر کی جانب چل دیے تھے۔

ڈیرک نے قدرے توقف کیا۔ پھر سوچنے لگا کہ وہ کیا کررہا تھا؟ اوہ ہاں، گھر میں موجود مزید قیمتی اشیا تلاش کرنی ہیں۔ اس نے کمرے کا ایک طائرانہ جائزہ لیا۔ دیوار پر آرٹ کے چند عمدہ نمونے دکھائی دے رہے تھے۔ فرنیچر بھی نیا لگ رہا تھا۔

ٹھیک ہے، یہ جوڑا امیر تو نہیں ہے لیکن ان کے پاس مزید اور کچھ بھی ہوگا جو اس کی یہاں آمد کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ بس اسے ان اشیا کو تلاش کرنے کے لیے محنت کرنا ہوگی۔

ڈیرک نے اپنی جیب میں سے رسی کا ایک ٹکڑا نکال کر مرد کی جانب اچھال دیا اور عورت سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''لیڈی! گھوم جاؤ تاکہ تمہارا شوہر تمہارے ہاتھ باندھ سکے۔''

''اس کے ہاتھ باندھ دوں؟'' مرد نے باریک سی آواز میں احتجاج کیا۔ ''میں...''

''شٹ اپ۔'' ڈیرک غرایا۔ ''تمہیں جیسا کہا جارہا ہے، وہ کرو۔ اس کے ہاتھ باندھ دو۔''

مرد کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں پھر وہ عورت سے بولا۔ ''سوری ڈیئر!'' یہ کہہ کر اس نے عورت کی کلائیوں میں رسی باندھنا شروع کردی۔

جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو ڈیرک نے اپنی

سوچیں!

☆ ایک ہزار قابل لوگوں کے مرنے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک احمق کے حکمراں بن جانے سے ہوتا ہے۔

☆ جیسی قوم، ویسے حکمراں... ہائیں! تو کیا ہم سب گنجے ہیں؟

ہر نوجوان کا خواب

☆ ...... عدد خوب صورت اور سگھڑ بیوی۔
☆ ......عدد صحت مند بچے۔
☆ ...... بیڈروم کا ذاتی گھر۔
☆ ...... پہیوں والی چمچماتی ہوئی ذاتی کار۔
☆ ......بجے دفتر سے چھٹی۔
☆ ...... ہندسوں کی ماہانہ تنخواہ۔
☆ ......دنوں میں دو دن چھٹی والی نوکری۔

(پیریا بابا سے صبا گل کا تحفہ)

جیب میں سے رسی کا ایک اور ٹکڑا نکال کر مرد کی جانب اچھال دیا اور بولا۔ ''اب اس کے پیر باندھ دو۔''

ایک منٹ بعد وہ عورت مشکیں کسی ہوئی مرغی کی طرح فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

''نہایت عمدہ!'' ڈیرک نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ اب تک اور کسی بچہ پارٹی نے دروازے کی ڈور بیل نہیں بجائی تھی اور سب کچھ بالکل صحیح ہو رہا تھا۔ اب اسے تیزی سے مکان کی تلاشی لینا تھی۔ پھر وہ اپنی راہ چل پڑتا۔ لیکن اس سے پہلے اسے مرد کے ہاتھ پیر بھی باندھنا تھے اور ان دونوں کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسنا تھا۔

''اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔'' ڈیرک نے مرد کو حکم دیا۔ ساتھ ہی سیدھی پشت والی ایک کرسی کی جانب اشارہ کر دیا۔ ''اور اپنے ہاتھ کرسی کے پیچھے لے جاؤ۔''

مرد چند لمحوں کے لیے ہچکچایا پھر دھیرے دھیرے کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈیرک نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں تمہارے ویمپائر کے کاسٹیوم سے واقعی متاثر ہوا ہوں۔ یہ ڈریکولا اسٹائل کے متاثر کن ملبوسات ہیں اور میک اپ بھی نیچرل لگ رہا ہے۔ بالکل اسی جیسا گیٹ اپ ہے جیسا کہ ہالی ووڈ کی فلموں میں ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ تمہیں اپنی وہ پارٹی مس کرنا پڑے گی جہاں تم جا رہے تھے۔''

یہ کہہ کر ڈیرک نے اپنی جیب سے رسی کا ایک اور ٹکڑا نکالا اور مرد کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''او کے مسٹر ویمپائر...'' وہ مرد کی جانب جھکا۔ ''اب وقت ہے کہ... آ...''

ڈیرک کی تیز چیخ نکل گئی کیونکہ مرد نے اچانک اپنے دانت ڈیرک کے اس ہاتھ کی کلائی میں گاڑ دیے تھے جس میں اس نے ریوالور پکڑا ہوا تھا۔ ریوالور ڈیرک کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے سرامک ٹائلوں کے فرش پر گر پڑا۔

ڈیرک ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس مرد نے اپنا جبڑا ڈیرک کی کلائی پر سے ہٹا دیا اور اپنے نکیلے دانت ڈیرک کی گردن میں گاڑ دیے۔ ڈیرک کی آنکھیں دہشت سے پھٹ پڑیں اور اس کے حلق سے ہولناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔

''تم کون ہو...؟'' ڈیرک نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔

پھر ڈیرک نے دیکھا کہ عورت نے پہلے اپنے ہاتھوں اور پھر پیروں میں بندھی رسی کی گرہوں کو کھول کر خود کو آزاد کرا لیا تھا۔

خوف... دہشت اور تکلیف سے ڈیرک فرش پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔

''نہایت عمدہ فرضی گرہیں تھیں، ڈارلنگ۔'' عورت نے اپنے پارٹنر سے آسودہ لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی منہ کھول کر اپنے تیز نکیلے دانت نمایاں کر دیے۔

مرد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ ڈیرک سے مخاطب ہوا تو اس کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ ''اور تم... تم احمق کلاؤن۔ تم یہ سمجھے کہ ہم ویمپائر کا سٹیوم میں ملبوس ہیں۔''

اس بار مرد نے ڈیرک کے اسٹائل میں نقل اتارتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا اور اپنی ساتھی کی جانب گھومتے ہوئے بولا۔ ''آؤ ڈیئر! اب تم سیراب ہو جاؤ۔ جی بھر کے پیو۔''

عورت نے لپک کر بے تابی سے اپنے نکیلے دانت ڈیرک کی گردن میں گاڑ دیے۔

ڈیرک کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

بعض بیویاں اپنے خوبرو شوہروں کے گرد گھومتی تتلیوں سے ہمہ وقت خوف زدہ رہتی ہیں... ان کے تحفظ کے پیش نظر ہمیشہ انہیں اپنی نظروں اور جاسوسوں کے حصار میں مقید رکھتی ہیں... نفسیاتی حربوں سے اپنے ہدف کو عبور کرنے والی بیوی کا پُرانتقام معرکہ...

تنبیہ

سلیم انور

دل میں اتر جانے والی دل نشیں لڑکیوں کے غیاب کا دردناک احوال...

وہ خط سفید رنگ کے سادے لفافے میں پہنچا تھا۔ اس پر کوئی جوابی پتا تحریر نہیں تھا۔ اندر ایک صفحہ تھا جس پر یہ لکھا ہوا تھا۔

''میرے شوہر سے دور رہو، کتیا۔ ورنہ تمہاری زندگی ختم ہے۔''

ایملی بے یقینی کی کیفیت میں اس تحریر کو گھورنے لگی۔ کیا یہ کوئی عملی مذاق ہے؟ یہ خط کسی کی شرارت محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے لفافے کو پلٹ کر دیکھا۔ سامنے کے حصے

پر کمپیوٹر سے پرنٹ کردہ ایک سفید اسٹیکر چسپاں تھا جس پر لکھا تھا۔
ایملی ایلڈرج
سینئر ایڈیٹر، برائیڈل بیوٹی میگزین
ایسٹ فورٹی سکستھ اسٹریٹ۔

اوپر داہنے کونے پر ایک کینسل کیا ہوا ٹکٹ چسپاں تھا۔ لفافے پر کسی بھی جگہ بھیجنے والے کا نام دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ اپنی کرسی پر سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی تا کہ اپنے کیوبیکل کی دیوار کے اوپر سے دیکھ سکے۔

''ینیسا؟'' اس نے آواز دی۔ ''ذرا دیکھو تو سہی یہ کیا ہے؟''

''کیا؟'' وینیسا نے اپنی کرسی گھماتے ہوئے اپنا رخ ایملی کی جانب کردیا۔ اس کی سرخی مائل بھوری زلفیں اس کے شانوں پر اس طرح لہرا گئیں جیسے وہ کسی شیمپو کے اشتہار کی ماڈلنگ کررہی ہے۔

ایملی نے وہ عجیب ساخط وینیسا کی جانب بڑھادیا۔ وینیسا نے لفافے میں سے خط نکالا، اسے پڑھنے لگی تو اس کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔ اس نے خط دوبارہ لفافے میں ڈال دیا اور بولی۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

''یہ آج کی ڈاک میں تھا۔''

''کیا تم کسی شادی شدہ آدمی کے ساتھ ملاقاتیں کررہی ہو؟'' وینیسا نے سوال کیا۔

''یقیناً نہیں۔'' اپنا جواب سوچنے سے قبل ہی یہ الفاظ ایملی کے منہ سے نکل گئے۔ وہ سوچنے لگی کیا ممکن ہوسکتا کہ جیسن شادی شدہ ہو؟ جیسن سے اس کی شناسائی کو صرف چند ہفتے ہی گزرے تھے۔ وہ اپنی کئی راتیں اس کے اپارٹمنٹ میں گزار چکا تھا لیکن وہ کبھی اس کے اپارٹمنٹ نہیں گئی تھی۔ کیا ایسا تو نہیں، وہ واقعی شادی شدہ ہو؟

''کیا تمہیں اس قسم کا کوئی خط پہلے کبھی موصول ہوا ہے؟''

ایملی نے نفی میں سر ہلادیا۔ ''نہیں۔''

وینیسا نے اپنے گہرے لپ اسٹک لگے ہوئے ہونٹوں کو سکیڑا۔ ''تمہیں نیویارک میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اس لیے تم جانتی نہیں ہو لیکن یہاں بعض گھناؤنے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جن سے تم توقع بھی نہیں کرسکتیں۔''

''کیا اس کا مطلب ہے کہ مجھے بہتر محسوس کرنا چاہیے؟''

''یہ میرا کام نہیں ہے کہ تمہیں بہتری کا احساس دلاؤں۔'' وینیسا نے اسے لفافہ واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا کام یہ ہے کہ تمہیں تنبیہ کردوں۔ تمہیں ہوشیار رہنے کو کہوں۔''

''مجھے ہوشیار رہنے کی ضرورت کیوں ہونی چاہیے؟''

''اس سے پوچھو جس کے ساتھ تمہارے تعلقات ہیں۔''

اس بات نے ایملی کو شدید بے سکونی کی کیفیت میں مبتلا کردیا۔ جب وہ اس رات اپنے کرائے کے اپارٹمنٹ میں پہنچی تو اپنے میل بکس میں دھمکی آمیز خطوط تلاش کرنے لگی لیکن وہاں صرف ایک بل اور کیٹلاگ کے سوا اور کوئی ڈاک نہیں تھی۔

اس نے سوچا کہ جیسن سے اس بارے میں سوال کرے لیکن پھر پُرسکون رہنے کا فیصلہ کیا اور اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔

جمعرات کو اس کی ملاقات جیسن سے ہوئی تو وہ اپنی بے تابی پر قابو نہ رکھ سکی۔

''مجھے اپنے دفتر میں ایک عجیب سا خط موصول ہوا ہے۔'' ابھی انہوں نے کیفے میں اپنی نشستیں سنبھالی بھی نہیں تھیں کہ ایملی بول پڑی۔ ''اس میں کہا گیا ہے کہ میں کسی کے شوہر کے ساتھ ملاقاتیں کررہی ہوں۔''

یہ سُن کر جیسن کی بھویں تن گئیں۔ ''واقعی؟''

''میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا تم شادی شدہ ہو؟'' ایملی نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

جیسن اس کی صورت تکنے لگا۔ ''تمہارا خیال ہے میری ایک بیوی ہے جسے میں نے کہیں چھپا رکھا ہے؟''

''میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے۔''

''ہاں، میں نے اپنے مکان کی سب سے اوپری منزل میں ایک پاگل عورت کو بند کرکے رکھا ہوا ہے۔ میں اسے باہر اس لیے نہیں نکال سکتا کہ وہ مجھے مار ڈالنے کی کوشش کرے گی اور ہر چیز کو آگ لگا کر راکھ کردے گی۔''

عام حالات میں شاید ایملی کو یہ ادبی حوالے دلکش لگتے لیکن یہ کوئی نارمل رات نہیں تھی۔ ''تم نے مسٹر روچسٹر کی کہانی کا غلط موقع پر حوالہ دیا ہے۔''

''بہرحال، یہ میں نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی دوسرا شخص ہو جس سے تم ملاقاتیں کررہی ہو۔''

یہ جواب ایملی کی زبان کی نوک پر آگیا تھا کہ وہ کسی

اور شخص سے ملاقاتیں نہیں کرتی لیکن یہ جواب اس کی یاسیت کو ظاہر کردیتا اس لیے اس نے بروقت اپنی زبان کو یہ جملہ ادا کرنے سے روک لیا۔ وہ اور جیسن باہر ملاقاتیں تو کررہے تھے لیکن یہ بات اب واضح ہوچکی تھی کہ وہ دیگر خواتین سے بھی تعلقات استوار کیے ہوئے تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انگور کی بیل کی طرح اس سے چمٹی رہے لہٰذا اس نے وہ بات وہیں ختم کردی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایملی اس خط کو تقریباً بھول چکی تھی پھر ایک سہ پہر اس نے کارڈبورڈ کا ایک بکس کھولا تو اندر ایک بڑا سا براؤن چوہا موجود پایا۔ یہ احساس ہونے سے پیشتر کہ وہ ایک مرا ہوا چوہا ہے، اس کی چیخ نکل گئی۔ اس بکس کے ساتھ کوئی پیغام نہیں تھا۔

اس کی چیخ سنتے ہی وینیسا نے بھی اپنی کیوبیکل کی دیوار کے اوپر سے جھانک کر ایملی کو دیکھا تو اس کی بھی چیخ نکل گئی۔

میگزین کے ایڈیٹر اِن چیف باربرا چار انچ اونچی ہیل پہنے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی وہاں آگئی۔ سنہری بالوں والی باربرا ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ عورت تھی۔ اس کی عمر پینتالیس، چھیالیس سال کے لگ بھگ تھی جو ہمیشہ پراڈا کے سوٹ زیب تن کیے رہتی تھی اور ہر طرح کے بیگ استعمال کرتی تھی۔ نصف مہینے وہ دفتر سے باہر رہتی تھی۔ وہ ہنی مون منانے والی تفریح گاہوں سے ہیجانی کیفیت کی فیچر کہانیوں کے حصول کے لیے جیٹ طیاروں میں سفر کیا کرتی تھی اور جنہیں وہ حیران کردینے والی باقاعدگی سے تحریر کیا کرتی تھی یا پھر کمپنی مینجمنٹ کے ہمراہ کارپوریٹ تقریبات کے اہتمام میں مصروف رہتی تھی۔

''یہ کیا ہورہا ہے؟'' اس نے درشتی سے پوچھا۔

''یہ بکس... ابھی ابھی مجھے...'' ایملی ہکلانے لگی۔

''کسی نے اسے چوہا بھیجا ہے۔'' وینیسا نے بتایا۔

باربرا نے بکس میں جھانک کر دیکھا، اندر کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور بکس کا ڈھکن بند کردیا۔ اس نے ایملی یا وینیسا کی طرح چوہے کو دیکھ کر کوئی چیخ نہیں ماری۔ وہ آنکھیں بھینچتے ہوئے بولی۔ ''کیوں؟''

''کیوں؟'' ایملی نے بنا سوچے سمجھے دہرایا۔ وہ کنفیوز ہوچکی تھی۔

''کسی نے تمہیں مرا ہوا چوہا کیوں بھیجا ہے؟''

''مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔''

''میں یہاں کسی قسم کی پریشانی نہیں دیکھنا چاہتی۔'' باربرا نے کہا۔ ''اپنے ذاتی مسائل یہاں دفتر لانے کی کوئی ضرورت نہیں... سمجھ گئیں؟''

''لیکن میں نے تو...''

''وینیسا! اس واقعے کو تحریری شکل میں لے آؤ... پلیز۔'' باربرا کا لہجہ سرد تھا۔ ''اور اس کی ذاتی فائل میں لگادو۔''

ایملی کو اپنی ایڈیٹر اِن چیف کے اس ردِعمل کی قطعی توقع نہیں تھی۔ ''لیکن میں نے تو کوئی غلط حرکت نہیں کی۔''

''اس قسم کی تباہ کن شے کو میگزین کے دروازے تک لانا ہی بہت بڑی غلطی ہے۔'' باربرا نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس قسم کا واقعہ دوبارہ یہاں سننے کو نہیں ملے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' وینیسا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ صورت حال نہیں ہوگی جو انٹرن کے ساتھ ہوئی تھی۔''

کمرے کا درجۂ حرارت اچانک گر گیا۔ ایملی کو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ان دونوں عورتوں کے درمیان سرد مہری بڑھ رہی تھی۔

''ہم یہاں بدنامی نہیں چاہتے۔'' باربرا نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے وینیسا سے کہا۔ ''میں تم سے توقع رکھتی ہوں کہ کوئی بھی ایشو سامنے آئے تو تم اسے سنبھالو۔ آخر کار تم مینجنگ ایڈیٹر ہو۔ کیا میں اس معاملے میں تم پر اعتماد کرسکتی ہوں؟''

''ہاں، باربرا۔''

''ویری ویل۔'' ایڈیٹر ان چیف تیز تیز قدموں سے اپنے دفتر کی جانب چل پڑی۔

''انٹرن کے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' ایملی نے وینیسا سے پوچھا۔

''وہ کوئی بات نہیں تھی۔ دیکھو، تم یقیناً باربرا کی نظر میں برا نہیں بننا چاہتی ہوگی۔'' وینیسا نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''اسے کسی قسم کے اسکینڈل یا منفی صحافت سے الرجی ہے۔ اس نے ایک ہی سانس میں تمہیں برخاست کردینا ہے اگر اسے گمان ہوا کہ تم نے اس کی پوزیشن خراب کی ہے۔''

''لیکن کوئی مجھے دھمکا رہا ہے۔'' ایملی نے کہا۔ ''میں اس کی رپورٹ کروں گی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ کے پاس جاؤ۔'' وینیسا نے کہا۔ ''وہ تمہیں بہت کچھ کر دکھائیں گے۔''

ایملی کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا لیکن وینیسا نے جو

بات کہی تھی، اس کا دل اسے مان رہا تھا۔ کسی کو کسی قسم کی کوئی گزند نہیں پہنچی تھی اور پولیس ایک بکس میں موجود مرے ہوئے چوہے پر کبھی اپنا وقت ضائع کرنا گوارا نہیں کرے گی۔

وہ جیسن کو اس بارے میں بتاتے ہوئے خفت محسوس کر رہی تھی۔

"واقعی، تمہیں چوہا بھیجا گیا؟" جیسن نے قدرے حیرت سے کہا۔ "لگتا ہے جیسے تمہارا واسطہ کسی قسم کے حاسد سے پڑ گیا ہے۔"

"یہ بڑی ڈراؤنی قسم کی بات تھی۔" ایملی نے اعتراف کیا۔

"کیا تمہارے اپارٹمنٹ پر کوئی چیز بھیجی گئی ہے؟" جیسن نے پوچھا۔

"اگر تمہارا مطلب کسی دھمکی یا بکس میں بند چوہے سے ہے تو میرا جواب نفی میں ہے۔ صرف آفس میں یہ چیزیں موصول ہوئی ہیں۔" ایملی نے بتایا۔

"یہ تو واقعی دلچسپ بات ہے۔ جو کوئی بھی یہ حرکت کر رہا ہے وہ تمہارا نام جانتا ہے اور یہ کہ تم کہاں کام کرتی ہو... لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ تم رہتی کہاں ہو۔"

ایملی نے اس بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ گھر کے مقابلے میں دفتر کے حوالے سے اس کا تعاقب کر کے اس تک پہنچ جانا کہیں زیادہ آسان تھا۔ اسے نیویارک میں رہتے ہوئے صرف تین ماہ ہوئے تھے اور اس دوران وہ کرائے کے دو اپارٹمنٹ بدل چکی تھی۔ اس بات نے صورتِ حال کو مزید پیچیدہ بنا دیا تھا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، چوہے والے واقعے کا صدمہ ماند پڑتا گیا لیکن پھر ایک نیا ناپسندیدہ سرپرائز اس کا منتظر تھا۔

جمعے کی صبح ایملی نے دریافت کیا کہ اس کے ای میل بکس میں جنسی ترغیب دینے والی ای میلوں کی سطر در سطر شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ سہ پہر تک اس کا ای میل بکس فحش باتوں اور تحاریر سے بُری طرح بھر چکا تھا۔ آوارہ غلیظ عورت کے الفاظ اکثر دہرائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے وہ الفاظ اور جملے بھی تھے جو کسی باتھ روم کی دیوار کے لحاظ سے زیادہ مناسب تھے۔

"وینیسا۔" ایملی نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے اپنی نشست سے اٹھ کر کیوبکل کی دیوار کی اوٹ سے برابر میں جھانکا۔

وینیسا کا کمپیوٹر آن تھا اور اس کا کوٹ بھی کیوبکل کے کنارے پر لٹکا ہوا تھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

خوف سے بولائی ہوئی ایملی اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ اس بارے میں بار بار اسے کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اس کی نظر ایملی کے کمپیوٹر کے اسکرین پر پڑ گئی تو غصے کی حرارت سے ایڈیٹر ان چیف کی سرد نیلی آنکھیں پگھل ہی نہ جائیں۔

ایملی نے مایوسی کے عالم میں آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں فون کیا۔ "یس؟" ایک سست بوری آواز سنائی دی۔

"کیا تم بائرن ہو؟" ایملی نے پوچھا۔ اسے وہ گنجا شخص یاد آ گیا تھا جس کے جسم پر ٹیٹو بنے ہوئے تھے اور جب ایملی نے برائیڈل بیوٹی میگزین میں کام کا آغاز کیا تھا تو اسی نے اس کا کمپیوٹر سیٹ کیا تھا۔

"ہاں، تم کیا چاہتی ہو؟"

"میرے ای میل اکاؤنٹ پر شرانگیز اور اخلاق باختہ پیغامات کی بھرمار ہو رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں... پلیز میری مدد کرو۔" ایملی نے ایک اچٹتی نگاہ اپنی کمپیوٹر اسکرین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ چونکہ اس نے فون اٹھایا ہوا تھا تو اس دوران مزید درجن بھر بغیر نتھرے پیغامات امڈ آئے تھے۔

"مجھے ایک نظر دیکھ لینے دو۔" بائرن نے کہا۔ ایملی کے کانوں میں کی بورڈ پر پُرجوش انداز میں انگلیاں چلانے کی آواز سنائی دی۔ "کیا تم نے فری آن لائن کلاسیفائڈ ویب سائٹ پر اپنا ای میل کا پتا اس اشتہار کے ساتھ پوسٹ کیا تھا کہ تم ایک بازاری عورت ہو؟"

"یقیناً نہیں۔"

"بہرحال، کسی نہ کسی نے تو پوسٹ کیا ہے۔" پھر مزید انگلیاں چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی بائرن بولا۔ "میں اس کے خلاف رپورٹ کر رہا ہوں۔ ویب سائٹ والے اس اشتہار کو ہٹا دیں گے اور میں تمہارا ای میل اکاؤنٹ بھی بند کر رہا ہوں۔"

"لیکن مجھے ای میل کی ضرورت ہے۔" ایملی نے کہا۔ "مجھے آج دن ختم ہونے سے پہلے کئی لوگوں سے رابطہ کرنا بے حد ضروری ہے۔"

"میں تمہارا ایک عارضی اکاؤنٹ سیٹ کر دیتا ہوں۔ تمہارا درمیانہ نام کیا ہے؟"

"سائمونی... کیوں؟"

"یہ تمہاری عارضی آئی ڈی ہوگی۔ سائمونی ایٹ

برائیڈل بیوٹی میگ ڈاٹ کام۔ پیارا نام ہے۔" اس نے کہا اور پھر دوبارہ کام کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "او کے، اب لاگ آؤٹ کر کے دوبارہ لاگ ان ہو جاؤ۔ اپنے معمول کے پاس ورڈ کے ساتھ۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ پاس ورڈ مجھے یاد بھی ہے کہ نہیں۔"

"وہ اس لیے یاد نہیں رہتا کہ تم ہر وقت لاگ ان رہتی ہو اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" بائرن نے اسے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا پاس ورڈ کیور انڈر اسکور بیل ہے۔"

"رائٹ۔" ایملی نے قدرے شرمندگی سے جواب دیا۔ "تمہاری مدد کا بہت بہت شکریہ۔"

"کیا تم مفت مشورہ چاہتی ہو؟"

"کیا؟"

"اس شخص سے ناتا توڑ لو۔ وہ ایسا نہیں کہ اس کی خاطر تردد کیا جائے۔" بائرن نے کہا۔

یہ سن کر ایملی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ ظاہر تھا کہ بائرن اس کی وہ تمام ای میل پڑھ چکا تھا جو اس نے جیسن کو بھیجی تھیں۔ ایملی کی عزتِ نفس کو صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے باوجود کہ اسے علم تھا اس نے اپنے ورک اکاؤنٹ سے جیسن کو جو بھی ای میل بھیجی تھیں، وہ کھلم کھلا نہیں تھیں۔

پھر اس نے فون سے جیسن کو ایک پیغام دیا۔ "ہمیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔"

جیسن کے جواب کے انتظار میں اس نے اپنی ڈاک دیکھنا شروع کر دی۔ تب اس کی نظر اس سفید لفافے پر پڑی جس پر واپسی کا کوئی پتا تحریر نہیں تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور اندر رکھا ہوا کاغذ نکال لیا۔ وہ ایک سفید کاغذ تھا جس پر یہ ٹائپ تھا۔

"میں نے تمہیں وارننگ دی تھی۔ اب بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کتیا۔"

ایملی لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وینیسا ابھی تک واپس نہیں آئی تھی اور آس پاس میں کوئی ایسا نہیں تھا جس سے وہ یہ بات کر سکتی۔ اسے فوری طور پر کسی سے بات کرنے کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے لپک کر اپنا کوٹ اٹھایا اور لفٹ کے ذریعے نیچے آ گئی۔

اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ جیسن کہاں رہتا ہے البتہ وہ اس گرافک ڈیزائن فرم سے واقف تھی جہاں وہ کام کرتا تھا۔ وہ فرم اس کے اپنے دفتر سے صرف نصف درجن بلاک کے فاصلے پر واقع تھی۔ وہ پیدل ہی وہاں چل دی۔ اب وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آج تک جیسن اور اس نے شہر کے وسط میں جہاں ان کے دفاتر تھے، کبھی ملاقات کیوں نہیں کی اور اس سوال کا جواب اسے جیسن کے دفتر پہنچنے پر مل گیا۔

"آئی ایم سوری لیکن جیسن کو عجلت میں باہر جانا پڑ گیا ہے۔" ریسپشنسٹ نے ایملی سے کہا۔ وہ بڑی بڑی براؤن آنکھوں والی ایک سنجیدہ مزاج لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ "مجھے احساس نہیں رہا کہ آج سہ پہر آپ کا ان کے ساتھ اپائنٹ منٹ ہے۔ کیلنڈر پر بھی درج نہیں ہے ورنہ میں آپ کو فون کر دیتی۔"

"سب کچھ ٹھیک ہے نا؟" ایملی نے جاننا چاہا۔

"ان کا بیٹا پلے گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے گر گیا تھا اور اس کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ بظاہر تو وہ بچہ گرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کھیلنے کودنے لگا تھا لیکن احتیاط کی خاطر اسے چیک اپ کے لیے اسپتال لے گئے ہیں۔"

یہ سن کر ایملی کا حلق خشک ہو گیا۔ "ان کا بیٹا؟"

"ناتھن... وہ لگ بھگ دو برس کا ہے۔"

"تھینک یو۔" ایملی نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ دوبارہ اپنے دفتر کی جانب چل دی۔ وہ بدستور سینے پر بوجھ محسوس کر رہی تھی۔

جب وہ اپنے دفتر پہنچی تو وینیسا اپنے کیوبکل میں موجود تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی لیکن جوں ہی اس کی نگاہ ایملی پر پڑی تو اس نے تیوریاں چڑھا لیں۔ "کیا کچھ گڑبڑ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ مجھے وہ پریشان کن پیغامات کون بھیج رہا ہے؟"

"واقعی؟" وینیسا نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"جیسن کی بیوی یا گرل فرینڈ یا وہ جو کوئی بھی ہے... اس کے بچے کی ماں۔" ایملی نے بتایا۔

"جیسن وہی ہے جس سے تم ملاقاتیں کرتی ہو؟" وینیسا نے کہا پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم نے یہ تو کبھی نہیں بتایا کہ اس کا کوئی بچہ بھی ہے۔"

"آج سہ پہر تک تو مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا کوئی بیٹا بھی ہے۔"

"اس قسم کی کوئی بات چھپائے رکھنا تو بڑی ہولناک

بات ہے۔ کیسا گھناؤنا شخص ہے۔"

اتنے میں ایملی کے سیل فون پر پیغام موصول ہونے کی بزر بجی۔ اس نے پیغام پڑھا، لکھا تھا۔ "سوری، آج کا دن خراب رہا۔ کل بات کریں گے۔" وہ اس تحریر کو گھورنے لگی پھر یہ جواب ٹائپ کیا۔

"تمہارا بیٹا کیسا ہے؟"

کچھ دیر توقف رہا جو ایملی کو ایک طویل عرصہ محسوس ہوا پھر یہ پیغام آیا۔ "ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ صرف سر پر ایک گومڑا پڑ گیا ہے۔"

ایملی کے ذہن کا ایک ننھا سا حصہ یہ توقع کر رہا تھا کہ شاید جیسن کی ریسپشنسٹ کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی اور اس نے کسی اور کو جیسن سمجھ کر اسے یہ جواب دیا تھا۔ شاید وہ ابھی نئی نئی ملازمت پر آئی تھی۔ ایک منٹ بعد اسے جیسن کا ایک اور پیغام موصول ہوا۔

"ہم ملاقات کرلیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ کیا کل ملاقات طے کی جاسکتی ہے؟"

ایملی نے جواب میں لکھا۔ "نہیں، مجھے دوبارہ زحمت مت دینا۔" ساتھ ہی اپنا سیل فون بھی آف کردیا۔

"کیا یہ وہی گھناؤنا شخص تھا؟" وینیسا نے پوچھا۔

ایملی نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اسے اپنے دل پر بے حد بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جیسن کو اچھی طرح سے جان چکی ہے۔ ان کے درمیان .... ذہنی ہم آہنگی تھی اور دیگر سیکڑوں باتیں بھی مشترک تھیں لیکن اب دن کی اس ٹھنڈی روشنی میں یہ سب بے کار اور فضول لگ رہا تھا۔

"آؤ آج رات کاک ٹیل کے لیے کہیں چلتے ہیں۔" وینیسا نے مشورہ دیا۔ "تمہاری کیفیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔"

ایملی کا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن جب گھڑی نے پانچ بجادیے تو دفتر سے نکلنے کے بعد اس نے خود کو وینیسا کے پیچھے چلتے ہوئے پایا۔ وہ دونوں سڑک پار واقع بار میں چلی گئیں۔

"نیویارک کے مرد عام طور پر گھناؤنے ہیں۔" وینیسا نے ایملی سے کہا۔ اس دوران میں ویٹرس ان کے لیے گریپ وائن کے دو گلاس لے آئی تھی۔ "تم حقیقت میں ان پر بھروسا نہیں کرسکتیں۔"

"میں خود کو انتہائی گھامڑ محسوس کر رہی ہوں۔" ایملی نے اقرار کیا اور اپنے گلاس سے ایک گھونٹ بھرنے لگی۔

"خود کو الزام مت دو۔ یہ تمہاری غلطی نہیں ہے۔"

"کیا تمہارے ساتھ کبھی ایسا ہوا؟" ایملی نے پوچھا۔

"میں اپنے حصے کے نظر فریب لوگوں سے مل چکی ہوں۔" وینیسا نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "آپ کو بس اپنی آنکھیں ثمرات پر رکھنے کی ضرورت ہے۔"

"اس بات کا کیا مطلب ہے؟"

"ہر مرد آپ سے کچھ چاہتا ہے۔ آپ کو خود سمجھنا چاہیے کہ آپ ان سے کیا چاہتی ہیں۔"

"یہ تو بڑا ہی ہولناک لگتا ہے۔"

"عملی زندگی میں یہی ہوتا ہے۔ بیشتر مواقع پر یہ آپ کو ان پریشانیوں سے دور رکھتا ہے جن میں سے ایک میں تم مبتلا ہو۔" وینیسا نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو میں اپنے اگلے جاب کے بارے میں سوچ رہی ہوتی۔"

ایملی کا جیسے سانس اٹک گیا۔ "لیکن میں نے ابھی ابھی تو یہاں ملازمت شروع کی ہے۔"

"ویل، میں پریشان اس لیے ہوں کہ زندگی کے چند اہم اور مخصوص طور طریقوں میں تم کامیاب نہیں ہوپاؤ گی۔" وینیسا کی نگاہیں ایملی کے شانوں پر سے اٹھ گئیں اور بظاہر خوشی سے اس کا منہ کھل گیا۔ "دیکھو، وہاں کون ہے؟" اس نے کہا۔

ایملی نے پلٹ کر اپنے پیچھے کی جانب دیکھا اور بولی۔ "کون؟"

"وہ سائمن تھورسن ہے۔"

"کون سائمن تھورسن؟" ایملی نے دہرایا۔

"میگزین ڈویژن کا سربراہ۔ اس نے کمپنی کے بانی کی بیٹی، باربرا سے شادی کی ہے۔" وینیسا نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے ہلکے سے لہرادیا۔ سائمن نے اسے دیکھا تو مسکرادیا اور میزوں کے درمیانی راستے پر چلتا ہوا ان کی جانب بڑھنے لگا۔

اس کی عمر پچاس میں لگ رہی تھی۔ کنپٹیوں کے بالوں پر سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے جو سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا، اس کی قیمت اس رقم سے پانچ یا چھ گنا زیادہ تھی جو ایک ماہ میں ایملی گھر لے جاتی تھی۔

"وینیسا! تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔" سائمن نے وینیسا کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ یوں لگا جیسے وہ اسے چومنے جارہا ہو پھر اس کی بھیڑیے جیسی ندیدی آنکھیں ایملی کی جانب گھوم گئیں۔

"ویل، ہیلو ایملی ایلڈرج۔"

ایملی سناٹے میں آگئی کہ وہ اس کے نام سے واقف ہے۔ اس سے قبل کہ وہ پوچھتی، وینیسا بول پڑی۔ "کیا آپ ہمارے ساتھ شامل ہونا پسند کریں گے؟"

"اگر میں شامل ہوجاؤں تو تم لوگ مائنڈ تو نہیں کروگے؟" سائمن نے وینیسا کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا لیکن وہ ایملی کے برابر میں بیٹھ گیا۔ "ہماری ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی لیکن میں نے تمہیں اسی وقت غور سے دیکھ لیا تھا جب تم نے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔"

"آپ ان تمام پریٹی لڑکیوں کو نگاہ میں رکھ لیتے ہیں جو یہاں ملازمت کے لیے آتی ہیں... ہے نا؟" وینیسا نے کہا۔

"بے شک، یہ میری جاب کا حصہ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟" سائمن نے بے ساختہ جواب دیا۔

اس کا جسم معمول کے انداز میں ایملی کے بدن سے مس ہوگیا۔ البتہ اس نے ایملی کے بازو کو جان بوجھ کر چھوا۔ سائمن کی اس توجہ نے ایملی کو بے چین سا کردیا۔ خاص طور پر جب اس نے سائمن کے ہاتھ میں شادی کی انگشتری دیکھی۔

"تو آپ کی بیوی میگزین کے بزنس سے وابستہ ہیں؟" ایملی نے پوچھا۔

"میری بیوی؟" سائمن کی شکل یوں بن گئی جیسے ایملی نے اس کے عمدہ سوٹ پر ٹھنڈا پانی الٹ دیا ہو۔ "نہیں... وہ... وہ اپنا کام کرتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے گھر جانا ہے۔" اس نے میز پر دو بڑے نوٹ پھینک دیے اور مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چل دیا۔

"برائیڈل بیوٹی کلب کا پہلا اصول یہ ہے کہ بیوی کا تذکرہ مت کرو۔" وینیسا نے پھنکارنے کے انداز میں کہا۔ "بیوی سر پھری ہوتی ہے۔"

"کیا؟"

"اگر آپ ایک خاتون ہیں اور اس کمپنی میں آگے بڑھنا چاہتی ہیں تو اس کے دو طریقے ہیں۔ ان میں پہلا طریقہ سائمن تھورسن ہے۔" وینیسا نے وائن کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔ "اس کا اپنا ایک مختلف انداز کا وسیع و عریض دفتری حرم ہے لیکن وہ خود عورتوں کا پیچھا نہیں کرتا۔ وہ ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کا پیچھا کریں۔"

"کیا تمہاری اس کے ساتھ وابستگی ہے؟"

وینیسا کے قہقہے میں تلخی تھی۔ "حماقت کی باتیں مت کرو۔ دوسرا طریقہ مائی ڈیئر ایملی یہ ہے کہ ناگزیر ہوجاؤ۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔"

"اس وقت تم دونوں میں سے کوئی بھی طریقہ اختیار کیے ہوئے نہیں ہو... کیا سمجھیں؟"

وینیسا بددلی کے تاثرات لیے وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ایملی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ ایمان دار کیوں نہیں ہوسکتے؟ بار سے باہر نکلنے کے بعد بھی یہ خیالات اس کا پیچھا کرتے رہے اور پورے ویک اینڈ اس کے ذہن پر سوار رہے۔

پاکستان کے سول اور فوجی اعزازا

یہ تھے پاکستان کے سات اعلیٰ فوجی اعزاز پاکستان کے ٹوٹل اعزازات کی تعداد چھتیس ہے جو کہ فوج اور پولیس کے علاوہ سول افراد کو بھی دیے جاسکتے ہیں ان اعزازات کے نام درج ذیل ہیں۔

(1) نشان حیدر۔ (2) نشان پاکستان۔ (3) ہلال جرأت۔ (4) نشان شجاعت۔ (5) ہلال شجاعت۔ (6) نشان امتیاز۔ (7) ہلال امتیاز۔ (8) نشان قائداعظم۔ (9) ہلال قائداعظم۔ (10) نشان حرمت۔ (11) ہلال خدمت۔ (12) ہلال پاکستان۔ (13) ستارہ پاکستان۔ (14) ستارہ جرأت۔ (15) ستارہ شجاعت۔ (16) تمغہ بسالت۔ (17) تمغہ قائداعظم۔ (18) تمغہ امتیاز۔ (19) تمغہ شجاعت۔ (20) تمغہ جرأت۔ (21) تمغہ پاکستان۔ (22) ستارہ بسالت۔ (23) ستارہ قائداعظم۔ (24) ستارہ امتیاز۔ (25) قائداعظم پولیس تمغہ بہادری۔ (26) پاکستان پولیس تمغہ بہادری۔ (27) تمغہ بیادگار یوم جمہوریہ۔ (28) تمغہ استقلال پاکستان۔ (29) تمغہ دفاع۔ (30) پاکستان پولیس تمغہ اعلیٰ کارکردگی۔ (31) قائداعظم پولیس تمغہ اعلیٰ کارکردگی۔ (32) تمغہ خدمت (سول)۔ (33) تمغہ خدمت فوجی) درجہ اول۔ (34) تمغہ خدمت (فوجی) درجہ دوم۔ (35) تمغہ خدمت (فوجی) درجہ سوم۔ (36) تمغہ پاکستان۔

(محسن مصطفیٰ کی تحقیق)

ان ہی خیالات کی بنا پر وہ جیسن کے تمام پیغامات کو نظر انداز کرتی رہی۔ وہ اکثر سوچتی کہ کیا نیویارک منتقل ہو کر اس نے غلطی کی ہے؟ اس کے ذہنی تناظر میں نیویارک میں ذلیل اور حقیر آدمی منڈلاتے پھر رہے تھے۔

پیر کے دن جب میل روم کا بندہ ڈاک لے کر آیا تو ایملی نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کے نام کوئی پُراسرار لیٹر ڈاک میں موجود نہیں تھا لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

لنچ کے بعد انٹرن کلارا، وینیسا کی میز کے پاس آئی اور بولی۔ ”کسی سائموئی کے نام ایک لیٹر آیا ہے۔“

”سائموئی کون؟“ وینیسا نے پوچھا۔

”اس کے آگے پیچھے کوئی نام نہیں لکھا ہے بس اتنا لکھا ہے، سائموئی، معرفت برائیڈل بیوٹی میگزین۔“

”یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔ مجھے یہاں کام کرتے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں اور میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔“ وینیسا نے کہا۔

ایملی کی نظریں اپنے کمپیوٹر اسکرین پر جم سی گئیں۔ سائموئی اس کا اپنا درمیانہ نام تھا لیکن اس کا علم کسی کو بھی نہیں تھا ماسوائے آئی ٹی شعبے کے بائرن کے۔

”میں اس لیٹر کا کیا کروں؟“ کلارا نے پوچھا۔

”آپ نے کہا تھا لارا چائلڈز کے نام کی تمام ڈاک آپ کے پاس بھیج دیا کروں لیکن اس کے بارے میں...“

”شش...“ وینیسا نے بے تابانہ انداز میں پھنکارنے کی سی آواز نکالی۔ ”یہ مجھے دے دو اور یہاں سے چلی جاؤ۔“

کلارا بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ایملی کے کانوں میں خط کھولنے والے چاقو سے لفافہ چاک کرنے کی آواز سنائی دی۔

ایملی سے رہا نہ گیا۔ اس نے کیوبیکل کی دیوار سے جھانکتے ہوئے وینیسا سے پوچھا۔ ”یہ کس بارے میں ہے؟“ ”ہوں... اوہ کچھ نہیں۔ نئی وضع کے شادی کے جوڑوں کے متعلق فضول سی ڈاک ہے۔“

ایملی موقع کا انتظار کرتی رہی کہ کب وینیسا اپنی میز پر سے اٹھتی ہے۔ پھر وہ بے چین انداز میں گھوم کر وینیسا کے کیوبیکل میں پہنچ گئی۔ جس لفافے پر سائموئی کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا، وہ وینیسا کے غیر کار آمد ڈبے میں موجود تھا۔ لفافے کے اندر ایک ٹائپ کیا ہوا پیغام تھا۔

”میرے شوہر سے گریز کرو، کتیا... میں تمہیں دوبارہ تنبیہ نہیں کروں گی۔“

ایملی نے وہ لیٹر تہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھ دیا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ وہ دو زینے اتر کر اس چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئی جو ٹیکنیکل عملے کے لیے مخصوص تھا۔ وہ سیدھی بائرن کے پاس چلی گئی اور وہ لفافہ اسے تھماتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا ہے؟“

بائرن نے لفافے میں رکھا ہوا کاغذ نکالا، اسے پڑھا اور ایملی کو لوٹاتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ تم اس کے شوہر کے ساتھ میل جول رکھو۔“

”ذرا یہ تو دیکھو کہ یہ کس کے نام بھیجا گیا ہے؟“ ایملی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

بائرن نے دوبارہ لفافے کو لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ تو تمہارا عارضی اکاؤنٹ ہے؟“

”یہ اکاؤنٹ تو تم نے جمعے کے روز سیٹ کیا تھا۔ کسی پاگل نے یہ خط ہفتے کے روز میرے نام سپرد ڈاک کیا ہے اور یہ ابھی ابھی پہنچا ہے۔“

”تم نے اس اکاؤنٹ سے کس کس کو ای میل بھیجی تھی؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

بائرن نے اپنی تین اسکرینوں میں سے ایک پر ایملی کا عارضی ای میل اکاؤنٹ کھول لیا۔ ”او کے، جمعے کی سہ پہر تم نے چند فری لانسرز، ایک آرٹ ڈائریکٹر، سوشل میڈیا کے لوگوں اور سائمن تھورسن کو ای میلز بھیجی تھیں۔“

”یہ تو بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ میری تو سائمن تھورسن سے ملاقات ہی جمعے کی شام ہوئی تھی اور میں نے اسے کبھی کوئی ای میل نہیں بھیجی۔“

”ویل... تو پھر یہ پڑھو۔“ بائرن نے اس کی توجہ اپنی اسکرین کی جانب مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ ایملی کی نظریں اسکرین پر جم گئیں۔ ای میل میں لکھا تھا۔

”تم سے آج رات ملاقات کے لیے بے تاب ہوں، بے بی۔ ہماری معمول کی ملاقات کی جگہ پر۔ میں انجیر کے درخت کا پتا ساتھ لاؤں گی۔“

”تم نے یہ پیغام تین بج کر پندرہ منٹ پر بھیجا تھا پھر فوراً ہی اپنے سینٹ فولڈر سے اسے اریز کر دیا تھا اور اپنے Trash سے اسے مستقل طور پر ڈیلیٹ کر دیا تھا۔“

”لیکن... اس وقت تو میں دفتر سے باہر تھی۔“

بائرن نے ایملی کو غور سے دیکھا پھر بولا۔ ”واقعی؟ تو پھر ان دیگر اوقات کے بارے میں کیا کہو گی؟“

تب ایملی اسکرین پر نمودار ہونے والے اِفلرٹیشن کے ان پیغامات کو گھورنے لگی جو اس کے اکاؤنٹ سے سائمن تھورسن کو بھیجے گئے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”میں نے ان میں سے کوئی بھی پیغام کبھی نہیں بھیجا۔“ ایملی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”بہر حال، کسی نہ کسی نے تو یہ پیغامات بھیجے ہیں اور اگر یہ تم نہیں ہو تو یہ وہ ہے جو یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے جیسے تمہارا اور سائمن کا افیئر چل رہا ہے۔“ بائرن نے کہا۔

”ایسا کون کر سکتا ہے؟“ ایملی نے پوچھا۔

”مجھے علم نہیں لیکن یقیناً تم یہ نہیں چاہو گی کہ تمہارا انجام بھی لارا چائلڈز کی طرح ہو۔“ بائرن نے بتایا۔

”وہ کون تھی؟“

”وہ ایک انٹرن تھی جس کا سائمن کے ساتھ افیئر رہا تھا۔“ بائرن نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ وہ واحد لڑکی تھی جس کا سائمن کے ساتھ قریبی تعلق تھا لیکن وہ پکڑی گئی تھی۔“

”اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”ایک رات وہ سب وے ٹرین کا انتظار کر رہی تھی تو کسی نے اسے ٹرین کے سامنے دھکیل دیا تھا۔“ بائرن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک میں نے سنا ہے، پولیس اس جنونی کو کبھی پکڑ نہیں سکی جس نے یہ حرکت کی تھی۔“

”یہ تو بڑی ہی ہولناک داستان ہے۔“ ایملی نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے خشک حلق کو تر کیا اور بائرن کے برابر کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

”تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن عین اس وقت کوئی تمہارے اکاؤنٹ سے ایک ای میل تحریر کر رہا ہے۔“ بائرن نے بتایا۔

”مجھے جانا ہو گا۔“ ایملی نے گہری سانس لیا اور زینے کی جانب لپکی۔

اپنے فلور پر پہنچنے کے بعد وہ تیزی سے اپنے کیوبیکل میں پہنچی لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

”کیا مقابلے کی دوڑ میں حصہ لے کر آ رہی ہو؟“ کیوبیکل کی دیوار کے دوسری جانب سے وینیسا سے پوچھا۔

”کیا تم نے کسی کو...“ ایملی اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ ”کیا تم نے کسی کو میری میز پر دیکھا تھا؟“ لیکن پھر اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ کتنی بے وقوف ہے۔ یہ وینیسا ہی ہے جو شروع سے اسے پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ وہی ہے جو ایملی کے کمپیوٹر سے پیغامات بھیج رہی ہے اور اسے اس افیئر میں پھنسانا چاہ رہی ہے جو وہ کسی سے نہیں چلا رہی۔

وہ حقیقت میں کیا کھیل، کھیل رہی ہے؟ سائمن کے ساتھ اپنے افیئر کو چھپانے کی خاطر اس کی پاگل بیوی کو جھوٹے دانے ڈال رہی ہے؟ وہ بھی ایملی کے نام سے۔

ایملی نے ایک لمبی آہ بھری اور بولی۔ ”کیا تم لارا چائلڈز کو جانتی ہو؟“

”اس نے کچھ عرصہ یہاں کام کیا تھا... کیوں؟“

”میں نے سنا ہے کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔“

”کسی جنونی نے اسے سب وے ٹریک پر دھکیل دیا تھا۔“ وینیسا نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”وہ یہاں پر ایک نصیحت آموز کہانی ہے۔ تمہیں نیویارک میں محتاط رہنا ہو گا۔“

”نصیحت آموز کہانی؟“

ایملی، وینیسا کے ٹھہرا دینے والے جملے پر غور کرنے لگی۔ اسے وہ سب کچھ صاف صاف پتا چل گیا تھا اس کے لیے جاننا ضروری تھا۔

جب وینیسا چھٹی کے بعد دفتر سے چلی گئی تو ایملی دبے پاؤں اس کے کیوبیکل میں پہنچی۔ ایملی کا اکاؤنٹ استعمال کرنے کے معاملے میں وینیسا چالاک رہی ہو گی لیکن اس معاملے میں خاصی احمق تھی کہ اپنا اکاؤنٹ ہمیشہ لاگ آن کیے رکھتی تھی۔

ایملی نے سائمن تھورسن کے نام ایک ای میل کمپوز کرنا شروع کی۔

”میں تمہیں مس کرتی ہوں۔ تم نے میرے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تم سے ملاقات کب ہو گی؟ میں جانتی ہوں کہ تم ان دیگر لڑکیوں سے صرف چھیڑ خانی کرتے ہو جو تمہیں ای میل کرتی ہیں۔ میں تم سے دوبارہ ملنے کے لیے مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“

برجستہ

شوہر گاڑی سے اترا تو بیوی نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا۔ شوہر نے کہا۔

”معاف کرنا ڈارلنگ میں تمہارے لیے وہ بندر نہ لا سکا جس کا وعدہ کر کے گیا تھا۔“

بیوی نے برجستہ کہا: ”کوئی بات نہیں تم آ گئے، یہی کافی ہے۔“

(کراچی سے میمونہ عزیز کا چٹکلا)

اس نے نہ صرف وینیسا کی رہائش گاہ کے پتے کا اضافہ کردیا تھا۔ بلکہ وینیسا کی ایک تصویر بھی انیچ کردی جو میگزین میں اس کے ایبی کیٹ کے کالم کے ساتھ شائع ہوتی تھی۔

جب ایملی دفتر سے نکلی تو اس کی تشویش بڑھ چکی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ آیا سائمن کی مستعد باؤلی بیوی اس کے دیے ہوئے چارے کے دام میں آجائے گی یا نہیں۔

ایملی خود بھی اندر سے خوف زدہ تھی کہ کہیں وہ عورت سب وے اسٹیشن میں اس کا انتظار نہ کررہی ہو۔ اس نے گھبرا کر گھر جانے کے لیے ایک ٹیکسی کرلی۔

اگلے روز ایک طویل بے سکون رات گزارنے کے بعد اس نے بیماری کے بہانے سے دفتر سے چھٹی کرلی۔ اس نے دن بھر ٹیلی ویژن آن نہیں کیا اور کمپیوٹر پر اپنی ای میلز بھی چیک نہیں کیں۔ اس نے خود کو ایک کتاب پڑھنے میں مصروف رکھا۔

اگلے روز جب وہ دفتر پہنچی تو خود کو قدرے کھسیانی سی محسوس کررہی تھی لیکن یہ احساس صرف اس وقت تک قائم رہا جب تک اس نے کلارا کو نہیں دیکھا جس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔

''خیریت تو ہے نا؟'' ایملی نے کلارا سے پوچھا۔

کلارا نے ایک جھرجھری سی لی۔ ''وینیسا مرچکی ہے۔ اسے کل اس کی رہائش گاہ کے باہر کسی نے چاقو کے وار سے ہلاک کردیا ہے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ جس کسی نے بھی یہ قتل کیا ہے اس نے وینیسا کا بیگ تک لے جانا گوارا نہیں کیا۔''

اس روز ایملی دن بھر اپنے کیوبیکل تک محدود رہی۔ وہ کسی سے بھی رابطہ کرنے سے ڈر رہی تھی۔ اس احساسِ ندامت سے اور اس بات سے کہ وینیسا مرنے کی مستحق نہیں تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ سی گئی تھی لیکن پھر اس کے غم وغصے کی کیفیت نے اس کے دل کو پتھر کردیا۔ وینیسا بھی تو بالآخر اسے موت کے منہ میں پہنچانے کے لیے سیٹنگ کررہی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وینیسا ہی نے لارا چائلڈز کی موت کے اسباب پیدا کیے ہوں۔

ایملی نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا اور اسے اس بات پر پورا یقین تھا۔

اگلا پورا ہفتہ پُرسکون گزر گیا۔ وینیسا کی تدفین میں لوگوں نے بھرپور شرکت کی۔ اس کی موت کی خبر پر ٹیبلائیڈ نے مختصر سی ہلچل بھی مچائی پھر ایڈیٹر ان چیف باربرا نے ایملی کو ایک میٹنگ کے لیے طلب کیا۔

''مجھے ایسے کسی معاون کی ضرورت ہے جس کے منیجنگ ایڈیٹر ہونے پر مجھے مکمل اعتماد ہو۔ عملی لحاظ سے میگزین اب تم چلاؤ گی۔ کیا تم اسے ہینڈل کرسکتی ہو؟''

''ہاں۔'' ایملی نے کہا۔ ''میں یہ کرسکتی ہوں۔''

ایملی نے ایک نئی ایڈیٹر رکھ لی جس کا نام وینڈی تھا۔ وہ ایملی کی جگہ پر آئی تھی۔ باربرا اس وقت شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ دو ہفتے بعد ایڈیٹر ان چیف نے ایک بار پھر ایملی کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔

''مجھے وہ لڑکی پسند نہیں آئی۔'' باربرا نے کہا۔ ''وہ اپنے بناؤ سنگھار پر کچھ زیادہ ہی توجہ دیتی ہے۔''

''وہ ایک اسمارٹ اور محنتی لڑکی ہے۔'' ایملی نے وینڈی کی حمایت میں کہا۔ ساتھ ہی وہ سوچنے لگی کہ باربرا، وینڈی کی خوب صورتی سے خوف زدہ کیوں ہے؟ وینڈی نظر فریب شخصیت کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ دوستانہ مزاج رکھتی تھی اور ملنسار بھی تھی۔

''لوگ اس کے بارے میں باتیں بنارہے ہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں۔'' باربرا نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اسے تھوڑے عرصے تک آزما کر دیکھتے ہیں۔''

اس میٹنگ نے ایملی کے سکون میں خلل ڈال دیا لیکن باربرا نے اس موضوع پر دوبارہ کوئی بات نہیں کی۔ ایملی بھی اس بات کو بھلا بیٹھی۔

پھر چند ہفتوں بعد جب اس کے کانوں میں برابر کے کیوبیکل سے وینڈی کی حیرت زدہ آواز سنائی دی تو اس نے اٹھ کر دیوار کے پرے وینڈی کی طرف جھانکا۔

وینڈی ہاتھ میں تھامے ہوئے ایک سفید کاغذ کو گھور رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' ایملی نے پوچھا۔

وینڈی کاغذ پر لکھی تحریر کو پڑھنے لگی۔ ''میرے شوہر سے دور رہو ورنہ میں تمہاری پلک جھپکنے سے پہلے تمہاری زندگی کا خاتمہ کردوں گی، کتیا۔'' پھر وینڈی نے سر گھما کر ایملی کی جانب دیکھا اور بولی۔ ''کیا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟''

''نہیں۔'' ایملی نے سرگوشی کے لہجے میں جواب دیا۔ اسے اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہونے لگی۔ ''یہ مذاق ہرگز نہیں ہے۔''

شوقیہ سراغرساں

میمونہ عزیز

عقل مندوں کا کہنا ہے کہ اس پتھر کو ہاتھ نہ لگاؤ... جسے اٹھانا تمہارے بس میں نہ ہو یا پھر سمندر میں تیر کر اتنی دور نہ جاؤ کہ واپسی مشکل ہو جائے... ایک ایسے ہی ہنرمند کا قصہ جو اپنے ہنر میں یکتا تھا... مگر قناعت... و اطمینان سے دور اسے ایک نئے کام کی تلاش و جستجو تھی... جو اسے بہاتے ہوئے دور تلک لے گئی...

شوق و ذوق سے لبریز شخص کی نادانی... جو چلتر بازوں کی نذر ہو گیا

''میں باہر جارہی ہوں۔'' سوزی نے کہا۔

پال نے اپنے کمپیوٹر سے سر اٹھا کر سوزی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم اس لباس میں کہاں جارہی ہو؟''

سوزی نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے اور گردن کو ایک ادا سے گھماتے ہوئے بولی۔ ''تم کیا سمجھ رہے ہو، میں کہاں جارہی ہوں؟''

پال الجھی نگاہوں سے سوزی کو دیکھنے لگا۔

''بھول رہے ہو کہ آج کون سا دن ہے؟'' سوزی

نے کہا۔

''اوہ ہاں، آج بدھ کی رات ہے۔''

''اور بدھ کی رات ہم لڑکیوں کی تفریح منانے کی رات ہوتی ہے۔''

''ہاں، میں بھول گیا تھا۔'' پال نے اپنی نظریں دوبارہ کمپیوٹر پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ تفریح کرو۔''

''اور تم کیا کررہے ہو، گیم کھیل رہے ہو؟'' سوزی نے سوال کیا۔

''نہیں، میں ریسرچ کررہا ہوں۔''

''کیا تم اب بھی یہی سمجھ رہے ہو کہ تم ایک پرائیویٹ سراغ رساں بن جاؤ گے؟'' سوزی کے لہجے میں ہلکا سا طنز شامل تھا۔

''میں پرائیوٹ سراغ رساں بن چکا ہوں۔'' پال نے دیوار پر آویزاں فریم شدہ سرٹیفکیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ اصلی سرٹیفکیٹ ہے؟''

''یقیناً یہ اصلی سرٹیفکیٹ ہے۔''

''تم نے کسی بوگس آن لائن اسکول کو سو ڈالر ادا کرکے یہ سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے۔ کیا تمہیں اس کام کے لیے ریاست سے لائسنس نہیں لینا چاہیے؟ کون ہوگا جو کسی شوقیہ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا چاہے گا؟'' سوزی نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔

''میں ریاست کا مستند لائسنس حاصل کرلوں گا۔'' پال نے جواب دیا۔

''جو کچھ بھی ہو لیکن اپنا معمول کا کام ترک مت کرنا۔'' سوزی نے کہا۔ اس کا اشارہ پال کے پلمبر کے پیشے کی جانب تھا۔ پال ترش روئی سے ہنس دیا۔

''اور میرا انتظار بھی مت کرنا۔'' سوزی نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

''گڈ بائے۔'' پال نے ہاتھ لہرادیا۔

وہ سوچنے لگا کہ شاید سوزی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اگر اس نے ریاست سے آزادانہ سراغ رسانی کا لائسنس حاصل کرلیا تو کیا ضروری ہے کہ کوئی اس کی خدمات مستعار لے گا۔ بطور پلمبر اس کی اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی لیکن بات آمدنی کی نہیں تھی۔ پال کو ایڈونچر سے، خطرات سے عشق تھا۔ وہ اپنے کام میں سنسنی چاہتا تھا اور باتھ روم کی نالیوں میں پھنسے ہوئے کچرے کو نکالنا اور ان کی صفائی کرنا کوئی ولولہ انگیز کام نہیں تھا۔

اتنے میں داخلی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

''گڈ۔'' پال نے سوچا۔ سوزی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اور وہ سوری کہنے کے لیے پلٹ آئی ہے۔ ٹھیک ہے وہ خود بھی اس سے معذرت کرلے گا۔ چاہے ان کے درمیان کتنی ہی بحث اور نوک جھونک ہوتی تھی، اس کے باوجود وہ اب بھی اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور اسے دل سے چاہتا تھا۔

اتنے میں ایک عورت نے اس کے دفتر میں جھانکا۔ وہ ایک انتہائی پُرکشش عورت تھی اور اس نے ایوننگ ڈریس پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک ہیٹ دکھائی دے رہا تھا اور ہاتھوں میں سفید رنگ کے دستانے تھے۔

''سر! کیا آپ ہی پرائیوٹ سراغ رساں ہیں؟ یا میں غلط پتے پر آگئی ہوں؟'' اس نے اپنے پرس میں سے ایک تہ کیا ہوا اخبار نکالتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ مائی گاڈ۔'' پال نے سوچا۔ اس کے اشتہار نے کام دکھادیا تھا۔

''نہیں... میرا مطلب ہے ہاں۔ آپ بالکل صحیح پتے پر آئی ہیں۔'' وہ تیزی سے اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ ''پال پائپر آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر پال۔ میرا نام ایملی ہے، ایملی گورڈن۔'' عورت نے کہا۔

''پلیز تشریف رکھیے، مس ایملی۔'' پال نے سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' وہ دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''میں مسز ہوں لیکن آپ مجھے ایملی کہہ سکتے ہیں۔'' عورت نے کہا پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''کیا ڈرائیو وے میں کھڑی ہوئی پک اپ آپ کی ہے؟''

''جی میڈم... میری ہی ہے۔''

''تو آپ ایک شکاری ہیں؟'' تب پال نے تجسس آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے آپ کی پک اپ میں گن ریک دیکھا ہے۔'' عورت نے کہا۔

''اوہ، جی ہاں۔''

''میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ رائفل سے نشانہ بازی میں بے حد عمدہ ہوں گے۔''

''اس کا بھی یہی خیال ہے۔'' پال نے سر کی جنبش سے دیوار پر آراستہ ہرن کے سر کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے جواب دیا۔

''گڈ کیونکہ یہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔'' ایملی نے کہا۔ ''میں اپنے شوہر کا تعاقب کرنے کے لیے آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا نام گورڈن ہے۔''

''آپ کے خیال میں کیا وہ آپ سے بے وفائی کررہا ہے؟'' پال نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے عین موقع پر پکڑلوں اور اس کی تصویریں اتارلوں؟'' پال نے کہا۔

''میرا شوہر ایک دولت مند آدمی ہے مسٹر پال اور اس کے پاس موجود جو کچھ بھی ہے، اس کے نصف پر میرا حق ہے۔''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں مسز گورڈن... میرا مطلب ہے ایملی۔''

ایملی نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے ایک تصویر اور لفافہ باہر نکال لیا پھر دونوں کو میز پر پال کی جانب کھسکاتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ یہ کام لینا چاہیں گے؟''

پال نے چند لمحوں تک تصویر کا بغور جائزہ لیا پھر لفافہ کھول کر دیکھا۔ لفافے میں سو ڈالر کے پانچ نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی کرسی سے گرتے گرتے بچا۔

''کیا آپ یہ کام لے رہے ہیں؟''

پال کا بے ساختہ جی چاہا کہ کہہ دے، ہاں کس کمبخت کو انکار ہے لیکن پھر اسے احساس ہوگیا کہ یہ کہنا پیشہ ورانہ طور پر قطعی درست نہیں ہوگا۔

''جی میڈم۔'' اس نے کہا۔ ''میں کب سے اپنے کام کا آغاز کروں؟''

''آج رات ہی سے لیکن اپنے ساتھ کوئی گن ضرور لے جانا۔ یہ بات بالکل مت بھولنا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کرسکتا ہے اگر اس نے تمہیں اپنی جاسوسی کرتے ہوئے پکڑلیا۔'' ایملی نے کہا۔

ایملی نے پال کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر کو کسی عورت کے ساتھ فون پر باتیں کرتے ہوئے سن لیا تھا۔ وہ اس عورت کو آج رات ڈنر کے لیے جھیل کے کنارے، راستے سے ہٹ کر واقع معروف سی فوڈ ریسٹورنٹ لے جارہا ہے۔ یہ وہی ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ ایملی کو اپنی سیکنڈ ڈیٹ پر لے گیا تھا۔ ایملی اپنے شوہر کے طریقہ کار سے بہ خوبی واقف تھی۔ پہلے ایک شاندار سی فوڈ ڈنر پھر جھیل کے عرشے پر ایک لمبی چہل قدمی پھر ایک خوب صورت پیار بھری غزل

آخری خواهش

ایک دفعہ تین آدمیوں کو سزائے موت سنائی گئی۔ تینوں کو تختۂ دار پر لے جایا گیا۔ سب سے پہلے مسلمان سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔ اس نے کہا کہ وہ دو رکعت نفل ادا کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کی خواہش پوری کرنے کے بعد اسے تختۂ دار پر چڑھایا گیا لیکن تختہ خراب ہوگیا اور اس کی جان خلاصی ہوگئی۔ اس کے بعد بنیے سے اس کی آخری خواہش پوچھ کر پوری کی گئی اور اسے تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا مگر خراب تختے نے اس کی بھی جان بچائی۔

اب سردار جی کی باری آگئی۔ اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔ سردار جی نے جھنجلا کر کہا۔

''نامرادو... خواہش کو مارو گولی، پہلے تختہ... ٹھیک تو کراؤ۔''

(صبا گل کی پیر بابا سے آمد)

پھر چاندنی میں محبت سے بھرپور بھڑکیلے جذبات کا اظہار پھر آخر میں پہاڑیوں میں واقع اپنے خوب صورت کاٹیج میں لے جانا۔

ایملی نے پال سے کہا کہ اس تمام عرصے میں اسے ان دونوں کی تصاویر اتارنے کے بہت سے مواقع میسر آجائیں گے۔

☆☆☆

پال جب طویل پختہ گھومتی ہوئی سڑک سے کچے ریتیلے راستے پر اترنے کے بعد کافی آگے پہنچ گیا تو سوچنے لگا کہ کہیں اس نے سڑک سے مڑنے میں غلطی تو نہیں کی۔ اس نے واپس پلٹنے کے ارادے سے اپنی پک اپ کی رفتار کم کردی۔ تب اسے دور فاصلے پر روشنی سی دکھائی دی۔

پال جب ان روشنیوں کے نزدیک پہنچا تو یہ وہی ریسٹورنٹ تھا جس کے بارے میں ایملی نے اسے بتایا تھا۔ ریسٹورنٹ کی پارکنگ لاٹ خالی دکھائی دے رہی تھی اور ریسٹورنٹ میں بھی تاریکی چھائی ہوئی تھی، البتہ ''ریسٹورنٹ بند ہے'' کے نمایاں بورڈ کے اوپر دو لائٹیں روشن تھیں۔ ریسٹورنٹ کی کھڑکیاں بھی تختے لگا کر بند کی ہوئی تھیں۔

'کیا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟' پال سوچنے لگا۔ 'کیا ایملی گورڈن نے اسے بے وقوف بنانے کے لیے یہ کھیل کھیلا ہے؟ نہیں یہ بات قابلِ فہم نہیں۔ اس لیے کہ ایملی نے اسے پانچ سو ڈالر نقد ادا کیے تھے۔'

پال نے اپنی پک اپ کو یوٹرن کے لیے گھمایا۔ تب اس کی نگاہ اپنی پک اپ کی ہیڈ لائٹس کی زد میں آنے والی سلور کلر کی ایکیورا کار پر پڑی۔ لگ رہا تھا کہ اس میں کوئی سوار نہیں ہے۔ اس نے اپنی پک اپ کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور انجن بند کر دیا۔

پھر جتنی خاموشی کے ساتھ ممکن ہو سکتا تھا، اپنی پک اپ کا دروازہ کھولا اور نیچے اترنے کے بعد ہاتھ میں اپنی فلیش لائٹ تھامے اس سلور ایکیورا کار کی جانب دبے پاؤں بڑھنے لگا۔

کار کے نزدیک پہنچ کر اس نے کار کے لائسنس پلیٹ نمبر کا اس نمبر سے موازنہ کیا جو ایملی نے اسے دیا تھا۔

بالکل وہی نمبر تھا اور یہ ایملی کے شوہر کی کار تھی۔ جب وہ ریسٹورنٹ کی جانب بڑھا تو اسے آوازیں سنائی دیں۔ وہ وہیں سانس روک کر کھڑا ہو گیا اور پوری توجہ سے ان آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔

کیا یہ آوازیں ریسٹورنٹ کے اندر سے آ رہی تھیں یا نہیں؟ یہ آوازیں اس کے بائیں جانب سے سنائی دے رہی تھیں۔

تب پال کو جھیل کے پشتے کے آخر میں ایک جوڑا دکھائی دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد قریب کھڑے ہوئے تھے لیکن اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ اتنے فاصلے سے وہ ان کی صاف تصویر نہیں اتار سکتا تھا۔ ان کے نقوش بھی واضح نہیں تھے اور وہ دونوں ہیولوں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے ان کے اور قریب جانا ہوگا اور فلیش بھی استعمال کرنا پڑے گا، پال نے خود سے کہا لیکن جب فلیش چمکے گا تو ان دونوں کا ردعمل کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے کہ ایملی کا شوہر اس کی جانب دوڑ پڑے۔ پال دوڑنے میں تیز نہیں تھا۔ وہ تصور میں خود کو ایملی کے شوہر کے ساتھ دست و گریباں ہوتے، اپنے چہرے کو مسلسل اس کی ضربوں کا نشانہ بنتے اور اپنے کیمرے کو چھینے جانے کے بعد جھیل برد ہوتے دیکھتا رہا۔

لیکن اس کے علاوہ اور کس طریقے سے وہ ان تصویروں کو حاصل کر سکتا تھا جن کی اسے ضرورت تھی؟

"کیا مصیبت ہے؟" وہ سوچنے لگا۔ وہ خطرات سے کھیلنے کا آرزومند تھا اور اب خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

وہ جھیل کے پشتے کے عقبی کنارے پر درختوں کے قریب سے آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا تاکہ ان کی نظروں میں نہ آ سکے۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کہ پشتے کا کوئی ڈھیلا تختہ اس کے وزن سے چرچرا نہ جائے۔ وہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھا رہا تھا۔

بالآخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے وہ دونوں فلیش کی رینج میں آ رہے تھے۔ پال نے احتیاط کے ساتھ اپنا کیمرا نکالا اور ان دونوں کو فوکس کرنے لگا۔ اسے ان دونوں کے چہرے واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن یہ کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔

اسے بس اس شاٹ کو فریم میں اور کیمرے کو ساکت تھامے رکھنے کی ضرورت تھی۔ پال نے کیمرے کا بٹن دبا دیا۔

عرشے کا کنارہ ایک لمحے کے لیے روشنی میں جگمگا اٹھا اور پھر وہاں دوبارہ تاریکی چھا گئی۔ وہ جوڑا بے ساختہ اس کی جانب گھوم گیا۔

"اے۔" مرد کی آواز تاریکی میں گونجی۔

پال نے بھاگنے کے لیے پلٹنا چاہا لیکن پھر وہیں رک گیا۔ جب فلیش نے اس جوڑے کو ایک لمحے کے لیے اپنی روشنی کی زد میں لیا تھا تو ان دونوں کے چہرے بالکل واضح دکھائی دیے تھے۔

"سوزی!" پال کی حیرت سے بھرپور آواز گونجی۔

دو سیکنڈ کی مکمل خاموشی کے بعد اسے سوزی کی آواز سنائی دی۔

"پال! کیا یہ تم ہو... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

پال نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اب وہ بالکل بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ "تمہاری لڑکیوں کے ساتھ تفریح منانے کی رات کیا ہوئی، سوزی؟"

"تمہیں میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی ہمت کیونکر ہوئی؟"

"تم میری بیوی ہو اور مجھ سے بے وفائی کر رہی ہو۔ اس لیے تم یقین رکھو کہ میں تمہارے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہوں۔" پال نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک چھپاکے کی آواز سنائی دی اور ایملی کا بے وفا شوہر غائب ہو گیا۔ پال نے خود کو عرشے پر گرا لیا، اس نے فائر کی آواز سن لی تھی۔

سوزی گھوم گئی اور عرشے کے کنارے سے جھک کر نیچے پانی میں دیکھتے ہوئے چلانے لگی۔

"گورڈن... گورڈن۔"

پال کو ایک اور فائر کی آواز سنائی دی۔ سوزی کا جسم عرشے پر سے اڑتا ہوا نیچے پانی میں جا گرا اور ایک چھپاکا ہوا۔

پال عرشے کے فرش پر پیٹ کے بل ساکت لیٹا رہا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر ایک کار کا انجن اسٹارٹ ہونے اور دور جانے کی آواز سنائی دی۔

پال کچھ دیر تک خاموش لیٹا رہا پھر اٹھا اور عرشے کے کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنی فلیش لائٹ آن کی اور اس کی روشنی پانی میں ڈالی۔ وہ ایک جھیل رہی ہوگی کیونکہ اس کا پانی بہت کم گہرا تھا۔

گورڈن اور سوزی منہ کے بل گیلی مٹی میں گرے ہوئے تھے اور ان دونوں کے سروں سے سرخ خون ابل رہا تھا۔ جھیل کا اتھلا ہلکا براؤن پانی دھیرے دھیرے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

گولیاں جس کسی نے بھی چلائی تھیں، وہ یقیناً پارکنگ لاٹ میں کسی جگہ پوزیشن لیے ہوئے تھا۔ پال نے سوچا... وہ کوئی ماہر نشانہ باز ہی تھا جس نے اتنے فاصلے سے ان کی کھوپڑیوں کا درست نشانہ لیا تھا اور اس کا ایک بھی نشانہ خطا نہیں ہوا تھا لیکن وہ نشانہ باز کون تھا اور اس نے ایسا کیوں کیا؟

کیا وہ ایملی گورڈن ہو سکتی تھی یا اس نے کسی ماہر نشانہ باز قاتل کی خدمات حاصل کی تھیں؟ اس کی سب سے پہلی کلائنٹ ہی ایک پاگل عورت ثابت ہوئی تھی۔

پال سوزی کی جدائی سے دل شکستہ ہو رہا تھا۔ وہ بالآخر اسے چھوڑ کر چلی جاتی، اس کے ارادے شاید یہی تھے لیکن پال یقینی طور پر اسے اس طریقے سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن ایملی نے اس کی خدمات کیوں حاصل کی تھیں؟ اس نے پال کو اس معاملے میں کیوں ملوث کیا تھا؟ یہ وہ سوالات تھے جو پال کے ذہن پر چوکے لگا رہے تھے۔

پھر جوں ہی وہ اپنی پک اپ کے پاس پہنچا، اسی لمحے پولیس کی دو کاریں پارکنگ لاٹ میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ پال خود بھی اس واقعے سے پولیس کو آگاہ کرنے کے لیے نائن ون ون پر فون کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ وہ پولیس سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا تھا۔

پولیس افسران اپنی کاروں سے نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک پال کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے پال کو اپنی فلیش لائٹ کی روشنی کی زد میں لے لیا تھا۔

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں کچھ فائر ہوئے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ پال کوئی جواب دیتا، دوسرے پولیس افسر نے اپنی فلیش لائٹ کی روشنی پال کی پک اپ پر مرکوز کر دی اور اس کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "کیا اس میں موجود رائفل آپ کی ہے سر؟"

"جی سر۔"

"اس سے حال ہی میں فائر کیے گئے ہیں؟"

"نہیں۔" پال نے جواب دیا۔ وہ اپنی رائفل اس لیے ساتھ لایا تھا کہ ایملی نے ایسا کہا تھا کیونکہ اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کا شوہر کہیں مار پیٹ اور تشدد پر نہ اتر آئے۔

پولیس افسر نے پک اپ کا پسنجر سائڈ کا دروازہ کھولا اور ریک پر سے رائفل اٹھالی۔

"اس کی نال ابھی تک گرم ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔

"آپ نے اس رائفل سے کس پر فائر کیے ہیں، سر؟" دوسرے پولیس افسر نے پوچھا۔

"کسی پر بھی نہیں۔" پال نے سادگی سے جواب دیا۔

اتنے میں ایک پولیس افسر اسے اس کے حقوق پڑھ کر سنانے لگا جبکہ دوسرے پولیس افسر نے پال کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

اس کی بے وفا بیوی اور اس کے بوائے فرینڈ اس کی ذاتی رائفل سے ہلاک کر دیے گئے تھے۔ اطراف میں میلوں تک کوئی دوسرا موجود نہیں تھا..... ایملی نے جس کسی کی خدمات مستعار لی تھیں، اس نے پال کی رائفل استعمال کرتے وقت بلاشبہ دستانے پہنے ہوئے تھے اور جب ایملی خود اس کے دفتر آئی تھی تو وہ تبھی اس وقت دستانے پہنے ہوئے تھی اور اس نے پال کو نقد رقم ادا کی تھی۔ پال کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ایملی نے اس سے کبھی ملاقات بھی کی ہے۔

"پال پائپر، شوقیہ سراغ رساں۔" اس نے کیا سوچ کر یہ پیشہ اپنانے کا فیصلہ کیا تھا؟ وہ بطور پلمبر اپنے پیشے سے راضی خوشی کیوں نہیں تھا؟

اس ایک رات میں ایک بے وفا بیوی اور ایک چلتر عورت نے نہ صرف اس کے شوقیہ سراغ رساں بننے کے خواب کو چکنا چور کر دیا تھا بلکہ پولیس کی نگاہوں میں اسے قاتل بھی بنا دیا تھا اور اب وہ پولیس کار میں سر تھام کر ہتھکڑیاں پہنے بیٹھا عورت کو اس کی عیاریوں پر بری طرح سے کوس رہا تھا۔

جواری

احمد اقبال

چھٹی قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان
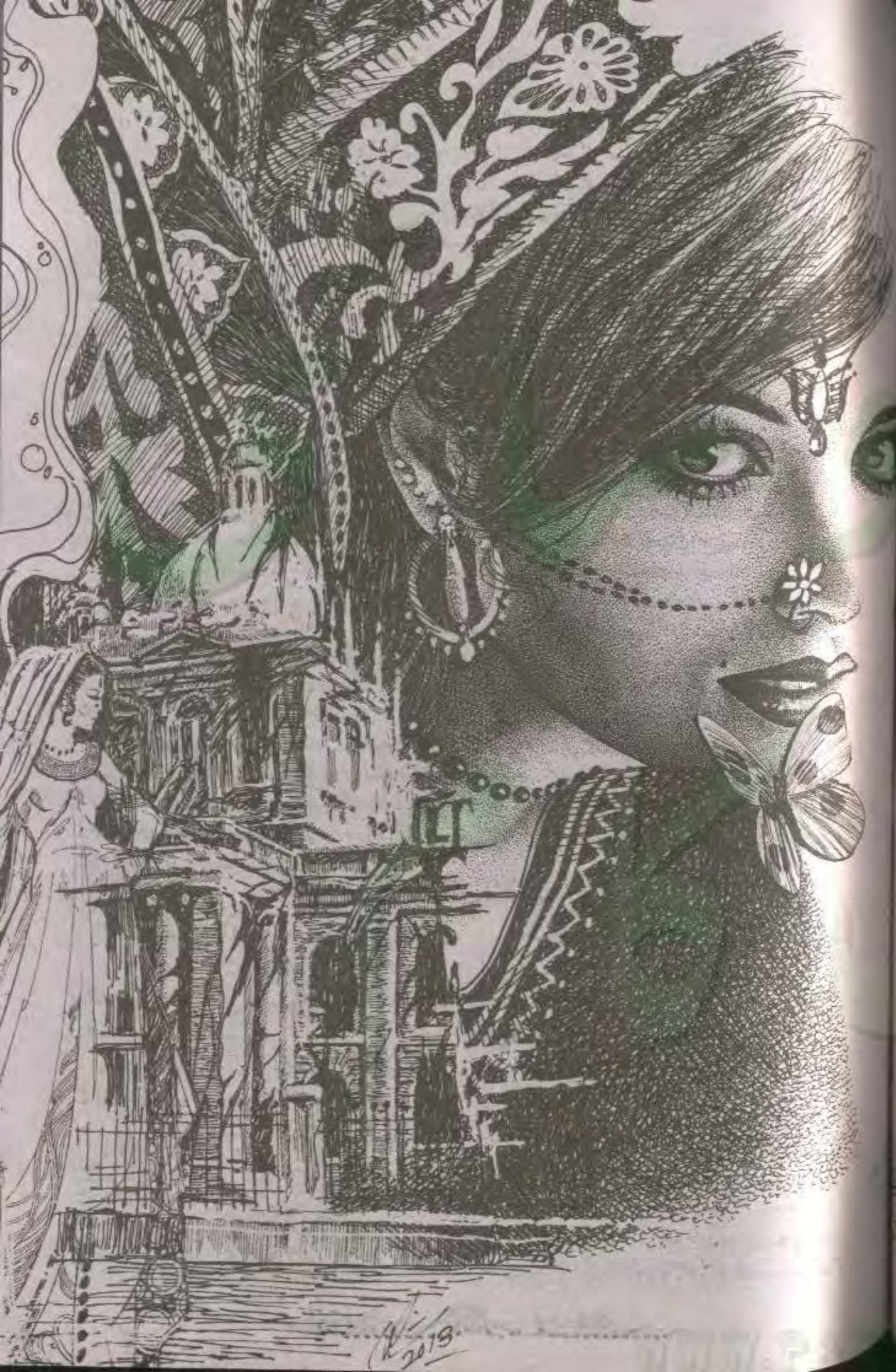
شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی، پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے پر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

..........**پہلی قسط کے واقعات**..........

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گامار ستم بھی پھانسی کا منتظر تھا... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا... نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ سلمان کے پاس ایک ریوالور بھی تھا جو خاور نے چھپا کے رکھ لیا۔ اس نے نورین سے یہ بات چھپائی، اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ فریدالدین (خاور) کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آ گئے۔ نورین کو ایڈمٹ کر لیا گیا۔ اچانک وہاں پولیس آ گئی۔ خاور اس صورتِ حال پر پریشان ہو گیا۔ پولیس کمرے سے آتی آوازوں کو سن کر آئی تھی تاہم انہیں کسی طرح کا شک نہیں ہوا اور وہ واپس چلے گئے۔ خاور اور نورین ہوٹل سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس نے ایک تصویر دکھائی جو نورین کی لگتی تھی مگر وہ نازی کی بہن تھی۔ اسے کسی وڈیرے کے بیٹے نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا تھا اور آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ قتل، بلیک میلنگ اور غلط فہمی کا نتیجہ تھا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانپور کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آ گئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے کرگے اٹھا کر لے گئے۔ خاور کو قید کر دیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہو گیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ ریشم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کر دیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ وہاں خاور کو اکبر کی نگرانی کرنی تھی۔ اکبر کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر جب چودھری انور آیا تو اکبر کمرے میں موجود نہیں تھا۔

..........**اب آپ آگے پڑھیے**..........

میں نے ریوالور نکال لیا۔ ”اکبر! کہاں ہو تم...؟“

انور علی نے حیرانی اور تجسس کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا۔ ”وہ صرف دروازے سے باہر نکل سکتا تھا... اور دروازہ باہر سے مقفل تھا۔“

میں نے پھر آواز دی۔ ”اکبر... تم جہاں بھی چھپے ہو سامنے آ جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔“

بیڈ کے نیچے سے اکبر کی عجیب سی ہذیانی ہنسی سنائی دی۔ ”تم مجھے کیسے مارو گے... جب تم مجھے دیکھ ہی نہیں سکتے پاگل کے بچے۔“

انور نے تشویش سے میری طرف دیکھا۔ ”اکبر... ہم تمہیں بیڈ کے نیچے سے نکال لیں گے... کھینچ کے۔“

اس کی دیوانگی آمیز ہنسی پھر سنائی دی۔ ”یہ لو... ایک اور پاگل کا بچہ آ گیا... اوئے پائے خاں... جب میں نظر ہی نہیں آؤں گا تو مجھے کیسے کھینچ کے نکالے گا... میں غائب ہو چکا ہوں۔“

اب مجھے بھی کچھ تشویش ہوئی۔ ”شاید اس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔“

انور علی نے نفی میں سر ہلا کر سرگوشی کی۔ ”ڈراما کر رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”غائب کیسے ہو گئے تم اکبر...؟“

”چھو منتر سے... ایک جادو تھا میرے پاس... سائیں چھو منتر ڈفلی والے نے سکھایا تھا مجھے... اب میں تم کو دیکھ سکتا ہوں۔ میرے دوست بھی مجھے دیکھ سکتے ہیں مگر دشمن نہیں۔“

”پر تم بیڈ کے نیچے کیوں چھپے ہو... دروازے سے نکل کیوں نہیں جاتے؟“ انور نے مسکرا کے پوچھا۔

”میں تمہاری جان لے کر جاؤں گا سور کے بچے... حرام زادے۔“ اس نے انور کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ”تُو کیا سمجھتا تھا، سب کچھ پھر سے چھین کر عیش کرے گا... اور تیرا یہ حمایتی... رستم پاکستان... ٹارزن دا تخم... تم دونوں کی سانس رک جائے گی ابھی... میں تمہارے گلے کا پھندا بن جاؤں گا... تڑپ تڑپ کر مرو گے تم دونوں۔“ اس نے کچھ اور فحش الفاظ استعمال کیے۔

اب میرا شک بھی یقین میں بدل گیا تھا کہ صدمے اور شدید مایوسی کی اذیت نے اکبر کا دماغ الٹا دیا ہے۔ اب بیڈ کے نیچے گھس کر اسے زبردستی باہر لانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اگر بالفرض وہ اس یقین کے ساتھ ہم پر حملہ کرتا کہ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا ہے اور اپنی مافوق الفطرت شیطانی قوت سے ہمارا کام تمام کر سکتا ہے، تب بھی ایک پاگل آدمی کو گولی نہیں ماری جا سکتی تھی۔ یہ کیفیت عارضی تھی... اس کا علاج ممکن تھا یا نہیں... یہ سب بعد کے مسئلے تھے۔

میں نے پیچھے سے سلونی کی آواز سنی۔ ”سر! کھانا لگا دیا گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سلونی! ہم آتے ہیں ابھی دس منٹ میں۔“

نیچے سے اکبر نے حقارت سے کہا۔ ”سلونی... دو ٹکے کی عورت... میرے باپ کی اور میری ہزار بار کی استعمال کی ہوئی جوتی... اب تمہارے سر چڑھے گی...“ اس نے سلونی کے بارے میں مزید بدترین بازاری زبان استعمال کی۔

میں نے ریوالور انور کو دے دیا۔ ”میں اسے نکالتا ہوں، تم پیچھے دروازہ بند کر دو... اور چوکس رہو۔“

”ذرا احتیاط سے... ایسا نہ ہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے۔“ انور علی نے پریشانی سے کہا۔ ”اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہ ہو۔“

میں نے کہا۔ ”کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا... فکر مت کرو... میں اسے نکال لاؤں گا۔“

”نیچے اندھیرا ہے... وہ شاید دیوار کے ساتھ آخری کونے میں ہوگا۔ ٹارچ ہوتی تو اچھا تھا۔“

میں نے جھک کے دیکھا۔ ”میں دیکھ لوں گا۔“ اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اور پھر الٹا لیٹ کے آہستہ آہستہ بیڈ کے نیچے گھسا۔

میری آنکھیں چند سیکنڈ میں نیم تاریک ماحول سے آشنا ہو گئیں۔ وہاں گھپ اندھیرا نہیں تھا۔ اکبر کا سایہ سا مجھے آخری گوشے میں دیوار کے ساتھ لگا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے کہنی کے بل آگے سرکنا شروع کیا۔ ”اکبر! آؤ میرے ساتھ... میں زبردستی کرنا نہیں چاہتا۔“

اس نے مجھے مزید گالیاں دیں۔ ”ابھی تو مارا جائے گا کتے کی موت... خون اگلے گا... تیرا کلیجا کٹ کے نکلے گا۔“

آہستہ آہستہ آگے رینگتے ہوئے میں نے ایک دم اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ اس کی اندھیرے میں چمکتی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں مگر جہاں وہ تھا، وہاں سے مزید پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ پیچھے سے دیوار نے اسے روک لیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک اور بھیانک گالی نکلی اور اس نے اپنا پیر چھڑانے کی کوشش میں دوسری لات میرے منہ پر مارنے کی کوشش کی لیکن اب میری آنکھیں بھی تاریکی میں دیکھ رہی تھیں اور اس کی یہ جارحانہ کوشش بھی عین متوقع تھی۔ میں نے اپنا منہ بچا لیا مگر اس کا پیر میرے کندھے پر لگا۔ میں اب اسے نرمی یا رحم دلی کی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے گھسیٹا اور تیزی سے پیچھے ہوا۔ اس کی پنڈلی کا سب سے نچلا اور پتلا حصہ میرے ہاتھ نے جکڑ لیا تھا۔ وہ گھسٹ کر میرے ساتھ آیا۔ اس کی گالیوں اور دھمکیوں کا شور بڑھ گیا۔ اب وہ نہ جانے کیا بے معنی لفظ دہرا رہا تھا۔ میری سمجھ میں ”بھرت کام گنڈاس مشبورن پام“ جیسے الفاظ آئے۔ اپنی طرف سے وہ کالے علم کا کوئی منتر دہرا رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ ہندی یا سنسکرت کے اشلوک اور جادو کے شبد وغیرہ نہیں تھے۔ اس کی مزاحمت بھرپور طریقے سے جاری تھی اور وہ مجھے لاتیں مار رہا تھا۔ اس کی ٹانگ دوبارہ میرے کندھے پر گرز کی طرح لگی مگر میں نے پیچھے ہٹنا جاری رکھا اور اسے گھسیٹا گیا۔ اوپر بیڈ کا فریم مشکل سے ایک فٹ اوپر تھا۔ خود کو آزاد کرانے کی دیوانہ وار جدوجہد میں ایک بار اس کا سر اوپر بھی لگا۔ میں باہر سے انور علی کی متوحش آواز بھی سن رہا تھا جو جھک کر نیچے جھانکتے ہوئے محض میری حوصلہ افزائی کے لیے کچھ کہہ رہا تھا مگر مجھے دونوں طرف کے شور کو سننے کی نہ ضرورت تھی نہ فرصت۔ وہ صرف چند فٹ کی مسافت تھی جو اکبر کی مزاحمت کی وجہ سے ایک مرحلہ بن گئی۔

بالآخر پہلے میری ٹانگیں... پھر میرا ہاتھ اور آخر میں

میرا سر بیڈ کے کنارے سے باہر آ گیا۔ اکبر نے ایک اور لات چلائی جو بیڈ کے فریم میں لگی اور وہ درد سے کراہا۔ انور نے کہا۔ ”دھیان سے... دھیان سے یہ حملہ کرے گا۔ یہ ڈراما ہے سب... یہ پاگل نہیں ہے... اور یہ کوئی منتر کے شبد نہیں۔“ اسی وقت اکبر نے پاؤں اٹھا کے بیڈ کے فریم کی اندر والی پٹی پر مضبوطی سے جما دیے لیکن اب میں گھٹنوں کے بل اٹھ گیا تھا۔ میں نے اسے ایک جھٹکا پیچھے کی طرف دیا تو اس کا پیر سلپ کر گیا اور میں نے دیر لگائے بغیر اسے بھی قابو کر لیا۔ پھر میں نے اسے وحشیانہ قوت اور بے رحمی کے ساتھ گھسیٹا اور وہ باہر آ گیا۔ ایک دم اس نے خود کو اٹھا کے میرے سر پر مکا مارنے کی کوشش کی۔ میں نے ٹخنہ مروڑا تو وہ بلبلایا اور الٹا ہو گیا۔ اب میں نے دونوں ٹانگیں چھوڑ کے اس کی کمر کے ازار بند کو اوپر کھینچا... وہ تھوڑا سا اٹھا ہی تھا کہ میرے دونوں ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ میرے ساتھ وہ بھی اٹھ گیا لیکن پلٹ نہیں سکا۔

”بس کرو اکبر! ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا... تم میری گرفت سے نہیں نکل سکتے۔“

اس کی وحشیانہ جدوجہد اور لایعنی بکواس اب دم توڑ رہی تھی... پھر بھی اندیشہ تھا کہ میں نے اسے چھوڑا تو وہ ایک آخری حملہ اور کرے گا... آسانی اس میں تھی کہ اسے ناک آؤٹ کر دیا جائے۔ میں نے اسے ہاتھوں کے شکنجے سے آزاد کیا اور ایک دم گھما کے اپنا دایاں ہاتھ اس کی کنپٹی پر مارا۔ یہ کھڑی ہتھیلی کا وار کوئی بھی ذی ہوش جھیل نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک دم بے جان ہو کے گرنے لگا۔ میں نے اسے سنبھال کر فرش پر ڈال دیا۔ چند سیکنڈ تک ہم فرش پر پڑے اس کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھتے رہے اور میں اپنی پھول جانے والی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

”یہ کام میں نہیں کر سکتا تھا۔“ انور علی نے اعتراف کیا۔

”پاگل آدمی کی وحشیانہ طاقت سے نمٹنا مشکل بھی ہوتا ہے... اور خطرناک بھی۔“

”پھر بھی یار... مجھے یہ پاگل پن مصنوعی لگا۔“

”مصنوعی بھی ہو سکتا ہے... اور عارضی بھی... ایسی بے بسی اور مایوسی کی کیفیت میں کون نارمل رہ سکتا ہے۔“

”یہ میرا بھائی ہے... چھوٹا بھائی۔“ انور علی نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ اس نے مجھے زنجیروں میں قید رکھا تھا، پورے ایک سال... اور مجھے مارنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی... کیسے رحم کروں میں اس پر اور کیسے معاف کروں اسے۔“

میں نے کہا۔ ”ایسی حالت میں ہم اسے یہاں سے کیسے منتقل کریں گے؟“

”میں بھی یہی سوچنے پر مجبور ہوں۔“

”خیر، تم پہلے ایک مضبوط رسی کا انتظام کرو کہیں سے... اب اسے باندھ کے رکھنا ضروری ہے۔ یہ ابھی آدھ گھنٹے سے پہلے ہی ہوش میں آ جائے گا۔“

”میرا خیال ہے... آج میں اسے نہ لے جاؤں... میں کسی ڈاکٹر کو لاتا ہوں جو چیک کرے کہ یہ دورہ دماغ کی خرابی تھی یا محض صدمے کا اثر... یا ایک ڈراما۔“ دروازہ کھول کے اس نے سلونی کو آواز لگائی۔

سلونی کسی روح کی طرح خاموشی سے نمودار ہوئی۔

”یس سر!“ اور وہ اسی خاموشی سے غائب ہو گئی۔

”دیکھو کہیں سے کوئی رسی ملے... یا تار۔“

میں نے کہا۔ ”ایک سائیکاٹرسٹ بہت آسانی سے اصلی اور مصنوعی پاگل پن کا پتا چلا سکتا ہے۔ کچھ لوگ بے وقوف عاملوں کے مشورے پر قتل عمد کے مرتکب ہونے کے بعد پاگل بن جاتے ہیں تا کہ سزائے موت یا عمر قید سے بھی بچ جائیں... جیل خانے کے بجائے پاگل خانے جائیں۔“

”مگر یہ مکر نہیں چلتا... دل کی خرابی ای سی جی سے دیکھی جاتی ہے... ایسے ہی دماغ کی کیفیت ای ای جی میں آ جاتی ہے۔ سر پر الیکٹروڈ لگا کے گراف نکال لیتے ہیں۔“

سلونی نے پیچھے سے آ کر کہا۔ ”رسی تو نہیں تھی سر... لیکن یہ ہیں۔“

”یہ کیا ہے... تمہارے دوپٹے؟“

”یس سر... بل دے کر رسی بنا لی۔ یہ ڈھائی گز لمبی نائلون کی رسی کوئی تارزن بھی نہیں توڑ سکتا۔“ اس نے فرش پر پڑے اپنے سابق مالک اور اس چودھری کو دیکھا جو عمر میں انور سے کم لیکن طاقت اور حکومت کی ناقابلِ شکست علامت تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور آنکھیں تجسس سے خالی... اس نے زمین آسمان کو الٹ پلٹ کر دینے والے اس انقلاب کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا... نہ حیرت کا نہ خوشی کا اور نہ غم کا... وہ مجھے دوپٹوں کی مدد سے اکبر کے دونوں پیر باندھتی دیکھتی رہی۔ اب انور نے بھی اسے نہیں کہا کہ تم کیوں کھڑی ہو... جاؤ... میں نے اکبر کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے باندھے اور ٹخنوں کے اوپر تیسرے دوپٹے کو بل دے کر بیڈ کے ایک پائے سے باندھ دیا۔ پھر دروازہ مقفل کر کے ہم باہر آ گئے۔

”میرا خیال ہے کہ کھانا کھا کے میں چلتا ہوں۔“ انور نے کہا اور ایک کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔

”اس کو یہاں سے بحفاظت شفٹ کرنے کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟“ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

سلونی نے ڈش اور پلیٹوں کو آگے بڑھایا۔ ”سر! یہ آپ کی پسند کی چیز تھی۔“

”سوری سلونی... میری بھوک مر گئی ہے۔ اب میں اسے انجوائے نہیں کر سکتا... پھر بھی تھینکس...“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”چیک اپ یہیں ہو جائے تو بہتر ہے۔ پھر ڈاکٹر اسے انجکشن دے کر سلا سکتا ہے اور ہم اسے خاموشی سے واپس لے جا سکتے ہیں۔“

”کسی بوری میں ڈال کے؟... ڈکی میں... یہی کرنا پڑے گا سلیم... ماں بہت اپ سیٹ ہے۔ وہ بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے بہت یقین دلایا کہ وہ ٹھیک ہے لیکن اسے یقین نہیں آ رہا۔ وہ خوف میں مبتلا ہے کہ میں بھائی کو چھوڑوں گا نہیں۔ اباجی بالکل چپ ہو گئے ہیں شاک کی کیفیت میں... ڈاکٹر آیا تھا، اس نے دونوں کو سکون آور دوائیں دی تھیں۔ دونوں نے کھائی نہیں۔ خیر، میں سنبھال لوں گا۔“

”جو کچھ تم کر رہے ہو، اس کی نہ میں حمایت کر سکتا ہوں، نہ مخالفت۔ میں تو بلاوجہ ان معاملات میں ملوث ہو گیا ہوں۔“

”جو کردار تم نے میری زندگی پر، اپنا اختیار حاصل کرنے میں کیا ہے، وہ نہ میں نے سوچا تھا نہ تم نے... قدرت نے تمہارا اس مقصد کے لیے انتخاب کیا اور حادثاتی طور پر ہی سہی، یہاں بھیجا۔“

”شاید ٹھیک کہتے ہو تم... لیکن اب میں اس گیم سے آؤٹ ہونا چاہتا ہوں۔“

”اور تم سمجھتے ہو یہ تمہارے اختیار میں ہے؟ پہلے جو تم نے سوچا تھا اور چاہا تھا، کیا وہ تم کر سکے؟“

”لیکن میں نے خود وہ سب نہیں کیا... جو ہوا...“

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”سلیم! پلیز ابھی جانے کی بات نہ کرو... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میرا کوئی دوست، ہمدرد یا مشیر نہیں جس کے خلوص پر میں آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکوں۔ یوں... آٹھ سال میں اس دنیا سے لاتعلق رہا جو میری دنیا تھی اور جب لوٹا تو اجنبی تھا۔ پھر مجھے دشمن سمجھ لیا گیا یا بنا دیا گیا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”شاید ریشم بھی اپنے باپ کے چہلم سے پہلے تمہارے ساتھ نہ جائے۔“

”ریشم؟ وہ میری مجبوری تھی... میرے ایسا نہ چاہنے کے باوجود میری ذمے داری بن گئی تھی ورنہ اس کے اور میرے درمیان کون سا جذباتی رشتہ تھا؟ میں تو ایک اجنبی ہوں یہاں... مگر اس کی عزت اور زندگی دونوں خطرے میں چھوڑ کے میں کیسے بھاگ جاتا؟“

”اب جا سکتے ہو؟“

”ہاں، مجھے معلوم ہے کہ تم اس کی حفاظت کر سکتے ہو، مجھ سے بہتر طور پر... میں اسے کہاں اپنے ساتھ لے کر پھرتا۔ یہاں اس کا گھر ہے، زمین ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اکیلی تو ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہی جا رہی تھی۔“

”اب کیوں جائے گی؟“ میں نے کہا۔

”او کے سلیم! اس سے بات کر لیں گے، چہلم کے بعد... اس وقت تک حالات بھی پوری طرح میرے قابو میں آ جائیں گے۔“

”انور! تمہیں اندازہ نہیں کہ کتنے سنگین خطرات میرے پیچھے آسیب کی طرح لگے ہوئے ہیں۔“

”میرے ہوتے تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ تم نے میری زندگی بچائی ہے۔ اب تمہاری زندگی بچانا میرا فرض ہے اور قرض ہے۔ کیا تمہیں بھروسا نہیں مجھ پر؟“

میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”او کے... لیکن ایک بات میں کلیئر کر دوں... میں نے نورین کو کھو دیا ہے اور اسے تلاش کرنا میری سب سے پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔“

”مجھے اس تلاش میں اپنے ساتھ سمجھو۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”میرے وسائل تمہارے لیے وقف ہوں گے۔ اگر میرے ساتھ تم ہو تو تمہارے ساتھ میں ہوں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی ہے۔ پتا نہیں میری غیر موجودگی میں کیا ہوا۔“

”اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہو گا۔ یہ بتا دو کہ میری یہ ذمے داری کب ختم ہو گی؟ یہ مشکل کام ہے دوست۔“

”مجھے معلوم ہے۔ آج ہی ڈاکٹر آئے گا۔ سلونی بہت اچھی نرس بھی ہے۔ یہ اسے سنبھال لے گی۔ میری خاطر بس ایک دن اور...“ اس نے محبت سے میرا کندھا دبایا اور باہر نکل گیا۔ ایک منٹ بعد میں نے اس کی کار کے روانہ ہونے

کی آواز سنی۔

اب سہ پہر ڈھلنے لگی تھی۔ سلونی کھانے کے برتن سمیٹنے لگی۔ اس نے کھانا بنانے میں جتنی محنت اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا تھا، شاید ہم پوری طرح اس کی داد نہیں دے سکے تھے۔ مینیو بہت لمبا چوڑا نہیں تھا۔ اتنے کم وقت میں یہ ممکن بھی نہ ہوتا مگر اس نے اپنے ہاتھ کے ذائقے کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ ہم اپنے اپنے مسائل میں ذہنی طور پر اتنے الجھے ہوئے تھے کہ ہم نے کھانا صرف پیٹ بھرنے کے لیے کھایا تھا، اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں۔ بہت کم وقت میں سلونی نے مجھ پر بھی ثابت کر دیا تھا کہ خدا نے اسے حسن کا شاہکار چاہے نہ بنایا ہو مگر ایک مکمل عورت ضرور بنا دیا تھا جو کسی بھی مرد کا دل جیتنا جانتی تھی۔

اس نے جاتے جاتے پوچھا۔ ”سر! شام کو کیا بناؤں؟“

میں نے کہا۔ ”سلونی! اتنا کچھ جب موجود ہے تو رات کی فکر کیوں؟“

اس نے رک رک کے کہا۔ ”ایسا لگا مجھے... کہ آپ کو کھانا پسند نہیں آیا۔“

”مجھے اچھا کھانے کا شوق ہے اور عام حالات میں یہی کھانا شاید میں اکیلا صاف کر دیتا... لیکن ہم پر دوسری فکریں سوار تھیں، ہم کھانے سے انصاف نہیں کر پائے۔ یہ ذائقہ شاید میری ماں کے ہاتھ میں تھا مگر اسے گزرے برسوں ہو گئے۔“

”آپ اپنی مسز کے سامنے بھی ایسا کہہ سکتے ہیں۔“ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

”کلمۂ حق تو میں بر سر دار بھی کہوں گا... جب مسز ہو گی کوئی تو وہ بھی سنے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میں ذرا اپنے دیوانے کو بھی دیکھ لوں۔“

وہ ہنسی اور باہر نکل گئی۔ میں نے اکبر کے کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ اسے ہوش آ چکا تھا لیکن اس کی دیوانگی برقرار تھی۔ وہ خود کو آزاد کرانے کے لیے لاحاصل جدوجہد کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پھر وہی بکواس شروع کی۔ لایعنی الفاظ کے جادوئی منتر، بددعائیں، کوسنے اور ساتھ ہی گالیاں۔ میں کچھ فاصلے پر کھڑا سنتا رہا۔ مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اس کا دماغ واقعی الٹ گیا ہے، یہ ایک اور آزمائش تھی۔

چند منٹ کے بعد وہ ہانپ کر ساکت اور خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”اکبر! بھوک ہے تو میں کھانا لا کر دوں؟“

وہ چلانے لگا۔ ”آخر کیا سمجھتا ہے تُو مجھے؟ میں پتھر کا بنا ہوا ہوں... مجھے بھوکا مارنا چاہتا ہے؟“ اس نے الفاظ کے دوران گالیاں بھی بکیں۔

”کھانا تم خود کھاؤ گے۔ اپنے ہاتھوں سے... اگر تم نے کھانا پھینکا تو سمجھ لینا کہ وہ آخری طعام تھا زندگی کا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا اور دروازے کو لاک کر کے کچن تک گیا۔ سلونی نے کھانا مجھے ایک ٹرے میں لگا دیا جس میں صرف روٹیاں تھیں اور ایک سالن... پانی کا گلاس رکھ کے میں واپس اکبر کے پاس گیا اور ٹرے اس کے قریب رکھ دی۔ جب میں نے اس کے ہاتھ کھولے تو اس بات کے لیے تیار تھا کہ کھانے پر ٹوٹنے کے بجائے وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے یہ حماقت نہیں کی۔ اس سے میرا شک پھر قوی ہو گیا کہ دیوانہ بکار خویش ہوشیار... اسے اندازہ تھا کہ ایسی حرکت کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ اس شک کو مزید تقویت ملی جب اس نے ٹرے صاف کر دی اور پانی کا گلاس حلق سے اتارنے کے بعد خالی گلاس مجھ پر کھینچ کر نہیں مارا۔ میں نے اس کے ہاتھ پھر پیچھے باندھے تو اس کا جنون عود کر آیا اور وہ پھر مجھے اور انور کو گالیاں دینے لگا۔ غلاظت منہ سے اگلنے کے معاملے میں اس کے ذہن کی تخلیقی صلاحیت اور اس کی زبان کی فصاحت دونوں کو کمال حاصل تھا لیکن میں کچھ سن ہی نہیں رہا تھا تو مشتعل خاک ہوتا۔

شام تک میں سونے جاگنے کی کیفیت میں لیٹا رہا اور اپنے ماضی سے زیادہ مستقبل کے مسائل اور امکانات نے مجھے بے چین رکھا۔ نہ جانے کیوں آج پھر نورین میرے خیالوں پر قابض رہی۔ وہ بار بار میرے سامنے آ جاتی تھی اور پوچھتی تھی کہ کیا مجھ سے زیادہ اہم یہ مسئلے ہیں جن میں تم خود کو الجھا رہے ہو... اتنا وقت گزار دیا۔ اب اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ تم مجھے بھلانے کی پوری کوشش کر رہے ہو۔ ذرا یاد کرو اپنے الفاظ جو تم نے مجھ سے بار بار کہے تھے... اور میں اپنے آپ کو یقین دلاتا تھا کہ ایسا بالکل نہیں ہے... مہینا بھر مجھے اور یہاں رکنا پڑا ہے تو انور کے اس وعدے نے مجھے روکا ہے کہ وہ بھی نورین کی تلاش میں اپنے سارے وسائل میرے لیے وقف کر دے گا اور اس کے وسائل یقیناً بہت زیادہ ہیں۔

سلونی نے دروازے پر انگلی سے دستک دی تو میں اٹھ بیٹھا۔ ”آ جاؤ سلونی... میں سو نہیں رہا تھا۔“

”میں بھی یہی پوچھنے آئی تھی کہ کافی لے آؤں؟“ وہ پلٹ گئی لیکن میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اب وہ رات تک فارغ

تھی چنانچہ اس نے لباس بدل لیا تھا اور ایک سادہ سلک کی ساڑی بڑے سنسنی خیز انداز میں باندھ لی تھی جو اس کے جسم کی ساری دلکشی کو ایسے اجاگر کر رہی تھی جیسے سرچ لائٹ سے دھندلکے میں ڈوبا ہوا کوئی حسین منظر جاگ اٹھے۔ اس نے بالوں کو نئے انداز میں ترتیب دیا تھا اور لباس کی مناسبت سے جھلملاتے آویزے پہن لیے تھے۔ یہ سادگی و پرکاری کی بڑی دلفریب تصویر تھی۔ افسوس یہ تھا کہ اس عورت نے جو قلوپطرہ کی طرح شہنشاہوں پر حکومت کر سکتی تھی، مجبوری میں وہ راستہ اختیار کر لیا تھا جو ہرگز باعزت نہ تھا۔ اسے اس راستے پر ڈالنے والے صرف ہوس پیشہ مرد تھے جو ہر اچھی لگنے والی عورت کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے کوڑے میں پھینک دیتے تھے۔ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ انور نے پھر اسے ایک باعزت مقام دے دیا تھا۔

جب وہ کافی لائی تو میں نے اسے ساتھ بٹھا لیا۔ ”تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ یہاں آتے وقت تم نے اتنا اسباب کیوں ساتھ لیا تھا؟ تمہیں تو ایک خادمہ کے طور پر بلایا گیا تھا؟“

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”لیکن یہاں میری قدر ہوئی۔ سامان زیادہ تو نہیں، بس ضرورت کے ساتھ میں نے شوق کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ آپ کی تعریف کا شکریہ سر۔“

”تمہاری زندگی گزارنے کا جو انداز رہا... یہاں آنے تک... کیا تمہیں پسند تھا؟ تم اس سے خوش اور مطمئن ہو؟“

”آئی ایم سوری سر! لیکن اس سوال کا جواب میں کیا دوں؟ کیا کبھی میں نے اپنے اختیار سے زندگی گزاری ہے؟ یا آپ نے اور انور علی صاحب نے؟“

”نہیں... میرا سوال واقعی غلط تھا۔“

”جب آپ سو رہے تھے تو چودھری انور کا فون آیا تھا۔ ڈاکٹر مغرب کے بعد آئے گا... رنگیلا کے ساتھ۔“

”مجھے کچھ رنگیلا کے بارے میں بتاؤ۔“

”میں کیا بتاؤں سر! وہ تو دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کا نام ایسے ہی تو رنگیلا نہیں ہو گیا۔“ وہ ہنسی۔

”اصل نام کیا تھا؟“

”ماں باپ نے تو مشتاق احمد رکھا تھا۔ کالج میں الٹے سیدھے شعر پڑھنے اور بنانے لگا تو اپنے نام کے ساتھ دیوانہ کا اضافہ کر لیا... مشتاق احمد دیوانہ... بنتا تھا ایم اے ڈی میڈ... یعنی دیوانہ۔“

”کالج تک پڑھا ہے اس نے اور ٹیکسی چلاتا ہے... چار پہیوں والی بھی اور دو آنکھوں والی بھی؟“

وہ دکھی ہو گئی۔ ”ٹیکسی سے روزی کمانے میں تو حق حلال کی کمائی تھی سر... بی اے ایم اے کر کے بھی بیکار پھرنے اور دھکے کھانے سے محنت مزدوری بہتر ہے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”ٹیکسی اسے میں نے خرید کر دی تھی اور وہ صبح سے شام تک مسافر ڈھوتا تھا۔ اس نے بی اے میں فیل ہو کے کالج چھوڑ دیا تھا۔ اکیلی ماں نے اسے روایتی طریقے سے برتن کپڑے دھو کے اپنی کمائی سے پڑھایا...... اس کا باپ تھا... باپ کے بغیر بیٹا کہاں سے آتا۔ اس کی ماں کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کیا اور وہ بے چاری شادی کے آسروں پر ہی رہی۔ جیسے ہی اسے ماں بننے کی خبر ملی، وہ بھاگ گیا اور پھر نہیں ملا۔ رنگیلا کو اس نے یہ سب نہیں بتایا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب وہ ایک سال کا تھا تو باپ حادثے میں مر گیا تھا۔ ماں نے یہی بتایا تھا اسے اور اچھا کیا تھا۔ وہ کسی کمپلیکس کا شکار نہیں ہوا۔ ماں کی بڑی خواہش تھی کہ بیٹا بی اے کر لے لیکن بدقسمتی دیکھیے سر... وہ بی اے کے آخری سال میں تھا کہ ماں کو بریسٹ کینسر ہوا۔ اسے کون بتاتا کہ یہ موذی مرض ہے اور بتا دیتا تو وہ علاج کہاں سے کراتی۔ بیٹے کے بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی وہ مر گئی۔ اب آپ اسے غلطی یا ظلم کہیں سر مگر اس نے تو اپنے ضمیر پر سے جھوٹ کے گناہ کا بوجھ اتارا تھا۔ اس نے بیٹے کو حقیقت بتا دی۔ سیدھی سادی جاہل عورت... یہ بار گناہ لے کر قبر میں اترنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس سچ نے رنگیلا کو مار دیا۔ وہ خود اپنی نظر میں رسوا ہو گیا۔ اس نے کالج چھوڑ دیا اور نشہ کرنے لگا۔ ادھر سے ادھر بھٹکتا پھرا اور ملتان میں ایک مزار پر جا کے پڑ گیا۔ فقیروں اور ملنگوں کی صحبت میں۔ پھر ایک رات اس نے خواب دیکھا یا اس کے اندر کی آواز نے اسے بیدار کیا۔ اس نے ماں کو دیکھا جو اس سے سخت خفا تھی کہ اس نے بھولے بسرے ماضی کی بات پر اس کی آخری بات کو فراموش کر دیا۔ ماں نے مرتے وقت کہا تھا کہ بی اے ضرور کرنا... بس وہیں سے اس کی زندگی نے رخ موڑا اور وہ واپس لاہور آ گیا۔ بی اے کا امتحان پرائیویٹ دیا اور دو سال تک اِدھر اُدھر کے سب کام کیے۔ کسی دکان پر سیلز مین رہا... بچوں کو ٹیوشن پڑھائی پھر رکشا چلانے لگا اور رفتہ رفتہ پھر پرانا رنگیلا بن گیا۔ جو اس کے رکشا میں بیٹھتے تھے، وہ باتوں کو بہت انجوائے کرتے تھے۔“

”رنگیلا وہ کیسے مشہور ہوا... باتوں سے یا لباس

سے؟''

''لباس سے...''

''اس نے اپنی مقبولیت سے فائدہ بھی اٹھایا ہوگا؟''

''آپ کا مطلب ہے سر... ناجائز فائدہ... جی اس نے اٹھایا۔ اسی میں وہ مارا گیا۔ وہ ایک خاصی معزز نظر آنے والی لڑکی کو ہر روز مومن آباد کے گھر سے چیرنگ کراس لاتا لے جاتا رہا۔ لڑکی نے بتایا تھا کہ وہ اسپتال میں نائٹ ڈیسک پر ریسپشنسٹ ہے۔ وہ نائٹ ڈیوٹی ضرور دیتی تھی مگر کسی اسپتال میں نہیں... رنگیلا بری طرح اس کے عشق میں گرفتار ہوگیا اور اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ صبح ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اسے واپس گھر لے جانے کے لیے بھی آسکتا ہے۔ لڑکی نے ٹالا کہ میری واپسی میں دیر سویر بھی ہوجاتی ہے... رنگیلا پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اسپتال کے باہر انتظار کرلے گا۔ لڑکی سمجھ تو گئی تھی کہ رنگیلا اس پر مرمٹا ہے مگر ایک رکشا والے کی کیا اوقات تھی۔ وہ اس سے کیسے محبت کرتی۔ اسے تو وہ اپنی ایک رات نہ دیتی کیونکہ وہ اس کو افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ رنگیلا اپنے پاگل پن میں یہ سراغ لگانے چل پڑا کہ وہ کس اسپتال میں ہے۔ چیرنگ کراس کے آس پاس تو ایسا کوئی بڑا اور مشہور اسپتال بھی نہیں تھا۔ اسی چکر میں اس لڑکی کی حقیقت سامنے آگئی۔''

کہانی کی دلچسپی اپنی جگہ، سلونی کے سنانے کا انداز دلکش تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ ''پھر انجام کیا ہوا؟''

''انجام کیا ہوسکتا تھا۔ جب حقیقت کا پتا چل گیا تو اس لڑکی نے رنگیلا کو روک دیا مگر وہ کہاں رکنے والا تھا۔ وہ اسی جنون کے ساتھ اپنی محبوبہ کی غلامی کرتا رہا... وہ لڑکی...''

''تم نے ابھی تک اس کا نام نہیں لیا؟''

اس نے نظر بھر کے مجھے دیکھا۔ ''آپ کا خیال ہے کہ وہ میں تھی؟ نہیں سر... اس کا نام تھا شمی... عورت وہ جیسی بھی تھی مگر عورت تھی۔ چاہت کا اور چاہے جانے کا جذبہ اس کے اندر بھی تھا۔ ہر رات کی چاہت سے الگ اسے بھی عشق کی دیوانگی والی چاہت کیسے متاثر نہ کرتی۔ اس نے رنگیلا کو قبول کرلیا۔ بلا نکاحی شوہر... یا گھر والا... یا محافظ... ساتھی یا غلام... ان کا بڑا عجیب رشتہ تھا۔ رنگیلا نے اسے بندۂ بے دام بنا رکھا تھا اور وہ بھی کسی روایتی مشرقی بیوی کی طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔ اس کا خیال رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا غصہ برداشت کرتی تھی اور اس سے مار بھی کھاتی تھی۔ جب وہ نشے میں ہوتا تھا تو اسے برا بھلا کہتا تھا۔ سخت سست سناتا تھا۔ کبھی خود چھوڑ کے چلا جاتا تھا، کبھی وہ نکال باہر کرتی تھی بے عزت کرکے... مگر اس کے بعد پھر وہی ایک کے بغیر دوسرا جیسے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ شاید یہ زندگی وہ دونوں ایسے ہی گزار دیتے... لیکن شمی کا قتل ہوگیا۔''

''قتل ہوگیا؟'' میں چونک پڑا۔ ''رنگیلا کے ہاتھوں؟''

''نہیں سر! کوئی تھا بدمعاش ہسٹری شیٹر... گوالمنڈی کا دادا کہلاتا تھا۔ وہ شمی کو گھر میں ڈالنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا پیسا جتنا چاہے لے لے مگر وہ تھا شادی شدہ بچوں والا اور خود شمی آزاد تتلی رہنا پسند کرتی تھی۔ کسی کے پنجرے کی مینا نہیں بننا چاہتی تھی۔ رنگیلا کو پتا ہی نہیں چلا۔ وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر شمی کو تلاش کرتا پھرا۔ تھانوں اور اسپتالوں میں بھی گیا۔ مایوس ہوکے اس نے سمجھ لیا تھا کہ شمی کسی کے ساتھ چلی گئی۔ پھر ایک تھانے میں کسی نے اسے بتایا کہ گوالمنڈی کے دادا نے اسے ماردیا۔''

''یعنی ایک اور محبت کی کہانی ختم؟''

وہ کچھ وقفے کے بعد بولی۔ ''نہیں، اس کا دی اینڈ یہ نہیں ہے۔ رنگیلا فراق میں مجنوں کی طرح دیوانہ ہوکے نہیں پھرا۔ اس نے انتقام لیا۔ گوالمنڈی کے اس دادا کو تلاش کیا اور بہت عرصہ اس کے پیچھے پھرتا رہا۔ ایک تیز دھار خنجر ہمیشہ اس کے پاس ہوتا تھا۔ بالآخر ایک دن اسے موقع ملا۔ وہ دادا اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا اور اس کا ڈرائیور کیولری گراؤنڈ کی کسی بیکری میں گیا تھا۔ رنگیلا نے اسے دیکھ لیا۔ رنگیلا کھڑکی کے پاس پہنچا اور اللہ کے نام پر ہاتھ پھیلا کے کچھ مانگنے لگا۔ دادا نے اسے دینے کے لیے دس کا نوٹ نکالا اور کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا ہی تھا کہ خنجر اس کی گردن پر پھر گیا۔ یوں کہ خود دادا کو پتا نہ چلا ہوگا۔ اس کا سر شانوں پر سے لڑھکنے سے پہلے ہی رنگیلا غائب ہوگیا۔ شمی کا گھر تو وہ بہت پہلے چھوڑ چکا تھا۔ اسے ہر طرف شمی نظر آتی تھی۔ وہ پھر رکشا چلانے لگا تھا مگر اپنا نہیں... دہاڑی پر کبھی کسی کا، کبھی کسی کا... رات کو جہاں رکشا کھڑا کرتا تھا، وہیں پڑ کے سو جاتا تھا۔ حوالے کی ضرورت اسے کبھی نہ پڑی۔ رکشا والوں کی برادری اسے جانتی تھی۔ انتقام کی آگ بجھ گئی تو اس نے پھر اپنا پرانا رکشا نکالا جو کہیں ڈھکا چھپا کھڑا تھا۔ دوبارہ اپنا وہی پرانا حلیہ اختیار کیا اور سڑک پر آگیا۔ رکشا برادری کے علاوہ پرانے شناساؤں نے اس کا خوش دلی سے استقبال کیا۔ اس

گوالمنڈی کے دادا کے قتل کا معما آج تک حل نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ آپ پولیس کو فون کرکے بتادیں تو اور بات ہے۔'' وہ مسکرائی۔

میں نے کہا۔ ''کیا اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی تم سب پر اعتماد کرلیتی ہو؟''

''سب کون... صرف اپنی بات کریں سر!''

''چلو مجھ پر کیوں اتنا بھروسا تھا کہ تم نے ایک خطرناک سچ مجھے بتادیا؟''

''اسے کچھ اور نہ سمجھیں سر! بے جا تعریف یا خوشامد... دراصل آپ کی ذات ہی اعتماد پیدا کرتی ہے۔ چودھری انور صاحب نے آپ پر کیوں اعتماد کیا؟ نہ وہ بے وقوف ہیں اور نہ آپ کے پرانے دوست... ریشم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے بھی غلطی نہیں کی۔''

''تھینک یو۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔ ''رنگیلا اب تک آیا نہیں... شام تو ہوچکی؟''

''ہوگی کوئی وجہ... رنگیلا نہیں آئے گا تو پتا چل جائے گا۔''

''رنگیلا رکشا پائلٹ سے... ٹیکسی ڈرائیور بن گیا۔ اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی؟'' میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''اس کی وجہ... میں ہوں۔''

''تم نے بتایا تھا کہ ٹیکسی اسے تم نے ہی دلوائی تھی۔ تم سے کیسے ملا تھا وہ؟''

''جیسے شمی ملی تھی۔'' وہ بولی۔ ''لیکن بے حد ڈرامائی طریقے سے... ایک دن میں نے اپنی گاڑی ورکشاپ میں چھوڑی اور واپس گھر جانے کے لیے رکشا کے انتظار میں کھڑی تھی کہ اس کا رکشا سامنے سے گزرا۔ اس میں سواری بیٹھی تھی۔ اچانک اس نے رکشا روکا اور اتر کے میری طرف آیا۔ شمی... شمی... کہاں تھیں تم؟ میں تو گھبرا گئی کہ یہ کون پاگل ہے... میں نے کہا کہ چلو دفع ہوجاؤ... میں شمی نہیں ہوں مگر وہ میرے پیچھے آیا۔ مجھ سے جھوٹ بولا تھا اس تھانے دار نے، تم زندہ ہو... میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ اب میں نے غصے میں کہا۔ جاتے ہو یا میں شور مچا کے لوگوں کو بلاؤں؟ مگر لوگوں کو بلانے سے پہلے ہی رکشا کی سواری اتر کے آگئی۔ اس نے چلّانا شروع کردیا کہ یہ رکشا کہاں روک دیا ہے؟ رنگیلا نے کہا کہ آپ دوسری سواری پکڑلو۔ مجھے میری شمی مل گئی ہے۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ ظاہر ہے وہ اور گرم ہوا کہ یہاں مجھے دوسرا رکشا کہاں ملے گا۔ اِدھر میں نے کہا کہ کون ہے تُو جو میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میں شمی نہیں ہوں۔ میں تو خود یہاں کسی رکشا کے انتظار میں کھڑی تھی۔ رنگیلا واقعی پاگل ہوچکا تھا۔ اس نے کہا۔ شمی! یہ رکشا تمہارا ہے۔ چلو میرے ساتھ۔ اتنی دیر میں دو چار لوگ آگئے اور میں نے کہا کہ میری جان چھڑاؤ... لوگوں نے اسے دھکے دیے اور مارا بھی مگر وہ چلّاتا رہا کہ قسم خدا کی، یہ میری شمی ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی پولیس کو بلائے۔ میرا نام شمی نہیں ہے۔ میں اسے نہیں جانتی۔ میں وہاں سے چل پڑی مگر رنگیلا پھر میرے پیچھے آیا۔ میں سخت پریشان تھی کہ کیا کروں۔ اس جگہ سے گزرتے ہوئے رکشا خالی نہیں تھے۔ ایک نے آواز لگائی کہ رنگیلا استاد کیا معاملہ ہے۔ دوسرا رک گیا۔ اس وقت تک آٹھ دس لوگ میری مدد کے لیے آچکے تھے اور رنگیلا کو اچھی خاصی مار پڑ چکی تھی۔ اس رکشا والے نے رنگیلا کو بچایا اور پھر مجھے بتایا کہ نہ یہ پاگل ہے اور نہ خطرناک... اس نے محبوبہ تو نہیں کہا۔ یہ کہا کہ شمی اس کی بیوی تھی جو کئی مہینے پہلے غائب ہوگئی تھی اور یہ اسے آج تک ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ سارے شہر کے رکشا والے جانتے ہیں اسے اور پولیس بھی۔ اس کی شمی کی سو فیصد یہی صورت تھی۔ لوگ ہنسنے لگے۔ تماشا میں بن گئی تھی۔ دوسرے رکشا والے نے کہا کہ بہن جی آپ بے خوف اس کے رکشا میں بیٹھ جائیں۔ یہ آپ کی خاطر جان تو دے سکتا ہے مگر آپ کو نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔ بس اس وقت جان چھڑانے کے لیے میں نے بہتر سمجھا کہ رکشا میں بیٹھ جاؤں۔ وہاں سے نکل کے میں نے اسے اپنے گھر کا پتا دیا اور اس نے مجھے دروازے پر اتار دیا۔ پھر میں نے کہا کہ دیکھو میں یہاں رہتی ہوں۔ اب تو یقین آگیا نا کہ میں تمہاری شمی نہیں ہوں؟ اور اسے کرائے کے پیسے دینے کی کوشش کی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ سخت صدمے کی کیفیت میں ہے۔ وہ رو رہا تھا۔ پیسے وہ مجھ سے کیا لیتا۔ خود مجھے اس سے جذباتی ہمدردی ہوگئی تھی۔ میں نے کہا کہ اچھا اندر آؤ۔ مجھے بتاؤ یہ شمی کون تھی؟ وہ سحر زدہ سا اندر آگیا اور گم صم بیٹھ کے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے مزید وضاحت کی کہ دیکھو... نہ یہ شمی کا گھر ہے نہ تمہارا... میری تصویریں دیکھو... اور بھی بہت ثبوت ہیں کہ میں سلونی ہوں۔ پھر میں نے اسے پانی پلایا اور اس کے لیے چائے بنائی۔ وہ واقعی معصوم اور بے ضرر تھا۔ میں نے پوچھا کہ تمہاری بیوی آخر کیسے غائب ہوگئی تھی؟ تو اس نے کہا کہ وہ میری بیوی نہیں تھی۔ میں محبت کرتا تھا اس سے۔ کسی نے اسے قتل کردیا تھا، میں نے اس کے

قاتل کو مار دیا مگر مجھے نہ شمی کی لاش ملی اور نہ قبر... میں آج بھی اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم کو ایک نہیں، دس بندے بتائیں گے کہ تم وہی ہو... یہ دیکھو اس کی تصویر۔ اس نے اپنے پرس میں سے کئی تصویریں نکالیں اور میں واقعی دم بخود رہ گئی کیونکہ واقعی وہ سب میری تصویریں تھی۔"

"کسی ہم صورت کا مل جانا ایسا اتفاق ہے جس پر فلمی کہانیاں بہت ہیں۔"

"جڑواں کیسے ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہوتے ہیں... دنیا میں ہر جگہ۔"

"رائٹ... لیکن ایسا کچھ عجیب لگتا ہے کہ ایک سے عشق ہو تو دوسرے سے بھی ہو جائے... کہ ایک نہیں تو کیا ہوا، عشق دوسرے سے کر لیتے ہیں۔"

اس نے ایک آہ بھری۔ "کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔"

"اور اس بات میں گویا کوئی صداقت نہیں کہ محبت ہو جاتی ہے... کی نہیں جاتی۔"

"آپ نے دیکھا ہوگا۔ مصوری کا عظیم شاہکار صرف ایک ہوتا ہے۔ مونالیزا کی لازوال مسکراہٹ کو صرف ایک بار کینوس پر اتارا گیا۔ چودھری انور صاحب نے بتایا تھا کہ وہ مشہور آرٹ میوزیم "لوور" میں محفوظ ہے مگر قدرداں اس کے پرنٹ ہر جگہ بڑے شوق سے اپنے ڈرائنگ رومز میں سجاتے ہیں۔ میں شمی کی نقشِ ثانی تھی۔ رنگیلا نے مجھ سے جو محبت کی، وہ بھی ایسی ہی تھی۔ اصل محبت کا عکس۔"

میں حیران رہ گیا۔ "تم نے مجھے قائل کر لیا۔ کیا اس کے جذبات بھی اصل نہیں تھے؟ تم نے جان لیا تھا؟"

"میں نے اس کے جذبات کی قدر نہیں کی مگر ان کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں کیا۔ وہ مجھے شمی کے بارے میں بتاتا رہتا تھا اور مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے احساس رہتا تھا کہ میں شمی نہیں ہوں سلونی ہوں۔ میں نے اس کی دل شکنی نہیں کی۔ اسے دھتکارا بھی نہیں۔ بس محبت دے دی اسے... وہ میں کسی کو بھی دے سکتی تھی۔ خود سلونی سے محبت کسی نے نہیں کی۔"

"تم نے اس سے رکشا چھین کے اسے ٹیکسی دے دی۔ کیوں؟ وہ رکشا اس کی شناخت تھا۔"

"شاید مجھے ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا سر۔" وہ بولی۔ "میں نے اپنی ضرورت دیکھی اور وہ مان گیا۔ کسی اور کے کہنے سے شاید وہ ایسا نہ کرتا۔ میں نے کہا کہ مجھے رکشا میں پھرنا چیپ لگتا ہے۔ تکلیف بھی ہوتی ہے مجھے اور بے عزتی اور میری پبلسٹی بھی ہوتی ہے۔ میں کار خرید سکتی ہوں یا وہ ٹیکسی لے لے۔ دونوں کام ہو جائیں گے۔ اس کا روزگار بھی بچا رہے گا اور میں اس کے ساتھ آجا سکوں گی۔ ایک سال سے وہ میرے ساتھ ہے۔ دیکھا جائے تو مجرم میں ہوں۔ اس نے مسافر بٹھانے کا دھندا میرے کہنے پر چھوڑا اور مسافر نوازی میں لگ گیا۔ میں جہاں اسے بھیجتی تھی، وہ چلا جاتا تھا۔ ہم ایک ساتھ رہے۔ میں بھی اسے پسند کرتی تھی لیکن یہ نہ عشق تھا نہ مجبوری... نہ کاروبار نہ دوستی... ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے۔"

"اب تمہیں چودھری انور علی نے بلایا ہے تو کیا تم اپنے ماضی سے کنارہ کش ہو جاؤ گی؟"

"میں اس پیشکش کو مسترد نہیں کر سکتی۔ اب اس لیے نہیں کہ مجھے چودھری انور سے زیادہ ملنے کی توقع ہے... جتنا میں کما رہی تھی، اس سے زیادہ۔"

"پھر کس لیے... کیا انور تم سے محبت کرتا ہے؟"

وہ تلخی سے ہنسی۔ "نہیں سر! میں ایسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھے پسند کرتے ہیں تو اس کی وجوہات مختلف ہیں۔ بڑے چودھری بھی میرے قدرداں ہی تھے، عاشق نہیں۔ لیکن انور صاحب زیادہ فراخ دل ہیں کہ انہوں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے یہ عزت دی۔ میں بیٹی ہوں ایک میراثی کی اور اب تو بدنامی کا ہار بھی پہن چکی تھی۔"

"ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گی... کیا تم محبت کرتی ہو انور سے؟"

اس کا رنگ پل بھر کے لیے بدلا۔ "آئی ایم سوری سر! اس سوال کا جواب میں نہیں دوں گی۔"

رنگیلا نے اسے بروقت بچا لیا۔ اب رات ہو چکی تھی۔ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس گھوم کر دروازے سے اندر آگئیں پھر رنگیلا نے خود ہی اتر کر گیٹ کھولا اور اس کی لشکارے مارتی ٹیکسی اندر آگئی۔ ایک دراز قد سوٹ میں ملبوس شخص بھاری سیاہ فریم کی عینک لگائے اور ڈاکٹروں کے روایتی انداز میں بیگ لیے میری طرف بڑھا۔ میں اسے ریسیو کرنے برآمدے تک آگیا۔ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے اپنا تعارف رسمی انداز میں ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی حیثیت سے کرایا۔ میں اسے اندر لے گیا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے اس نے کہا۔ "آپ مریض نہیں ہو سکتے۔"

میں نے کہا۔ "میں تیماردار ہوں... انور کا دوست۔ کیا انہوں نے آپ کو مریض اور مرض کے بارے میں بتا دیا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں لیکن میں آپ سے بھی سننا چاہوں گا۔"

"وہ انور کے چھوٹے بھائی ہیں چودھری اکبر علی... ان کا نروس بریک ڈاؤن کچھ پاگل پن کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ شک یہ ہے کہ یہ پاگل پن مصنوعی ہے۔"

"انور صاحب نے کہا تھا کہ پاگل پن کی اصل وجہ آپ تفصیل سے بتائیں گے۔ انور آپ کا دوست ہے تو میں انور کا دوست ہوں۔ جب میں لندن سے ایف آر سی پی کر رہا تھا نفسیاتی بیماریوں پر تو وہ بھی وہیں تھا اور فنِ تعمیر کی ڈگری لے رہا تھا... مزاج کا میں بھی سیلانی ہوں۔ ہم دنیا میں ساتھ بہت گھومے۔ اتفاق سے ہم ایک ساتھ ہی واپس بھی آئے۔ مجھے پریکٹس کرنی تھی۔ اسے یہ جاگیر سنبھالنا تھی۔ دونوں کے والدین چاہتے تھے کہ ہم شادی کر لیں۔ میں انکار نہ کر سکا، اس نے کر دیا۔ پھر ظاہر ہے کہ ہماری مصروفیت کے دائرے الگ ہو گئے۔ اب اتنے عرصے بعد اس نے فون کیا اور کہا کہ ایک ٹیکسی والا تمہیں سیدھا بیمار تک پہنچا دے گا۔ یہ ذرا حیرانی کی بات تھی۔ وہ اپنی گاڑی بھیجتا ورنہ میں اپنی گاڑی پر آجاتا لیکن پھر اس کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ شاید میں خود آتا تو بہت بھٹکتا۔ جب تک میں کافی پیوں، آپ مجھے مریض اور مرض کے بارے میں بتائیں۔"

میں نے سلونی سے کافی لانے کو کہا اور ڈاکٹر کو وہ سب بتا دیا جو اکبر نے کیا تھا۔ گزشتہ ایک سال میں انور کے ساتھ اکبر نے کیا سلوک کیا تھا، اس کی ڈاکٹر کو خبر نہیں تھی۔ میں نے بھی بہتر سمجھا کہ اس مسئلے کو نہ چھیڑوں۔ میں نے اسے یہ بتایا کہ اکبر کو یہاں رکھنا مجبوری تھی اور وہ محض انور کو پریشان کر رہا ہے۔ پاگل پن کا یہ ڈراما بھی اسی سلسلے کی کڑی لگتا ہے۔ لیکن اصلیت کا پتا نہیں چلتا۔ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے تو پھر علاج کے بارے میں سوچا جائے گا۔

میں اسے کمرے میں لے گیا جہاں اکبر بے دست و پا پڑا تھا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حقارت اور ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ "یہ کون پاگل کا بچہ ہے تیرے ساتھ؟"

ڈاکٹر نے مسکرا کے کہا۔ "میں ڈاکٹر ہوں۔"

وہ تلخی سے ہنسا۔ "ڈاکٹر؟ شکل سے براتی لگتا ہے۔ گلے میں باجے کی جگہ یہ آلہ ڈال لیا ہے۔"

"دراصل میں پاگل خانے کا ڈاکٹر ہوں۔" شفیق الرحمٰن نے کہا۔ "تمہیں ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے اکبر کا رنگ متغیر ہوا۔ "تو کیا لے جائے گا مجھے... تجھے لے جائے گا موت کا فرشتہ... تو بھی مرے گا تڑپ تڑپ کے لعنتی۔ میرے پاس کالا جادو ہے۔" اس نے اوٹ پٹانگ الفاظ والا منتر پڑھنا شروع کیا اور ہم پر یوں پھنکار رہا جیسے مٹھی بھر بھر کے ریت پھینک رہا ہو۔

ڈاکٹر اسے دیکھتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اس کی حالت تو بہت خراب ہے۔ علاج مشکل ہے۔"

میں نے تشویش ظاہر کی۔ "پھر کیا کرنا چاہیے؟"

"پاگل کتے کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے؟" ڈاکٹر نے بیگ کھولا۔ "آپ اسے پکڑ کے رکھو... میں زہر کا انجکشن لگا دیتا ہوں۔ بے چارہ بہت تکلیف میں ہے۔"

میں نے بھی ہمدردی سے کہا۔ "ہاں، اس کی مشکل آسان کریں ڈاکٹر صاحب... اور ہماری بھی۔"

ڈاکٹر کے الفاظ کا ڈرامائی اثر ہوا۔ اکبر کا رنگ اڑ گیا۔ وہ بدحواسی میں چلّایا۔ "نہیں، مت مارو مجھے... میں پاگل نہیں ہوں... خدا کی قسم۔"

میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے دبا لیا۔ ڈاکٹر نے اس کے سامنے کوئی انجکشن بھرا۔ اکبر کی وہی حالت ہوئی جو پھانسی کے تختے پر لے جانے والے کی ہوتی ہے۔ وہ رونے اور گھگیانے لگا۔ "خدا کا واسطہ... رسول کا واسطہ... مجھے مت مارو... میں ٹھیک ہوں... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں ڈراما کر رہا تھا۔ تنگ کر رہا تھا تمہیں... میں مرنا نہیں چاہتا۔"

میں نے سنی ان سنی کر دی۔ "چلو کلمہ پڑھ لو۔ ڈاکٹر صاحب انجکشن لگا رہے ہیں۔"

وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپنے اور چلّانے لگا۔ میں اس کے جسم کی لرزش کو محسوس بھی کر سکتا تھا۔ میرا یہ خیال بھی درست ثابت ہوا کہ اس کا بول و براز خطا ہو جائے گا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ کہیں خوف سے اس کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر قریب آتے آتے رک گیا۔ "اس کو چھوڑ دیں... حقیقت تو معلوم ہو گئی ہے۔"

میں نے اکبر کو چھوڑ دیا۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے اور پھر ڈاکٹر کو دیکھا۔ اسے ابھی تک نہ سچ کا یقین

آیا تھا نہ جھوٹ کا۔ اس کا خوف اب بھی برقرار تھا مگر کچھ کم ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اپنی بزدلی پر شرمندگی نے خوف کی جگہ لے لی۔ اس نے جھوٹی دھمکی پر اعترافِ جرم کر لیا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنے کپڑے اور بستر بھی ناپاک کر دیے ہیں۔

ڈاکٹر نے انجکشن رکھ دیا۔ ''مسٹر چودھری اکبر! ڈاکٹر جان بچاتے ہیں، جان لیتے نہیں۔ کسی کو قتل نہیں کرتے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم سے بڑے ڈرامے باز نہیں ہو تم۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ انجکشن سچائی جاننے کے لیے دیا جاتا ہے۔ ان قتل کے مجرموں کو جو پھانسی سے بچنے کے لیے پاگل پن کا ڈراما کرتے ہیں۔''

''پھر کبھی یہ ڈراما کرو گے تو یہ نسخہ پھر آزمایا جائے گا اور تم جو اعتراف کرو گے وہ ریکارڈ کر لیا جائے گا۔'' میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔ ''کیا اب اس کی ضرورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔''

ہم اکبر کو خاموش اور بے حس و حرکت پڑا چھوڑ کے باہر نکل آئے۔ میں نے کہا۔ ''آپ فون کر کے چودھری انور علی کو پوری میڈیکل رپورٹ دے دیں۔''

میں اسے فون کے پاس چھوڑ کے کچن میں چلا گیا اور سلونی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بھی اب کھانا کھا کے ہی جائیں گے۔

''میں نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔'' وہ پریشانی سے بولی۔ ''وہی دن کا کھانا ہو گا۔ اگر آدھا گھنٹا دیں تو میں کچھ کرتی ہوں۔''

''تمہیں ایک گھنٹے کی اجازت ہے میڈم۔'' میں نے کہا۔ ''وہ رنگیلا کہاں ہے؟''

''آپ اس سے نہیں ملے ابھی تک سر؟'' وہ بولی۔ ''ابھی تھا یہاں، باہر ہو گا۔''

میں باہر آیا تو تاریکی میں سے اچانک وہ میرے سامنے آ گیا۔ ''گڈ مارننگ حضورِ والا۔'' اس نے مجھے فوجی اسٹائل میں سیلیوٹ کیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''ایٹ یور سروس۔''

سلونی کی باتیں سن کر میں نے اپنے ذہن میں رنگیلا کا جو تصور قائم کیا تھا، وہ اس سے یکسر مختلف ثابت ہوا۔ شاید وہ جوانی دیوانی تھی جب اس نے ایک کارٹون بن کے خود اپنی پبلسٹی کی تاہم یہ اس کی ذہانت بھی تھی کہ اس نے اپنے مسخرے پن کو اپنے کاروبار میں من و عن بھی استعمال کر کے ایک گڈول بھی بنائی۔ لوگ اس پر ہنستے تھے جو یقیناً اس سے بہتر تھا کہ لوگ اس پر روتے۔ اس نے دوست بنائے نہیں۔ شمی سے ایک جنونی عشق بھی اس عمر کے آتشیں جذبات کا نتیجہ تھا اور جیسے سیلاب گزر جانے کے بعد ... چھوڑ جاتا ہے، ایسے ہی شمی کے چلے جانے کے بعد اس کی دبی ہوئی آگ سلونی کو دیکھ کے پھر بھڑکی لیکن اب جنون کی دیوانگی نے ہوش مندی کو ساتھ رکھا تھا۔ وہ اب بھی جذباتی تھا... دوستی میں مخلص تھا اور وفاداری میں ثابت قدم۔ لیکن اب وہ صرف نام کا رنگیلا تھا، ہنسنا ہنسانا اس کی فطرت تھی جو بدل نہیں سکتی تھی۔

اس نے عام سی پتلون کے ساتھ چار خانے والی شرٹ پہن رکھی تھی اور جاگرز... متوجہ کرنے والی اس کی خوش دلی اور جاندار مسکراہٹ تھی۔ وہ ساڑھے پانچ فٹ اوسط قد کا کسرتی بدن والا انیس بتیس سال کا جوان آدمی تھا مگر بے حد جوشیلا اور اضطرابی مزاج رکھنے والا۔ یوں لگتا تھا جیسے توانائی اس کے اندر یوں بھری ہوئی ہے جیسے سرد نظر آنے والے آتش فشاں پہاڑ کی گہرائی میں ابلتا کھولتا لاوا۔

میں نے اس سے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا۔ ''مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ سلونی نے تمہارے بارے میں مجھے سب بتا دیا تھا۔''

وہ ہنسا۔ ''عورتیں ایسے ہی بے پر کی اڑاتی ہیں سر... کاکروچ دیکھ کے ایسے چیخ مارتی ہیں جیسے شیر ہو اور شوہر شیر کا بچہ شیر خان ہو تو اسے بنا دیتی ہیں کاکروچ۔''

میں نے کہا۔ ''بھئی اپنے اپنے تجربے کی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کھانا کھا کے جائیں گے، تم بھی کھا لو۔''

اندر ٹیلی فون پر ڈاکٹر کی انور علی سے نہ جانے کیا گفتگو چل رہی تھی۔ اس کے لیے میں اجنبی تھا اور میرے لیے وہ، چنانچہ ہم دونوں نے حویلی کی سیاست اور حویلی میں رہنے والوں کے باہمی رشتوں پر بات کرنے سے گریز کیا۔ جاتے وقت اس نے مجھے دو گولیاں دیں۔ ''شاید اس کیفیت میں وہ نہ دوا لے اور نہ انجکشن۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔''

''پھر یہ گولیاں؟''

اس نے کہا۔ ''یہ آپ کھانے یا چائے میں ملا کر دے سکتے ہیں۔ صرف ایک گولی۔ اگر کسی وجہ سے وہ ضائع ہو جائے تو دوسری کام آئے گی۔ اس سے وہ گہری نیند سو جائے گا اور اس کو واپس حویلی منتقل کرنا آسان ہو گا۔ وہ مزاحمت نہیں کرے گا۔''

میں نے گولیاں جیب میں رکھ لیں۔ ''آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔''

رنگیلا اپنی ٹیکسی میں ڈاکٹر کو لے گیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ میں نے اکبر علی کے لیے کھانا ایک ٹرے میں لگوایا اور گولی کو پیس کر تھوڑے سے سالن میں ملا دیا۔ پھر میں نے اس کا ذائقہ چکھا تو مجھے فرق کوئی محسوس نہ ہوا۔ دوسری پلیٹ میں تھوڑے سے چاولوں کے ساتھ میں ٹرے کو اکبر کے کمرے میں لے گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بھوکا ہو گا اور یہ کھانا اسے یقیناً ناکافی ہو گا لیکن میں چاہتا تھا کہ پوری گولی اس کے پیٹ میں پہنچ جائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے سارا سالن ان چاولوں پر ڈالا اور ذرا سی دیر میں ختم کر دیا۔ اس کا غرور و تکبر، اس کی خودسری اور شرم، خوش فہمی اور مزاحمت کی قوت سب کا گراف اب زیرو پر آ چکا تھا۔ وہ ایک مایوس، ہارا ہوا اور بے بس قیدی تھا۔ چودھری اکبر علی دی گریٹ نہیں جو ناقابلِ شکست تھا۔ اس نے اپنے اس انجام سے کوئی سبق سیکھا تھا یا نہیں، اسے مکافاتِ عمل تسلیم کیا تھا یا نہیں اور مستقبل سے بالکل ناامید ہو گیا تھا یا اب بھی امید رکھتا تھا کہ آنے والے وقت میں حالات پھر اس کے حق میں پلٹا کھائیں گے... یہ میں نہیں جان سکتا تھا۔ کھانا ختم ہو گیا تو اس نے پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے اسے مزید کھانا لا دیا۔

''مجھے کب تک یہاں رہنا ہو گا؟'' اس نے کھانے کے بعد پوچھا۔

''قیدی کو کیا فرق پڑتا ہے، اس کو کسی بھی جیل میں رکھا جائے۔ فرق پڑتا ہے تو اس کے اچھے رویے سے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں اپنی بیوی... اور ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''اس رعایت کا انحصار بھی تمہارے رویے پر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انور اتنا سنگ دل اور بے ضمیر جیلر نہیں ہے جتنے تم تھے۔''

پھر میں نے برتن اٹھائے اور دروازہ کھلا چھوڑ کے باہر نکل آیا۔

رات کے گیارہ بجے کے بعد جب میں رنگیلا کی واپسی کا منتظر تھا، فون کی گھنٹی بجنے لگی اور میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف ریشم تھی۔ ''معاف کرنا، میں نے تمہاری نیند خراب کی۔'' وہ طنز سے بولی۔

''میں سو فیصد جاگ رہا تھا اور تمہیں یاد کر رہا تھا۔''

''تم شہری لوگ باتوں میں بڑے چالاک بنتے ہو۔ بھاگ گئے ہو، مجھ سے جان چھڑا کے... پلٹ کے خبر بھی نہیں لی اور خود پتا نہیں کہاں چھپے بیٹھے ہو۔''

''بس یا اور کچھ کہنا باقی ہے۔ اب کچھ میری بھی سن لو۔ مجھے انور نے ایک ذمے داری سونپی تھی۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔''

''یعنی ابھی کوئی ارادہ نہیں تمہارا واپس آنے کا؟'' وہ خفگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''مجبوری ہے۔ شاید مہینا بھر اور لگ جائے۔ تم کچھ پریشان لگتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''پریشانی تو ہے۔ یہاں سب بڑی عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں مجھے اور پیٹھ پیچھے بُری بُری باتیں بھی کرتے ہیں۔''

''کیسی باتیں... تم نے کیا بُرائی کی ہے کسی کے ساتھ؟''

''تم نہیں سمجھے... چودھری انور علی نے مجھے جو عزت دی ہے، وہ سب کو بری لگ رہی ہے۔ میں ایک غریب مزارع کی لڑکی پہلے ہی بہت منہ پھٹ مشہور تھی۔ پھر تمہاری وجہ سے لوگوں نے بدنام کیا اور یہ بھی کہا کہ... میرے باپ نے تم سے میرا سودا کر لیا تھا۔''

''لاحول ولاقوۃ... کون کہتا ہے ایسا؟''

''نام کس کا لوں میں... مجھے پتا ہے پہلے یہ بھی کہتے تھے کہنے والے کہ میں نے چودھری اکبر کو پھانسا ہے اور اس سے شادی کر کے حویلی کی مالکن بننا چاہتی ہوں۔ اب کہتے ہیں کہ میں نے اکبر کو اور تمہیں چھوڑ کے انور علی سے رشتہ جوڑ لیا ہے۔ تم جانتے ہو ایسا نہیں ہے۔'' وہ رو پڑی۔

''ریشم! خدا کے لیے سنبھالو خود کو... بھونکنے دو ان کتوں کو۔''

''بڑے چودھری صاحب ذرا لحاظ نہیں کرتے۔ چودھرائن کے سامنے میں جا نہیں سکتی... وہ کہتی ہے ناقابلِ برداشت ہے میرے لیے۔ اس کی منہ چڑھی خدمت گار میری وجہ سے ماری گئی۔ اسے میں نے تو نہیں مارا تھا لیکن چودھرائن کا خیال ہے کہ تمہارے ساتھ بھاگنے میں اس نے میری مدد لانچ میں کی تھی۔ میں نے اسے رشوت دی تھی۔ اس تانگے والے کو میں نے تو نہیں بلایا تھا۔ اس کی بیوہ مجھے کوستی ہے۔ اپنے باپ کو قتل کرنے کا الزام مجھ پر پہلے ہی تھا۔ وجہ وہی کہ میں نے تم سے یاری لگائی تھی۔ اب بتاؤ میں کس کس الزام کو غلط کہوں اور میری مانے گا کون؟ یہاں

کے ملازم نفرت سے تھوکتے ہیں میری طرف دیکھ کر کیونکہ چودھری انور نے سب کو سختی سے حکم دیا ہے کہ مجھے خاص مہمان سمجھا جائے۔ سب میرا حکم مانیں... میری خدمت کریں اور مجھے سلام کریں۔"

میں نے کہا۔ "ریشم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب رونا بند کرو اور سو جاؤ۔"

"کل کیا ہوگا.. تم انور سے کہو گے؟" وہ بولی۔ "کوئی ضرورت نہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "کل میں آجاؤں گا... صبح تمہاری آنکھ کھلے گی تو تم مجھے حویلی میں دیکھو گی۔"

"ابھی کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"وہ مذاق کی بات تھی۔" میں نے کہا۔ اسی وقت باہر سے ہارن سنائی دیا تو میں نے کہا۔ "اچھا خدا حافظ۔"

سلونی نے اندر آ کے کہا۔ "رنگیلا آ گیا ہے سر۔"

ریشم نے پوچھا۔ "یہ کون عورت ہے تمہارے ساتھ؟" اس کے لہجے میں شک بہت واضح تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ سلونی ہے... اس کے بارے میں چودھری انور سے پوچھ لینا۔" اور فون بند کر دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میری کوئی وضاحت کافی نہیں ہوگی۔ ریشم نے سلونی کی آواز سن لی تھی اور اس کے لیے وہ سب سفید جھوٹ ہو گیا تھا۔ میں نے انور کی طرف سے دی گئی ذمے داری کے حوالے سے کہا تھا اس کا ثبوت بھی مل گیا جب فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی اور مسلسل بجتی رہی مگر میں نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ یہ ناممکن تھا کہ میں ریشم کو اپنے سچ کا یقین دلا کے مطمئن کر سکتا۔ وہ میری کوئی وضاحت قبول نہ کرتی۔ بہتر یہی تھا کہ اسے بدگمانی میں جلتا رہنے دیا جائے۔ کل اسے فرصت سے قائل کیا جا سکتا تھا۔ ابھی وقت نہیں تھا۔

میں باہر آیا تو رنگیلا مستعد کھڑا تھا۔ میں اسے اندر لے گیا۔ چودھری اکبر بے ہوشی کی نیند میں تھا۔ کسی دشواری کے بغیر ہم نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کے ایک بنڈل سا بنایا۔ رنگیلا نے کسی دشواری کے بغیر اسے اٹھا کے کندھے پر ڈال لیا۔ یوں کہ اکبر کے ہاتھ پیچھے کی طرف جھول رہے تھے اور نچلا دھڑ ٹانگوں کے ساتھ آگے تھا۔ سلونی نے جتنی دیر میں سب کمرے لاک کیے اور لائٹس آف کر کے باہر آئی، ہم نے اکبر کو ٹیکسی کی پیچھے والی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔ سلونی سے میں نے کہا کہ وہ آگے والی سیٹ پر رنگیلا کے ساتھ بیٹھ جائے۔ میں خود پچھلی سیٹ پر تھوڑی سی جگہ میں سمٹ کے بیٹھ گیا۔

نصف شب کے قریب ٹیکسی لائٹس آف کر کے حویلی کے عقبی حصے میں جا کھڑی ہوئی۔ مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ اب اکبر کو واپس حویلی کے اندر تہ خانے میں کیسے پہنچایا جائے گا۔ اس بات کا امکان بہرحال موجود تھا کہ کسی جاگنے والے کی نظر اس پراسرار نقل و حرکت کو دیکھ لے۔ بڑے چودھری بھی کم خوابی کے مریض تھے اور شاید اکبر کی ماں کے لیے بھی چین کی نیند سونا اتنا ہی مشکل تھا جتنا اکبر کی بیوی کے لیے۔

اچانک اندھیرے میں سے ایک سایہ سا نکل آیا۔ یہ انور علی تھا۔ "تھینک یو یار... تم نے بڑی مدد کی... تمہارے سوا میں اور کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔"

"یہ رسمی باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ اکبر کو اندر کیسے لے جائیں گے؟"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا بندوبست پکا ہے۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا تو رنگیلا نے ڈگی میں سے ایک بوری نکال لی تھی اور اب اکبر کو اس میں فولڈ کر کے ڈال رہا تھا۔ گھٹنوں کے پاس سے اکبر کی ٹانگیں موڑ کے رنگیلا نے بوری اس کے سر پر چڑھا دی اور بوری کا منہ نیچے سے باندھ دیا۔ کسی دشواری کے بغیر اس نے یہ بنڈل پھر اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ ہم حویلی کی دیوار کے ایک عقبی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ حویلی کوئی شاہی محل نہیں تھی لیکن اس میں اندر آنے جانے کے خفیہ راستے رکھے گئے تھے۔ دس منٹ بعد اکبر اسی زنداں میں تھا جہاں انور نے ایک سال گزارا تھا۔ اکبر اس وقت بھی نیند میں تھا جب اس کے ایک پیر کو پہلے کی طرح حلقۂ زنجیر میں ڈال دیا گیا۔ ایک نظر میں بالکل اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ جگہ صرف چند گھنٹے کے لیے اپنی شناخت بدل چکی ہے۔ جب ایک تھانے دار نے اسے دیکھا تھا تو اس میں گندم، چاول، چینی اور دیگر اجناس سے بھری بوریاں اوپر تلے رکھی تھیں جن کو چوہوں کے تیز دانتوں نے کتر کے سوراخ کر دیے تھے اور باہر بکھرے ہوئے دانے گواہی دیتے تھے کہ حویلی میں زیر زمین دوسرے بہت سے ایسے ہی کمروں کی طرح یہ جگہ سال بھر کے لیے غلے اور فصل کی اضافی پیداوار کو ذخیرہ رکھنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ درمیانی دیوار کے ساتھ بھی گھی تیل کے کنستر اور گڑ چینی کی بوریاں تھیں اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق تمام بڑے زمیندار اپنی فصل کی

پیداوار کو اسی طرح محفوظ کرتے تھے۔ یہاں سے قیدی کا بیڈ اور استعمال کا فرنیچر غائب کر دیا گیا تھا۔ بعد میں انور علی نے مجھے دوسری جانب کا نقشہ بھی دکھایا تھا جہاں میں نے اسیری کا ایک پورا دن گزارا تھا۔ کتابوں کی وہ الماری دونوں جانب رکھے ہوئے اجناس کے ذخیرے میں غائب ہو گئی تھی جس میں سے میں نے راستہ نکال کے اپنے اور انور علی کے لیے آزادی کے حصول کو ممکن بنایا تھا اور اس انقلاب کی راہ ہموار کی تھی جس نے سب کچھ الٹ دیا تھا۔

اب درمیان کی مدت میں یہ جگہ کیا تھی، اس کا میں صرف تصور کر سکتا تھا۔ میری نظر میں سب کچھ وہی تھا اور ویسا ہی تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر میں یہ محسوس کر سکتا تھا کہ شاید فرش اور دیواریں پہلے سے زیادہ صاف نظر آتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اجناس رکھنے اور ہٹانے کے بعد فرش کو دھو دیا گیا تھا اور دیواروں پر تازہ چونے کی سفیدی تھی۔ اس کی خفیف سی مہک تہ خانے کی محبوس فضا میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ ایک نئے قیدی کی آمد کے استقبال پر یہ اہتمام بھی یوں تھا جیسے خزاں کے بعد بہار کے آنے سے پہلے خشک ٹہنیاں بھی ہری ہو جاتی ہیں۔

دروازے مقفل کر کے اور باہر مسلح محافظ پوسٹ کرنے کے بعد ہم اوپر آئے تو سلونی کہیں نہ تھی۔ شاید وہ اپنی سابقہ حیثیت کی بحالی کے بعد وہیں چلی گئی تھی جہاں اس کا پہلے ٹھکانا تھا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟" رنگیلا نے برآمدے میں پہنچ کے سوال کیا۔

انور علی نے رک کر کچھ سوچا۔ "تمہارے لیے بھی انتظام ہو جائے گا... ابھی تم جاؤ اور ٹیکسی بھی لے جاؤ۔ کل دوپہر تک کسی وقت بھی آ جانا۔ تمہیں اس خدمت کا انعام بھی ملے گا اور نئی ذمے داری بھی دی جائے گی۔"

تمام برآمدوں میں اوپر چھت میں نصب شیڈ والی لائٹس کا مدھم سا اجالا تھا۔ دستور کے مطابق رات دس بجے کے بعد دیواروں پر لگی ٹیوب لائٹس آف کر دی جاتی تھیں۔ چھت کی بلندی سے ہر برآمدے کی ایک لائٹ کا پچیس واٹ والا بلب صرف تاریکی دور کرتا تھا۔ اس کی برائے نام روشنی کسی خواب گاہ کی کھڑکی کے شیشوں سے گزر کے سونے والوں کی نیند میں خلل نہیں ڈال سکتی تھی۔ رات کے پہرے دار بھی صرف چار تھے جو برآمدے کے وسط میں رات بھر بت بنے خاموشی سے پہرا دیتے تھے۔ صبح کے انتظار میں کھڑے کھڑے ان کی ٹانگیں شل ہو جاتی تھیں مگر ان کو نہ بیٹھنے کے لیے کوئی اسٹول میسر تھا اور نہ اپنی جگہ سے ہلنے کی اجازت تھی۔

میری خواب گاہ کے دروازے پر کھڑے محافظ نے خاموشی سے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ انور نے فقط سر کی جنبش سے جواب دیا اور میرے ساتھ اندر آ کے دروازہ بند کر دیا...... جذباتی انداز میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ چند سیکنڈ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "تمہارا شکریہ میں کیسے ادا کروں... الفاظ نہیں ہیں میرے پاس۔"

میں نے کہا۔ "رسمی باتوں میں تکلف کی بو آتی ہے۔ کیا دوستوں کا اتنا بھی حق نہیں ہوتا؟"

وہ خوشی سے مسکرایا۔ "کیسی عجیب ہے یہ واردات بھی۔ ہم دونوں دو دن پہلے اجنبی تھے اور ایک سے قیدی... اعتماد کا یہ رشتہ برسوں میں قائم ہوتا ہے۔ چلو اب سو جاؤ، صبح ملاقات ہوگی... شب بخیر۔"

"شب بخیر۔" میں نے کہا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا مگر نیند کے آنے تک گزرے ہوئے چند دنوں کے واقعات کسی فلم کے سین کی طرح میری نظر سے گزرتے رہے۔ معلوم نہیں تقدیر جو آج اتنی مہرباں تھی، آنے والے وقت میں کیا کھیل دکھانے والی تھی۔ مجھے منیر نیازی کا مشہور شعر یاد آیا۔ ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو... میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا۔ کیا میرے لیے زندگی میں کہیں سکون اور عاقبت کا پڑاؤ بھی ہے یا یہ عمر ایسے ہی نشیب و فراز، زندگی اور موت کی آنکھ مچولی اور تقدیر سے تدبیر کی محاذ آرائی میں گزر جائے گی۔

تھکن کے باوجود میں ایک طویل راحت بخش نیند سے محروم رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دن کا اجالا خاصا پھیل چکا تھا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھنے سے مجھے دھوپ کی چمک نے احساس دلایا کہ صبح ہوئے دیر ہوئی۔ گھڑی میں بھی دس بجے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بے سکونی کے ساتھ بھی میں پانچ چھ گھنٹے کی نیند لے چکا ہوں۔ جسم کی کسلمندی دور کرنے کے لیے میں نے غسل خانے کا رخ کیا۔ لاہور سے یہ جگہ شاید سو کلومیٹر بھی نہیں تھی مگر اس کا شمار قصبے میں بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ملتان کی طرف یہ کچے پکے دو سو گھروں کی آبادی تھی جہاں عام آدمی کچے گھروں میں اسی طرح رہتا تھا جیسے اس کے آباؤ اجداد رہتے چلے آئے تھے۔ بھوسے گارے کی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھتوں کے نیچے آج بھی لالٹین جلتی تھی اور گوبر کے اپلوں کا دھواں بھرتا تھا لیکن چودھری کی وسیع و عریض حویلی جو باہر سے بھدی عمارت

سازی کا نمونہ تھی، اندر سے ان تمام آسائشوں سے مزین تھی جو کسی الٹرا ماڈرن طرزِ تعمیر رکھنے والی کوٹھی میں ہو سکتی تھیں۔ شاید ان کے معیار میں فرق ہوگا۔ یہاں کا فرنیچر امپورٹڈ نہیں تھا اور باتھ روم فٹنگ لوکل تھی۔ کوریڈور میں بیلجیم کے کرسٹل گلاس والے فانوس نہیں جگمگاتے تھے اور دیواروں پر آرٹ کے شاہکار آویزاں نہیں تھے لیکن خواب گاہوں میں بیش قیمت فرنیچر... پردے اور قالین یہاں تک کہ ایئر کنڈیشنز تک تھے۔ اسی طرح ان کے واش روم جن کو وہ غسل خانے کہتے تھے، گرم ٹھنڈے پانی سے پرتکلف غسل کے لیے ٹب اور شاور بھی تھے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ سرحد اور بلوچستان کے دور افتادہ اور بہت پسماندہ نظر آنے والے علاقوں میں مقامی سرداروں اور نوابوں کی کوٹھیاں بھی باہر سے پرانے قلعوں جیسی تھیں مگر اندر عیاشی کے تمام لوازمات رکھتی تھیں۔ میں نے اس کا ایک نمونہ خود بھی دیکھا تھا۔

میں غسل کے لیے گیا تو یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ وہاں میرے پہننے کے لیے وارڈ روب میں ایک درجن کے قریب کپڑے موجود تھے۔ یہ سب کہاں سے آئے اور کیسے آئے... شاید یہ مہمان خانے کے منتظم کی ذمے داری میں شامل تھا۔ میں نے تازہ دم ہو کے اپنے لیے ایک پتلون اور شرٹ کا انتخاب کیا جو بیش قیمت ہی نہیں بالکل میرے جسم کے مطابق تھے۔ اب مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ میں دروازے سے باہر آیا تو باہر خاصی گہما گہمی تھی۔ حویلی کے درمیانی کشادہ صحن میں انور علی کوئی عدالت لگائے بیٹھا تھا اور ایک عورت سینہ کوبی کر رہی تھی۔ دروازے پر محافظ کی جگہ اب ایک خادم اسٹول پر بیٹھا تھا جو مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں ناشتا لانے کا حکم دیتا، میں نے ریشم کو دیکھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی اور اب میری طرف آ رہی تھی۔

واپس اندر آ کے میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی حالت میں مجھے نمایاں فرق دکھائی دیا۔ دکھ اور خوف کی جگہ اب اس کے چہرے پر ایک پرسکون بشاشت تھی۔ ”بڑے چھیلا بابو بنے ہوئے ہو؟“ وہ مسکرا کے بولی۔

میں نے کہا۔ ”تم بھی کسی پنجابی فلم کی ہیروئن لگ رہی ہو۔ میں نے تو مانگے کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔“

”میرے ساتھ تو ایسا سلوک ہو رہا ہے جیسے میں کوئی خاص مہمان ہوں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”واقعی وہ ہوں جو تم نے کہا، فلمی ہیروئن... بڑا اچھا کمرا ملا ہے مجھے... بالکل ایسا ہی۔“ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ”ایک ماسی ہے میری ماں کی عمر کی۔ وہ ہر وقت خدمت کے لیے حاضر رہتی ہے اور ایسے کپڑے تو خواب میں بھی نہیں دیکھتی تھی میں... میں نے ماسی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ سب آپ کے لیے ہیں ریشم بی بی! نئے بنوائے گئے ہیں۔ بالکل میرے ناپ کے ہیں۔ اتنی جلدی معلوم نہیں کیسے بن گئے۔ میں سمجھی تھی کہ کسی کے ہوں گے لیکن یہ میرے ہیں۔“

میں نے مسکرا کے کہا۔ ”یہ سب چودھری انور علی کی مہربانی ہے۔ یہ بتاؤ ناشتا کیا ہے تم نے؟“

”چودھری انور کے ساتھ کیا تھا۔ ایک گھنٹا ہو گیا۔ تم سو رہے تھے۔“

”اچھا، میرے لیے یہیں منگوا دو۔ کسی سے کہہ دو۔ اچھا بیٹھو میں کہہ دیتا ہوں اس حکم کے غلام سے جو باہر بیٹھا ہے۔“ میں نے کہا اور دروازے سے باہر جھانک کے احکامات جاری کر دیے۔

”ابھی مجھے بھی عادت نہیں ہے ایسے کسی پر حکم چلانے کی۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے یہ سب۔“

”راتوں رات ہماری حیثیت بدل گئی ہے۔ پہلے ہم چودھری اکبر کے مجرم تھے۔ اب چودھری انور کے خاص مہمان ہو گئے ہیں۔ یہ باہر کیا تماشا ہو رہا ہے؟“

”وہ تانگے والا جو مارا گیا تھا بلاوجہ... یہ اس کی بیوہ ہے۔ اپنے پانچ بچوں کے ساتھ فریاد کرنے آئی ہے۔ جس نے گولی ماری تھی اسے وہ مل نہیں رہا ہے، شاید بھاگ گیا۔“

”مگر اب انور کیا کرے گا؟“

”اس کا کوئی جوان بیٹا ہے اسے ملازمت دے گا اپنے پاس... قاتل کے خلاف تو وہ پرچہ درج کرائے گا۔ اس کی جگہ خالی ہو گی۔ بیوہ کو کچھ زمین ملے گی اور شاید اس کے بچوں کی تعلیم کی ذمے داری چودھری انور صاحب لیں گے۔“

”تمہیں تو مکمل انفارمیشن ہے۔“

”ہاں، چودھری صاحب نے ہی بتایا تھا مجھے کل رات... انہوں نے کھانا میرے ساتھ کھایا تھا، میرے کمرے میں... مجھ سے پوچھا کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو... میں تو بڑی حیران ہوئی۔ اتنی عزت دے کر پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو اعتراض نہ ہو۔“

میں نے کہا۔ ”وہ پڑھا لکھا، مہذب اور شائستہ آدمی ہے۔ ساری دنیا گھوم کے آیا ہے۔ خواتین کے ساتھ کیسے

پیش آنا چاہیے یہ سمجھتا ہے ورنہ اس سے پہلے اکبر تھا۔ میں بھی اگر تمہارے کمرے میں آؤں گا تو بغیر اجازت نہیں آؤں گا۔“

”کیا سب شہری ایسا کرتے ہیں؟“

”سب نہیں، صرف تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ۔ اس نے تو تمہارے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ دوسرے لوگ نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے اور کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔“

اس کا رنگ کچھ لال ہوا۔ ”کیا باتیں کر رہے ہوں گے؟“

”چھوڑو، تم جانتی ہو۔ تم نے بتایا بھی تھا کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن کہتے ہیں نا کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں، قافلہ چلتا رہتا ہے۔ نیت صاف ہو تو آدمی کسی سے نہیں ڈرتا۔“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”ٹھیک کہتے ہو تم۔ موقع خود میں نے دیا لیکن میں بھی کیا کرتی۔ میں ان کو انکار کیسے کر سکتی تھی۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتے رہے۔“ ایک خادمہ ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی اندر آئی اور درمیان میں چھوڑ کے چلی گئی۔

میں نے اپنے لیے چائے بنا کے ریشم سے پوچھا۔ ”تم پیو گی؟“

وہ مسکرائی۔ ”پہلے پیتی نہیں تھی۔ اب پی لوں گی۔“

”تم نے انور سے اپنا مسئلہ بیان کیا؟“ میں نے دیسی گھی کا گرم اور خستہ پراٹھا اٹھا لیا اور مکھن کے ساتھ آملیٹ لے لیا حالانکہ ڈبل روٹی کے سلائس بھی تھے مگر خوشبو نے میری بھوک بڑھا دی تھی۔

”کون سا مسئلہ... میرا تو اب کوئی مسئلہ نہیں رہا، جب بابا ہی نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری زمین کا مسئلہ... وہ جو تمہاری زمین پر کاشت کرتا تھا شامو... اس نے کیا دھمکی دی تھی؟“

”ہاں، وہ بات ہوئی تھی۔ دراصل چودھری صاحب نے پوچھا تھا کہ میں نے اپنے لیے کیا سوچا ہے۔ میں نے کہا کہ میں کیا سوچوں... مجھے خطرہ تھا چودھری اکبر...... سے... وہ اب نہیں ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اس گھر میں تم اکیلی کیسے رہو گی۔ میں نے کہا کہ تھوڑی سی زمین ہے میری لیکن اس پر بھی شامو نے قبضے کی دھمکی دی تھی۔ میں اسی لیے سلیم کے ساتھ یہاں سے جا رہی تھی۔ میری حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔“

”پھر کیا کہا انور نے؟“ میں نے اس کے چہرے کی گہری لالی کو غور سے دیکھا۔

”انہوں نے پوچھا تھا، سلیم کے ساتھ تم کہاں جاتیں؟ اس کا تو اپنا کوئی گھر نہیں اور اتنا اعتبار کر لیا تھا تم نے اس پر؟“ ریشم نے نظر جھکا کے اور رک رک کے کہا۔ ”میں نے کہا وہ شریف آدمی ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے اور پھر میں کرتی بھی کیا۔ خود کو چودھری اکبر سے کیسے بچاتی۔ یہاں تو سب کی نظر تھی مجھ پر... شامو زمین پر قبضہ کر لیتا تو میں کیا کرتی۔ سلیم کا یہاں رہنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لوگ اس کے خلاف سو طرح کی باتیں کر رہے تھے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

”پھر؟ چودھری انور نے تمہیں کہا کہ اب تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں... چاہو تو اپنے گھر میں رہو یا تم سلیم کے ساتھ ہی جاؤ گی؟“

اس نے نظر اٹھا کے مجھے عجیب سی نظر سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں یہ سب پہلے سے بتا دیا تھا چودھری انور نے؟“

”تم قسم لے لو۔ میری تو اس معاملے میں اس سے بات ہی نہیں ہوئی۔“

”پھر تم کیسے جانتے ہو کہ انہوں نے یہ کہا ہوگا؟“ وہ بولی۔

”کیا میرا اندازہ غلط تھا؟“ میں نے مسکرا کے پوچھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”انہوں نے یہی کہا تھا بلکہ... پوچھا تھا کہ کیا میں نے فیصلہ کر لیا ہے؟ سلیم کے ساتھ زندگی گزارنے کا؟ میں نے کہا کہ چودھری صاحب، زندگی کا تو ابھی کچھ پتا نہیں... میرے فیصلے سے کیا ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ ریشم یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اگر اجازت دو تو میں ایک آخری سوال پوچھ لوں؟ میں نے کہا کہ چودھری صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کس ذاتی معاملے کی بات کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اگر اس نے تم سے شادی کی بات کی ہے اور تم نے مان لی ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں گھبرا گئی۔ میں نے کہا کہ نہیں چودھری صاحب، نہ اس نے کوئی بات کی ہے اور نہ میں نے سوچا ہے ایسا... حالات ایسے تھے اس وقت کہ وہ بھی یہاں نہیں رہ سکتا تھا اور میرے لیے اکیلا رہنا ناممکن تھا۔ میں مجبور تھی۔ اس پر چودھری صاحب نے کہا کہ اب تو کوئی مجبوری نہیں۔ تم چاہو تو اپنے گھر میں رہو لیکن تم حویلی میں بھی رہ سکتی ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں کوشش کروں گا کہ سلیم کو بھی

روک لوں۔ وہ بھروسے کا آدمی ہے اور میرے لیے ایک ہی دوست ہے دنیا میں... اس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ اگر وہ رک گیا تو میری خواہش ہوگی کہ تم بھی رہو۔ زمین کا معاملہ تو میں ٹھیک کردوں گا۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑگئی۔ میں نے کہا کہ اچھا چودھری صاحب پہلے آپ سلیم سے بات کرلیں۔"

ہمارے درمیان خاموشی کا وقفہ آیا جس میں وہ فرش کو انگوٹھے سے کریدتی رہی اور میں چائے کا خالی کپ لیے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ "میں تمہیں کسی دھوکے یا غلط فہمی میں رکھنا نہیں چاہتا ریشم... میں مجبوراً لے جارہا تھا تمہیں... صرف تمہیں بچانے کے لیے... لیکن تم یہاں رہ سکتی ہو تو تمہیں یہیں رہنا چاہیے۔ چودھری انور مجھ سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ وہ تمہاری حفاظت کرسکتا ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ میں نے صرف ایک مہینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ انور نے مجھے نورین کی تلاش میں مدد کا یقین دلایا ہے۔ اسے تلاش کرنا میری زندگی کا پہلا مقصد ہے۔ اس کے علاوہ... میں خود بے حد غیر محفوظ ہوں۔ میرے پیچھے پولیس بھی لگی ہوئی ہے اور نادر شاہ کے شکاری کتے بھی۔ جو خود محفوظ نہ ہو وہ کسی اور کی حفاظت کیا کرے گا؟ لیکن مجبوری میں تمہاری ذمے داری قبول کرلی تھی میں نے... اور کیا کرتا۔"

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ "چلو اچھا کیا تم نے صاف بتادیا۔ چودھری انور کی بات بھی مجھے غلط نہیں لگی کہ میں اپنے گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم یہاں رہنے میں کوئی خطرہ محسوس کرتی ہو؟"

"ابھی تو نہیں لیکن سلیم... میرے جیسی لاوارث لڑکی تو سب کے لیے وہ خزانہ ہے جس کا کوئی محافظ نہیں۔ جو چاہے لوٹ لے... برا مت ماننا... جب تم محافظ بنے تھے خطرہ تب بھی تھا نیت کا حال خدا جانتا ہے اور کس کی نیت کب بدل جائے... اس کا بھی کیا پتا۔ آج چودھری انور یہ ذمے داری لینے کو تیار ہے۔"

"بھروسا تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا کسی پر۔"

"ہاں، پھر کیوں نہ میں وہیں رہوں جہاں میرا گھر ہے اور میری زندگی گزری... لوگ جانتے ہیں مجھے۔"

"بالکل صحیح فیصلہ ہے تمہارا... میں ایک اجنبی ہوں جس کا نہ کوئی گھر ہے اور نہ ٹھکانا اور نہ کوئی مستقبل۔"

اچانک باہر سے کسی کا واویلا سنائی دیا۔ معلوم نہیں کون تھا جو بلبلا کے فریاد کررہا تھا۔ "ہائے... ہائے میری توبہ، میرے باپ کی توبہ چودھری صاحب۔"

"یہ کیا ہورہا ہے؟" ریشم نے پریشانی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ انصاف ہورہا ہے۔ کہتے ہیں انصاف ہوتا نظر بھی آنا چاہیے، یہ سنائی بھی دے رہا ہے۔" میں نے کہا۔

میں ناشتا ختم کرچکا تھا۔ ریشم کے ساتھ میں باہر آیا تو عجیب منظر دیکھا۔ انور کی عدالت سے تانگے والے کی بیوہ کا کیس نمٹا دیا گیا تھا۔ وہیں اب دوسرے مقدمے کے مجرم کو سزا دی جارہی تھی۔ انور کرسی پر بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا اور اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر شامو مرغا بنا ہوا تھا۔ پتا نہیں پولیس تفتیش میں استعمال ہونے والا وہ چھتر کسی تھانے سے امپورٹ کیا گیا تھا یا حویلی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے آرڈر پر بنوا کے رکھا گیا تھا۔ شامو پر وہ بڑے موثر انداز سے استعمال ہورہا تھا۔ استعمال کرنے والا بھی پیشہ ور اور تجربہ کار لگتا تھا۔ سزا کو موثر بنانے کے لیے اس نے شامو کی شلوار نہیں اتاری تھی جیسے کہ تھانے کا دستور ہے۔ اس نے شامو کو مرغا بنا کے پیچھے سے قمیص اٹھادی تھی اور شلوار کا تھوڑا سا حصہ پھاڑ دیا تھا۔ تماشا چونکہ حویلی کے صحن میں ہورہا تھا اس لیے شامو کو ننگا نہیں کیا گیا تھا اور اس کا مضروب حصہ بھی مخالف سمت میں تھا۔

ریشم پریشان ہوگئی۔ "سلیم! تم جا کے چودھری انور سے کہو کہ یہ ظلم نہ کرے۔"

"میں کہہ دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر میرا خیال ہے کہ سزا سے کچھ عبرت بھی ہونی چاہیے دوسروں کو... اور جو حالات نہ بدلتے تو کیا شامو تمہیں کوئی رعایت دیتا کہ یتیم لڑکی ہے... تمہاری زمین پر قبضہ نہ کرتا؟ وہ تو گھر بھی لے لیتا... تم تو سب چھوڑ چھاڑ کے بھاگ جانا چاہتی تھیں۔"

وہ دکھ اور ناخوشی کے ساتھ دیکھتی رہی اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں انور کے پاس گیا اور دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیسی گزری رات... نیند آئی، ناشتا کیا؟" وہ مسکرا کے بولا۔

میں نے سر ہلا کے سارے سوالوں کا جواب اثبات میں دیا۔ "میرا خیال ہے کہ شامو کے لیے اتنی سزا کافی ہے۔"

"یہ جرم کی نہیں... جرم کی نیت رکھنے کی سزا تھی۔"

"یہ ریشم نے کہلوایا ہے۔"

"یہ سفارش مسترد کیسے کی جاسکتی ہے۔" انور بولا اور ہاتھ کے اشارے سے سزا کا عمل رکوادیا۔

شامو زاروقطار روتا اور ہائے ہائے کرتا سیدھا کھڑا ہوا اور اپنے کان پکڑ لیے۔ "چودھری صاحب! میری توبہ... میرے باپ کی توبہ... میرے دادا کی توبہ۔" اس نے توبہ کے بعد قسموں کا سلسلہ شروع کیا۔

چودھری انور نے گرج کے کہا۔ "بند کر اپنی بکواس... سیدھا کھڑا ہوجا۔"

شامو یوں چپ ہوگیا جیسے کوئی ریڈیو کا والیوم آف کردے۔ دس برآمدوں میں کھڑے حویلی کے ملازم اس پر مسکرا رہے تھے اور کچھ ناخوش بھی نظر آتے تھے۔ انور نے اپنا فرمان جاری کیا۔ "چل اب دفع ہوجا۔ زمین پر تو ہی کام کرے گا لیکن میرا منشی سارا حساب کتاب کرے گا۔ ایک دانہ بھی ادھر سے ادھر ہوا نا تو تیری کھال کے جوتے بنوا کے اسی سے سر پر ایسا طبلہ بجاؤں گا کہ تو گنجا ہوجائے گا۔"

شامو پلٹ کے ایسے بھاگا جیسے نشے میں ہو۔ "تم نئے حاکم کی دہشت قائم کررہے ہو۔ ریشم کے شکایت کرنے کا مقصد یہ بہرحال نہیں تھا۔"

"یہ سب مجھے بھی پسند نہیں مگر ضروری ہے۔ ورنہ شرافت کو میری کمزوری سمجھ لیا جائے گا اور پرانے پاپی میرے خلاف سازشوں میں مصروف ہوجائیں گے۔ آہستہ آہستہ معاملات کو میں اپنے ڈھب پر لے آؤں گا۔"

"حویلی کے اندر تمہاری فیملی کا موڈ کیسا ہے؟"

"ظاہر ہے کہ اچھا نہیں ہے۔ صبح میں ماں کو سلام کرنے گیا۔ نماز کے بعد وہ جائے نماز پر تسبیح لیے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ ناراض ہیں مجھ سے؟ انہوں نے منہ پھیر کے کہا۔ کیا فرق پڑتا ہے کسی کو میرے ناراض ہونے سے... تم دونوں ایک سے ظالم ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کو بہت جلد اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ ظلم اور زیادتی پہلے میرے ساتھ ہوئی تھی اور اکبر نے چھوٹا ہونے کے باوجود جو میرے ساتھ کیا، اس پر نہ آپ نے اسے روکا اور نہ ابا نے۔ وہ رونے لگیں کہ تجھے کیا معلوم میں نے کتنی کوشش کی تھی۔ آج تو زندہ ہے تو مجھے الزام دے رہا ہے اور اپنا بدلہ لے رہا ہے۔ میں کیا کروں؟ ہاتھ تیرا ابھی نہیں پکڑ سکتی۔ میں نے کہا کہ چند دن میں آپ دیکھ لیں گی کہ میں انتقام نہیں لینا چاہتا۔"

"انہوں نے یقین نہیں کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... دو دن سے وہ دیکھ رہی ہیں کہ میں ہلاکو خان بنا ہوا ہوں۔"

"اور بڑے چودھری صاحب؟"

"کل تک وہ صدمے کی کیفیت میں تھے۔ اب شاید کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ میرے سلام کے جواب میں انہوں نے بڑے جلالی انداز میں کہا۔ دفع ہوجا یہاں سے۔ تو کیا سمجھتا ہے میں مرگیا ہوں؟ ابھی چودھری اصغر زندہ ہے۔ یہ سب نہ تیرا ہے نہ اس کا۔ میں مالک ہوں سب کا۔ میں یہ سب نہیں کرنے دوں گا تجھے۔ ورنہ ڈال دے مجھے بھی قید میں۔ زہر دے دے مجھے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، ان کے سامنے سے تو میں جواب دیے بغیر لوٹ آیا لیکن سلیم... اگر وہ چاہیں تو بہت کچھ کرسکتے ہیں قانونی طور پر۔"

میں نے کہا۔ "مثلاً؟ وہ عاق کرسکتے ہیں تمہیں۔"

"عاق کرنے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ وہ جائز قانونی وارثوں کو ان کے حق سے محروم نہیں کرسکتے۔"

"پھر کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟ وہ تمہارے خلاف فوجداری مقدمہ دائر کردیں گے؟"

"اس میں تو وہ خود مجرم بن جائیں گے۔ پہل ان کی طرف سے ہوئی تھی۔ اکبر بھی نہیں بچے گا۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ انہیں یہ خوف رہے گا کہ ایسا نہ ہوا کبر غائب ہوجائے۔ وہ خود نہ جانے کتنے بندے غائب کرچکے ہیں اور جو غائب ہوجاتا ہے وہ اس دنیا میں کہیں نہیں ملتا۔ نہ زمین کے اوپر نہ نیچے... اس کا تو سوال ہی نہیں۔"

"وہ کیا کرسکتے ہیں جس سے مسئلہ حل ہوجائے؟"

"ابھی میں زندہ ہوں... اس بات کا مطلب بہت واضح ہے۔ حقِ وراثت ملتا ہے موت کے بعد۔ اپنی زندگی میں کوئی اپنا سب کچھ خیرات کردے، منادے یا کسی کو بخش دے۔ وہ مکمل قانونی اختیار رکھتا ہے۔ لوگ اپنا سب کچھ خیراتی اداروں کو دے جاتے ہیں۔ مسجد کے لیے وقف کردیتے ہیں یا خانقاہ کے ٹرسٹ کے لیے۔"

"وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔

"رائٹ، ایسا وہ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ جدی پشتی خاندانی ریاست ہی تو ان کا سرمایہ حیات ہے۔ اسی کا غرور ان کی رگوں میں خون بن کے دوڑ رہا ہے۔ مرتے وقت وہ ایک تہی دست اور مفلس عام انسان ہوں، ایسا خیال ان کے لیے قبر کے عذاب کی طرح ہوگا۔ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ اس کا مالک نہ میں رہوں نہ اکبر۔ ماں اس ارادے کی راہ میں حائل ہوگی۔ لیکن ایسے تمام فیصلے مرد

کرتے ہیں۔ بیٹے ہم دو ہی تھے۔ بیٹی ہوتی تو بھائی کے گھر میں ہوتی۔ جیسے بھائی کی بیٹی ان کے گھر میں ہے اور بھائی ابھی زندہ ہے۔"

"اوہ... وہ جائداد کا مالک بھائی کو بنا دیں گے؟"

"وہ ایسا سوچ سکتے ہیں۔ خاندان کی جاگیر خاندان میں ہی رہے گی لیکن یہ اتنا ہی مشکل فیصلہ ہوگا جتنا مجھے اور اکبر کو حقِ وراثت سے محروم کرنے کا... اور اس کی ایک تاریخی وجہ ہے۔ یہ وجہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا، اندر چل کے کافی بریک لیتے ہیں۔ آج صبح سے یہ معاملات نمٹانے میں میرا دماغ تھک گیا ہے۔"

انور مجھے اپنے بیڈروم میں لے گیا اور صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "انور صاحب! آپ کے ان سو فیصد خاندانی معاملات میں میرا کیا رول ہو سکتا ہے؟"

"تم میرے واحد مشیر ہو اور کس پر اتنا اعتماد کر سکتا ہوں میں... اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔"

"یہ بہت بڑا رسک ہوگا تمہارے لیے... تمہیں سمجھنا چاہیے۔"

"اس بارے میں پھر بات کریں گے۔" وہ بولا۔ "ابھی میں چاہتا ہوں کہ تم میرے معاملات کو سمجھ لو... گہرائی میں جا کے۔"

میں نے ہتھیار ڈالنا بہتر سمجھا۔ "اچھا بولو... کتنی گہرائی تک جانا ہوگا مجھے؟"

"پہلے کافی پیو۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟"

"اتنے پُرتکلف شاہانہ سلوک کا عادی نہیں ہوں میں۔ بس یہی تکلیف ہے۔" میں نے ہنس کے جواب دیا۔

"صورتِ حال یہ ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "غالباً ہماری خاندانی تاریخ ایسے ہی چلتی آئی ہے۔ یعنی کسی نہ کسی کو حق تلفی کی شکایت رہی لیکن رشتوں کی زنجیریں اتنی مضبوط تھیں کہ توڑنا بالکل ناممکن تھا۔ اب یہ جو میرے تایا صاحب ہیں، اباجی کے بڑے بھائی... ان کو اپنے ابا سے بھی شکایت تھی کہ انہوں نے انصاف نہیں کیا تھا۔ ابا اپنی مرضی چلاتے ہیں مگر آج دونوں بھائیوں کے سوشل اسٹیٹس میں جو فرق آیا ہے وہ غیر منصفانہ تقسیم کے باعث نہیں... زمین برابر ملی تھی دونوں کو۔ اب کچھ کو بعد میں پانی کم ملا۔ نہر سے دوری اس کی ایک وجہ تھی۔ اصل وجہ پانی کی کمی بنی۔ پانی دریاؤں میں کم ہوا تو نہروں میں کم ملا۔ پھر محکمۂ انہار والے پیسا لے کر پانی چھوڑتے تھے۔ اباجی نے سب جائز ناجائز حربے استعمال کر کے فائدہ اٹھایا۔ تایا جی کچھ ڈھیلے رہے۔ اثر پیداوار پر اور زرخیزی پر پڑا لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ اباجی نے مزید زمین پکڑی۔ زور زبردستی سے بھی اور مال خرچ کر کے بھی... وہ سیاسی تعلقات میں ایکٹیو رہے۔ تم نے مہمان خانہ دیکھا ہے نا؟ سرکاری افسران کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ہر قسم کے شکار کے لیے۔ تایا اس معاملے میں بھی پیچھے رہے۔"

"بڑے چودھری صاحب نے ملکی سیاست میں دخل در معقولات نہیں کیا؟"

"کیا تھا... کچھ لوگوں کے اکسانے پر صوبائی نشست کے لیے امیدوار بنے تھے مگر پارٹی نے ٹکٹ نہیں دیا۔ وہ آزاد امیدوار تھے۔ آخری وقت میں مقابلے سے دستبردار ہو گئے۔ مخالف امیدوار نے سودا کر لیا۔ اس کا فائدہ الگ ہوا اور سیاسی رقابت بھی نہیں ہوئی۔ وہ امیدوار جیتا تو اس سے اچھے مراسم بنا لیے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان ایک خاموش دوری ہے۔ رشتہ اپنی جگہ... ان کی بیٹی پر اباجی نے اپنا حق نہیں چھوڑا اور انہوں نے بھی چھوٹے بھائی کو یہ حق دیا۔ اب تم دیکھو کہ اباجی کے پلڑے میں وزن زیادہ ہے۔ اکبر بھی بیٹا ہے اور میں بھی لیکن اکبر کی بیوی ہے تایا کی بیٹی اور تایا کی حمایت بھی اباجی کو حاصل ہے۔ میں ہوں ابھی تک اکیلا چھڑا چھانٹ... دماغ الگ خراب ہے میرا... تو قدرتی طور پر اکبر کو ایڈوانٹیج حاصل ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے، اباجی ساری زمین اکبر کے نام کر سکتے ہیں؟"

"اگر انہیں اکبر کی زندگی کی ضمانت حاصل ہو۔ وہ فی الحال یہ رسک نہیں لیں گے اور نہ بہو ایسا قدم اٹھائے گی کہ جیسے شوہر دو دن کے لیے غائب ہوا تھا ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے۔ یہاں قانون کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ایک انقلاب ہے بادشاہت میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اباجی کا بھی اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ قانون کا سہارا وہ لیں گے نہیں لیکن اس کو خاموش دھمکی کے ذریعے استعمال ضرور کریں گے... ارادہ کر چکے ہیں۔ دوسرا مہرہ ہوں گی ماں... ان کے جذباتی دباؤ کو آزمایا جا سکتا ہے۔ ابھی خاموشی کا مطلب ہے تمام امکانات پر غور جاری ہے۔ بہو نے بھی اپنی ماں کو ضرور بتایا ہوگا لیکن اس کی ماں کو یہاں کے معاملات میں دخل کی اجازت نہیں اور اس کا ایک مطلب یہ ہوگا کہ بہو نے گھر کے اندر کی بات باہر پہنچائی۔ اس کے میکے میں بھی غور و خوض جاری ہوگا اور شاید بہت جلد دونوں بھائی بھی سر جوڑ کے بیٹھیں گے۔"

"تم نے کیا سوچا ہے، یہ بتاؤ؟"

"ہاں، ایک ٹرمپ کارڈ تو ہے میرے ہاتھ میں بھی۔" انور پاؤں اوپر کر کے صوفے پر لیٹ گیا۔ "کل پرسوں میں ماں کو اکبر سے ملنے کی اجازت بھی دے دوں گا۔ وہ اس کا کھانا خود بنا کے لے جائیں گی۔ یہ بہت بڑی رعایت ہوگی جو مجھے نہیں ملی تھی۔ میں ایک پوائنٹ اسکور کر لوں گا۔ اس کے بعد یہی احسان کروں گا بھابی پر۔ ابھی نہیں، کچھ عرصے بعد... بات اس کے کانوں تک پہنچا دوں گا کہ میں یہ رعایت دے سکتا ہوں۔ اسے اپنا رویہ بھی درست کرنا پڑے گا۔ میرے اچھے دیور جیسے رویے کے جواب میں، دوسرا پوائنٹ... پھر جب تمام سیکیورٹی رسک کور کرنے کے بعد میں میاں بیوی کو محدود تعلق کا موقع دوں گا تو حالات میرے حق میں بہت بہتر ہو جائیں گے۔"

"یہ بہت اچھی اسٹریٹجی ہے... اگر تمہیں اس پر عمل کی مہلت ملے۔"

"مہلت لینا ہی پہلا مرحلہ ہے اور اس کے لیے میں اپنا ٹرمپ کارڈ استعمال کر سکتا ہوں لیکن اس سے میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ زندگی بھر کے لیے ایک روگ پال لوں گا۔ تایا کی ایک اور بیٹی ہے، بھابی کی چھوٹی بہن۔"

"میں سمجھ گیا۔ یہ واقعی زبردست چال ہوگی۔ اگر تم اس سے شادی کر لو۔"

"وہ میرے نام پر بک ہے۔ اسے انکار کرنا سنگین مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ یہ تایا کی سخت بے عزتی ہوگی اور اس لڑکی کے لیے بھی۔ اگر آج میں ماں سے کہہ دوں کہ بات کریں تو یہ ساری ٹینشن وقتی طور پر ختم ہو جائے گی۔ پھر ایک امید پیدا ہو جائے گی کہ اب یہ مسئلہ خاندانی روایات کے مطابق حل ہو جائے گا۔ ایک طرف دو بہنیں اور دو خاندانی بڑے... میں گویا آ گیا راہِ راست پر۔ صبح کا بھولا شام کو لوٹ آیا۔ دیر ہوئی سو ہوئی مگر اب مزید خرابی نہیں ہو گی۔"

"اور تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"پریشانی؟ وہ لڑکی جو تمام عمر میری شریکِ حیات ہو گی، سب سے بڑی پریشانی تو وہی ہے۔ وہ روایتی انداز کی جاہل، خر دماغ اور بے وقوف لڑکی... میرے اس کے مزاج، فطرت اور پسند میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"کیا وہ خوب صورت نہیں ہے... تمہاری بھابی کے جیسی؟"

"یار! خوب صورت عورتیں بہت دیکھی ہیں میں نے دنیا میں۔ استعمال بھی کی ہیں اور اب بھی بہت دستیاب ہیں لیکن شریکِ حیات کی بات اور ہوتی ہے۔ اس کے انتخاب کا حق میں کسی اور کو دینا نہیں چاہتا اور یہ بھی ناقابلِ تصور ہے میرے لیے کہ ایک کو حویلی میں باندھ کے رکھوں اور پھر دوسری شریکِ حیات اپنی مرضی کی لاؤں۔"

"تمہاری نظر میں ہے کوئی؟ کسی کا انتخاب کیا تم نے دنیا کے بازار سے؟"

"ابھی نہیں... جب وقت آئے گا تو وہ خود ہی آجائے گی میری زندگی میں... آسمان پر جوڑے بننے کا نظریہ غلط نہیں ہے لیکن تب تک میری زندگی میں شریکِ حیات نمبر ون کوئی نہیں ہونی چاہیے۔ بس جتنا سوچتا ہوں، اتنا ہی یہ ٹرمپ کارڈ کھیلنا مجھے سو فیصد خسارے کا سودا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف میں یہ رشتہ نہ کروں تو گویا اوپن وار... خاندانی دشمنی... ابھی نہ سہی کچھ عرصے بعد سہی۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی ہے اور قربانی کا بکرا تو میں ہوں بہرحال..."

میں نے کہا۔ "اللہ تمہاری قربانی قبول کرے۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"تمہارے لیے میں بہت اہم ذمے داری دیکھ رہا ہوں۔ مستقبل میں... تمہیں درمیان میں ایک ثالث کا کردار بھی ادا کرنا پڑ سکتا ہے اور میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ تم میں اس کی صلاحیت ہے اور تم میرے اچھے وکیل بن سکتے ہو۔ اسی لیے میں تم کو کیس ہسٹری بتا رہا ہوں۔ آج دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کا موڈ ہو تو تمہاری مرضی ورنہ ہم ایک راؤنڈ پر نکلیں گے۔"

"اور جائیں گے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک مطالعاتی دورہ ہوگا۔ تمہیں ہسٹری کے ساتھ جغرافیہ بھی معلوم ہونا چاہیے۔"

"دیکھو، میں خود کو انتہائی غیر محفوظ سمجھتا ہوں۔ میں خطرات سے کھیل رہا ہوں۔ پولیس خود اتنی مستعد نہیں ہے لیکن نادر شاہ انہیں میرا سراغ دے گا کہ وہ اسی علاقے میں غائب ہوا۔"

"اور پھر نہیں ملا... ویگن پل سے دریا میں گری اور ڈوب گئی۔ کیا کوئی زندہ بچا تھا؟"

"مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم۔ ویگن وہیں تھی، اتنی بلندی سے گر کے وہ نیچے کیچڑ میں دھنس گئی تھی۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ویگن کا ڈھانچا وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔ یہ کارروائی چند روز قبل رات کے وقت ہوئی تھی، اسے پولیس لے گئی۔"

"اچھا، مجھے کیوں معلوم نہیں ہوا؟"

"یہ ابھی دو چار دن پہلے کی بات ہے اور مجھے معلوم کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ خیال بھی نہیں آیا کہ پولیس کہاں سے آئی تھی اور یہ ساری کارروائی اتنی تاخیر سے کیوں ہوئی اور کس کے ایما پر ہوئی۔ وہ میں معلوم کرلوں گا۔"

"یار! تم ان کو نہیں جانتے، نادر شاہ کے قبیل کے لوگ فرشتۂ اجل کی طرح بھولتے نہیں اور پیچھے لگے رہتے ہیں۔"

"میں تمہیں یہ بتا دوں کہ وہ ہوگا بہت لمبے ہاتھوں والا... لیکن یہاں تمہاری پوزیشن وہی ہے جو بیرونِ ملک فرار ہوجانے والے مجرموں کی ہوتی ہے۔ یہ کسی بے حیثیت اور بے آسرا غریب کا ٹھکانا نہیں ہے جہاں کسی کے لیے چادر اور چار دیواری کا احترام لازمی نہ ہو۔ مجرم کو اٹھا لو ورنہ اس کی ماں بہن کو لے جاؤ۔ یہاں جو بھی آئے گا، پہلے بتائے گا کہ وہ کون ہے اور کیوں آیا ہے... خواہ وہ نادر شاہ ہو یا چنگیز خان... پولیس کا رویہ تم نے دیکھ لیا اور ایسے کسی علاقے میں جو ہم جیسے وڈیرے رہتے ہیں، ان کے قلعے میں بلا اجازت داخل ہونے کی جرأت کوئی نہیں کرتا۔ ایسا ہر جگہ ہے۔ سندھ ہو یا پنجاب... بلوچستان یا سرحد۔"

"تمہاری باتوں نے یقیناً میرا حوصلہ بحال کیا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ... ریشم اب کیسا محسوس کرتی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ کس قسم کا سوال ہے؟ ظاہر ہے، بہت اچھا... غیر متوقع اور... وہ خوش ہے لیکن ڈرتی بھی ہے۔"

"مجھ سے؟"

"تم سے نہیں... یہ تبدیلی اس کے لیے عجیب ہے، کسی خواب جیسی... ڈرتی ہے کہ خواب ٹوٹے تو پتا چلے دنیا وہی ہے۔"

"مجھے اس کی صورت پر اطمینان کے آثار نظر آئے ہیں۔ یہاں رہنے پر اسے کوئی اعتراض یا پریشانی تو نہیں؟"

"پریشانی تو نہیں، جھجک فطری ہے لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ یہی سب سے بہتر ہے۔ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی اور جیسے وہ میرے ساتھ نکلنے کا سوچ رہی تھی کیونکہ یہاں وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی، اب وہ صورتِ حال نہیں ہے... میرا تو کوئی گھر بار بھی نہیں۔"

"یہ مشکل ہوگا کہ میں اسے خاندان کی عورتوں جیسا مرتبہ دلا سکوں۔ سب کے خون میں اونچ نیچ کا فرق شامل ہے۔ حویلی کے اندر بھابی اور میری ماں کے برابر تو وہ نہیں ہوسکتی مگر اسے بے عزت کرنے کی جرأت بھی کوئی نہیں کر سکتا۔"

سلونی نے انگلی سے دروازے پر ناک کیا۔ "سر! میں آسکتی ہوں؟"

"آؤ آؤ... ہماری میٹنگ اسی طرح ختم ہوگی کہ تم لنچ پر مدعو کرلو... یہ بتاؤ تم نے ٹیک اوور کرلیا ہے مکمل طور پر یا نہیں؟"

"ہوجائے گا سر! جارحانہ عجلت کی ضرورت میں خود محسوس نہیں کرتی۔ سب کو راضی کرلوں گی میں۔"

"بے شک تم میں صلاحیت ہے اس کی۔ ریشم تمہاری خاص ذمے داری ہے۔ اس کا اعتماد بحال کرنا ہے تمہیں... ابھی وہ کچھ "اَن ایزی" محسوس کرتی ہے یہاں۔"

کھانے کی میز پر خاندان کے تین افراد نہیں تھے۔ بڑے چودھری صاحب، ان کی بیگم اور بہو اپنی ناراضی کا اظہار اسی طرح کرسکتے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں ریشم کا موجود ہونا خود اس کے لیے آسان نہ تھا۔ اس کو خود حویلی کے ملازم بھی محسوس کرسکتے تھے مگر انور علی اپنے رویّے سے کوشش کرتا رہا کہ ہم خود کو اجنبی اور غیر اہم نہ سمجھیں۔ تاہم ابھی سب کے لیے مطمئن نظر آنے کی اداکاری ایک مشکل کام تھا۔ ریشم اپنے کمرے میں سونے چلی گئی تو انور علی نے اپنی جیپ نکلوائی۔ وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ ایک ڈرائیور اور گن مین پیچھے بیٹھے۔ ڈرائیور بھی مسلح تھا لیکن گن مین تو باڈی گارڈ کی طرح مستعد نظر آتا تھا۔ کسی کے لیے یہ نظارہ نیا نہیں تھا۔ بڑے چودھری اصغر علی کی سواری بھی اسی اہتمام کے ساتھ نکلتی تھی۔ اکبر علی بھی اسی شان سے ہر جگہ جاتا تھا۔ ان کے لیے یہ معمول تھا۔ انور علی کے لیے طاقت کا یہ مظاہرہ ایک سیاسی ضرورت تھا۔ نیا بادشاہ پہلی بار اپنی رعایا کا حال جاننے کے لیے مملکت کے دورے پر نکلا تھا۔ میں اس پروٹوکول کا عادی نہیں تھا اور یہ تقدیر کا تماشا لگتا تھا کہ جو دن رات پہرے داروں کی نگرانی میں جیل کی چار دیواری میں بھی پابہ زنجیر رہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ پھانسی کے تختے تک لے جانے کو یقینی بنایا جائے اور اس کی حفاظت کی جائے۔ آج وہ مسلح محافظوں کی حفاظت میں تھا تو اس لیے کہ اس کی زندگی اہم ہوگئی تھی۔

دریا کے کنارے اب خشک تھے۔ وہاں سے بیل گاڑیاں اور ریڑھے گزرتے تھے۔ اس سے ایک کچا راستہ سا بن گیا تھا۔ عام کار وہاں پھنس سکتی تھی مگر جیپ فور وہیل ڈرائیو تھی۔ ہم پل کی مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ شاید ایسی ہی جگہ سے کسی نے مجھے پانی میں سے نکالا ہوگا۔ انور نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سے دریا کی شاخ ہے۔

"ویسے تو یہ ایک برساتی نالہ ہے۔ بارشوں کے موسم میں دریا بن جاتا ہے۔" انور نے کہا۔ "ادھر آگے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر وہ دریا ہے جس کا پانی ہم پر بند کردیا گیا ہے۔ ستلج اور بیاس ہمارے نہیں رہے، اب یہ پنجاب نہیں سراب ہے... راوی، جہلم اور چناب کی زمین پہلے دریا کے دائیں طرف ہماری جاگیر تھی اور اب بھی ہے۔ دوسری طرف تایا کی زمین ہے لیکن ان کے پاس آج بھی اتنا ہی ہے، جتنا انہیں ملا تھا۔ وہ بھی کم نہیں ہے۔ ان کا شمار بہت خوش حال زمینداروں میں ہوتا ہے لیکن وہ کچھ قناعت پسند ہیں۔"

دریا اب سمٹ کر نالہ سا بن گیا تھا اور جیپ اس کے ریتیلے کناروں پر متوازی لکیریں بناتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ مجھے چھوٹا سا پل نظر آیا جس کی کل لمبائی شاید سو گز ہوگی۔ چوڑائی بھی اتنی تھی کہ ایک وقت میں صرف ایک گاڑی اس پر سے گزر سکتی تھی۔ جیپ نے موڑ کاٹا اور پل پر چلنے لگی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ دو بھائیوں کی جاگیر کے درمیان یہ ندی ایک حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی تھی اور انہیں ملانے کا واحد ذریعہ یہ چھوٹا سا پل تھا۔ پل کے نیچے وسط میں دو کنکریٹ کے ستون تھے اور پھر چالیس چالیس فٹ کے فاصلے سے دونوں جانب مزید دو... اس سے آگے پل کے کنارے پتھریلی چٹانوں کے سہارے پر سیمنٹ سے جوڑے گئے تھے۔ پل کم سے کم خرچ کرکے بنایا گیا تھا اور اس کے لیے وہ جگہ منتخب کی گئی تھی جہاں ندی کی چوڑائی سب سے کم تھی۔ یہ ایک قدرتی صورتِ حال تھی کہ یہاں دونوں طرف چٹانیں بالکل دیوار بنی کھڑی تھیں اور دریا کو ان کے بیچ میں سے سمٹ کر گزرنا پڑتا تھا۔

انور علی نے مجھے غور سے پل کا جائزہ لیتا دیکھا تو بولا۔ "یہ حکومت نے نہیں، خود ہم نے اپنے خرچ سے بنایا تھا۔ اب سے کوئی دس سال پہلے... اس سے پہلے دونوں کناروں کو ملانے کا واحد ذریعہ وہ پل تھا جو بہت آگے سڑک پر ہے۔ خشک سالی کے موسم میں لوگ کم گہرے پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ دونوں طرف کچھ ایسے راستے تھے جہاں پانی گھٹنوں سے اوپر نہیں ہوتا تھا مگر بارش اور طغیانی کے موسم میں یہ ممکن نہیں رہتا تھا۔"

"اب بھی سیلاب کے موسم میں یہ پل بھی پانی میں ڈوب جاتا ہوگا۔ اس کی اونچائی زیادہ نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن ایسا کم ہوتا ہے۔ جب اوپر شدید بارش ہو تو ایک ریلا آتا ہے جو پل کے اوپر سے گزرتا ہے۔ عام طور پر پانی کی سطح پل سے کچھ نیچے ہی رہتی ہے۔ اس پر تیس لاکھ خرچ ہوئے تھے۔ آدھے آدھے دونوں بھائیوں نے شیئر کیے تھے۔ ابا جی کی مرضی تھی کہ اسے عام لوگوں کے لیے نہ رکھا جائے مگر تایا نے انکار کردیا اور شرط رکھی کہ اپنے حصے کا خرچ وہ اسی صورت میں دیں گے جب اسے سب استعمال کریں۔ ابا جی کو ان کی بات ماننا پڑی۔"

"ابا کے مقابلے میں تمہارے تایا کچھ عوام دوست لگتے ہیں۔"

جیپ اب دوسرے کنارے پر واپس جا رہی تھی۔

"ہاں، دونوں بھائیوں کے مزاج میں یہ فرق ہے اور ایک نسل کے بعد دیکھو تاریخ کیسے خود کو دہرا رہی ہے۔ یہی فرق میری اور اکبر کی فطرت میں ہے۔ تایا پڑھے لکھے تو زیادہ نہیں ہیں مگر طبعاً قناعت پسند، رحم دل اور فیاض ہیں۔ تم اس خاندانی تاریخ سے بور تو نہیں ہوئے؟"

"بالکل بھی نہیں۔ میں پہلی بار اس ماحول سے متعارف ہو رہا ہوں۔ رئیسوں، نوابوں اور وڈیروں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا میں نے۔"

انور نے جیپ روک دی اور نیچے اتر گیا۔ ندی کے کنارے پر سیمنٹ کے دو چبوترے بنے ہوئے تھے۔ ایک پر بیٹھ کے اس نے تھرماس کھولا اور مجھے گرما گرم کافی دی۔

"یہاں مرد، عورتیں کپڑے دھوتے ہیں۔ منگل اور جمعرات کے دن عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس دن مرد ادھر نہیں آسکتے۔"

میں نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "واہ، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم پورا انتظام کرکے چلے ہو۔"

وہ ہنسا۔ "مجھ میں اتنا سلیقہ کہاں... یہ سلونی کا حسنِ انتظام ہے۔ اس جگہ سے تم دونوں طرف کا فرق دیکھ سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آرہا۔"

"میں بتاتا ہوں۔ میرے دادا کی زمین ندی کے

دونوں طرف تھی۔ مجھے اندازہ نہیں کہ کتنی تھی مگر بہت تھی۔ وہ اس علاقے کے سب سے متمول زمیندار شمار ہوتے تھے۔ انہیں انگریز نے خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔"

"ایسی کیا خدمات تھیں ان کی؟" میں نے کہا۔

"یہ ایک افسوسناک اور تلخ حقیقت ہے کہ انگریز خطاب اور جاگیریں انہی کو دیتے تھے جو ان کے وفادار اور خدمت گزار ہوں۔ رعایا کے لیے فلاح و بہبود کے کام کرنے پر نہیں۔ ہندو ہو تو رائے بہادر... مسلمان ہو تو خان بہادر... اوپر کی سطح پر نوابوں اور طبقۂ اشرافیہ کے لیے سر کا خطاب تھا۔ دادا نے جنگِ آزادی 1857ء میں جسے انگریز غدر کہتے ہیں، انگریزوں کی بہت مدد کی تھی اور مفرور باغیوں کو پکڑوانے سے نیک نامی کمائی تھی۔ تمام گرفتار ہونے والے باغی سرِعام پھانسی پر لٹکا دیے جاتے تھے۔ تم نے تاریخ پڑھی ہے تو اندازہ ہوگا کہ یہ انگریز کے خطاب یافتہ اور جاگیریں پانے والے عام لوگوں کے نزدیک تو غدار ہی تھے۔ لیکن اب ایک صدی کے بعد انہی کی اولادیں معزز ہیں۔ سیاست بھی انہی کی ہے۔ تو وہ زمین برابر تقسیم ہوئی اور وہ ندی کے دونوں طرف تھی۔ یہ دادا کی عقل مندی تھی کہ پہلی بار ندی کے ایک طرف لی۔ دوسری مرتبہ موقع ملا تو دوسری طرف پکڑلی۔ جب وارث دو بنے تو ایک کی حکومت ادھر اور دوسرے کی اُدھر... بڑا بھائی ایک تو قناعت پسند تھا اور دوسرے یہ کہ اس کی اولادِ نرینہ نہیں ہوئی۔ کیا اتفاق ہے کہ ادھر دونوں بیٹے... ادھر دو بیٹیاں۔"

"یعنی چھوٹے بھائی کی جاگیر میں خودبخود بڑے بھائی کی جاگیر شامل ہوجاتی۔"

"ہاں، رشتے تو پیدائشی طور پر طے تھے۔ اب تم اندازہ کرسکتے ہو کہ مجھ پر کتنا دباؤ ہے۔ ایک بیٹی آگئی ہے ہمارے گھر میں۔ دوسری نہ آئی تو سمجھو جاگیر گئی کسی اور کے پاس۔ یہ دونوں بھائیوں کو منظور نہیں ہوگا۔ یہ اتنی بڑی مجبوری ہے کہ میں باہر سے ولایتی میم لے آتا... جس کا سب کو یقین تھا، تب بھی دوسری بیٹی میری دوسری بیوی بن کے آتی اسی گھر میں۔ اب ایک طرح سے بہت کچھ میرے ہاتھ میں ہے۔ کوئی نہیں چاہے گا کہ میں گھر چھوڑ کے جاؤں۔ دو بہنیں ایک بھائی کے نکاح میں تو آنے سے رہیں... اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ سب کو میری ماننا پڑے گی اور بالآخر سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"یعنی تم شادی کرلوگے دوسری بہن سے؟"

"بھئی ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر میں دس سال بعد چاہوں گا تو وہ دس سال بیٹھی رہے گی باپ کے گھر میں۔"

"اتنا بڑا ظلم کرسکتے ہو تم... اس بے چاری لڑکی کا کیا قصور ہے آخر؟"

"میں سمجھتا ہوں یار... لیکن فوری فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اس مسئلے کا حل بھی نکل آئے گا۔ پہلے زیادہ اہم معاملات سے نمٹ لوں۔ تمہیں یہاں لانے کا ایک مقصد ہے۔"

"تم مجھے تایا سے ملوانا چاہتے ہو؟"

"ابھی ہرگز نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ بالآخر ان کی ملاقات ہوگی تم سے۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ آنے والے وقت میں تمہاری کتنی اہمیت ہوگی۔ تایا کی زمین آج بھی اتنی ہی ہے لیکن اباجی نے ادھر بھی پاؤں پھیلائے اور بہت زمین گھیرلی، کچھ خریدی۔ کچھ پر قبضہ کیا اور اس وقت شاید اباجی کی زمین زیادہ ہے۔ چلو میں تمہیں ایک راؤنڈ لگوادوں۔"

ہم پھر جیپ لے کر چل پڑے۔ وہ ایک کچے گھروندوں والی آبادی تھی۔ اس میں چند دکانیں تھیں۔ اسکول کوئی نہیں تھا، اسپتال کوئی نہیں تھا۔ دونوں بھائیوں کی جاگیر کے درمیان حد بندی ایک خاردار تار کی باڑھ کرتی تھی۔ جو رقبہ زیرِ کاشت تھا، اس کا اندازہ انور علی کو نہیں تھا۔ جب ہم چکر لگا کے واپس پہنچے تو سورج غروب ہوئے ایک گھنٹا ہوچکا تھا۔ میں بھی اتنا تھک گیا تھا کہ اپنے کمرے میں جا کے لیٹ گیا۔

ریشم آئی اور خاموشی سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"مجھے کیا ہونا ہے؟"

"کسی نے کچھ کہا ہے... منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے جانا تھا تمہارے ساتھ اپنے گھر... لیکن تمہیں فرصت کہاں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"اگر بہت ضروری ہے تو چلو... ورنہ کل۔" میں نے کہا۔

"اور بھی کسی نے پوچھا تھا مجھ سے تمہارے بارے میں۔"

میں اٹھ بیٹھا۔ "کس نے؟ سلونی نے؟"

اس نے مجھے شک اور شبے کی نظر سے دیکھا۔ "صرف سلونی ہی ہے جس کے لیے تم اتنے اہم ہو؟ اور لوگ بھی ہیں۔ ان کا نام نہیں آیا تمہاری زبان پر... بڑا خیال ہے اس کا۔"

"یار کون پوچھے گا مجھے اور کیوں؟ اور یہ عورتوں والی
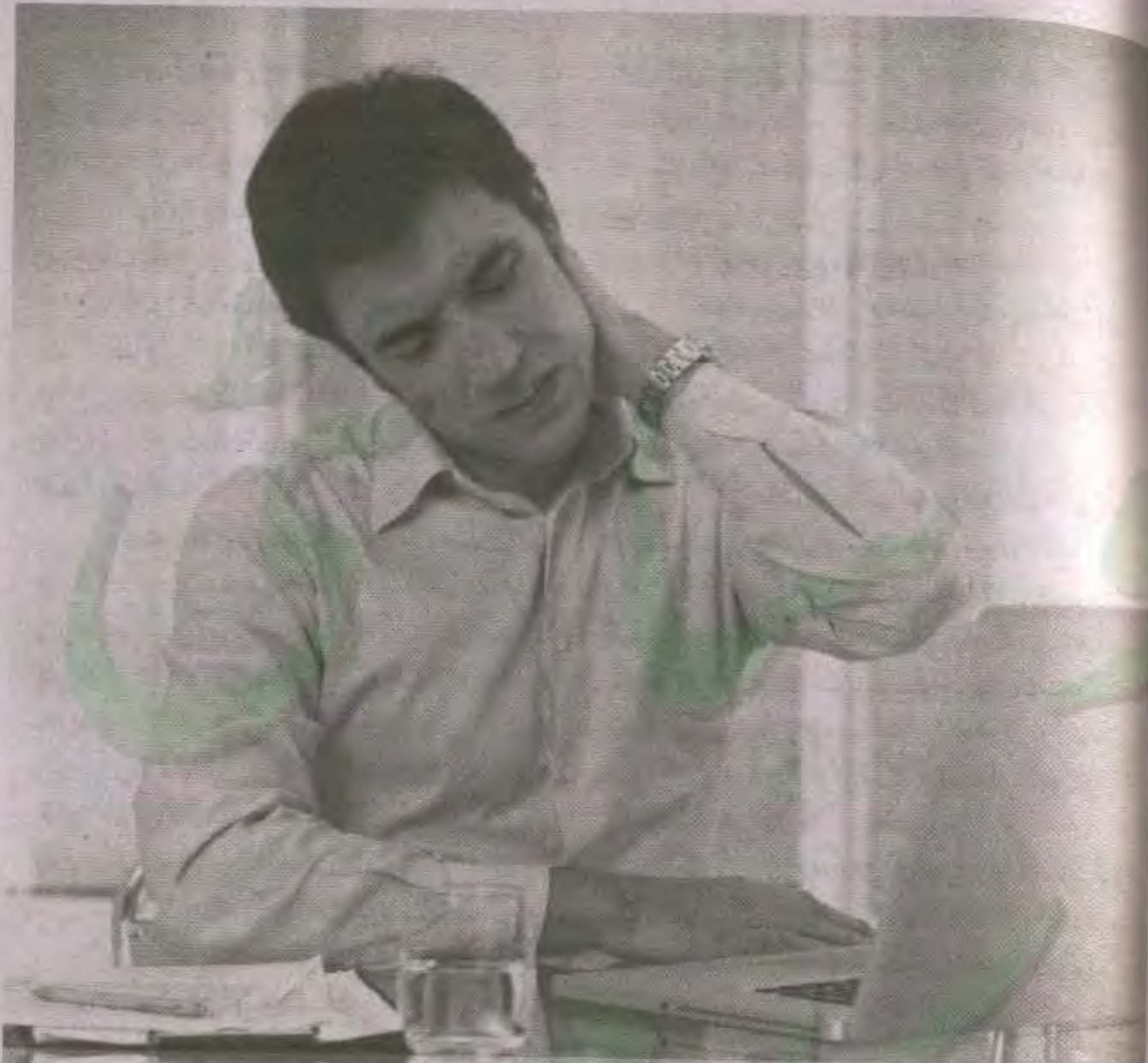
حسد کی جلی کٹی مت سناؤ مجھے... بات کرو ڈھنگ سے ورنہ جاؤ۔"

"ماں جی نے پوچھا تھا مجھ سے کہ سلیم کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم۔ بعد میں کسی نے بتا دیا ہوگا کہ چودھری انور علی اور وہ ساتھ گئے ہیں کہیں۔"

"تم ابھی جا کے بتا سکتی ہو کہ میں آ گیا ہوں۔ میں ان سے مل لیتا ہوں۔"

"میں بالکل نہیں جاؤں گی ان کے کمرے میں۔ ان کی نظر میں کوئی عزت نہیں ہے میری۔ معلوم ہے کیا الفاظ استعمال کیے تھے انہوں نے؟ انہوں نے کہا تھا کہ ریشم... وہ تیرا یار کدھر ہے... بس جواب نہیں دیا میں نے... غصہ بہت آیا تھا مجھے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ کچھ دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم دیکھنا... سب کا رویہ بھی۔" میں نے کہا اور باہر جھانک کے دیکھا تو ایک ملازمہ نظر آئی۔ میں نے اسے بلایا اور کہا بڑی چودھرائن کو بتا دے کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

اس نے کہا۔ "ابھی وہ نماز پڑھ رہی ہیں پھر وظیفہ ہو گا اور عشا کی نماز۔ پھر وہ کھانا کھا کے سو جائیں گی۔ اس وقت وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتیں جناب۔"

"تم کہاں گئے تھے چودھری انور کے ساتھ؟"

"وہ مجھے اپنا علاقہ دکھانے لے گیا تھا۔ ندی کے دوسری طرف بھی ان کی زمین ہے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ایسا لگتا ہے کہ تم نے یہاں سے جانے کا خیال چھوڑ دیا ہے؟"

"میں کیا کروں۔ اب میں کمبل کو چھوڑتا ہوں تو کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ چودھری انور نے بہت اصرار سے مجھے کم سے کم ایک مہینے کے لیے روک لیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہاں کے معاملات ٹھیک کرنے میں اس کی مدد صرف میں کر سکتا ہوں۔"

ریشم خوش ہوگئی۔ "تم یہاں رہ سکتے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ میری زمین سنبھال لو گے۔ چودھری انور سے زمین خرید بھی سکتے ہو تم۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ریشم! میری بہت سی مجبوریاں ہیں۔ تم جانتی ہو۔ پہلے کی بات اور تھی جب تمہارے بابا تھے۔ شامو نہیں اکیلا سمجھ کے بدمعاشی دکھا رہا تھا اس لیے میں نے کہہ دیا تھا۔ مجھے جانا ہے۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ "کیا تم نے چودھری انور کو سب بتا دیا ہے؟"

"ہاں، وہ کہتا ہے کہ میرے لیے خطرے کی بات کوئی نہیں۔ اس کے ہوتے کوئی بھی میری طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا... نہ وہ دشمن مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں جو میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور نہ پولیس ہاتھ لگا سکتی ہے۔"

"پھر کیوں جانا چاہتے ہو تم؟"

"مجھے نورین کو تلاش کرنا ہے۔ کوئی نہیں سمجھتا کہ یہ میرے لیے کتنا اہم ہے۔ میں یہ فرض کر کے مطمئن نہیں بیٹھ سکتا کہ وہ مر گئی۔ وہ میری ذمے داری تھی جو میں نے خود قبول کی تھی اور اس نے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔"

"آخر تم سمجھتے کیوں نہیں کہ وہ زندہ ہوتی تو کیا پہلے یہاں نہ آتی تمہیں تلاش کرنے... وہ ڈوب گئی ہوگی۔"

"ریشم! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ نہ ڈوبی ہو اور انہی میں سے کوئی اسے اپنے ساتھ لے گیا ہو جو مجھے بھی نادر شاہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے لے جا رہے تھے۔ وہ نادر شاہ کی قید میں ہو۔"

"اگر ایسا ہو گا تو کیا اکیلے تم اسے قید سے چھڑا لو گے؟"

"میں کوشش ضرور کروں گا۔ ویسے بھی مجھے نادر شاہ سے بدلہ تو لینا تھا اپنے بھائی کے قتل کا بھی اور اپنا بھی۔ انور نے کہا ہے کہ وہ نورین کا پتا چلانے میں میری مدد کرے گا۔"

انور نے دروازے سے جھانک کے کہا۔ "میں آ سکتا ہوں، دخل در معقولات کرنے؟"

میں نے ہنس کے کہا۔ "ہم کوئی معقول بات نہیں کر رہے تھے۔"

وہ اندر آیا تو اس کی نظر ریشم پر جم گئی۔ "میں نے دیکھا تو تم اپنے کمرے میں نہیں تھیں۔ برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں چودھری صاحب؟"

"پہلی بات تو یہ کہ تم مجھے چودھری صاحب نہیں صرف انور صاحب کہہ سکتی ہو زیادہ سے زیادہ... ورنہ انور کافی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب... جب اور کوئی آپ سے یوں مخاطب نہیں ہو سکتا تو میری کیا اوقات ہے۔"

"دراصل ابھی تک میرا ذہن اس ماحول کا عادی نہیں ہوا۔ باہر ایسا ہی ہے۔ بیٹا، باپ کو نام سے مخاطب کرتا ہے۔ ماتحت اپنے باس کا نام لیتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ اس لباس میں تم بہت اچھی لگ رہی ہو تو برا مت ماننا۔ باہر لوگ شوہر کے سامنے بیوی کو اور باپ کے سامنے بیٹی کو کہتے ہیں کہ تم بہت حسین نظر آ رہی ہو تو خواتین خوش ہوتی ہیں اور نہ شوہر اسے برا سمجھتا ہے اور نہ باپ۔"

"لیکن اب تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ولایت نہیں پاکستان ہے۔" میں نے ریشم کو خفت سے بچایا جس کا رنگ انور کی بات پر لال ہو گیا تھا۔

"میں ذرا دیکھ لوں... کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کچھ سلونی کا ہاتھ بٹا دوں۔" ریشم نے کہا۔

"سلونی سے تمہاری اچھی گپ شپ ہو گئی ہے۔ وہ تعریف کر رہی تھی تمہاری۔" انور نے کہا۔

انور میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم نے دیکھا یہاں ٹیلنٹ کیسے ضائع ہو جاتا ہے۔ اب یہ لڑکی ریشم اس گاؤں میں نہ ہوتی، شہر میں ہوتی اور اسے اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا، صحیح ماحول میں اس کی حوصلہ افزائی ہوتی تو یہ بہت آگے جاتی۔ ہمت ہے اس میں... سلونی اگر باہر ہوتی تو تہلکہ مچا دیتی۔ ماڈلنگ میں... شوبز میں... پی آر میں۔"

میں نے کہا۔ "ماں جی نے یاد کیا تھا مجھے۔"

انور علی کو جیسے ایک دم بریک لگ گیا۔ "ماں جی نے... کب؟ کس نے بتایا؟"

"انہوں نے ریشم سے پوچھا تھا۔"

انور کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ملاؤ ہاتھ... کتنا صحیح تھا میرا اندازہ... تم وسیلہ بنو گے۔ اباجی نے بھی ٹھیک سوچا کہ جو کہنا ہے تم سے کہا جائے اور اماں سے کہلوایا۔ خود ان کے لیے انا کا مسئلہ تھا۔"

"میں چاہتا تھا کہ ابھی حاضر ہو جاؤں لیکن اب صبح ہی ملاقات ہوگی۔"

"ہاں، وہ لمبی نماز پڑھتی ہیں اور پھر درود و وظائف میں لگی رہتی ہیں۔ کل میں تمہیں لینڈ ریکارڈ دکھاؤں گا۔ میں نے پٹواری کو بلایا ہے۔"

میں نے ہاتھ جوڑے۔ "انور صاحب! مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔ میں کہاں سمجھ سکتا ہوں ان پٹواریوں کے بہی کھاتے؟"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "یہی تو میری مشکل ہے۔ میں سمجھا تھا تم سیانے بندے ہو۔ خیر، عملی صورت حال تو تمہاری سمجھ میں آ گئی ہے نا۔ اب تم ثالث کا کردار نبھا سکتے ہو۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ کسی اور کی نظر میں میری کیا اوقات ہے۔ مجھے کوئی ثالث کیوں بنائے گا؟"

"یہ تم دیکھو گے، چلو اب کھانا کھا لیں۔"

اگلے دن میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ریشم نے مجھے پھر بتایا۔ "چلو، تمہیں طلب کیا گیا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم سے کہا ہے انہوں نے؟"

"نہیں، ایک خادمہ ان کا پیغام لائی تھی۔"

میں اپنے کمرے سے نکل کے چودھری صاحب کے بیڈ روم تک گیا اور باہر موجود خادمہ سے کہلوایا کہ بڑی چودھرائن کو میرے آنے کی اطلاع کر دے۔ پھر میں اجازت کے انتظار میں کھڑا رہا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد میں نے خادمہ سے پوچھا کہ کیا چودھری صاحب اور بڑی چودھرائن مصروف ہیں؟ انہیں پھر یاد کرا دو۔

اس نے منہ بنا کے کہا۔ "نہیں جی، میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے گالیاں پڑیں گی۔ میں نے ایک بار بتا دیا۔"

مجھے یوں لگا جیسے انتظار میں کھڑا رکھنے کا مقصد محض میری تذلیل ہے اور مجھے اپنی اوقات یاد دلانا ہے۔ میں خادمہ سے یہ کہہ کر جانے ہی والا تھا کہ جب وہ بلائیں تو مجھے کمرے میں آ کے بتا دینا... کہ خادمہ کو اندر سے حکم ملا۔ "بھیج دو اسے۔" یہ چودھرائن کی آواز تھی۔

میں اندر گیا اور اخلاقاً دونوں کو سلام کیا۔ وہ بڑے طمطراق سے ایک صوفے پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کسی نے سر کی جنبش سے بھی میرے سلام کا جواب دینا گوارا نہیں کیا۔ بیٹھنے کے لیے کہنا تو دور کی بات ہے۔

"دیکھ... کیا نام ہے تیرا... سلیم..." چودھری صاحب نے بڑی رعونت سے کہا۔ "ہمیں نہیں معلوم کہ تو کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور تیرا کوئی گھر، خاندان ہے... ذات برادری ہے۔"

میں نے سمجھ لیا کہ اس جارحانہ آغاز کے بعد کوئی اچھی توقع رکھنا لاحاصل ہوگا۔ میں نے جواب میں کسی بدتمیزی یا بداخلاقی کا مظاہرہ کرنے سے گریز کیا۔ ان کے ہتک آمیز سلوک کا ایک جواب تو میں نے یوں دیا کہ تیسرے بڑے صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ پھر میں نے کہا۔ "آپ کے لیے یہ تمام معلومات حاصل کرنا کیوں اتنا ضروری ہو گیا ہے چودھری صاحب؟"

غصہ تو چودھری صاحب کی آنکھوں میں میرے بلا اجازت بیٹھ جانے پر ہی اتر آیا تھا۔ اب انہوں نے برہمی سے کہا۔ "ضروری اس لیے ہے کہ کوئی ایرا غیرا حویلی میں

مہمان نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے افسر ہی مہمان خانے میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ یہ جو تو حویلی کے اندر دندناتا پھر رہا ہے انور کی وجہ سے...."

میں نے ان کی بات نرمی سے کاٹ دی۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب انور کی وجہ سے ہے تو وہ آپ کا بیٹا ہے۔ اس سے جواب طلبی کریں۔"

چودھری گرجا۔ "بات سن میری۔ خبردار جو پھر بیچ میں بولا۔ یہ سب ہوا ہے تیری وجہ سے۔ آخر کیا سمجھتا ہے تو خود کو... تو کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ مجھے بلاوجہ الزام دے رہے ہیں۔ یہ آپ کے دو بیٹوں کی لڑائی ہے اور اس کے ذمے دار ہیں خود آپ۔ اگر آپ نے انصاف سے کام لیا ہوتا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"تو مجھے الزام دیتا ہے؟" چودھری دہاڑا۔

میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جواب دیا۔ "جی، ایک سال پہلے آپ نے ایک بیٹے کی بے جا حمایت کی تھی۔ کیا دوسرا سوتیلا تھا کہ آپ نے اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کو خاموشی سے برداشت کیا؟"

"مگر آج جو ہو رہا ہے... اس کا ذمے دار تو ہے۔ تیرا کیا تعلق تھا ان معاملات سے۔ تو نے حالات خراب کیے ہیں۔ تو نے گمراہ کیا ہے انور کو۔ اب وہ تیرے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔" چودھری غصے میں گرجتا رہا۔

"یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے صرف اپنی زندگی بچانے کے لیے قید سے رہائی حاصل کی تھی۔ یہ میرا حق تھا۔ میں کیا خاموشی سے آپ کی ناانصافی پر قربان ہو جاتا اگر میرے ساتھ انور کو بھی رہائی ملی تو کیا غلط ہوا؟ کیا میں اسے وہیں زنجیروں میں جکڑا ہوا چھوڑ کے نکل آتا؟ اب جو کچھ کر رہا ہے انور کر رہا ہے اور اپنی مرضی سے کر رہا ہے، میرے مشورے سے نہیں۔ جیسے اکبر سب کچھ اپنی مرضی سے کرتا تھا اور حقیقت یہ ہے چودھری صاحب کہ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ خدا سے زیادہ انصاف کرنے والا کون ہے۔ آخرت سے پہلے اسی دنیا میں انسان کو اس کی بداعمالی کی سزا مل جاتی ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا ایک دن۔"

"چپ کر وڈے مولوی کی اولاد... اپنا پتا ہے تجھے کہ تیرا باپ کون تھا اور تیری ماں کی بداعمالیاں کیا تھیں؟"

"آپ کی گالیوں سے مجھے فرق نہیں پڑتا... آپ تو سب کی ماں بہن ایک کرتے آئے ہیں۔ آپ میرے برابر کے ہوتے تو میں آپ کو صحیح جواب دیتا لیکن مجھے صرف آپ کی عمر کا لحاظ ہے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اچھی امید لے کر آیا تھا۔ اپنی بے عزتی کرانے نہیں۔"

"بے عزتی ان کی ہوتی ہے جن کی عزت ہو۔" چودھری چیخ کے بولا۔

اب چودھرائن نے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہر کے میری بات بھی سن لے۔ چودھری صاحب! آپ کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔ مجھے بات کرنے دیں اور یہ دوا کھا لیں۔" اس نے میز پر سے ایک شیشی اٹھا کے گولی نکالی اور پانی کے گلاس کے ساتھ چودھری کو دی۔

"اس سے کہو دفع ہو جائے یہاں سے۔" چودھری کی آواز بھی غصے سے کانپ رہی تھی اور اس کے جسم پر بھی رعشہ طاری تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ ابھی ٹل جاؤں۔ "ماں جی! میں پھر آجاؤں گا یا آپ آجائیں میرے کمرے میں اگر بات کرنا چاہیں۔"

چودھری کی حالت ایسی تھی کہ لگتا تھا اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ ایسا ہوتا تو عذاب خود بخود مجھ پر آتا۔ اس کے دہاڑنے کے باوجود اتنی ہمت پھر بھی کسی میں نہ تھی کہ اندر آکے اس کی ناراضی کا سبب پوچھتا۔ انور کا متعین کردہ محافظ دروازے پر بت بنا کھڑا تھا۔ باقی سب برآمدوں میں بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ صرف ریشم اپنے کمرے کے باہر پریشان کھڑی تھی۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ "کیا کہہ دیا تم نے ایسا چودھری سے؟"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں کہی لیکن وہ صرف کہنے کا عادی ہے... سننے کا نہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"سلیم! نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ یہاں کچھ اچھا ہونے والا نہیں ہے اور اچھا ہے کہ ہم اس سے پہلے ہی نکل جائیں۔ ہم کیوں بیٹھے ہیں آخر یہاں؟" وہ میرے کمرے کے دروازے پر رک گئی۔

"چاہتا تو میں بھی یہی تھا لیکن انور کے آگے میری ایک نہیں چلتی۔ آخر وہ ہے کہاں؟"

"مہمان خانے میں۔ سلونی بتا رہی تھی کہ پولیس کے کوئی اعلیٰ افسر آئے ہیں۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ "کس سلسلے میں؟"

"سلونی نے کہا کہ سب آتے رہتے ہیں۔ چودھریوں کے ملاقاتی ہیں۔ چودھری انور نے کہا تھا کہ فارغ ہو کے آپ بھی ادھر آجائیں۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں۔" میں نے کہا۔

"تم ڈرتے ہو؟"

"ہاں، میں ڈرتا ہوں۔ میں جیل سے فرار ہوا تھا اور ایسے چند مجرموں میں شامل تھا جو سزائے موت کے منتظر تھے۔ یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہوئی۔ ایسا سنگین واقعہ پہلے کسی جیل میں پیش نہیں آیا کہ ایک ساتھ اتنے قیدی جیل پر حملہ کر کے چھڑائے جائیں جو سب چور، ڈاکو اور قاتل ہوں۔ میں اخبارات دیکھتا رہا ہوں۔ ان میں سے آدھے مارے گئے تھے۔ بعد میں بہت سے پھر پکڑ لیے گئے۔ میرے جیسے شاید گنتی کے ہوں گے جو ابھی تک ہاتھ نہیں آئے۔ میری تصویریں اخبارات میں چھپی تھیں اور ہر تھانے میں موجود ہوں گی۔"

"ابھی تک کسی نے پہچانا نہیں تمہیں۔ پولیس بابا کے قتل کی تفتیش پر بھی آئی تھی اور یہاں کا تھانے دار بھی پرانا ہے۔"

"یہ غیر معروف جگہ ہے اور یہاں میری موجودگی کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے اس گاؤں کا رہنے والا تسلیم کرلیا گیا تھا اور تمہارا عزیز... جو سب کی موجودگی میں تمام معاملات سنبھالتا رہا۔ میری شناخت کا مسئلہ ہی نہیں اٹھا۔ نہ مجھ سے کسی نے پوچھا نہ کسی اور سے لیکن صرف میں کسی کے سامنے جاؤں تو ہوسکتا ہے اسے شک پڑ جائے۔ مجھے خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ انور نے مجھے زبردستی روک لیا ہے ایک مہینے کے لیے۔"

"آج تم میرے ساتھ چلوگے نا... میرے گھر۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ایسا کیا کام ہے ریشم جو ضروری ہے؟"

"بابا کے چہلم کے بعد میں چاہتی ہوں کہ اس گھر کو اور اپنی زمین کو بیچ دوں۔ آخر کیا کروں گی میں تمہارے جانے کے بعد۔ میں وہاں رہ سکتی ہوں اور نہ زمین کی دیکھ بھال کرسکتی ہوں۔ کوئی قبضہ کرلے گا اس پر... شامو نہ سہی کوئی اور سہی... انور نے کہا ہے کہ سودا میری مرضی کے مطابق کرادے گا۔"

ریشم نے پہلی بار چودھری انور علی کا نام اتنی بے تکلفی سے صرف انور لیا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "گویا یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے تم نے؟"

"اور میں کیا کروں؟ انور نے مجھے یقین دلایا ہے۔"

"اور خود انور نہ رہا... پھر؟ کیا کروگی تم... کہاں جاؤگی؟"

وہ تنک کر بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو... کیوں نہیں رہے گا انور؟"

"جیسے اکبر نہیں رہا۔ اسے کیا اندازہ ہوگا یا کبھی سوچا ہوگا اس نے کہ ایک دن وہ بھائی کی جگہ زنجیروں میں جکڑا پڑا ہوگا۔ اس کے حمایتی دوست اور جاں نثار بھی ہوں گے۔ ایک اس کی خاطر مارا گیا۔ دوسرا حمایتی کوئی سازش کرسکتا ہے جو کامیاب ہو جائے۔ اکبر دوبارہ بھی آسکتا ہے۔"

"تم کیوں ڈراتے ہو مجھے؟ خود میں ہمت ہے نہیں مجھے ساتھ لے جانے کی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"بات ہمت کی نہیں... جس کا اپنا کوئی ٹھکانا آسرا نہ ہو، وہ کسی اور کی کیا ذمے داری لے گا۔"

"آخر نورین کی ذمے داری بھی تو قبول کی تھی تم نے؟"

میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اپنی مرضی سے نہیں... وہ خود میری طرح فرار ہوئی تھی۔ قتل اس نے نہیں کیا تھا مگر الزام اسی پر تھا۔ تمہیں آخر کیا ضرورت ہے میرے ساتھ دربدر ہونے کی۔ میں تو مطمئن تھا کہ تمہاری شادی اکبر سے ہو جائے گی تو کچھ دن بعد تم سب بھول جاؤگی۔ حویلی کے اندر تمہیں خطرہ کوئی نہیں ہوگا۔"

"تم بہت بے وقوف ہو سلیم! تم نے یقین کرلیا تھا کہ وہ سچ مچ میری محبت میں مبتلا ہے اور مجھے شادی کے بعد وہی حیثیت مل جائے گی جو پہلی بیوی کو حاصل ہے؟ ایسی شادیاں اس کے لیے کھیل ہیں۔ میرا انجام سلونی جیسا ہوتا۔ وہ ایک میراثی کی بیٹی ہے۔ میں ایک مزارع کی بیٹی ہوں۔ کم ذات اور کم حیثیت۔ بڑے چودھری نے شادی نہیں کی تھی سلونی سے... یہ خاندان میرے جیسی کم ذات کو قبول کرتا؟"

ایک خادمہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ "جناب! آپ کو چھوٹی چودھرائن نے بلایا ہے، اپنے کمرے میں۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی سماعت پر شک ہوا۔ "تمہارا مطلب ہے بڑی چودھرائن نے؟"

خادمہ جاتے جاتے پلٹی۔ "نہیں جناب! چھوٹی چودھرائن نے۔"

میں تذبذب میں گرفتار ہوگیا۔ ابھی میں چودھری صاحب کی ذات والا صفات کی خوش کلامی سے لطف اندوز ہو کے آیا تھا۔ کیا اب چھوٹی سرکار کے دربار میں مزید ذلت کا انعام وصول کرنے جاؤں؟ وہ شاید اپنے مجازی خدا کی معزولی پر جتنی چراغ پا ہوگی، اس سے زیادہ اپنے جیتے جی بیوہ ہو جانے کے خیال پر دکھی ہوگی اور میں اپنی صفائی میں جو بھی کہوں گا، رائگاں جائے گا۔ یہاں صرف مجھے تمام خرابی

کا براہ راست ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ نہ میں اسے رہا کرتا نہ یہ مسائل کھڑے ہوتے۔ اور اس سے پہلے کی بات کی جائے تو نہ میں ریشم کے ساتھ یہاں قدم رنجہ فرماتا، نہ اس سے پہلے اس ندی میں گرتا۔ اور آخری بات یہ کہ نہ میں پیدا ہوتا، نہ انہیں یہ دن دیکھنا پڑتا۔

میرے تذبذب کو دیکھتے ہوئے ریشم نے مجھے مشورہ دیا۔ ''چھوڑو، اس کا حکم ماننا ضروری تو نہیں تمہارے لیے اور ملے گا بھی کیا سوائے مزید ذلت کے۔ وہ تو ایک زخمی ناگن بنی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بات تمہاری بھی غلط نہیں لیکن انور نے کہا تھا کہ تم ثالث کا کردار ادا کر سکتے ہو۔ معاملات کو سلجھانے کے لیے تمہیں استعمال کیا جائے گا۔''

''بڑی امیدیں لے کر گئے تھے نا چودھری صاحب کے پاس... کیا ہوا؟''

''اگر یہاں بھی وہی رویہ سامنے آیا تو میں الٹے پاؤں لوٹ آؤں گا لیکن جانا تو چاہیے مجھے۔''

''تمہاری مرضی، میں نے تو دیکھا ہے کہ ساس تیر ہے تو بہو تلوار۔''

چھوٹی چودھرائن کے دروازے پر دستک کے ساتھ ہی اس کی آواز سنائی دی۔ ''آجاؤ۔''

اس کے بیڈ روم کا نقشہ بھی مختلف نہیں تھا۔ ایک بھاری بھرکم نقشیں بیڈ اور ویسے ہی صوفے۔ وہ افسردہ مگر بڑی تمکنت کے ساتھ کمرے کے وسط میں ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ شاید مجھے ریسیو کرنے سے پہلے اس نے لباس بھی بدلا تھا اور بال بھی بنائے تھے۔ سفید ریشمی شلوار کے ساتھ وہ سیاہ لمبی قمیص میں تھی اور سفید دوپٹا اس کے ایک شانے پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے تیور جارحانہ نہیں ہیں۔ وہ ایک خوب صورت، دراز قد، باوقار عورت تھی۔

''میرا خیال تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔'' اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود میرے مقابل بیٹھ گئی۔

اس کے پُرسکون رویّے اور لہجے کو دیکھتے ہوئے میں بیٹھ گیا۔ ''ایسا کیوں سوچا تھا آپ نے؟''

''مجھے اندازہ ہے کہ چاچا نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں سن رہی تھی۔''

''اگر یہاں بھی میرا ویسا ہی استقبال ہوتا تو میں دروازے سے لوٹ جاتا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''چاچا کا ایسا ہی مزاج رہا ہے۔ اب کچھ صدمہ ہے، کچھ بلڈ پریشر... ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ میں ابھی انجکشن لگا کے آئی ہوں۔''

''آپ ڈاکٹر بھی ہیں؟''

''یہ سب کرنا میری ذمے داری بن گیا تو میں نے سیکھا۔ میرے والد مختلف مزاج کے آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ سسرال میں جا کے بھومت بن جانا... بچی بچی ہی رہنا۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے انور نے بھی بتایا تھا کہ دونوں بھائی مزاج میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔''

''جیسے یہ دونوں بھائی۔'' وہ بولی۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ ''اور یہ دونوں کے بڑوں کی تربیت کا فرق ہے یا فطرت کا... لیکن نظر آتا ہے۔''

''میں چائے پینے جا رہی تھی۔ تم بھی پی لو۔'' چائے کے برتن پہلے سے درمیان کی میز پر موجود تھے۔ وہ چائے بنانے لگی۔

''بڑے چودھری صاحب بلاوجہ مجھ سے بدگمان ہیں کہ یہاں جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار میں ہوں۔''

''مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم کون ہو اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا کیوں ہوا۔'' اس نے چائے میرے سامنے رکھی۔ ''لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ اب انور علی تم پر بہت زیادہ اعتماد کرتا ہے کیونکہ وہ تمہیں اپنا محسن سمجھتا ہے۔''

''نہ میں یہاں اپنی مرضی سے آیا تھا اور نہ اب اپنی خوشی سے قیام کر رہا ہوں۔ انور نے مجھے روک لیا ہے۔''

''کس لیے؟'' وہ مجھ پر نظر جما کے بولی۔

میں نے پہلو بدل کے کہا۔ ''تاکہ میں حالات پر قابو پانے اور بہتر بنانے میں اس کی مدد کروں۔''

''اگر تم نے یہ ذمے داری قبول کر لی ہے تو اس کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟''

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک ذہین عورت تھی۔ ''یہ میں قبل از وقت بتا نہیں سکتا لیکن اس کوشش میں انور کا ساتھ میں ضرور دوں گا۔''

''میرا بھی خیال ہے کہ تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''انور برا آدمی نہیں ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے اس لیے مہذب اور فراخ دل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام خرابی کے ذمے دار بڑے چودھری صاحب ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو اس مسئلے کو ایسے حل کر سکتے تھے کہ کسی کے ساتھ ظلم یا ناانصافی نہ ہوتی۔ وہ مزاج اور فطرت میں آتش فشاں ہیں اور اپنے آگے کسی کی نہیں سنتے اور شاید ان کی بیگم بڑی

چودھرائن بہت کمزور ہیں۔''

''یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارے گھروں میں سارے فیصلے مرد کرتے ہیں۔ عورت کی حیثیت صفر ہے لیکن انہوں نے تو بڑے بھائی کو صاف جواب دے دیا کہ آپ اپنے معاملات سے غرض رکھیں۔ وہ خاموش ہو گئے۔''

''ان کا مشورہ کیا تھا؟''

''انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ اصغر، جو کرو اصول اور انصاف کے مطابق کرو۔''

''ساری خرابی اسی لیے ہوئی۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے لیکن میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انور کی نیت نیک ہے۔ وہ کسی کا برا نہیں چاہتا اور کسی کا دشمن نہیں ہے۔ میں بڑی چودھرائن کو بھی یہی اطمینان دلانے گیا تھا لیکن وہاں سامنا ہو گیا بڑے چودھری صاحب سے... آپ بھی خاطر جمع رکھیں۔ بالآخر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کے چہرے کی افسردگی پر اطمینان کی چمک آ گئی۔ ''کیا واقعی ایسا ہو گا؟''

''انور چاہتا ہے اس لیے میں بھی کوشش کر سکتا ہوں۔ بس کوئی رخنہ اندازی نہ ہو اور دشمنی میں کوئی اسے نقصان نہ پہنچائے۔ جیسے کہ کل اسے قتل کرنے کی کوشش ضرور کی گئی تھی۔ کچھ وقت لگے گا مسئلے کا ایسا حل نکالنے میں جو سب کو قبول ہو۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ''اور تم سمجھتے ہو کہ ایسا ہو سکتا ہے تو پھر یہاں سے جانے کی بات کیوں کرتے ہو؟''

میں نے پہلو بدل کے کہا۔ ''میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔''

''کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے... بچے ہیں؟''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''مجبوری سے یہ مطلب نہیں تھا میرا۔''

''اگر تمہارے بیوی بچے ہوتے... تو شاید تم میری مجبوری بہتر طور پر سمجھ سکتے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں کھل کے تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی اور کسی قسم کی یقین دہانی بھی نہیں کرا سکتی۔ بڑی چودھرائن مجھ سے بھی زیادہ کمزور اور بے بس ہیں۔''

''مجھے اندازہ ہو گیا ہے مشکلات کا۔''

''ویسے تو میرے ابا بڑے ہیں لیکن ان کی چلتی نہیں۔ وہ چلانا جانتے ہی نہیں اور چاہتے بھی نہیں۔ وہ قناعت پسند اور صابر و شاکر آدمی ہیں۔ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں مگر ان کا اخلاق اور کردار اس کے برعکس ہے جو چھوٹے بھائی کا ہے۔ میں نے اسکول میں تو نہیں پڑھا لیکن خود انہوں نے مجھے اور میری بہن کو بہت کچھ پڑھایا ہے۔ اس میں ادب آداب اور تمیز تہذیب پر زیادہ زور تھا۔ پہلے میں صدمے اور غصے میں زیادہ بول گئی تھی۔ ورنہ بڑوں کے سامنے زبان کھولنا مجھے نہیں سکھایا گیا۔ میں ابا سے بات بھی نہیں کر سکتی کہ میرے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کچھ نہیں کریں گے۔ سوائے صبر کی تلقین کے اور دعا کے... لیکن میری ایک اور بھی مجبوری ہے۔ کیا تمہیں انور نے میری بہن کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟''

''بتایا ہے... لیکن یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ میرے کہنے کو کچھ نہیں۔ میں کمرے سے نکل آیا۔

حویلی کے صحن میں سلونی اور ریشم بڑے دوستانہ انداز میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہی تھیں۔ صحن تقریباً سو فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا جس کے چاروں طرف برآمدے تھے اور برآمدوں میں سارے بیڈ رومز کے دروازے کھلتے تھے۔ سامنے کا حصہ مہمان خانہ تھا اور سب سے پیچھے والا نوکروں کی رہائش، کچن اور اسٹور پر مشتمل تھا۔ درمیانی حصے کے وسط میں ایک گول تالاب میں فوارہ لگا ہوا تھا لیکن پانی نہ ہونے کی وجہ سے وہ چلتا نہیں تھا۔ فوارے سے سیمنٹ کے تین فٹ چوڑے راستے چاروں برآمدوں تک جاتے تھے۔ اس طرح صحن چار حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ہر حصے میں سرسبز ہموار تراشی ہوئی گھاس تھی۔

سلونی کے ریشم سے اچھے دوستانہ مراسم ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ دونوں جوان تھیں، بااخلاق تھیں اور اس خاندان میں شامل نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ سب کا رویہ وہی تھا جو ملازموں کے ساتھ تھا لیکن وہ گھر کے کام کاج کرنے والے نوکر اور ذاتی خادمہ کی حیثیت سے بالاتر تھیں۔ سلونی یہاں کے ماحول کو سمجھتی تھی اور حویلی میں رہنے والوں کے مزاج کو بھی۔ ریشم انہیں صرف حویلی کے حاکموں کی حیثیت سے جانتی تھی اور مہمان خصوصی کا درجہ پانے کے باوجود خود کو تنہا اور اجنبی سمجھنے پر مجبور تھی۔ سلونی کی کمپنی اس کی تنہائی اور بیزاری کا علاج ہو سکتی تھی۔ وہ سلونی سے زندگی کا سلیقہ بھی سیکھ سکتی تھی جس میں ذاتی رکھ رکھاؤ سے دوسروں کے ساتھ باوقار رویہ اختیار کرنے تک بہت کچھ شامل تھا۔ لباس اور میک اپ کہاں، کس وقت کیسا ہونا چاہیے اور مرتبہ، موقع محل اور ضرورت کو سمجھ کے کس سے کیا بات کرنی چاہیے اور کیا

نہیں، یہ ریشم کو سلونی کی صحبت اور تربیت ہی سکھا سکتی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ ریشم میں سیکھنے کی صلاحیت ہے۔

سلونی نے مجھے دیکھا تو ریشم کا ہاتھ چھوڑ کے میری طرف آئی۔ ''سر! چودھری انور علی نے آپ کو مہمان خانے میں بلایا ہے۔''

میں رک گیا۔ ''مہمان خانے میں؟ تم نے بتایا تھا کہ شاید کوئی پولیس افسر آئے ہیں۔''

''جی سر! مجھے انہوں نے یہی بتایا تھا۔''

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ چاروں صوبوں میں سیکڑوں چھوٹے بڑے پولیس افسر ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹرانسفر ہوتے رہتے ہیں۔ میرے کیس کا تعلق سکھر سے تھا جو سندھ پولیس کا علاقہ اور ان کے دائرۂ اختیار میں آتا تھا لیکن مفرور مجرمان کے معاملے میں چاروں صوبائی پولیس کے محکموں کے درمیان تعاون ہر سطح پر ہوتا تھا اور کسی مفرور مجرم کی تلاش یا گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم دوسرے صوبے میں جاتی تھی تو اسے تمام وسائل دستیاب رہتے تھے۔ میرا معاملہ چاروں صوبوں کے لیے سنگین اور اہم تھا اور سب کے پاس مفرور مجرموں کے بارے میں مفصل معلومات کا ہونا یقینی تھا۔ اس میں تصویر کے ساتھ فنگر پرنٹس بھی ہوں گے تاکہ حلیہ بدل کے پھرنے والے کی شناخت کو یقینی بنایا جاسکے۔ کیا ایسی صورت میں مجھے کسی سینئر پولیس افسر کے سامنے جانے کا خطرہ مول لینا چاہیے؟ بے شک یہ معاملہ پرانا ہو گیا تھا اور کسی حد تک سرد خانے میں پہنچ چکا تھا لیکن ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

ابھی میں شش و پنج میں تھا کہ مہمان خانے سے انور برآمد ہوا۔ اس نے مجھے دور سے دیکھ کر ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ انور بے وقوف نہیں تھا۔ اسے میری ساری ہسٹری معلوم تھی اور اس کے باوجود اس نے مجھے کسی سینئر پولیس افسر سے ملانے کے لیے بلایا تھا تو اسے یقین ہوگا کہ اس میں میرے لیے رسک کی کوئی بات نہیں ہے۔ انور دوبارہ اندر چلا گیا تھا اور اب میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں اس کی مان لوں یا کمرے میں جا کے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے لیٹ جاؤں۔ پھر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا اور پورے اعتماد کے ساتھ مہمان خانے میں داخل ہو گیا۔ میرا موجودہ حلیہ اور نام مفرور فریدالدین سے مختلف تھا۔ میری صحت بہت بہتر تھی۔ میرے چہرے پر وہ داڑھی تھی جو بالوں کے خط سے رخساروں پر اور ٹھوڑی کے گرد نفاست سے تراشی ہوئی آدھے انچ کے بالوں کی سیاہی نظر آتی تھی اور فیشن کے ایک اسٹائل کا نمونہ تھی۔ میں نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی بدل دیا تھا۔ پہلے بال چھوٹے تھے جن کو میں درمیان کے دو حصوں میں بناتا تھا۔ جیل میں قیام کے دوران ایک بار مجھے گنجا کرا دیا گیا تھا۔ جیل حکام کے مطابق ان کے پاس ہر قیدی کے ہیئر اسٹائل کا نخرا اٹھانے کی گنجائش نہ تھی۔ اس کے بعد سے جب تک میں جیل میں رہا، میرے سر پر ایک ایک انچ سے زیادہ لمبے بال نہیں تھے۔ اب میرے بال پیچھے کی طرف بنے ہوئے تھے اور لمبائی میں شرٹ کے کالر سے بھی آگے تک پشت کی طرف جاتے تھے۔

وہ ایک وسیع کمرا تھا جس میں ایک طرف کھڑکی کے ساتھ ڈبل بیڈ لگا ہوا تھا اور پھر ایک غالیچہ بچھا ہوا تھا جس پر سرہانے کی طرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی اور دوسری طرف ٹیبل پر چودہ انچ کا ٹی وی رکھ دیا گیا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر دوسرا غالیچہ تھا۔ اس پر ایک صوفہ سیٹ تھا۔ دو سنگل صوفے آمنے سامنے تھے۔ بڑا صوفہ دیوار کے ساتھ اور ان کے درمیان شیشے کی گول سینٹر ٹیبل پر چائے کے خالی برتن رکھے ہوئے تھے۔ ایک صوفے پر چالیس پینتالیس سال کا ادھیڑ عمر شخص بڑی فراغت سے نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔ سانولے رنگ کے اس دراز قامت پولیس افسر کا جسم فربہی مائل تھا مگر روایتی انداز میں اس کی توند نکلی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے سامنے والے صوفے پر براجمان ہونے سے پہلے اس سے ہاتھ ملایا۔

انور علی نے کہا۔ ''یار! یہ ہیں ہمارے پرانے مہربان ڈی آئی جی ملک احسان اللہ... پہلے یہاں ڈی ایس پی اور ایس پی بھی رہ چکے ہیں۔ آج کل ہیں کراچی میں... فیملی ساہیوال میں ہے اور جناب! یہ ہمارے خاص دوست ملک سلیم اختر... آپ کی ملک برادری کا رشتہ ہر جگہ نکل آتا ہے۔''

کراچی کے نام پر میرا دل کم سے کم ایک بار دھڑکنا بھول گیا تھا مگر میں نے ظاہر کچھ نہیں ہونے دیا۔ ''چھٹی پر آئے ہیں ملک صاحب یا ڈیوٹی ہے؟''

وہ کچھ مسکرایا۔ ''دونوں ہی باتیں ہیں۔ گھر بھی آنا تھا... ڈیوٹی نکال لی۔ کوشش کروں گا ادھر پنجاب میں ہی پوسٹنگ ہو جائے تو واپس نہ جانا پڑے۔''

میں نے کہا۔ ''کراچی مشکل جگہ ہے۔''

''سوچنگے ہیں جی... کام کرنے والا بندہ کیا کرے۔ چودھری صاحب! یہ آپ کے دوست کیا کرتے ہیں؟''

''زیادہ وقت تو میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کی زمین بھی ہے ادھر... ہائی وے ڈپارٹمنٹ میں سپلائی کے ٹھیکے ہیں اس لیے لاہور آنا جانا رہتا ہے۔ ریلوے ہیڈ کوارٹر سے بھی بات چل رہی ہے ٹرین میں ایک کنٹریکٹ کی۔''

ڈی آئی جی کی نظر جیسے مجھ پر جم کے رہ گئی تھی۔ ''گھر ادھر ہی ہے؟''

''ہاں جی، بچے لاہور میں ہیں۔ ماں باپ تھے ادھر... والد کا ابھی کچھ عرصہ پہلے انتقال ہوا ہے۔''

''دراصل ان کی صورت کسی اور سے ملتی ہے۔'' اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''کس سے... کسی ڈاکو سے یا فراڈیے سے؟'' انور علی ہنس پڑا۔ میں نے چہرے پر ایک پُرسکون مسکراہٹ رکھی۔

ڈی آئی جی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی کچھ عرصے پہلے ایک بڑی واردات ہوئی تھی سکھر میں۔ آپ نے سنا ضرور ہوگا۔ کچھ ڈاکوؤں نے جیل پر حملہ کیا تھا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑا کے لے گئے تھے۔ ان میں گینگ لیڈر غلام محمد بھی تھا جو رستم ڈاکو کے نام سے مشہور تھا۔ گامار رستم بھی کہلاتا تھا۔''

انور علی نے سادگی سے کہا۔ ''یہاں اخبار تو آتے نہیں اور ٹی وی پر خبر چلی ہوگی ایک دو دن تو میں نے دیکھی نہیں۔''

ملک احسان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جیل بریکنگ کی یہ سب سے بڑی واردات تھی۔ ڈاکوؤں کے ساتھ بہت سے قیدی بھی نکل گئے۔ ریکارڈ کے مطابق اٹھہتر... ان میں سزائے موت پانے والے بھی تھے۔''

''کمال ہے، جیل کا حفاظتی عملہ کیا مجرا دیکھنے گیا ہوا تھا؟'' انور بولا۔

''فرار ہونے والوں میں سے آدھے کے قریب تو مارے گئے تھے محافظوں کی فائرنگ سے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ صبح آس پاس سے ان کی لاشیں اٹھالی گئیں جو بتیس تھیں۔ بائیس بعد میں پکڑے گئے۔ کچھ شہر میں اور کچھ فرار ہونے کی کوشش میں بس کے اڈوں سے اور ریلوے اسٹیشن سے۔ بیس ابھی تک غائب ہیں۔''

''کیا میرے دوست کی صورت بھی کسی مفرور مجرم سے ملتی ہے؟''

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''اسی شکل و صورت کا تھا ایک بندہ فریدالدین۔''

''ڈاکو تھا وہ بھی؟''

ملک احسان بولا۔ ''نہیں، اس کا تعلق نادر شاہ کے گروہ سے تھا۔ انڈر گراؤنڈ مافیا کا بندہ ہے۔ ڈرگ کے علاوہ بردہ فروشی میں ملوث ہے۔ فلپائن، سری لنکا اور بنگلہ دیش سے لڑکیاں لاتا ہے۔ لیکن یہ بندہ فریدالدین ایک مرڈر کیس میں سزا یافتہ تھا۔ اس کی سزائے موت کی اپیل ہائی کورٹ سے تو نامنظور ہو گئی تھی اور سپریم کورٹ میں وہ گیا نہیں تھا۔ اپیل کی میعاد ہوتی ہے۔ وہ گزر چکی تھی۔ رحم کی اپیل کرتا تو وہ مسترد ہی ہونی تھی۔''

''میں نے تو سنا ہے ایسی سیکڑوں اپیلیں رکی ہوئی ہیں۔''

''ابھی تک سزائے موت پانے والے سات مفرور ہیں۔ دو کے بارے میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ فوت ہو گئے۔ ہم نے ان کے گاؤں اور عزیزوں سے معلوم کیا تھا کہ قبر کہاں ہے۔ شاید کورٹ سے حکم مل جائے کہ تصدیق کے لیے قبر کھود دو۔''

''چلو جی، آپ کا سر درد تو نہیں ہے نا؟'' انور علی نے کہا۔

''کدھر اپنے چودھری انور صاحب۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اتنی آسانی سے ہماری جان کہاں چھوٹتی ہے۔ اب ادھر کا راؤنڈ اسی بہانے بنا لیا تھا میں نے۔ رپورٹ تو مجھے مل جائے گی ہر ایس پی سے اور میں نے اکٹھی کر کے واپس جا کے آئی جی صاحب کو دے دینی ہے کہ سارا پنجاب چھان مارا۔''

انور ہنسنے لگا۔ ''دن رات ایک کر دیا۔ صحت خراب ہو گئی۔ بیوی ناراض ہو گئی کہ میرے لیے کوئی ٹائم نہیں۔''

میں بھی ہنسا لیکن اندر سے میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے کیونکہ ڈی آئی جی نے اپنے سوٹ کیس میں سے کوئی فائل نکال لی تھی اور مسکراتا ہوا واپس آرہا تھا۔ یقیناً اس میں تاحال مفرور مجرموں کی تفصیلات تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ انور علی کی بات سے اس کا شک دور ہوا تھا یا نہیں۔ وہ پرانا پاپی تھا اور مجرموں کے سامنے اپنے چہرے کے تاثرات سے دل کی بات کا اظہار نہیں ہونے دیتا تھا۔ واپس اپنی جگہ بیٹھ کے اس نے ایک جگہ سے فائل کھولی اور انور کو دے دی۔ ''یہ آپ خود دیکھ لو۔''

انور نے فائل لی اور پھر میری طرف دیکھا۔ ''واقعی ملک صاحب... کچھ تھوڑی بہت شکل ملتی ہے تیری سلیم! روپوش ہو جا خیریت چاہتا ہے تو۔''

اس نے فائل میری طرف بڑھا دی تو میں نے خود اپنی سرکاری ریکارڈ کی تصویر ملاحظہ کی۔ اس میں کچھ

فوٹوگرافر کے اینگل کی وجہ سے اور کچھ دو سال گزر جانے کے باعث بھی اپنی تصویریں میں کم عمر اور کمزور سا لگتا تھا۔ میرے بال بھی درمیان سے بنے ہوئے تھے۔ ''سچ کہتا ہے تو انور! تیرے پاس ہے کوئی جادو کی ٹوپی؟''

انور نے سرسری انداز میں کہا۔ ''فرق تو کافی ہے لیکن شک ہوسکتا ہے ایک نظر میں... جب میں فلورنس میں تھا تو ایک ایسا واقعہ میرے ساتھ ہوگیا تھا۔ ایک اٹالین خاتون اچانک چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی اور سب کے سامنے مجھے چومنا شروع کردیا۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ایسے ہمارے نصیب کہاں... تھی کیسی وہ؟ جوان تھی کہ بڑھیا؟''

''او یار تھی تو اٹالین بیوٹی اور عمر ہوگی یہی مجھ سے دو چار سال کم... مگر سارا مزہ کرکرا ہوگیا جب لوگ جمع ہوئے۔ میں انگلش اور جو تھوڑی بہت فرنچ آتی تھی، اس میں پوچھ رہا تھا کہ کیا بات ہے خاتون! لیکن زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم... والا معاملہ تھا۔ ایک ٹیکسی والا گزرا تو اس نے میری فریاد و فغاں سنی اور رک کے مجھے بتایا کہ وہ مجھے اپنا بچپن کا گمشدہ بھائی سمجھ رہی ہے اور پیارے بھائی پیارے بھائی کی گردان کررہی ہے۔ لوگ ہنسنے لگے اور خاتون یہ جان کر سخت شرمندہ ہوئی۔ شرم سے نہیں... غلط فہمی کے باعث میری تکلیف سے... تکلیف تو بعد میں ہوئی تھی جب پتا چلا تھا کہ وہ بھائی کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے تو بڑا مزہ آرہا تھا۔ یوں پھر کبھی کوئی بھی نہیں چمٹی۔''

میں جان گیا تھا کہ انور علی نے بڑی ذہانت سے ڈی آئی جی کے دماغ سے شک کا سایہ دور کرنے کے لیے ایک من گھڑت واقعہ سنا دیا تھا۔ اس سے پہلے ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر اس نے میرا تعارف بڑے پراعتماد حوالوں کے ساتھ کرایا تھا جو اس کے دماغ نے ایجاد کیے تھے۔ میں نے سرسری نظر سے اپنے بارے میں وہ سب پڑھا جو جھوٹ تھا مگر سچ بنا دیا گیا تھا اور فائل ڈی آئی جی کی طرف بڑھا دی۔

انور نے کہا۔ ''ملک صاحب! ذرا تسلی سے آتے آپ... بھابی کو اور بچوں کو بھی ایک بار شکار انجوائے کرنے دیں۔''

وہ ہنسا۔ ''آپ ابھی بیوی والے نہیں ہو چودھری صاحب! یہ جو بڑی شوقین نظر آنے والی ہرنی جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں نا، یہ شادی کے دس سال بعد کیا چیز بن جاتی ہیں۔ اس کا بس چلے تو میرے شوق پر بھی پابندی لگا دے۔ پہلے ایک دو بار میں نے کہا کہ چلو تم بھی دیکھو شکار کیا ہوتا ہے تو کہنے لگی کہ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا کہ رات کو جنگلوں میں پھروں معصوم بے زبانوں کی جان لینے کے لیے... ہزار بلائیں رات کو چمٹ جاتی ہیں۔''

''آپ نے کہا نہیں کہ ایسا تو گھر میں بھی ہوتا ہے۔'' انور بولا۔

میں اور ملک احسان ایک ساتھ ہنسے۔ وہ بولا۔ ''سچ اگلوا... لیتے ہیں ہم مگر بیوی کے سامنے سچ بولنے کی ہمت کہاں ہے۔''

''تو چلے گا سلیم رات کو؟'' انور نے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یار! میں کافی حد تک بھابی کا ہم خیال ہوں۔ خواب میں ہی مار لوں گا بکری یا شیر... جو ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے نظر آئے۔''

''وہ تو کہتی ہے کہ مجھے سب ایک سا لگتا ہے۔ گوشت ہرن کا ہو یا بکرے کا۔ خرگوش روسٹ کیا ہو یا چکن روسٹ... حد ہے۔''

ایک خادم بروقت کھانے کی ٹرے کے ساتھ اندر آگیا۔ اس کے پیچھے دوسرا خادم دوسری ٹرے کے ساتھ آیا اور انہوں نے درمیان کی میز پر کھانے کے برتن لگانے شروع کیے۔ سابق افسر مہمان داری سلونی نے پھر چارج لے لیا تھا۔ اس کا اندازہ کھانے کی ورائٹی اور معیار دونوں سے ہوتا تھا۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ انور نے اپنے بھائی اکبر کی غیر موجودگی کی کیا وضاحت کی ہے۔ ملک احسان بڑے چودھری کے زمانے سے آتا رہا تھا جب وہ ڈی ایس پی تھا اور پھر ایس پی ہوگیا تھا۔ بڑے چودھری صاحب کی عدم موجودگی کا سبب اس نے علالت بتایا۔ کچھ عمر کا تقاضا تھا۔ کچھ جوانی سے اب تک کی بے اعتدالی کہ جب دل کا دورہ پڑا تو معلوم ہوا بائی پاس کے بغیر گزارہ نہیں۔ اس کے بعد سے سب شوق چھوڑ دیے۔ آج کل عمرے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ ملک احسان بھی بظاہر فریدالدین کا کیس بھول چکا تھا۔ میں نے اسے گورنمنٹ کالج سے ایم اے کرنے کے دوران اچانک کینسر کی طرح ہوجانے والے عشق کے بارے میں بتایا۔

انور نے کہا۔ ''یہ بھی بتا دے کہ انجام کیا ہوا؟''

''انجام وہی جو ہوتا آیا ہے... عشق کی موت۔ شادی ہوگئی اس سے۔''

انور نے عاشقی اور کثرتِ اولاد پر ایک شعر پڑھ دیا۔

''عاشقی قیدِ شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوہ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے''

میں نے کہا۔ ''مجنوں کا انجام بھی یہی ہوتا۔ لیلیٰ سے کتنی محبت ہے اس کا اندازہ لوگ بچے گن کر کرتے۔''

ان کا پروگرام رات کو نکلنے کا تھا۔ میں نے ملک احسان سے پھر معذرت کی کہ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکوں گا اور واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ ایک سویا ہوا خوف میرے اندر اچانک بیدار ہوگیا تھا اور کوئی آوازِ غیب مجھے خبردار کرنے لگی تھی کہ مجھے یہاں سے نکل جانے کی جو مہلت ملی ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤں ورنہ یہ گھاگ شکاری کسی وارننگ کے بغیر مجھے گرفتار کرکے اپنی پروموشن کے لیے ایک پوائنٹ اسکور کرے گا۔ انور علی سے اس کی دوستی کی بنیاد خلوص پر نہیں باہمی مفادات پر رہی ہے اور اس میں غرض مندی چودھری انور کی فیملی کی زیادہ رہی ہے۔ اب وہ ایسی پوزیشن میں ہے کہ ان وڈیروں، جاگیرداروں کی گڈول ملک احسان کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ انور کا کوئی لحاظ کرے گا تو صرف اتنا کہ اسے ایک مجرم کو پناہ دینے اور غلط بیانی سے قانون کو گمراہ کرنے کے جرم میں ملوث نہیں کرے گا کہ جائیے چودھری صاحب... اس کیس میں ہم آپ کا نام نہیں ڈالتے ورنہ جرم آپ کا سنگین ہے۔

چودھری انور میرے کمرے میں آیا تو میں دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے بیڈ پر نیم دراز تھا اور چھت پر اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھنے کی ناکام کوشش کررہا تھا جیسے دست شناس ہاتھ کی لکیروں میں پڑھتے ہیں۔

''یار! تو اپ سیٹ ہے؟'' انور نے میرے پاس بیٹھ کر بے تکلفی سے کہا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ ''کیا مجھے ہونا نہیں چاہیے؟ یہ بات ہی ایسی ہے پھر بھی تھینک یو۔ تم نے مجھے شک و شبہے سے بچائے رکھنے کی بڑی اچھی کوشش کی مگر کوشش کامیاب رہی یا نہیں، اس کا پتا ابھی نہیں چل سکتا۔''

''پتا چل جائے گا۔ ملک احسان کے دل سے شک کا کانٹا نکلا نہیں ہوگا تو رات بھر میں کوئی بات ضرور کرے گا۔''

''اور کوئی بات کیے بغیر اس نے شک دور کرنے کے لیے مجھے اٹھوا دیا پھر... چودھری صاحب کی بات سچ ثابت ہوئی تو سوری کہنا کیا مشکل ہے۔''

''نہیں دوست! ایسا نہ ہوا کبھی اور نہ ہوگا میرے دوست... مہمان اور گھر کے بندے پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے کوئی سوچنے کا تکلف بھی نہ کرے، اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں ہم۔ یہ بات سب سمجھتے ہیں۔''

''پھر کیا میں اس وقت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں؟ وہ اخلاقاً تجھ سے پوچھنے کے بعد کیا خاموشی سے لوٹ جائے گا اگر تُو نے اجازت نہ دی؟''

''ایسا ہونے سے بہت پہلے میں تجھے خبردار کردوں گا۔ وہی تو وقت ہوگا کہ میں تیرے احسان کا بدلہ چکا سکوں۔ تُو نے زندگی بچائی ہے میری۔ قرض ہمیشہ رہے گا مجھ پر۔'' وہ بولا۔

''تُو جذباتی مت ہو۔ تجھے پریکٹیکل رہنا چاہیے۔''

''جذبات کے بغیر کیا انسان مکمل ہوتا ہے؟ اپنے سارے علم اور اشرف المخلوقات ہونے کے دعووں کے باوجود... کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنی ماں کو قتل ہوتا دیکھ کر چپ رہ سکتا ہے کہ بڑھیا کی زندگی کے اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔''

ظاہر ہے اس کے بعد میرے لیے کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ میں نے خود کو نوشتۂ تقدیر پر راضی کرلیا تھا۔ ''تم کتنے دن باہر رہو گے؟''

''بس آج رات اور کل کا دن۔ اگر مجھے ذرا بھی اندیشہ محسوس ہوا تو میں ایک بندے کو خاموشی سے روانہ کردوں گا۔ میرے ساتھ چار نوکر جائیں گے۔ اسے شک بھی نہیں ہوسکتا کہ میں نے تجھے فرار کرا دیا ہے۔ میں سلونی کو بھی لے جاؤں گا۔ رنگیلا تجھے بالکل محفوظ مقام پر پہنچا دے گا۔''

''اور تُو نے جو جھوٹ بولا اس کا کیا ہوگا؟''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ جھوٹ ہم سے زیادہ وہ بولتا ہوگا۔ ہم ضرورت کے تحت بولتے ہیں، یہ لوگ عادت کے مطابق۔ میرے خلاف وہ کیا کرسکتا ہے۔ اسے بھی معلوم ہے کہ لاحاصل الزام سے خفت بھی وہی اٹھائے گا اور شاید پریشانی بھی۔''

''اچھا یار! جیسا تیرا حکم۔ اب دوستی یک طرفہ تو نہیں ہوسکتی۔''

وہ مطمئن ہوکر مسکرایا۔ ''تیری آج میٹنگ تھی، کیسی رہی؟''

''سلونی نے کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔ ''سب نے ساری کارروائی براہِ راست سنی تھی۔''

''میں ایوانِ صدر میں پیشی کی بات کررہا تھا۔ پرائم منسٹر صاحبہ نے بھی تو طلب کیا تھا۔''

''وہ خلافِ امید اچھی رہی۔ تیری بھابی کے بارے میں میری رائے کچھ اور تھی۔ اب میرا خیال ہے کہ وہ صورتِ حال کی بہتری میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔'' میں نے کہا اور اسے گفتگو کا خلاصہ بتا دیا۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا یار۔ بس خطرہ ہے ابا جی کی طرف سے... محسوس ہوتا ہے کہ وہ قانونی جنگ پر نہ اتر آئیں۔''

''وہ کیا کرسکتے ہیں؟''

''دیکھ نا' مالک تو وہی ہیں۔ عملاً ان کا اختیار اور کنٹرول ایک سال سے نہیں تھا۔ وہ ملک کے آئینی صدر کی طرح تھے کہ تمام انتظامی معاملات اکبر کے ہاتھ میں تھے۔ سب سے وہی نمٹتا تھا۔ جہاں دستخط کرنے ہوتے تھے، وہ کر دیتے تھے لیکن معاملے کو سمجھ کر اور کاغذات پڑھ کر۔ اکبر نے کوشش ضرور کی ہوگی کہ پاور آف اٹارنی اسے مل جائے لیکن ابا جی نے دی نہیں۔ ابھی تک زمین، جائداد کی ملکیت کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا۔ سب کچھ ویسے ہی چل رہا ہے جیسے ابا جی چلاتے تھے۔ لاقانونیت میں ان کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں تھا۔ مزارعوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی میں اکبر انہی کی پالیسی پر گامزن تھا بلکہ شاید کچھ آگے ہی تھا۔ ابا جی کو مجھ سے اصل خطرہ یہی محسوس ہوا تھا کہ میں مزارعوں میں بے اطمینانی پھیلا دوں گا۔ وہ باغی اور سرکش ہوجائیں گے، اپنا حق مانگنے کھڑے ہوجائیں گے۔ ابھی تو انہیں حقِ محنت نہ دو، ان سے بیگار لو، ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرو... ان کے گھر کی عورت کی عزت کو مالِ غنیمت کی طرح سمجھو۔ مجھے معلوم ہے کہ ان بے چاروں کے ساتھ کیا ہوتا آیا ہے۔ وہ کہیں فریاد ہی نہیں کرسکتے۔ قانون ان کی حفاظت کے لیے نہیں، ان کا حق اور ان کی آواز دبانے کے لیے ہے۔ ابھی میں نے ریکارڈ نہیں دیکھا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ کتنی زمینوں پر ہمارا قبضہ غیر قانونی تھا جس میں پٹواری اور پولیس نے ہمارا ساتھ دیا۔ میں آدھی جاگیر پر زبردستی اپنا حق حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ سب اکبر کے نام کر دیتے، تب میں کسی عدالت میں نہیں جاسکتا تھا لیکن میں ظلم، ناانصافی اور لاقانونیت کے خلاف تھا اور ان کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر دیتا۔ ابا جی نے اس کی باتوں میں آکے بڑی غلطی کی۔ ایسے مجھے کب تک رکھا جاسکتا تھا۔ یہ حبسِ بے جا کا معاملہ تھا۔ اکبر نے کہا کہ کچھ عرصے میں اس کا دماغ درست ہوجائے گا۔ درحقیقت اس کا پلان یہ تھا کہ کچھ عرصے میں اس خطرے کا وجود ہی نہیں رہے گا۔''

''اور اب ابا جی کیا کرسکتے ہیں، خطرے پر قابو پانے کے لیے؟''

''یہی مشکل فیصلہ ہے۔ میرے خلاف ابھی قانونی چارہ جوئی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اگر اکبر کے حبسِ بے جا کا مسئلہ اٹھائیں تو پہلے خود اس کی جواب دہی کریں۔ پہلے تو مقدمہ میری طرف سے ان پر بنتا ہے۔ وہ ثابت نہ ہو تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ خطرہ وہی ہے کہ اکبر غائب نہ ہوجائے۔ اس کے لاپتا ہونے کی رپورٹ درج کروائی جاسکتی ہے مگر اس سے فائدہ نہیں ہوگا بلکہ خطرہ اکبر کے لیے بڑھ جائے گا۔ ان کے دماغ کا کمپیوٹر پرانا ہے مگر کارکردگی میں ٹھیک ہے۔ وہ کام کر رہا ہوگا۔ صورتِ حال جوں کی توں ہی رہی تو ان کے اعصاب پر خطرہ سوار رہے گا۔ فوری حل کوئی نہیں... اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے میں، ماں، بھابی اور تایا جی ایک مفاہمت کا محفوظ راستہ نکال سکتے ہیں اور وہ مجبور ہوسکتے ہیں کہ اسے قبول کریں۔ اب میں تیاری کروں، باقی معاملات پر واپس آنے کے بعد بات کریں گے۔''

میرا خیال تھا کہ چودھرائن مجھ سے بات کرنا چاہیں گی۔ بڑے چودھری صاحب سے میری بات چیت کے دوران وہ خاموش رہی تھیں۔ چودھری صاحب کا خیال تھا کہ تمام معاملات میری مداخلت کی وجہ سے خراب ہوئے لیکن ان کی بہو کا خیال تھا کہ ان حالات کو ٹھیک کرنے میں میرا کردار معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ شاید ایک ماں کی حیثیت سے ان کی سوچ کچھ اور ہو۔ چودھری صاحب کے رویّے نے معاملات کو مزید خراب کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی بیگم نے محسوس کیا ہو کہ انہیں مختلف حکمتِ عملی اپنا کے دیکھنا چاہیے۔ خود بڑے چودھری صاحب کو اپنی اپروچ غلط ہونے کا احساس ہوا ہوگا تو وہ بھی مجھے دوبارہ بلا کے سوری کبھی نہیں کہیں گے۔ وہ بیوی کو استعمال کریں گے کہ تم بات کرکے دیکھو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بہو نے ساس سے وہ گفتگو شیئر کی ہو جو میرے اور اس کے درمیان ہوئی تھی اور یہ امید ظاہر کی ہو کہ مجھے باعزت طور پر مفاہمت اور ثالثی کی ذمے داری دی جائے تو نتائج خاطر خواہ برآمد ہوں گے۔ ریشم نے تو کہا تھا کہ ساس تیر ہے تو بہو تلوار ممکن ہے ان کے آپس کے رشتے میں جذبات ایسے ہی ہوں جو بالکل فطری بات تھی لیکن یہ معاملہ باہمی مفاد کا تھا۔ اب شام ہونے کو آئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ بڑی چودھرائن سے میری توقعات بے بنیاد تھیں۔ وہ بھی شوہر کے ساتھ اسی جیسی ہوگئی تھیں یا شوہر

صاحب کی مرضی کے خلاف ان میں کوئی قدم اٹھانے کی ہمت ہی نہ ہو۔

شام کی چائے میرے لیے خود ریشم لے کر آئی تو اس نے مجھے خبر دی کہ بڑے چودھری صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

''سلونی نے، وہ ڈاکٹر کی سنتے ہیں نہ کسی اور کی۔ پہلے ایک بار اسپتال میں رہے تھے تو ٹیسٹ ہوئے تھے اور رپورٹیں ان کے دل کی حالت خراب بتاتی تھیں مگر احتیاط اور علاج نہ وہ کرتے ہیں اور نہ ان سے کروایا جاسکتا ہے۔''

''بلڈ پریشر کی گولی تو انہیں میرے سامنے دی گئی تھی اور انہوں نے کھالی تھی۔''

''اسے وہ سر درد کی گولی کی طرح استعمال کرتے ہیں جب ضرورت پڑی کھالی اور پھر چھوڑ دی حالانکہ وہ بڑی باقاعدگی سے روز کھانے کی ہوتی ہے۔ ابھی ڈاکٹر آنے والا ہے، دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔''

''ڈاکٹر کہاں سے آئے گا... لاہور سے؟''

''ہاں، رنگیلا لے کر آئے گا۔ ان کا کوئی فیملی ڈاکٹر ہے۔ ان کی مرضی کے مطابق علاج کرتا ہے اس لیے چل رہا ہے۔ ورنہ صحیح بات کہنے والے کو فارغ کر دیا جاتا ہے، نااہل قرار دے کر۔''

صورتِ حال گمبھیر ہوگئی۔ میں نے رنگیلا کی ٹیکسی کو اندر آتا دیکھا۔ اس میں سے ایک کارٹون ٹائپ ڈاکٹر اترا اور چودھری صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اتنا کوتاہ قامت اور موٹا تھا کہ چلتے وقت لڑھکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ پھر مہمان خانے کی طرف سے انور نمودار ہوا اور اندر چلا گیا۔ ہم برآمدے میں بیٹھ کے چائے پی رہے تھے اس لیے سب ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سلونی کمرے میں سے باہر آئی تو میں نے اسے اشارے سے بلا لیا۔ وہ کچھ پریشان سی تھی۔ ''بڑے چودھری کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ انہیں اسپتال لے جانا ہے۔''

''کون سے اسپتال...''

''لاہور میں ہے پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی... لیکن بڑے چودھری صاحب مانیں جب... وہ بضد ہیں کہ جو اسپتال کے کمرے میں ہوگا، وہ یہاں کرو۔ دوا، انجکشن، آکسیجن اور دوسری ہر مشین یہاں لگاؤ... ای سی جی اور مانیٹر وغیرہ... جیسے ایمبولینس میں ہوتا ہے۔''

''کیا بچکانا ضد ہے۔ طبیعت زیادہ خراب ہوگئی پھر؟'' ریشم نے کہا۔ ''انور سمجھائے۔''

سلونی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''انور سے تو وہ بات کرنے کے روادار نہیں۔ اس کی بات کا جواب بھی بیوی کو دیتے ہیں۔ مجھ سے پہلے ہی خفا تھے۔ یہ ڈاکٹر جو آیا ہے، ان کے حکم کا غلام ہے۔ کوئی کیا کرے... زبردستی کون کرسکتا ہے۔''

''انور کو جانا تھا شکار کے لیے... ملک احسان کے ساتھ۔''

''ایسی صورتِ حال میں کیسے جاسکتے ہیں وہ...'' وہ مہمان خانے کی طرف چلی گئی۔

ریشم اور میں خاموشی سے چائے پیتے رہے اور منتظر رہے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ انور کچھ دیر بعد میری طرف آیا تو خاصا اپ سیٹ تھا۔ ''یار! ابا جی کی طبیعت بہت بگڑ گئی ہے۔''

''سلونی بتا رہی تھی کہ وہ اسپتال جانے پر راضی نہیں۔''

''یہی تو مشکل ہے۔ مجھ سے براہِ راست تو نہیں کہا ماں جی سے کہہ رہے تھے کہ ایسے میں مرنے والا نہیں تھا لیکن مجھے پتا ہے کون مجھے مارنا چاہتا ہے۔ یہاں نہ مرا تو اسپتال میں لے جا کے مار دے گا۔ پھر اسے آزادی ہوگی من مانی کرنے کی۔ ان کا دماغ بھی الٹا سوچ رہا ہے۔ یہ اسی ذہنی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ پتا ہے وہ کیا سمجھ رہے ہیں؟ یہ کہ میں نے اکبر کو مار کے ٹھکانے لگا دیا ہے۔''

''یہ شک کیوں ہوگیا اچانک؟'' میں نے کہا۔

''اچانک نہیں، پولیس کو خود انہوں نے بلایا تھا۔ یہ ایس ایچ او بڑا احرام زادہ ہے۔ ان کی غلامی کرتا رہا ہے۔ جب سے یہاں آیا ہے بہت پیسا کھینچا ہے ان کے غیر قانونی کام کرکے۔ اب دیکھا کہ ان کی چلنے والی نہیں ہے تو فوراً وفاداری بدل کے میرے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتا چل پڑا ہے۔ ابا جی نے اس سے کہا تھا کہ اس بڑے بھائی نے چھوٹے کو قید کر رکھا ہے۔ زنجیروں میں باندھ کے ڈالا ہوا ہے تہ خانے میں... اسے وہ خود لے کر گئے تھے نیچے مگر نیچے کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ تھانے دار نے کہہ دیا کہ بڑے چودھری صاحب! آپ بھی کہانیاں بناتے رہتے ہو لیکن ہمارا وقت ضائع ہوتا ہے۔ بس آپ دنیا داری چھوڑ دو... اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔ حج نہیں تو عمرہ ہی کر آؤ۔ بس

اسے وہ گالیاں دیں کہ اور کوئی نہ سنتا۔ اس کے بعد تھانے دار کے سامنے مجھے گالیاں دیں کہ تو نے بھائی کو مار کے کہیں گاڑ دیا ہے... میں تیرے خلاف قتل کا پرچہ کٹواؤں گا۔ تھانے دار نے مجھ سے کہا کہ بڑے چودھری صاحب کا دماغ چل گیا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو یا سیانے کو دکھاؤ۔“

”پھر اب کیا کرو گے تم... میری مانو تو زبردستی اسپتال لے جاؤ۔“

”زبردستی؟“ وہ تلخی سے مسکرایا۔ ”ناممکن... وہ پاگلوں کی طرح مزاحمت کریں گے اور خدانخواستہ انہیں کچھ ہوگیا تو الزام مجھ پر آئے گا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ ماں نے ابھی کہا ہے کہ میں اکبر کو لاؤں... وہ راضی کرلے گا۔ ایمبولینس آرہی ہے۔“

”کیا یہ ناممکن ہے... تم سب کو ہٹادو پھر اسے حفاظتی پہرے میں لے آؤ۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو یار! وہ موقع سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ مجھے سپورٹ نہیں کرے گا۔ الٹا اباجی کو ورغلائے گا کہ میری بات مان کے خطرہ مول نہ لیں۔ میں نے ڈاکٹر کے ساتھ مل کے انہیں مارنے کی سازش کرلی ہوگی۔ اکبر کو دوبارہ قابو کرنا واقعی ناممکن ہوجائے گا۔ سارا معاملہ الٹا ہوجائے گا۔ ابھی ملک احسان بھی موجود ہے۔ اس سے میں نے کیا کہا تھا۔ سب جھوٹ بن جائے گا۔ جو تیرے بارے میں کہا وہ بھی... میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔ میں نے ماں کو انکار کردیا ہے۔“

انور شدید ٹینشن میں تھا جو ایک فطری بات تھی۔ ایک طرف باپ اس کی بات نہیں مان رہا تھا، دوسری طرف وہ ماں کی بات مان کے بنا بنایا کھیل بگاڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ دونوں طرف سے زیرِ عتاب تھا۔ ادھر ایک مہمان کے ساتھ بنایا ہوا پروگرام ان حالات میں قابلِ عمل نہیں رہا تھا۔ وہ شاید یہی بتانے مہمان خانے کی طرف گیا تھا۔ گھر کے نوکر چاکر بھی خاموش اور سہمے ہوئے سے تھے کیونکہ خبر چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔ نہ میں اس پوزیشن میں تھا کہ بڑے چودھری کے کمرے میں جا کے اظہارِ ہمدردی ہی کرسکوں، نہ ریشم میں اتنی ہمت تھی۔ دس منٹ بعد سلونی پھر اندر گئی اور پھر چھوٹی چودھرائن...

”خدانخواستہ بڑے چودھری کو کچھ ہوگیا تو...“ ریشم نے اپنا سوال ادھورا چھوڑا۔

”وقت آگیا ہوگا تو اسے کون ٹال سکتا ہے۔ خرابی بہت ہوگی۔ انور مجبور ہوجائے گا کہ اکبر کو سامنے لائے اور پھر سب کی باتیں بھی سنے۔ اس کے لیے اکبر کو باپ کے سوگ میں شریک نہ ہونے دینا عملاً ناممکن ہوگا۔ ماں سینہ کوبی کرکے اسے بددعائیں دے گی۔ اکبر جنازے میں شریک ہوگا تو سب کے سامنے آجائے گا۔ سوئم تک لوگ اس سے بھی تعزیت کریں گے اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے وہ خود کو محفوظ کرلے گا۔ انور کے لیے دوبارہ اسے قابو کرنا اور صورتِ حال کو پہلے جیسا کرنا بالکل ناممکن ہوگا۔ الٹا خود اس کے لیے زیرِ دام آنے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔“

”یہ بھی سوچو کہ پھر ہمارا کیا ہوگا؟ انور نے جو عزت کا مقام دے رکھا ہے...“

”سارا کھیل ہی الٹ جائے گا ریشم... یہ فکر تو سلونی کو بھی ہوگی۔“

”کیوں نہ ہم پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔“

”اور نکل کے کہاں جائیں؟“ میں نے کہا۔

”کل میں اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ وہ ایک جگہ تو ہے نا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں، تمہارے لیے ہے مگر میں وہاں تمہارے ساتھ تو نہیں رہ سکتا... اور خود تم اکیلی کب تک رہو گی؟“

”کل تم ہی تو وہاں جانے کی بات کررہے تھے۔ اگر خیریت رہی تو واپس آجائیں گے۔“

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو اٹھو، ایک گھنٹے میں معلوم ہوجائے گا۔“

ہم سب کی نظر بچا کے نکل آئے۔ اس وقت رات اپنا سیاہ دامن پھیلانے لگی تھی۔ جہاں ہم بیٹھے تھے، وہ جگہ مہمان خانے اور باہر جانے والے راستے کے قریب تھی۔ کسی نے بھی ہمیں نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سوائے گیٹ پر کھڑے گارڈ کے... ہم ٹہلنے کے انداز میں چلتے گئے۔ کچھ دور آ کے ہم نے رخ بدلا اور ایک مسجد کے پیچھے سے نکل کے ریشم کے گھر کی طرف ہوگئے جو وہاں سے بمشکل دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ وہ گھر ویران پڑا تھا۔ ریشم اس جگہ کو دیکھ کے روئی جہاں اس نے اپنے باپ کی لاش کو لہولہان پڑا دیکھا تھا۔ پھر اپنے سامان میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ میں نے موقع پا کے اپنا سارا سرمایہ اکٹھا کیا۔ یہ اب بھی نو لاکھ سے اوپر نقد رقم تھی اور میرے اندازے کے مطابق نورین کا زیور اتنی ہی مالیت کا ضرور تھا۔ ریشم نے ایک لالٹین روشن کردی تھی جس کی مدھم روشنی میں ہمارے دیوار پر متحرک سائے کبھی بڑھ جاتے تھے اور پھر سمٹ جاتے تھے۔ خلاف

توقع ریشم نے دس منٹ بعد ہی مجھے ایک تھیلا تھمادیا۔ ”یہ ساتھ لے جانا ہے۔“

”کیا ہے اس میں؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ زمین کے کاغذ ہیں... اور میرا تھوڑا سا زیور... مجھے ڈر لگ رہا ہے سلیم... چلو...“

ماحول کا آسیب زدہ محسوس ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اس کی اصل وجہ وہ خوف تھا جو ہم دونوں کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سوال میرے لیے بھی اہمیت اختیار کرگیا تھا کہ بڑے چودھری کے انتقال کی صورت میں کیا میرا یہاں مزید قیام عقل مندی ہوگا؟ میرا فوراً بھاگ جانا بھی شکوک پیدا کرسکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال مجھے پریشان کرتا تھا کہ میں ریشم کو اپنے ساتھ کہاں لے جاؤں گا؟ اسے ساتھ لے کر نہ جانا بھی مشکل ہوتا۔

ریشم نے چلتے چلتے کہا۔ ”خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہوگی تو پتا چل جائے گا... پھر کیا کریں گے ہم؟“

”دیکھو، اس کے بعد میرا یہاں قیام ناممکن ہوجائے گا۔ انور بعد میں اپنے معاملات سے جیسے چاہے نمٹے...“

”لیکن تم اسے بتائے بغیر تو نہیں جاؤ گے... اور بتاؤ گے تو کیا وہ جانے دے گا؟“

”مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ یہاں انور تمہاری حفاظت تو کر ہی سکتا ہے۔“

”وہ مجھے اور تمہیں سلونی کے ساتھ بھی تو بھیج سکتا ہے۔ رنگیلا موجود ہے یہاں... دو دن کہاں رہے تھے تم؟“

ڈوبتے کو جیسے تنکے کا سہارا مل گیا۔ میں نے کہا۔ ”میری ساری پریشانی دور کردی تم نے... واقعی... سلونی خود بھی تو جائے گی۔ ہم اس کے ساتھ جاسکتے ہیں۔“

حویلی کے دروازے پر پہنچنے تک میرے کانوں نے اندر سے کسی قسم کی آہ و بکا نہیں سنی۔ اس سے میرا اضطراب کچھ کم ہوا۔ چودھری صاحب گزر گئے ہوتے تو حویلی میں چیخ و پکار مچی ہوتی۔ گیٹ پر کاہلی سے کھڑے بندوق بردار نے ہمیں پھر سلام کیا۔ بظاہر کسی نے بھی ہماری پون گھنٹے کی غیر حاضری کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ سب بڑے چودھری کے کمرے میں تھے۔ میرا کمرا بائیں ہاتھ پر مڑتے ہی دوسرا تھا۔ برآمدے میں لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹ جلا کے وہ بیگ بھی بیڈ کے نیچے ڈال دیا جو میرے ہاتھ میں تھا اور ریشم کا دیا ہوا بھی... پھر وہ ”میں دیکھ کے آتی ہوں“ کہہ کے باہر نکل گئی۔ اب میں نے غور کیا تو مجھے رنگیلا کی ٹیکسی بھی دکھائی نہ دی۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا تھا کہ ڈاکٹر اپنی تسلی کرکے رخصت ہوگیا یا پھر وہ موجود ہے اور اس نے رنگیلا کو ایمرجنسی میں استعمال ہونے والی کوئی دوا یا انجکشن لینے شہر بھیجا ہے جو وہ بیگ میں اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔

کرسی پر بیٹھ کے میں نے ایک جگ سے پانی کا گلاس بھرا ہی تھا کہ انور نمودار ہوا۔ ”یار! تم کہاں چلے گئے تھے؟“

میں نے کہا۔ ”ریشم کو اپنے گھر سے کچھ لانا تھا، کل بھی کہا تھا اس نے۔“

”ایسی کیا ضروری چیز تھی؟“ وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اب اس کا چہرہ پہلے سے کم تناؤ کا شکار تھا۔

”میں نے پوچھا نہیں۔ غالباً زیورات تھے اس کے... وہاں چوری ہونے کا ڈر ہوگا۔ تم اباجی کی بتاؤ۔“

”بس یار! ابھی خطرہ ٹل گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر کی رائے ہے۔ جو دوائیں وہ احتیاطاً رکھ لایا تھا ان سے کام چل گیا۔ ان سے طبیعت سنبھل گئی ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ٹھیک ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ ان کا علاج دل کے اسپتال میں ہی ہوگا۔ یہاں کیسے پتا چل سکتا ہے کہ اندر کی حالت کیا ہے۔ میری باتوں سے کچھ حوصلہ ملا اسے... اس نے کہا کہ میں انکار بھی نہیں کرسکتا آنے سے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ معاملہ میرے بس کا نہیں کیونکہ میں میڈیکل اسپیشلسٹ ہوں، کارڈیالوجسٹ نہیں... میری بات نہ اکبر صاحب سمجھے تھے اور نہ بڑی چودھرائن... سال بھر میں حالت پہلے سے زیادہ خراب ہی ہوئی ہے کیونکہ نہ علاج ریگولر ہے اور نہ پرہیز... آپ اگر منوا سکتے ہیں اپنی بات تو ان کو اسپتال شفٹ کردیں۔ ابھی کنڈیشن اسٹیبل ہوگئی ہے لیکن اگلے چوبیس گھنٹے انہیں آبزرویشن میں رکھنا ضروری ہے۔“

”پھر... کیا سوچا تم نے؟“

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میرے اختیار کی بات بھی نہیں۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا کہ یہ بتاؤ یہاں ان کے کمرے کو اگر آئی سی یو جیسا بنانا ہو تو کیا یہ ممکن ہے؟ اس نے کہا کہ ایکوپمنٹ اور انسٹرومنٹس آپ کو مل جائیں گے بازار سے اور یہاں لگ بھی جائیں گے۔ مثلاً آکسیجن دینے کا سامان، الیکٹرانک مانیٹر... لاہور بڑا شہر ہے۔ دن بھر میں آپ ضرورت کی ہر چیز تلاش کرکے لاسکتے ہیں سوائے شاید وینٹی لیٹر کے... مگر لاکھوں خرچ ہوں

گے۔ میں نے کہا کہ اس کی فکر مت کرو۔ یہ ذمے داری تم لو گے؟ اس نے کہا کہ میں انکار نہیں کرسکتا لیکن پھر مسئلہ ہوگا ٹرینڈ نرس کا جو چوبیں گھنٹے رہے۔ میں نے کہا کہ دگنی چوگنی تنخواہ پر تو آئے گی... ایک مہینے کے ایک لاکھ لے کر تو ملے گی۔ وہ بولا کہ ہاں پیسے سے کیا نہیں ملتا مگر کارڈیالوجسٹ کہاں سے آئے گا؟ سب اسپتالوں میں ہیں... پھر خود ہی سوچ کے بولا کہ ایک بڈھا ہے... خود بھی دل کا مریض ہے۔ اب تو ریٹائر ہو چکا ہے اور اکیلا ہے۔ بیوی مرگئی، بچے باہر چلے گئے۔ شاید وہ آجائے... آپ خود بات کر کے دیکھ لیں۔ میں نے کہا کہ بس ٹھیک ہے، کل میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں ابا جی کو اسپتال نہیں لے جاسکتا مگر اسپتال کو یہاں لاسکتا ہوں۔ یہ ان کی ضد کا توڑ بھی ہے اور میری نیک نیتی کا امتحان بھی... ایسا ہوگیا تو شاید میرے بارے میں ان کی رائے بدل جائے۔ ابا جی کی اور ماں کی۔ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اکبر یہ نہ کرسکتا تھا اور نہ کرتا۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہاری کوشش یا جدوجہد میں تمہارے ساتھ ہوں... تم ضرور کامیاب ہوجاؤ گے۔"

"بس یار! اتنی مہلت مل جائے مجھے... ناممکن کچھ نہیں سمجھتا میں بشرطیکہ نیت ہو اور وسائل ہوں۔ میں نے ملک احسان کو بھی سب بتایا اور اخلاقاً معذرت کی کہ اس کا پروگرام خراب ہوا تو وہ کہنے لگا کہ چودھری صاحب مجھے شرمندہ نہ کرو... یہ بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ بس آپ دعا کریں یار زندہ صحبت باقی... وہ صبح چلا جائے گا مگر اس نے کہا ہے کہ جہاں ضرورت محسوس ہو میری، مجھے فون کردینا۔ تین نمبر دیے ہیں اس نے مجھے... اس نے صاف کہا کہ بعض اوقات سفارش سے بھی کام ہوتا ہے یا جلدی ہوجاتا ہے۔"

"تم اس ڈاکٹر کو روک لیتے رات بھر کے لیے۔"

"میں نے کہا تھا لیکن اس کا ایک ذاتی مسئلہ تھا۔ اس کی بیوی گھر میں اکیلی ہے۔ بچے نہیں ہیں اس کے۔ اور بیوی دمے کی مریضہ ہے۔ اسے جب دورہ پڑ جائے رات کو تو سنبھالنے والا اور کوئی نہیں۔ دن میں ملازمہ ہوتی ہے جو پرانی ہے اور تجربہ کار ہوگئی ہے۔ اس نے اطمینان تو دلایا ہے مجھے... اب دیکھو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ذرا چکر لگا لوں۔"

"تم نے ماں کو بتایا کہ کل تم کیا کرنا چاہتے ہو اور ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟"

"ہاں، ان کے اعتماد اور حمایت کے لیے یہ ضروری تھا۔ وہ کچھ مطمئن اور پُرسکون ہوئی ہیں۔ بھابی کچھ خفا اور مایوس ہیں کہ ایسی حالت میں بھی میں نے بھائی کو رعایت نہیں دی۔ وہ بھی ٹھیک ہوجائیں گی۔ بس تھوڑی سی مہلت مل جائے مجھے۔"

رات کے کھانے پر مجھے ملک احسان اور انور کا ساتھ دینا پڑا۔ مجھے ڈر تھا کہ انور خود تو ابا جی کی تیمارداری میں لگا رہے گا اور مجھے مہمان کو کمپنی دینے کا فرض سونپ دے گا۔ اپنے تمام ظاہری اطمینان کے باوجود اندر سے میں خوف کا شکار تھا۔ انور میرے بارے میں سوچے سمجھے بغیر پورے اعتماد سے جھوٹ بولتا رہا تھا۔ اس کا مقصد مجھے فول پروف کور دینا تھا اور شاید وہ اس میں کامیاب بھی رہا تھا۔ میں مقامی رہائشی اور انور کا پرانا دوست تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ دورانِ گفتگو ڈی آئی جی صاحب میرے ماضی کو کریدیں۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے یا محض گپ شپ کے لیے... مجھ سے نادانستہ غلطی ہوجائے۔ میں کوئی ایسی بات کہہ دوں جو حقائق کے خلاف ہو۔ ملک احسان تو اس فیملی اور یہاں کے معاملات کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔

پھر کھانے کے دوران ہی ایک ایسی بات ہوگئی کہ میرے لیے ظاہری سکون برقرار رکھنا بھی آزمائش بن گیا۔ معلوم نہیں وہ کس کا فون تھا۔ مہمان خانے کا فون نمبر الگ تھا۔ ایک ملازم نے ملک احسان کو کارڈلیس فون کا ریسیور لا کے دیا۔ "سر! آپ کے لیے۔"

اس نے ریسیور لے لیا۔ "گھر سے کال ہوگی۔" وہ بولا۔ "اور کسی کو تو پتا ہی نہیں کہ میں یہاں ہوں۔"

انور نے ملازم کو ڈانٹا۔ "کہہ نہیں سکتے تھے کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں۔"

"کہا تھا جنابِ عالی... انہوں نے کہا کہ بکواس مت کرو۔ معاملہ اہم ہے۔ فون انہیں دو۔" ملازم سہم کر بولا۔

ملک احسان نے کہا۔ "کون؟ ہاں ملک احسان ڈی آئی جی بول رہا ہوں میں... تم کون ہو... ہاں میں اسی معاملے میں تفتیش کرنے آیا ہوں۔" وہ کھانا چھوڑ کے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میرے دل میں کھدبد شروع ہوچکی تھی۔ معاملہ ایک ہی تھا جس کی تفتیش کے بہانے ملک احسان کراچی سے لاہور آگیا تھا۔ کام کے بعد اس کا ارادہ چھٹی لینے اور اس دوران اپنی پوسٹنگ پنجاب میں کرانے کا تھا۔ یہ وہ بتا چکا تھا۔ انور نے کہا۔ "تم نے کیوں ہاتھ روک دیا؟ کھانا جاری رکھو... ملک احسان آجائے گا۔"

میں نے بات بنائی۔ "بس ایسے ہی اخلاقاً۔"

ہم دونوں نے کھانا ختم کرلیا مگر ملک احسان کی بات ختم نہیں ہوئی۔ وہ تقریباً دس منٹ کے بعد آیا اور سوری کہہ کے پھر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ انور نے کہا۔ "کھانا ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ گرم منگواتے ہیں۔"

"نہیں، ٹھیک ہے۔ وہ بات ہی ایسی تھی کہ مجھے سننے کے لیے جانا پڑا۔" وہ بولا تو اس کے لہجے میں کچھ تشویش تھی۔

"خیریت تو ہے نا ملک صاحب! خدانخواستہ گھر میں... سب ٹھیک ہے؟"

وہ مسکرایا۔ "نہیں چودھری انور... میں سمجھا تھا فون گھر سے آیا ہوگا لیکن اس نے فون نمبر گھر سے لیا تھا، میری بیوی سے... وہ تم سے ذکر کیا تھا نا میں نے کہ سکھر جیل سے جو لوگ فرار ہوئے تھے ان میں ایک فریدالدین تھا۔"

انور نے صرف سر ہلایا مگر میرے دل کی دھڑکن جیسے بند ہوگئی۔ ایک دم مجھ پر اندیشوں کی یلغار ہوگئی۔

ملک احسان نے کہا۔ "وہ فریدالدین کسی عورت کے ساتھ تھا۔ سکھر کی ایک عورت تھی نورین۔ پتا نہیں فرید کا اس سے کیا رشتہ اور تعلق تھا۔ اسی رات وہ اپنے گھر سے فرار ہوئی، دولہا کو قتل کر کے... اسی روز شادی ہوئی تھی اس کی... چچا کے گھر سے کیونکہ باپ فوت ہوچکا تھا۔"

"یہ تو بڑی سنسنی خیز لو اسٹوری ہے۔" انور نے کہا۔

میں نے سرسری انداز میں اپنا تبصرہ شامل کیا۔ "یہ کچھ عجیب بات نہیں ہے؟ کیا اس عورت کو... کیا نام بتایا اس کا... نور جہاں؟"

"نورین... چوبیس سال کی لڑکی ہے۔"

"کیا وہ بھی ان ڈاکوؤں کی ساتھی تھی جنہوں نے جیل پر حملہ کیا؟"

ملک احسان نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "یہ آپ نے کیسے فرض کرلیا؟"

"پھر اسے کیسے معلوم تھا کہ آج رات اس کا عاشق فریدالدین جیل سے نکل آئے گا... عین اس کی شادی والے روز اور وہ تیار بیٹھی تھی کہ اسے قتل کرے اور ٹھیک وقت پر جیل سے فرار ہونے والا اسے پک کر کے ساتھ لے جائے۔"

انور نے مجھے سپورٹ کیا۔ "ہاں، یہ ناممکن اتفاقات پر مبنی اسٹوری ہے۔"

ملک احسان نے سر ہلایا۔ "یہ تو عام سی بات ہے کہ لڑکی نے شوہر کو آشنا کی مدد سے مارا اور پھر دونوں فرار ہوگئے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ دونوں کے پرانے مراسم تھے۔ اسی لیے تو وہ نکل گئی اس کے ساتھ۔"

"نورین کو نہیں تو پھر کیا اس فرید کو معلوم تھا کہ آج اس کی محبوبہ کی رخصتی ہے۔ اس نے ڈاکوؤں سے کہا کہ آج رات حملہ کریں اور جیل سے اپنے ساتھیوں کو نکالیں۔ وہ بھی نکل جائے گا ان کے ساتھ... ڈاکوؤں نے اس کی درخواست قبول کرلی اور اس فریدالدین نے اپنی محبوبہ کو بھی بتادیا تھا کہ تم فکر نہ کرو... آج ہی میں جیل سے نکل آؤں گا اور تمہیں لے جاؤں گا اپنے ساتھ۔" انور نے پوری کہانی کے بخیے ادھیڑ دیے۔

میں نے بھی ہنس کے کہا۔ "اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ فرید بھی ڈاکوؤں کے گروہ میں تھا اور ڈاکوؤں کو اپنے ساتھیوں کو چھڑانے سے زیادہ یہ فکر تھی کہ یہ لو اسٹوری اسی طرح ختم ہو۔ فرید کا رقیب دولہا وصل سے شادکام نہ ہوسکے اور وقت پر ہلاک ہو۔ نہ دلہن کا وار ناکام ہو اور نہ ڈاکوؤں کا حملہ... وہ ٹھیک وقت پر کارروائی کریں، ناکام نہ ہوں اور ہیرو کو بروقت وہاں پہنچادیں جہاں ہیروئن فرار کے لیے تیار بیٹھی تھی... بیوہ محبوبہ۔"

ملک احسان ہنس پڑا۔ "آپ لوگوں نے تو لو اسٹوری کا بیڑا غرق کردیا۔"

"یہ اخبار والے بھی جوڑتے خوب ہیں۔" انور بولا۔

"یار! تم دونوں مل کے جوڑ رہے ہو اور ایک کہانی بنا رہے ہو۔ جو صرف اتنی ہے کہ ایک عورت نورین بھی فرید کے ساتھ ہے۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ان کا پہلے سے نہ تعلق ہو اور نہ تعارف؟"

"پھر ان کا نام ایک ساتھ کیوں آرہا ہے اس کہانی میں؟" میں نے کہا۔

"میرے خیال میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ فرید اسے نہیں جانتا تھا۔ وہ جیل سے فرار ہوا اور وہ لڑکی اپنے گھر سے... دونوں کہیں اتفاق سے مل گئے اور ایک ساتھ ہوگئے۔ فرید مرد تھا۔ عورت کے چکر میں آکے ہیرو بن گیا اسے بچانے کے لیے..."

"یہ اطلاع آپ کو کس نے دی ابھی؟"

"ہمارے اپنے ذرائع ہوتے ہیں، پولیس کے مخبر... ظاہر ہے سکھر میں قتل کی ایک واردات ہوئی۔ اس کی رپورٹ اخبارات میں ہوگی۔ جیل بریک کی خبر تو سارے

اخباروں کی ہیڈ لائن تھی۔ اس بڑی خبر میں سکھر کی چھوٹی خبر دب گئی جو اہم اس لیے بھی نہیں تھی کہ قتل تو ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ضلع کی خبر کا دوسرے شہر والوں کو پتا ہی نہیں چلتا۔ کسی نے دونوں کو جوڑا اور تیسری خبر بنالی۔ کسی مقامی صحافی نے دونوں وارداتوں کی ٹائمنگ دیکھی کہ ایک ہی ہے، اس سے یہ سنسنی خیزی کا پہلو نکل آیا۔“

”یعنی ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو، وہ ساتھ ہی نہ ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جس نے مجھے اطلاع دی ہے اس نے بڑے یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ انہیں کہاں کہاں ایک ساتھ دیکھا گیا تھا۔ اب بات نکل آئی ہے تو ایک بات میں بھی بتادوں۔ یہ جو فرید تھا سزائے موت کا مجرم... اس کا تعلق تھا نادر شاہ کے گینگ سے... ان کے اختلافات ہوئے تو فرید پر قتل کا کیس بنادیا گیا۔ گینگ وار میں یہی ہوتا ہے۔ جو بغاوت کرے وہ مارا جاتا ہے یا مروا دیا جاتا ہے۔ فیصلے سنانا عدالت کا کام ہے۔ وہاں ثبوت، شہادت فراہم ہوجاتی ہے اور سزا بھی کم نہیں ہونے دی جاتی۔ کام تو نادر شاہ کا پیسا اور اثر رسوخ کر رہا تھا۔ فریدالدین بچ کیسے سکتا تھا سزائے موت سے... جب وہ جیل سے نکلا تو نادر شاہ کو فکر ہوئی اور اس نے اپنے بندے بھی لگادیے فرید کے پیچھے اور پولیس کو بھی ٹائٹ کردیا کہ اس بندے کو پکڑنا ہے ہر حال میں... یہ انڈرورلڈ میں ہوتا ہے۔ خود نادر شاہ نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ ہم نے فرید کو پکڑ لیا ہے اور اس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے مگر اس کے بعد کی خبر یہ ہے کہ وہ دونوں نکل گئے۔“

”وہ فون پر آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا گویا... آپ کا نمبر اس کے پاس تھا اور اس کا نمبر آپ جانتے تھے؟“ انور نے طنز سے کہا۔

”فون وہ کہیں سے بھی کرسکتا تھا۔“

”آپ کو یقین ہے کہ وہ نادر شاہ تھا؟“

ملک احسان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، اس فرید کے معاملے میں ہمارے مقاصد ایک ہوگئے تھے۔ وہ ہماری مدد کر رہا تھا اور ہم اس کی۔ ہمیں بھی اجازت ہے کہ وہ جہاں نظر آئے اسے گولی ماردیں اور نادر شاہ بھی یہی کرے گا۔“

”یعنی پبلک کا یہ تاثر غلط نہیں ہے کہ پولیس ہی ہر مافیا کی سرپرستی کرتی ہے... ہر گینگ کو بناتی ہے... سپورٹ کرتی ہے اور ان کی شیئر ہولڈر ہے... مالِ غنیمت میں حصے دار ہے؟“ انور نے کہا۔

”ایسا ہے... سو فیصد نہیں۔“

”یہ بھی پرانا گھسا پٹا بیان ہے کہ پولیس میں چند کالی بھیڑیں ہیں۔ یار! میں کہتا ہوں کہ تم ایک سفید بھیڑ دکھا دو بس۔“

ملک احسان مسکرایا۔ ”میں ہوں نا ایک سفید بھیڑ۔“

”یہ دعویٰ تو ہر پولیس والا کرتا ہے نیچے سے اوپر تک کہ ہاں جی، ایسا ہوتا ہے مگر میں نہیں کرتا۔“ میں نے کہا۔

”گواہی دیں گے بڑے چودھری صاحب، ان کے کتنے غیر قانونی کام میں نے نہیں کیے۔ اکبر علی بھی ناراض تھا مجھ سے... لیکن بڑے چودھری صاحب قدر بھی کرتے تھے اور تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ تو چل کیسے رہا ہے پولیس میں... پوسٹنگ میری کبھی اس ضلع میں نہیں رہی... ٹرانسفر اکثر ہوتے تھے۔ میرا زیادہ وقت بلوچستان، گلگت اور سوات میں گزرا جہاں سزا یافتہ بھیجے جاتے ہیں۔ مجھے یاد آیا۔ فائل میں اس تاریخ کے اخبارات میں جب جیل توڑ کے ڈاکو فرار ہوئے تھے، سکھر کے اخبار بھی ہیں ایک دو... میں دیکھتا ہوں... یہ جو نورین والا کیس ہے یہ مقامی اخباروں میں تو پہلے صفحے پر ہوگا... اور کہیں ہو نہ ہو۔“

میں نے ابھی تک اپنی لاتعلقی کا انداز برقرار رکھنے میں بڑی محنت کی تھی تاکہ میری دلچسپی میں شک کا عنصر نہ آئے۔ اندر سے میری جو دلی کیفیت تھی، وہ ظاہر نہ ہو۔ اس معاملے میں انور مجھ سے زیادہ بحث کرتا رہا تھا۔ جب ملک احسان اٹھ کے پھر فائل نکالنے گیا تو میں نے پانی پیا اور انور اٹھ کے دروازے تک گیا کہ ملازم کو کافی لانے کا کہے۔ حویلی میں خاموشی تھی اور سب ٹھیک تھا۔ میں بھی سونا چاہتا تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ بیچ میں سے اٹھ کر جانا مناسب نہیں۔ شاید میں بہت سی مفید معلومات سے محروم رہ جاؤں گا اور میرا خیال غلط نہیں تھا۔

ڈی آئی جی فائل نکال کے لایا۔ یہ خاصی ضخیم فائل تھی۔ ”اس میں خبر کا تراشہ لگا ہوا ہے۔ اہم خبر تھی اس لیے فرنٹ پیج پر آئی۔ سکھر کے تین مقامی اخباروں کا پہلا صفحہ پورا لگا دیا گیا ہے۔“ اس نے ٹیگ نکال کے ایک ایک اخبار کو الگ کیا۔ سکھر کے اخبارات کا پہلا صفحہ چار بار فولڈ کرکے لگایا گیا تھا۔ اس نے ایک اخبار کو پورا کھولا اور اوپر سے نیچے نظر ڈال کے الگ کردیا۔ پھر دوسرے کو کھولا اور بولا۔ ”یہ... اس میں ہے۔ میں نے ابھی تک غور نہیں کیا تھا۔“

اس نے اخبار چودھری انور کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے خبر کو سرسری انداز میں دیکھا۔ ”یار! لڑکی تو بڑی ظالم ہے۔“

ملک احسان مسکرایا۔ ”ایک نظر میں اپنی ریما جیسی لگتی ہے۔“

انور نے اخبار میری طرف بڑھایا۔ ”اس سے پوچھ رہی ہے۔ ریما کیا ہے اس کے سامنے۔“

میں نے نورین کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر کو ایک خونی خبر کے ساتھ اپنے سامنے پایا۔ خبر کی سرخی تھی۔ ”شادی کی رات دلہن اپنے دولہا کو قتل کرکے فرار ہوگئی۔“ نیچے دیگر تفصیلات تھیں مگر میری نظر نورین پر جم کے رہ گئی تھی۔ میں نے بھی نورین کو دلہن کے پیراہن میں دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ یہ تصویر اس کا پاسنگ بھی نہ تھی۔ میرے تصور میں آج بھی اس کا پہلا نقش قیامت آفریں حسن کا تھا جس کا پہلا نظارہ میری نظر کو چکا چوند کر گیا تھا۔ ملک احسان اور انور علی دونوں جس تصویر کو دیکھ کر نورین کے حسن بے مثال کا قصیدہ پڑھ رہے تھے، اگر انہوں نے نورین کو لباسِ عروسی میں پورے میک اپ کے ساتھ دیکھا ہوتا تو شاید زندگی بھر نہ بھولتے۔

ہنستے ہوئے انور نے کہا۔ ”یار! کیا فریدالدین کا رقیب ہوگیا ہے تو غائبانہ؟“ اور اخبار میرے ہاتھ سے لے لیا۔

میں چونک پڑا لیکن میرا چونکنا ملک احسان نے نہیں دیکھا۔ اس وقت وہ اخبار کو واپس فولڈ کرکے ٹیگ میں لگا رہا تھا۔ ”میں جیل بریک کی تفصیل دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو یہ ملی بھگت لگتی ہے۔ جیل والوں نے لاکھوں لیے ہوں گے آنکھیں بند رکھنے کے۔“

”یہ تو سارے صحافی کہہ رہے ہیں لیکن حفاظتی عملہ معطل کردیا گیا تھا فوراً۔“

انور ہنس پڑا۔ ”معطل... یہ بھی خوب ڈراما ہوتا ہے پولیس کا... معطل ہونے والے کب بحال ہوتے ہیں اور کب پھر پیٹی کس کے کس تھانے میں کمان سنبھالتے ہیں، اس کی خبر کسی کو کانوں کان نہیں ہوتی... اور اس کیس میں تو سب برطرف ہوجائیں پھر بھی کیا غم... ڈاکوؤں نے اتنا دے دیا ہوگا کہ معمولی پہرے دار کی عمر بھر کی تنخواہ کے برابر ہوگا اور دعوت نامہ الگ ہوگا پارٹی میں شامل ہونے کا... ابھی وردی پہن کے لوٹ رہے ہو... بغیر وردی کے ہمارے ساتھ آجاؤ۔“

ملک احسان نے ہاتھ جوڑے۔ ”یار چودھری صاحب! آپ تو باہر یورپ گھوم کے آئے ہو نا... ہمارا مقابلہ کرتے ہو ان

ہے... بغیر ان حالات کا فرق دیکھے جو پاکستان اور یورپی ممالک کے معاشی اور سماجی یا سیاسی ماحول میں ہیں۔"

انور نے کہا۔ "بس اب ہم بھی کہہ چکے جو کہنا تھا۔ تم بھی سو جاؤ۔ صبح ہمیں بھی کام بہت ہیں... اور تمہارا جو پروگرام خراب ہوا اس کے لیے پھر سوری۔"

"یار! ایک بار شرمندہ کرنا کافی نہیں تھا؟"

"تم پھر آجاؤ... ابھی تو تم ہو یہاں... ہفتہ دس دن بعد چلتے ہیں۔" انور نے کہا۔

"دیکھو اگر موقع ملا۔" اس نے مصافحہ کیا اور ہم اس کے کمرے سے باہر آگئے۔

چند منٹ کے بعد میں نے کہا۔ "انور! یہ صورتِ حال خطرناک ہوگئی ہے۔ احسان کو شک ہوگیا ہے۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "دیکھ یار! یہ تیرے اندر کا خوف ہے۔"

"وہ بڑا پرانا اور تجربہ کار ہی نہیں، ایماندار افسر بھی ہے۔ وہ کچھ ظاہر نہیں ہونے دے گا۔"

انور رک گیا۔ "میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسے۔ اگر ذرا بھی شک ہوتا اسے تو وہ تجھے کمرے سے باہر بھی نہ جانے دیتا کہ تو راتوں رات فرار ہو جائے گا۔ محض صورت کی مشابہت پر وہ تجھے فریدالدین کی جگہ گرفتار کر ہی نہیں سکتا۔ وہ مجھے بھی جانتا ہے کہ میں اکبر سے کتنا مختلف ہوں اور وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ جو کچھ میں نے اسے تیرے بارے میں بتایا..."

"وہ سفید جھوٹ تھا۔"

"لیکن اس نے تسلیم کرلیا کہ سچ ہے کیونکہ میرے جیسا شخص نہ کسی مجرم کو پناہ دے گا اور نہ اس کی حمایت کرے گا۔ میں نے تو تجھے اپنا پرانا دوست بتایا ہے اور ایک طرح سے گواہی دی ہے کہ تو سلیم اختر ہے جس کے سارے حوالے مستند ہیں۔ اس کا کسی نادر شاہ کے گروہ اور سکھر جیل سے مفرور فریدالدین سے کیا تعلق... ایسے ملتی جلتی صورت والے تو چودھری انور علی اور ملک احسان کے بھی کہیں نہ کہیں نظر آجائیں گے۔"

"یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے میرے لیے انور۔"

"میں کیا سمجھتا نہیں۔ چاہوں تو ابھی رنگیلا کے ساتھ تجھے روانہ کردوں۔ ڈی آئی جی صاحب کے فرشتوں کو خبر نہ ہو لیکن وہ پوری طرح مطمئن ہے ورنہ یہ چانس ہرگز نہ لیتا کہ جلدی کیا ہے۔ صبح گرفتار کرلیں گے۔ فرید جیسے مجرم دو منٹ میں نکل جاتے ہیں اگر موقع دیا جائے۔"

اس کی دلیل نے مجھے کچھ قائل کیا۔ "تو میری زندگی داؤ پر لگا رہا ہے انور۔"

"یار! اب دوست کہا ہے تو غدار اور احسان فراموش مت کہہ۔ تیرے احسان کے بدلے میں ایسا کرسکتا ہوں؟ دراصل تو بہت زیادہ ڈر گیا ہے۔ چل آج رات تو میرے کمرے میں سو جا۔ بفرضِ محال ملک احسان نے رات کو تجھے سوتے میں ہتھکڑی لگانے کے لیے چھاپا مارا تو وہاں ہوں گا میں۔ اس کے بعد میں جانوں اور وہ۔ اس کے باپ کی آئی جی کی مجال نہیں کہ وہ دوسرے کمروں میں جا کے دیکھے۔"

"تو خود بڑی مشکل میں پڑ جائے گا۔"

وہ ہنسا۔ "او نہیں... ملک احسان پاگل نہیں ہے کہ میری طرف انگلی بھی اٹھائے۔ جب میرا باپ اپنے بیٹے کو غائب کرسکتا ہے اور میں اپنے بھائی کو... اور کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا... تو یہ باہر کا آدمی کیا چیز ہے۔ میرا وہ مزاج نہیں لیکن میرے باپ نے اور میرے چھوٹے بھائی نے کتنے بندوں کو ایسے غائب کیا ہے جیسے زمین پر ان کا وجود ہی نہ تھا اور ان میں ایک دو بڑے پھنے خان تھے۔"

"اب دنیا بہت بدل گئی ہے انور۔"

"ہاں، میں نواب آف کالا باغ نہیں ہوں اور نہ اندرونِ سندھ کا وڈیرا پیر... میں ایک پڑھا لکھا مہذب آدمی ہوں۔ پھر بھی مجھ سے پنگا کوئی نہیں لے گا، مجھے کمزور سمجھ کے۔ چل آجا میرے ساتھ۔ صبح تو اٹھے گا تو تیرے سارے اندیشے بے بنیاد ہو جائیں گے۔ ملک احسان جا چکا ہوگا اور تو سلیم اختر... بالکل محفوظ ہوگا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے انور کی بات مان لی اور اس کے بیڈ روم میں محفوظ ہو کے سو گیا۔ میں نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا کیونکہ بہادر بننے کا خطرہ مول لینا میرے نزدیک خودکشی کے مترادف ہوتا۔ خطرہ انور کو نہیں، مجھے درپیش تھا۔ اندر سے میں نے دروازے کو لاک کردیا۔ باہر ایک محافظ برآمدے میں یہاں سے وہاں تک ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اسے انور نے حکم دیا کہ وہ میرے دروازے پر کھڑا رہے اور کوئی بھی زبردستی میرے کمرے میں گھسنا چاہے تو اسے بے دھڑک گولی مار دے۔ یہ احکامات ایک معمولی گارڈ کے لیے جتنے حیران کن تھے، اتنے ہی پریشان کن بھی تھے مگر وہ تعمیل سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔

بیڈ پر لیٹ کر اندھیرا کرنے کے بعد بھی اندیشوں کے آسیب میرے چاروں طرف منڈلاتے رہے۔ بہت عرصے بعد جب میں سمجھ رہا تھا کہ خطرہ بہت پیچھے رہ گیا ہے تو

خطرہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے پتا چلا تھا کہ میرے خلاف پولیس اور نادر شاہ کس طرح متحد ہو گئے تھے۔ جیل سے فرار ہونے والے دوسرے قیدیوں کو صرف پولیس کی نظر سے بچ کے رہنا تھا۔ میرے تعاقب میں وہ بھی تھے جن کی شناخت نہ تھی لیکن وہ مجھے شناخت کرسکتے تھے۔ اچانک نورین اور فریدالدین ایک جیسے مطلوب مجرم بن گئے تھے۔ اس کا نام میرے نام کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ مفروضات اور افواہوں اور غیر مصدقہ اطلاعات پر یہ کیس زندہ تھا۔ یہ ابھی تک سرد خانے میں نہیں گیا تھا تو اس کے پیچھے نادر شاہ کا عزم تھا۔ پولیس کے لیے ایسے سیکڑوں ہزاروں کیس تھے جو ختم نہیں ہوئے تھے مگر صرف فائلوں میں رہ گئے تھے۔ نادر شاہ کے لیے صرف ایک کیس اہم تھا جو میرے خاتمے کے بغیر ختم ہونے والا نہیں تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری فرار اور مسلسل فرار کی حکمتِ عملی زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی۔

شاید مجھے اب جارحانہ حکمتِ عملی اپنانے کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے کہ دشمن تمہیں ختم کرے، تم دشمن کو ختم کر دو... کیا میں اتنی طاقت رکھتا ہوں اور اتنے وسائل؟ میں نے سوچا مگر مجھے نادر شاہ کے پورے گروہ کا خاتمہ نہیں کرنا... میرا ٹارگٹ صرف نادر شاہ ہونا چاہیے۔ صرف ایک آدمی میں بھی ہوں اور ایک حریف وہ بھی ہے۔ اس کا گینگ میرا دشمن نہیں ہے۔ دشمن صرف نادر شاہ ہے۔ جب وہ نہیں رہے گا تو اس کی جگہ لینے والا پرانے دشمنوں کو ختم کرنے کے منشور پر عمل نہیں کرے گا۔ اس کا اپنا پلان ہوگا اور اپنے ٹارگٹ۔

مجھے اندازہ ہے کہ میری وہ رات اسی طرح گزری جیسے جیل میں آخری رات گزرتی ہے۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے مجھے تختۂ دار سے ایک مردہ جسم کی صورت میں اتارا جاتا اور لاوارث لاشوں کی تدفین کرنے والے کسی ادارے کے سپرد کردیا جاتا۔ نورین بار بار اندھیرے میں سے نکل کر میرے سامنے آتی رہی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہے بغیر بہت کچھ کہا۔ میں بار بار اٹھ کے بیٹھتا رہا۔ ہر بار میرا حلق خشک ہوتا تھا اور میں پانی پی کے پھر لیٹ جاتا تھا۔ مجھے نیند کی گولی کی اشد ضرورت پہلی بار محسوس ہوئی۔ آخری بار میں جاگا تو ہوا کے دوش پر آوازِ اذان سنائی دے رہی تھی۔ اور جب میں وضو کے بعد قبلہ رو کھڑا ہوا تو مجھے پھر یوں لگا جیسے میری یہ نماز وہ ہے جو ہر مجرم پھانسی پانے سے پہلے پڑھتا ہے۔

صبح کا اجالا کمرے کی کھڑکیوں کے پردوں سے جھلکنے لگا مگر میں کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے خوف آتا تھا۔ تاہم میری کیفیت رات سے بہت مختلف تھی۔ انور کی بات کی صداقت ثابت ہو چکی تھی۔ ملک احسان نے مجھے گرفتار نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب واضح تھا کہ اس نے مجھے ملک سلیم اختر تسلیم کرلیا تھا اور فریدالدین سے میری مشابہت کو عام اتفاق سمجھ کے بھلا دیا تھا۔ میں اسی گاؤں کا رہنے والا اور انور کا پرانا دوست تھا۔ میرا بزنس لاہور میں تھا اور میرے بیوی بچے بھی وہیں تھے۔ ملک احسان نے سب مان لیا تھا۔

جب انور نے دستک دے کر مجھے آواز دی۔ "سلیم صاحب! جاگو پیارے۔" تو میں نے سکون اور اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اپنے چہرے پر اعتماد بحال کر کے دروازہ کھول دیا۔ جماہی لے کر میں نے ظاہر کیا کہ میں سو رہا تھا اور انور میرا خوف دور کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے آنکھیں کھول کے گھڑی دیکھی۔

"آٹھ بجے ہیں یار... ابھی ملک احسان گیا ہے۔ میں نے ناشتا اس کے ساتھ کرلیا۔ آدابِ میزبانی کا تقاضا تھا۔"

"اچھا کیا... اس نے مجھے تو نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ سو رہے ہیں۔ آپ کہیں تو جگا دوں... اس نے منع کردیا۔" انور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ "چل اب تو تیار ہو کے ناشتا کر... آج کام ہیں بہت سارے۔"

میں نے کہا۔ "بڑے چودھری صاحب کیسے ہیں؟"

"ٹھیک... وہ بھی ناشتا کررہے ہیں اور تجھے بتاؤں... انہوں نے مجھ سے بات بھی کی۔ میں نے کہا کہ آج ان کی خواہش کے مطابق علاج کا بہترین انتظام حویلی میں ہی ہو جائے گا۔ وہ سب یہاں آجائے گا جو کسی اسپتال کے آئی سی یو میں ہوتا ہے۔ آپ اسپتال نہیں جائیں گے اور میں نے کہا کہ یہ سب سلیم اختر کی وجہ سے ہوا۔ اس نے کہا کہ کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہوگا۔ اسے زیادہ پتا ہے کہ کہاں سے کیا ملے گا لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا کوئی پرانا جاننے والا دل کے امراض کا ماہر ڈاکٹر ہے جو اب کسی اسپتال میں نہیں... بوڑھا آدمی ہے۔ سلیم اسے یہاں لانے کی کوشش کرے گا کہ حویلی میں اس کی رہائش کا بندوبست کردیا جائے۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ”انہوں نے مان بھی لیا؟“

”اس کا پتا چل جائے گا تجھے... ماں پر تو فوراً اثر ہو گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ پتر! ایسا ہو جائے تو میرے بھی دل سے دعا نکلے گی۔ اسے بھی اپنا بیٹا بنا لوں گی میں۔ تو ناشتے سے فارغ ہو پھر شہر جانے سے پہلے میرے ساتھ چل کے ابا جی کی طبیعت پوچھنا اور دیکھنا میری کوشش کا نتیجہ... بعض اوقات خرابی میں بھی بہتری ہو جاتی ہے۔ اس کرائسس نے میری اور تیری پوزیشن کو قابلِ اعتبار بنا دیا ہے۔“ وہ بہت خوش تھا اور مطمئن بھی۔

میں نے اپنے کمرے میں جاکے غسل کیا اور شیو... پھر لباس بدلا اور ناشتا طلب کیا تو دس منٹ بعد ریشم خود ناشتا لے کر آگئی۔ ”تم رات کو اپنے کمرے میں نہیں تھے۔“ اس نے آتے ہی کہا۔

میں نے اعتراف کر لیا۔ ”ہاں، میں انور کے کمرے میں سویا تھا۔“

”ایسی کیا بات تھی؟“ وہ شک بھرے لہجے میں بولی۔

”ظاہر ہے کچھ خطرہ تھا۔ انور نے کہا تو میں نے اس کی مان لی۔“

”خطرہ اس پولیس افسر کی وجہ سے محسوس ہوا تھا؟“

”دیکھو، خوامخواہ کی تفتیش مت کرو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے تمہارے ہر سوال کا تفصیلی جواب دینے کے لیے۔ مجھے انور کے ساتھ شہر جانا ہے... بہت سے کام ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے سب۔“ اس کا منہ سوج گیا۔ ”تم بھی وہی مرد ہو نا جو عورتوں کو ہر بات نہیں بتاتے، ان پر بھروسا نہیں کرتے۔“

”اگر جانتی ہو تو خفا کیوں ہو؟ چلو ناشتا کرواور لڑنا ہے تو کل لڑیں گے فرصت سے۔“

”انور نے سب بتا دیا تھا مجھے۔ میں تم سے سننا چاہتی تھی۔ مجھے تم سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تم سے لاکھ درجہ بہتر آدمی ہے۔“

میں ہنس پڑا۔ ”میں آدمی ہی کب ہوں کہ تم اس سے میرا مقابلہ کر رہی ہو۔“

انور نے باہر سے کہا۔ ”چل یار! آج تھوڑا کھا لے۔“ میں اٹھ کے اس کے ساتھ چل پڑا۔ میں اب بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ پورے اعتماد کے ساتھ میں بڑے چودھری صاحب کے کمرے میں داخل ہوا اور ان کی خیریت پوچھی۔

خلافِ معمول انہوں نے شرافت سے جواب دیا۔ ”بس ابھی دن پورے نہیں ہوئے تھے... قضا ئل گئی ہے۔“

میں نے اخلاقی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ ”کیسی باتیں کرتے ہیں چودھری صاحب! آپ کو تو ابھی بہت دن جینا ہے۔“

ماں جی نے کہا۔ ”چلو جاؤ تم دونوں خیر سے... اللہ تمہاری کوشش کامیاب کرے۔“

اور باہر آ کے مجھے انور کی بات کا قائل ہونا پڑا۔ یہ ہارٹ اٹیک نہ ہوتا تو انور کی اور میری طرف سے چودھری صاحب کی ناراضی اور بدگمانی کبھی ختم نہ ہوتی۔ اب ایسا لگتا تھا کہ قدرت بھی انور کی مدد کر رہی ہے اور وہ حالات پر اپنی مرضی کے مطابق قابو پا لے گا۔ انور کو امید تھی کہ بھابی دلی کشیدگی اور بدگمانی کی فضا کو ہمارے لیے سازگار بنانے میں اپنا کردار ضرور ادا کرے گی۔ وہ اپنے باپ سے بھی مشورہ ضرور حاصل کرے گی۔ اسے چودھری اکبر کے اقتدار کی بحالی میں نہیں، اس کی زندگی کے تحفظ میں زیادہ دلچسپی ہوگی۔ وہ درویش صفت آدمی دنیا دار بھی ہے لیکن ہوس اور نشۂ اقتدار سے محفوظ ہے۔ اب شاید جو معاملات ہفتوں میں ٹھیک ہونے کی امید تھی، وہ دنوں میں بہتر ہو جائیں گے۔

میں نے جانے سے پہلے انور کو اپنے بیڈ کے نیچے سے دو بیگ نکال کے دیے۔ ”انہیں سنبھال کے رکھ۔“

”کیا ہے ان میں؟“ اس نے بیگ کھول کے اندر جھانکا۔

”یہ بیگ میرا ہے۔ اس میں نو لاکھ سے زیادہ نقد ہیں۔ باقی زیورات جن کی مالیت کا مجھے علم نہیں۔“

”یہ کہاں سے آئے... اور کس کے ہیں؟“

”یہ بعد میں بتاؤں گا... تمام زیور نورین کا ہے۔“

”اور یہ رقم؟ تُو نے دیکھا بھی نہیں کہ کتنی ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ بھی نورین کی ہے؟“

”نہیں لیکن میں اسے اپنی بھی نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک ایسے شخص کی تھی جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کے پاس بھی کہاں سے آئی تھی۔ اگر میں نہ لیتا تو پولیس لے لیتی اور اس کا ذکر بھی کسی سے نہ کرتی۔“

”پھر اب تیری ہوئی نا... جب اس کا دعوے دار کوئی نہیں۔“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کو اپنا سمجھ کے خرچ کرتے ہوئے مجھے عجیب سی غیر اخلاقی جھجک محسوس ہوتی ہے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”دیکھ یار! تو اپنی اخلاقی ذمے داری پوری کرنے کسی تھانے میں جاکے تو یہ بیان نہیں دے سکتا اور نہ اسٹیٹ بینک جاکے اسے سرکاری خزانے میں جمع کرا سکتا ہے کہ اس پر میرا حق نہیں بنتا۔ ایسے جذباتی رویے کے ساتھ آج کی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے کوئی... خود میں نے اپنی اسیری کے زمانے میں بہت سوچ بچار کیا۔ سوچ بچار کے سوا میرے پاس کرنے کو کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے پریکٹیکل ہونا پڑے گا اپنی بقا کے لیے۔ یہ کوئی خیالی یا مثالی دنیا نہیں ہے ہمارے آس پاس۔ تو نے دیکھا میں کیا سوچتا تھا اور کیا کر رہا ہوں۔“

”تُو نے میری ایک خلش دور کر دی۔ اچھا، یہ دوسرا بیگ ریشم کا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ زمین کی ملکیت کے کاغذات ہیں اور کچھ زیورات اور نقد بھی ہے۔ نہ اس نے بتایا، نہ میں نے مالیت پوچھی۔ ان کو کہیں حفاظت سے رکھوا دے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اپنی تجوری میں رکھ دیتا ہوں۔ تجھے ضرورت ہو تو بتا دینا۔“

میں نے کہا۔ ”میری جیب میں تو کچھ بھی نہیں اور ہم جا رہے ہیں شہر...“

”میری جیب میں تو ہیں۔“ وہ بولا اور دونوں بیگ لے کر نکل گیا۔ اس کے اور میرے درمیان اعتماد کا رشتہ اتنے کم وقت میں ایک بیج سے تناور درخت بن گیا تھا کہ اس کی مثال ملنی مشکل تھی جو کل مکمل اجنبی تھے، وہ آج بے تکلف دوست تھے۔ چودھری صاحب سے میں انور پر آیا تھا اور تم سے ہم دونوں ”تو“ پر آ گئے تھے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ ہی نہیں فراخ دل اور باضمیر آدمی بھی تھا۔

حویلی والوں کے زیرِ استعمال تین گاڑیاں تھیں۔ ایک نیلی سیڈان کار تھی۔ دوسری شاہانہ وقار اور دبدبے والی سیاہ پجیرو جو پرانے وقت کے بادشاہوں اور مہاراجوں کے ہاتھی جیسی چال اور شان و شوکت رکھتی تھی۔ تیسری روزمرہ کے استعمال کے لیے سواری سوزوکی کیری ہائی روف تھی جسے کیری ڈبا یا صرف ڈبا بھی کہا جاتا تھا۔ اس وقت پجیرو حویلی کے دروازے پر کھڑی لشکارے مار رہی تھی اور اس کے سیاہ شیشوں کے پیچھے کی فضا کو باہر کے گرم موسم کے مقابلے میں مری جیسا رکھنے کے لیے انجن بھی چل رہا تھا اور سرکاری شوفر سفید وردی اور ٹوپی کے ساتھ منتظر تھا کہ ہم آئیں تو وہ لپک کے دروازے کھولے۔ ممانعت سیاہ شیشوں کے استعمال پر بھی تھی اور اسلحے کی نمائش پر بھی لیکن قانون یا تو غریب اور لاوارث کے لیے بنایا جاتا ہے یا صرف توڑنے کے لیے... شوفر نے بیلٹ کے ساتھ ریوالور لگا رکھا تھا اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے پاس سیٹ کے نیچے کلاشنکوف بھی موجود تھی۔

ہم پچھلی سیٹوں پر تشریف فرما ہو گئے تو شوفر نے گاڑی کا رخ جی ٹی روڈ کی طرف موڑ دیا۔ ایک ذیلی سڑک وہ تھی جو برساتی ندی کے اوپر سے گزرتی تھی۔ اس کے پل پر سے میں اور نورین ویگن سمیت نیچے گرے تھے۔ اب گاڑی بائیں کنارے پر چل رہی تھی اور انور مجھے بتا رہا تھا کہ دائیں طرف کی ساری زمین ہماری ہے۔ اس پر فصل تیار کھڑی تھی اور کھیتوں میں کام کرنے والے اِکا دُکا مرد عورتیں گاڑی کو دیکھتے تھے تو ان کے ہاتھ بے ساختہ سلام کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ گاڑی میں کوئی ہے یا نہیں۔

”تو نے ان کی حالت دیکھی؟“ انور نے کہا۔ ”صدیوں سے ان کی کئی نسلیں ایسی ہی بے آبرو زندگی گزار رہی ہیں۔ یہ شاید ہمارے مویشی، اصطبل کے گھوڑے اور ہمارے شکاری کتے ہوتے تو بہت سکھی ہوتے۔“

میں نے کہا۔ ”ایسا تو پورے پاکستان میں ہو رہا ہے۔“

”میں سارے پاکستان کا ٹھیکے دار نہیں ہوں۔ ان کے لیے میں ضرور کچھ کرنا چاہتا ہوں جو میرے کارکن ہیں۔ کارکن کا لفظ بڑی عزت اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں انہیں کمّی کمین کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ یہ غلام ہیں اور زر خرید سے بدتر۔“

”تُو کیا کرے گا... انہیں اپنے برابر لے آئے گا؟“

”یہ تو شاید ممکن نہیں مگر دو چار منصوبے قابلِ عمل ہیں۔ ان کو بہتر معاوضہ ملے، رہنے کو دو کمروں کا گھر جس میں بجلی ہو۔ علاج کے لیے یہاں ایک اسپتال ہو اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول... سلونی تو جانتی ہے میرے عزائم کیا تھے۔ خوشی مجھے ہوئی جب ریشم نے کہا کہ وہ پڑھے گی بھی اور پڑھائے گی بھی۔ ابا جی کو یہ پسند نہیں آئے گا لیکن وہ اب پیچھے ہٹ جائیں گے۔ برداشت کریں گے۔ اکبر سے شدید مخالفت کا اندیشہ ہے۔ اسے میں کب تک قید میں رکھ سکتا ہوں۔ جو وہ کر سکتا تھا میں نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے وہ بھی اب میرے ساتھ اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہو گا۔ جاگیر، جائداد میں بڑا چھوٹا کوئی نہیں۔ سب برابر کے

شریک اور مالک ہیں۔ اب روایت کا سکہ تو چلے گا نہیں کہ میں اپنا حکم چلاؤں اور چھوٹے اختلاف نہ کریں۔ اکبر بہت جلد کہے گا کہ انور کو حق ہے اپنے حصے کی جاگیر جیسے چاہے لٹائے اور اسلامی مساوات کا دستور چلائے۔ مجھے میرا حصہ چاہیے۔ میں باپ دادا کی روایات کی مٹی پلید نہیں کرسکتا۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "پُرامن بقائے باہمی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوگا۔"

"ایک تو وہ جائداد ہے جو مجھے اپنے باپ سے ملے گی لیکن اس کے ساتھ مجھے تایا کی جائداد میں سے بھی نصف مل سکتی ہے۔ اگر میں ان کی بیٹی سے شادی کرلوں، اب یہ بڑا مشکل فیصلہ ہے۔ اگر میں اپنے پروگرام کو دیکھوں تو مجھے اپنے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ ان سب کے بارے میں سوچنا چاہیے جو تایا کے مزارع ہیں۔ میرے انکار کی صورت میں بڑی خرابی ہوسکتی ہے۔"

"کیسی خرابی... اس کی رخنہ اندازی بڑھ جائے گی؟"

"اس سے بھی کہیں زیادہ۔ ایک سال میں میرا دماغ دن رات ماضی حال اور مستقبل کے حالات پر غور کرتا رہا۔ میں اپنے بھائی کی فطرت سے واقف ہوں۔ اقتدار کی ہوس میں وہ کسی بھی انتہا تک جاسکتا ہے۔ جو اپنے بھائی کو راستے سے ہٹانے میں عار محسوس نہ کرتا ہو اس کے لیے بیوی کیا چیز ہے۔"

میں چونک پڑا۔ "بیوی... اس کو بھی قتل کرسکتا ہے وہ؟"

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "تُو یہاں کے وڈیروں کی ذہنیت کو نہیں سمجھتا۔ میں بچپن سے مشاہدہ کرتا آیا ہوں۔ عورت یہاں سب سے کمزور اور بے آسرا مخلوق ہے جس کو نہ خاندان کی سپورٹ ملتی ہے نہ ہی ...... معاشرے کی... قانون تو خیالی بات ہے۔ ماں باپ کہتے ہیں کہ اب ڈولی گئی ہے تو جنازہ ہی نکلنا چاہیے شوہر کے گھر سے۔ طلاق تو خودکشی سے زیادہ حرام ہے۔ گالی ہے تو مرد کے لیے۔ چنانچہ عورت کا غائب ہوجانا ایسا واقعہ ہوتا ہے جس پر کوئی بھی پردہ ڈالا جاسکتا ہے۔ اکبر اپنی موجودہ بیوی کو جب چاہے غائب کرسکتا ہے۔"

"کیوں... کیا اسے محبت نہیں ہے اپنی بیوی سے؟ اب تو وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

انور ہنس پڑا۔ "محبت تو ہر بیوی سے کی جاسکتی ہے۔ بچے بھی سب دیتی ہیں۔ چار کی اجازت کے لیے شرع کی چھتری ہے مگر یہاں ایسا روگ پالا نہیں جاتا۔ ایک خاندانی سیٹ پر براجمان رہتی ہے۔ دوسری کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ یہ عارضی پوسٹ ہے۔"

"مگر یہ پہلی تو خاندانی بیوی کے عہدے پر فائز ہے؟"

"یہی اس کی بدقسمتی ہے۔ اکبر ایک کے ہوتے دوسری بہن سے شادی نہیں کرسکتا اور اس مشکل کا واحد حل یہی ہے کہ پہلی نہ رہے۔ پھر اکبر بہ آسانی دوسری سے شادی کرلے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ تایا اپنی مرضی سے اسے باہر بیاہ سکے۔ پہلا حق اکبر کا ہوگا۔ دوسری جب آئے گی تو اپنے ساتھ ساری جائداد کے حقوق وراثت لائے گی۔ تایا کی سب جائداد اکبر کو مل جائے گی۔ یوں... میرے پاس اپنے حصے کی نصف ہوگی۔ اس کے پاس تایا کی بھی ساری... یعنی ایک حصہ میرے پاس... تین اس کے پاس۔ میں اس سے شادی کرلوں تو ہم برابر۔ ایک چوتھائی کے بجائے میں نصف کی حالت بہتر بناسکوں گا۔"

"میں سمجھ گیا۔ اس میں قباحت کیا ہے؟ کیا وہ لڑکی اس قابل نہیں؟"

"لڑکی یہاں صرف لڑکی ہوتی ہے یا پھر بیوی۔ اچھی بری گائے بھینس دیکھی جاتی ہے کہ کون دودھ زیادہ دیتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ بھابی کے مقابلے میں گرم مزاج ہے، کچھ پھوہڑ بھی۔ میری بیوی بن کے وہ دم نہیں مار سکتی لیکن جو میں کروں گا، اس کی مخالفت وہ ضرور کرے گی۔ اس کے علاوہ یار... مجھے بیوی چاہیے شریک حیات... لائف کی ایکٹیو پارٹنر... جو زندگی میں ہر قدم پر عملاً میرے ساتھ ہو۔ ہمارا صرف جسمانی رشتہ ہی نہ ہو، ذہنی بھی ہو۔"

"وہ ایسی نہیں ہے تو پھر کیا ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے اگر میں چاہوں۔ وہی کروں جو خاندان کی روایت ہے۔ اسے خاندانی تخت پر بٹھادوں اور لائف پارٹنر اپنی مرضی کی تلاش کرلاؤں۔"

"اسے تلاش کرنے کا مرحلہ باقی ہے ابھی... ساری دنیا کی خاک چھاننے کے باوجود؟"

وہ ہنسا۔ "دل لگی خوب کی۔ دل ایک ہی سے لگا لیکن کہاں یہ پاکستان جیسے ملک کا پنڈ... اور کہاں لندن سینٹرل..."

"پھر یہ کیسا دل کا لگانا ہوا؟"

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں لیکن پہلے اس زمین کے مسئلے کا حل تو نکلے۔ اگر میں پاؤں کی اس بیڑی کو نہ کاٹ سکا تو پھر صبر اختیار کروں گا۔ دیکھو نا یار! اس لڑکی کے

بھی تو جذبات ہیں جو بچپن سے اب تک اپنی آنکھوں میں ایک ہی خواب لیے بیٹھی ہے۔ اسے تعبیر نہ ملی تو وہ کتنی دکھی ہو گی۔ اور میں یہ نہیں کر سکتا کہ ایک گھر چلانے والی رکھوں اور دوسری دل بہلانے والی... یہ تو ظلم برداشت کر سکتی ہے... وہ کرے گی؟"

"تمہاری لندن سینٹرل والی؟"

"ہاں، وہ تو لعنت بھیجے گی مجھ پر اور میری محبت پر... نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ اس لیے میں نے ایک رات فیصلہ کر لیا تو پھر محبت بھی بیوی سے ہی کروں گا۔ ہونے والی چیز ہے مگر میں کروں گا... تمام عمر ایکٹنگ۔"

اب ہم لاہور کی اپر مال سے زمزمہ کی طرف مڑ چکے تھے۔ ڈرائیور نے درمیان والے شیشے کا پارٹیشن ہٹا کے پوچھا۔ "اب کدھر جانا ہے جناب عالی؟"

انور نے میری طرف دیکھا۔ "تم بتاؤ کہاں سے شروع کریں؟"

میں نے کہا۔ "میو اسپتال کے اطراف میں میڈیکل ایکوپمنٹ سپلائی کی کمپنیاں ہیں، وہیں بتائیں گے۔"

جب ہم نے تلاش کا آغاز کیا تو عملی مشکلات کا اندازہ ہوا۔ وہاں چھوٹی بڑی بہت سی دکانیں تھیں جہاں عام ضرورت کے آلات سے بیساکھیاں اور وہیل چیئر دستیاب تھیں۔ میں نے ایک بڑی کمپنی سے آغاز کیا جو اسپتال کو ایکوپمنٹ سپلائی کرتی تھی۔ باہر ان کے شوکیس میں تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن آفس بہت بڑا تھا اور اندر دکان سے زیادہ دفتر کا ماحول تھا۔ سامنے ہی ایک لڑکی "ریسیپشن" کا بورڈ لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے ہمیں تین میں سے درمیانی کیبن کی طرف اشارہ کر دیا۔ باہر تو کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ اندر ایک بہت اسمارٹ اور خوش اخلاق نوجوان نے تھوڑا سا اٹھ کے ہمارا استقبال کیا اور اپنا نام خواجہ بتایا۔

انور نے کہا۔ "خواجہ صاحب! ہم ایک ایسے کام میں آپ سے مدد چاہتے ہیں جو آپ کرتے ہیں۔"

"جی؟" اس نے کہا اور انٹرکام پر چائے کے لیے کہہ دیا۔

"آپ ہر قسم کا سامان اسپتالوں کو فراہم کرتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ اگر میں اپنے گھر میں وہی ایکوپمنٹ انسٹال کرانا چاہوں؟"

وہ مجسم سوال بن گیا۔ "آپ کچھ وضاحت کریں گے؟ اسپتال میں ہر شعبے کی ضرورت کا سامان الگ ہے۔"

"رائٹ، میں اپنے گھر میں ایک کارڈیک کیئر یونٹ بنانا چاہوں تو؟"

"کارڈیک کیئر یونٹ... گھر میں؟"

"جی، دیکھیے معاملہ میرے والد کا ہے۔ وہ ہارٹ کے پیشنٹ ہیں۔ عمر ہے تقریباً سیونٹی فائیو... وہ کسی صورت اسپتال جانا نہیں چاہتے حالانکہ یہ ان کے لیے ضروری ہے۔ میں سرجری کی بات نہیں کر رہا۔ انجیوگرافی یا انجیوپلاسٹی اور بائی پاس وغیرہ تو صرف اسپتالوں میں ممکن ہیں۔ لیکن علاج میں اچانک کوئی ایمرجنسی آجائے... ان کی طبیعت اچانک بگڑ جائے تو انہیں سنبھالا جا سکے۔"

"یہ بھی آسان نہیں ہوتا انور صاحب... کیا آپ کے گھر میں کوئی ڈاکٹر ہے؟"

"کوئی نہیں لیکن ہم نے ایک کارڈیالوجسٹ اور ایک نرس کو ہائر کیا ہے جو چوبیس گھنٹے موجود رہیں گے۔"

خواجہ نے کہا۔ "آئی ڈونٹ نو... رہائش کہاں ہے آپ کی؟"

انور نے تفصیل سے بتایا تو خواجہ افسوس سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ "ایسی جگہ پر... یہ زیادہ مشکل ہوگا... آپ زیادہ سے زیادہ آکسیجن کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ ای سی جی مشین اب پورٹیبل آرہی ہے۔ الیکٹرانک مانیٹر بھی لگا سکتے ہیں لیکن ایمرجنسی میں اور بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً شاک تھراپی کی مشین... اور وینٹی لیٹر تو کسی صورت نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر ان چیزوں کے لیے اسٹینڈ بائی ارینج منٹ... اسپتال میں تو وہ فوراً دوسرا مانیٹر لگا دیتے ہیں... اور سب سے بڑی ضرورت ہے بجلی کی مستقل سپلائی... اس کے لیے ایک آٹومیٹک جنریٹر... اس کا فیول... مینٹی نینس۔"

میں نے کہا۔ "اگر ہم یہ سب خرید کے انسٹال کرانا چاہیں... تو آپ کر دیں گے؟"

"کر دیں گے... ہمارا تو یہی کام ہے لیکن آپ کو کچھ اندازہ ہے کاسٹ کا؟"

انور نے کہا۔ "وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ "اسٹی میٹ" بتائیے۔"

میں نے کہا۔ "اور کام کی تکمیل میں کم سے کم وقت کتنا چاہیے؟"

وہ پھر کچھ غیر مطمئن نظر آنے لگا۔ "کاسٹ تو ہم ایک دو دن میں بتا دیں گے۔"

"ایک دو دن؟ آپ کو تو سب معلوم ہوگا۔ کوٹیشن بنانے میں کیا پرابلم ہے؟ دس بیس فیصد اوپر نیچے سہی۔ ہم چاہتے ہیں آج شام تک..." انور نے کہا۔

"او کے... شام تک مگر صرف کوٹیشن... یو سی... یہ اسٹاک میں دستیاب چیزیں نہیں ہیں۔ کچھ آسانی سے مل جائیں گی لوکل مارکیٹس میں... باقی ہم کراچی سے پوچھ سکتے ہیں جہاں ہر ملک کی کمپنی کا آفس ہے... ان کے پاس ہوگی تو کم سے کم چار دن... نہ ہوئی تو پھر ہمیں آرڈر دینا پڑے گا اور کون سی چیز کہاں سے کب ملتی ہے... یہ میں بالکل نہیں بتا سکتا۔"

انور کچھ مایوس ہوا۔ "او کے، آپ جس حد تک کوشش کر سکتے ہیں، دیکھیں... ہم شام تک یہاں ہیں۔"

اس نے فون پر کسی کو بلایا۔ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص اندر آگیا۔ نہ جانے کیوں اس کا چہرہ مجھے کچھ شناسا لگا۔ خواجہ نے اسے مختصراً ہماری آمد کا مقصد بتایا اور وہ "یس سر... یس سر" کہہ کے سر ہلاتا رہا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی نظر بار بار مجھ پر ٹھہر جاتی تھی۔ وہ بھی مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک دم میرے دماغ میں خطرے کا الارم بج گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے شناخت کرنے والا کوئی نہیں لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ سکھر جیل میں بھی سیکڑوں قیدی تھے اور میں سب سے آشنا نہیں تھا۔

جب وہ چلا گیا تو انور نے چیک بک نکالی۔ "آپ کو کتنا ایڈوانس دے دوں؟"

"ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ آپ شام کو بھی دے سکتے ہیں۔ تقریباً آدھی لاگت کے برابر۔" خواجہ نے شائستگی سے کہا۔ "آپ شام پانچ بجے آئیے۔ میں دیکھتا ہوں کم سے کم وقت میں کیا ہو سکتا ہے۔ ایسی ڈیمانڈ پہلے کبھی نہیں آئی۔ اسپتال بہت پہلے بتا دیتے ہیں۔"

"یہ آپ ہماری خصوصی مدد کریں گے اور ہم یقیناً آپ کے شکر گزار ہوں گے۔" انور نے اور میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

وہ شخص باہر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ دروازے تک پہنچنے سے پہلے اس نے کہا۔ "ایکسکیوزمی۔"

میں رک گیا۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ میرا اصل نام لے کر مجھے پکارتا تو میں ضرور چونکتا اور مڑ کے بھی دیکھتا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"جی، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا نام فریدالدین ہے؟"

مجھے نہ چونکنے کے لیے ایک لمحے کی وارننگ مل گئی تھی۔ میں نے صورت پر سوالیہ حیرانی طاری کر لی۔ "جی نہیں، میں ملک سلیم اختر ہوں۔"

اس نے کہا۔ "سوری، دراصل آپ کی صورت ایک اور شخص سے ملتی ہے۔ میرے خیال میں اسے پھانسی ہو چکی۔"

"پھانسی؟" میں نے اپنے شاک پر قابو پالیا۔ "کس جرم میں؟ آپ کا کون تھا وہ؟"

"ایک دوست کا بھائی تھا۔ قتل کا الزام تھا اس پر... لیکن آئی ایم سوری۔" وہ ایک دم پلٹا اور کیبن میں چلا گیا۔

محاورے کے مطابق زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکل چکی تھی لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ انور نے فوراً میرا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو ملک صاحب۔"

میں نے دروازے پر کھڑے چوکیدار سے پوچھا۔ "یہ صاحب جو ابھی مجھ سے بات کر رہے تھے، ان کا کیا نام ہے؟"

"راجہ ریاست خان سر۔" چوکیدار نے کہا۔

راجہ ریاست خان؟ نام سے مجھے کچھ بھی یاد نہیں آیا لیکن میرے ذہن میں بہت سے سوال پیدا ہو گئے۔ کیا وہ سکھر جیل میں تھا؟ تھا تو کس جرم میں؟ مجھے یعنی فریدالدین کو کیسے جانتا تھا اور اب یہاں کیسے کام کر رہا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بھی فرار ہونے والوں میں شامل ہو؟ میں چوکیدار سے پوچھ سکتا تھا کہ اس کمپنی میں وہ کب سے کام کر رہا ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی سزا پوری کر کے میرے فرار سے پہلے ہی نکل آیا ہو۔ عدالت نے اسے بری کر دیا ہو۔

انور نے کہا۔ "چل بیٹھ گاڑی میں۔ کہیں کھانا کھاتے ہیں اور اتنا فکر مند نہ ہو۔"

"انور! دو دن میں دوسری بار کسی نے فریدالدین کو شناخت کیا ہے۔ یہ فکر مندی کی بات نہیں ہے؟"

"کرتے ہیں اس پر بات اور کوئی پکا انتظام۔"

انور کی ہدایت کے مطابق انور نے ڈرائیور کو پی سی کی طرف جانے کے لیے کہا۔ "اتنا نروس مت ہو۔"

"انور! مجھے اس طرح آزادانہ نہیں گھومنا چاہیے۔ خصوصاً شہر میں اور پبلک پلیس پر جانے میں یہ خطرہ زیادہ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کھانا گاڑی میں ہی کھا لیں؟"

"یار! پی سی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہر ایرا غیرا آتا جاتا ہو اور ایسا اتفاق بار بار نہیں ہوگا۔"

"کچھ بھی ہو، میں شام کو تیرے ساتھ وہاں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

ہوٹل میں انور نے ایک ایسے گوشے کا انتخاب کر لیا جو

الگ تھلگ تھا مگر میری تو بھوک اڑ چکی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد جب میں کچھ پراعتماد محسوس کرنے لگا تھا تو ملک احسان نے اچانک میرے یقین کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ نادر شاہ نے فریدالدین کو پکڑا تھا لیکن وہ نکل گئے۔ اس کے نزدیک یہ مصدقہ اطلاع نہیں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ غلط نہیں ہے، اگر میں زندہ تھا تو نورین بھی کہیں تھی۔

یکے بعد دیگرے دو افراد کے شک نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میرے لیے خطرہ ابھی باقی ہے اور مجھے مزید کچھ عرصہ روپوش ہی رہنا چاہیے۔ حویلی محفوظ جگہ تھی۔ اگر میں اپنی مصروفیات کو محدود کر دیتا تو مزید چند ماہ میں صورت حال بہتر ہو جاتی۔ شاید مجھے بھی اپنی صورت کو بدلنے کی ضرورت تھی۔

انور نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”سلیم! کیا تجھے بھروسا نہیں مجھ پر؟ تیری حفاظت میری ذمے داری ہے اور میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ اس کا پکا بندوبست کرنا ضروری ہے۔“

”کیا پکا بندوبست... مجھے روپوش رہنا ہوگا اور...“

”ٹھیک ہے۔ ہم محتاط رہیں گے۔ ایسے ہر جگہ ہر وقت میں تجھے ساتھ نہیں لے جاؤں گا لیکن ایک کام اور کرنا ہے۔ میں نے سلونی سے پوچھا تھا اور اس نے رنگیلا سے کہا تھا یہ کام۔ وہ کرا سکتا ہے۔ وہ بہت چلتا پرزہ ہے اور سارے شہر کو جانتا ہے۔“

ہم ہوٹل سے نکلے تو تین بجنے والے تھے۔ انور نے ڈرائیور سے کچھ کہا اور وہ گاڑی کو موڑ کے نیلا گنبد کی طرف لے گیا۔ وہاں پارکنگ کے لیے جگہ نہ تھی۔ ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔ ہم نیچے اترے تو مجھے رنگیلا نظر آیا جو اپنی ٹیکسی لیے وہاں موجود تھا۔ انور کے ساتھ میں بھی ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور ٹیکسی باہر نکلی تو انور کے شوفر نے ہیر واس کی جگہ لگا دی۔ میں نے اشارے سے پوچھا کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں تو انور نے اشارے میں جواب دیا کہ حوصلہ رکھو ابھی پتا چل جائے گا۔

ٹیکسی ایک جگہ رکی اور رنگیلا اتر کے گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہاں کیا کام ہے؟ یہ کیا جگہ ہے؟“

”ابھی پتا چل جائے گا سر۔“ انور مسکرایا۔ ”تجھے ملک سلیم اختر بنانا ہے پکّا... یہاں شناختی کارڈ بنتے ہیں۔“

رنگیلا پانچ منٹ میں لوٹ آیا۔ ”آپ اوپر چلے جائیں سر... فرسٹ فلور پر شہباز خان کے کمرے میں۔“

شہباز خان بھی ادھیڑ عمر آدمی تھا جس کے بال سر پر نہیں چہرے پر تھے۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کے میز پر رکھ دی تھی اور اپنی انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔ وہ شکل سے عیار اور آنکھوں سے مکار نظر آتا تھا۔ کسی رسمی سلام دعا کے بغیر اس نے ہم دونوں کو دیکھا۔ ”شناختی کارڈ کس کا بنے گا؟“

انور نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”ملک سلیم اختر کا۔“

”بن جائے گا۔ دس ہزار ہوں گے۔ ایک ہفتہ لگے گا۔ ارجنٹ چاہیے تو بیس... وہ دو دن میں مل جائے گا۔“

”ہمیں ایک دن میں چاہیے۔ ہم پچیس ہزار دیں گے... ایڈوانس...“ انور نے کہا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”آپ آجاؤ میرے ساتھ۔“ اس نے مجھے اشارہ کیا۔

وہ انور کو اور مجھے نیچے ایک ہال میں لے گیا جہاں ہر طرف شناختی کارڈ آفس کے لوگ کام، گپ شپ اور بزنس میں مصروف تھے۔ میں نے سب کچھ انور پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے فارم بھرا اور میرا نام ملک سلیم اختر ولد حاجی اختر رسول مرحوم لکھا۔ میرا مستقل پتا اپنے گاؤں کا درج کیا اور عارضی پتا لاہور میں کمن آباد کے کسی گھر کا۔ میرے پرانے اصل کارڈ میں شناخت کی علامت گردن پر ایک تل تھا۔ جیل میں ایک لڑائی کے دوران لڑنے والوں کو الگ کرنے کی کوشش میں چاقو کا ایک زخم میرے گال پر لگا تھا جو اتنا گہرا تھا کہ مندمل ہو جانے کے بعد بھی اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ فارم پر دستخط خود میں نے کیے لیکن مختلف... پہلے میں نے انگلش والے دستخط کیے تھے اب اردو میں ایم ایس اختر لکھا۔

شہباز خان ارجنٹ کارڈ بنانے کے پروسیجر سے واقف تھا اور اندر یہ کام ملی بھگت سے ہوتا تھا۔ ایک جگہ بٹھا کے میری فوٹو بھی بنالی گئی۔ آخری مرحلہ اپنے انگوٹھے کا نشان ثبت کرنے کا تھا جو میں نے اسکینر پر لگا دیا۔ شہباز خان نے کمپیوٹر کی اسکرین پر کچھ دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔

”یہ تو فریدالدین کا پرنٹ ہے؟“ وہ بولا اور میں نے اسکرین پر اپنا پرانا شناختی کارڈ دیکھا۔

شہباز خان نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”یہ تو... نہیں بن سکتا۔“ اس نے غور سے میرا چہرہ دیکھا۔

میرا خون خشک ہونے لگا۔

> ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
> جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

چکرباز

جمال دستی

سوچوں اور اندازوں پر پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے... وہ اپنی پسند اور اندازے کی درستی کے مطابق اپنا ہر کام پایۂ تکمیل تک پہنچاتا تھا... مگر اس دفعہ اس سے ایک چوک ہوگئی۔

سالگرہ کی تقریب میں رونما ہونے والے ایک دلچسپ سرپرائز کا احوال......

نکسن اور نزدیک آگیا۔ ”کیا میں تمہیں نروس کر رہا ہوں؟“ اس نے بدبودار سگریٹ کا دھواں جیسی کے چہرے پر اگلتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے تم نے سابقہ چکما بازوں کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا... ہے نا؟“

”نہیں۔“ جیسی نے جواب دیا۔ اس نے تو کبھی زیادہ وقت اس طرح کی اندھیری گلیوں میں بھی نہیں گزارا تھا۔

”سو تم مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہو یا کوئی اور معاملہ ہے؟“ نکسن نے پوچھا۔

یہ شخص یقینی طور پر پولیس کا آدمی دکھائی نہیں دے رہا ہے، جیسی نے سوچا۔ لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ...

”ہاں، جمعے کی شب میرے بزنس پارٹنر کے گھر تمہیں اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ اس کی بیوی نے اس کے اعزاز میں ایک بڑی سرپرائز برتھ ڈے پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ میں بھی اپنے طور پر اسے ایک چھوٹا سا سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ اس کے تمام دوستوں اور فیملی کی عین موجودگی میں۔“

”کوئی خاص... انٹرٹینمنٹ؟“

”ہاں۔“

”پھر تو بڑی تفریح رہے گی۔“ نکسن نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے چھوٹے نوٹوں کی شکل میں دس ہزار ڈالرز چاہیے ہوں گے۔“

”یہ تو بہت زیادہ رقم ہے۔“

نکسن کے ہونٹوں پر عیارانہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ”اگر تم کسی اور کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کیا کررہے ہیں تو پارٹی کا سارا مزہ حقیقت میں کرکرا ہوجائے گا اور معاملات... بگڑ جائیں گے۔“

جیسی ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ”نہیں، میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ یہ کام خوش اسلوبی سے اور درست طور پر ہونا ضروری ہے۔“

”تم سمجھ دار آدمی ہو۔“

جیسی نے اپنے سوٹ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اسے نکسن کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پتا اس پر لکھا ہوا ہے۔ آٹھ بجے کے قریب آجانا۔ یقیناً میں بھی وہاں موجود ہوں گا۔ کسی کو بھی شبہ نہیں ہوگا کہ وہ میں ہوں جس نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔“

”درست۔“

”لیکن اس کے پاس دو بچے بھی ہیں۔ لہٰذا ان کا خیال رکھنا۔ درحقیقت وہ بچے میرے ہیں... اور میری بیوی...“

”تو اس کتے کے بچے نے تمہاری فیملی ہتھیالی ہے؟“

”ہاں۔“ جیسی نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اب وہ مجھے کمپنی سے زبردستی نکالنے کی کوشش کررہا ہے۔ وہ کاروبار ہم نے مل کر جمایا تھا۔ اس کا ستیاناس کردینا۔“

”لگتا ہے کہ تمہارے اس کے ساتھ معاملات نہایت گمبھیر ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تب تو تمہیں اسے خود ہی سرپرائز دینا چاہیے۔“ نکسن نے مشورہ دیا۔

”میں حقیقت میں عملی ٹائپ کا آدمی نہیں ہوں۔“ جیسی نے جواب دیا۔

”گڈ! مجھے بھی کام درکار ہے۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے اسی لیے میں سوچ رہا ہوں کہ تم خوشی خوشی اپنا معاوضہ پانچ ہزار ڈالرز کرنے پر راضی ہوجاؤ گے۔“

نکسن نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کردیا۔

گو گلی میں روشنی بے حد مدھم تھی لیکن جیسی کو اس چاقو کا چھ انچ لمبا چمک دار پھل صاف دکھائی دے رہا تھا جو نکسن کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ نکسن نے اپنے بائیں ہاتھ سے دھکیل کر اسے دیوار سے لگا دیا۔

”تم کمینے... اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ کر کیوں گئی ہے۔ اگر میں تمہارا سینہ چاک کردوں اور تمہارا کلیجا نکال کر چوہوں کو کھلا دوں تو کیسا رہے گا؟“

جیسی کی زبان گنگ تھی۔ اسے کچھ محسوس نہیں ہورہا تھا۔

”تم نے ایک کام کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں اور وہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ نہ ہی معاوضے میں کوئی کمی ہوگی۔ لہٰذا اپنا منہ بند رکھو۔“

جیسی کا حلق خشک ہورہا تھا۔ اس نے بہ مشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے اسے تر کیا۔

”کل رات ٹھیک دس بجے تم رقم لے کر یہیں پہنچ جانا اور جمعے کی شب تمہارے پارٹنر کو ایک حیرت انگیز سرپرائز مل جائے گا۔“ یہ کہہ کر نکسن نے جیسی کے پیٹ پر ایک گھونسا جڑ دیا اور پلٹ کر چل دیا۔

☆☆☆

جیسی نے پھلوں کے رس کی شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔ ”یہ ایک زبردست پارٹی ہے، کیتھی۔“

”صرف میرے جیک کے لیے۔“

یہ سن کر جیسی کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔ ”میں خیال

نہیں کرتا کہ اسے اس بات کی توقع ہوگی۔“

”ہاں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام مہمان موجود ہیں۔ کوئی بھی غیر حاضر نہیں رہا۔“ کیتھی نے کہا۔

”اے سنو، لگتا ہے دروازے کی گھنٹی بجی ہے۔“ جیسی نے کہا۔

کیتھی دروازہ کھولنے چلی گئی۔

کچھ ہی لمحوں بعد ایک کلاؤن اندر آگیا۔ ”سوری، میں لیٹ ہوگیا۔“ اس نے کہا۔ ”بتائیں جس لڑکے کا برتھ ڈے ہے وہ کہاں ہے؟“

کیتھی اس کلاؤن کے پیچھے تھی۔ وہ بولی۔ ”سوری مسٹر کلاؤن! میرے خیال میں آپ غلط گھر میں آگئے ہیں۔ میں نے کسی کلاؤن کی خدمات حاصل نہیں کی ہیں۔“

کلاؤن نے کیتھی کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ کمرے میں موجود مہمانوں سے مخاطب ہونے لگا جو اطراف میں کھڑے کیک کھانے، مشروبات پینے اور آپس میں گپ شپ کرنے میں مصروف تھے۔ ”او کے بچو! جیک کہاں ہے؟“

مہمانوں میں سے ایک شخص نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”کیا تمہیں معلوم نہیں؟ جیک وہ ہے جس نے پرپل رنگ کا پارٹی ہیٹ پہنا ہوا ہے۔“

کلاؤن نے اپنے لباس کی بڑی سی جیبوں میں سے ایک میں ہاتھ ڈالا اور اس طرف چل دیا جدھر جیک کھڑا تھا۔

جیسی نے اپنی جگہ تبدیل کرلی تاکہ اسے منظر صاف دکھائی دے سکے۔

کلاؤن نے اپنی جیب میں سے جھٹکے کے ساتھ کوئی چیز باہر نکالی۔ وہ سرخ رنگ کا ایک غبارہ تھا۔ اس نے غبارہ پھلایا اور اسے اس طرح بل دیا کہ وہ ایک ہیٹ بن گیا۔ پھر دوسرا غبارہ پھلایا جو پیلے رنگ کا تھا۔ اس نے غبارے کو بھی ہیٹ کی شکل دے دی اور اس پر ایک گولڈ بینڈ چڑھا دیا۔ ”یہ بادشاہ کے لیے تاج ہے... میرا مطلب ہے برتھ ڈے بوائے کے لیے۔“ اس نے وہ ہیٹ جیک کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

ہر کوئی قہقہے لگانے لگا۔

کیتھی کی نگاہیں کمرے میں موجود مہمانوں کے چہروں کا طواف کررہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان میں سے کس نے کلاؤن کی خدمات حاصل کی ہیں۔

پھر وہ کلاؤن اپنا سینہ تان کر جیک کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے سینے پر ایک مصنوعی پھول سجایا ہوا تھا۔ اس نے وہ پھول جیک کے چہرے کے عین مقابل کردیا۔

تب جیسی کو احساس ہوا کہ وہ کلاؤن کوئی اور نہیں بلکہ نکسن ہے۔ وہ چھلاباز جس کی خدمات اس نے دس ہزار ڈالرز کے عوض حاصل کی ہیں۔

کلاؤن نے اپنے ہاتھ میں موجود چھوٹی سی سرخ رنگ کی گیند کو دبایا تو مصنوعی پھول میں سے پانی کا فوارہ سا نکل کر جیک کے چہرے کو تر کر گیا۔

مہمانوں کے قہقہوں نے کمرا سر پر اٹھالیا۔

پھر کلاؤن نے دونوں بچوں کے لیے غباروں کے کھلونے بنا کر دیے اور بڑوں کے لیے مختلف قسم کے ہیٹ اور نیکلیس بنانے کے بعد وہ کلاؤن ہاتھ لہرا کر سب کو الوداع کہتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ جیسی کو یوں سنائی دیا جیسا اس نے سب کو میری کرسمس اور شب بخیر بھی کہا ہو۔

پھر جس تیزی سے وہ وہاں نمودار ہوا تھا، اس سے کہیں زیادہ تیزی سے وہاں سے روانہ بھی ہوگیا۔

جیسی کی نظریں جیک پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید نکسن

نے مصنوعی پھول کے پانی میں تیزاب یا کسی زہریلے محلول کی آمیزش کر دی ہوگی۔ اب جلد ہی یہ محلول بے چارے جیک کی ہلاکت خیزی کا سبب بن جائے گا۔

پانچ منٹ گزر گئے۔

دس منٹ گزر گئے۔

لیکن جیک کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے کیک کا ایک اور ٹکڑا اٹھالیا اور کافی کے کپ کے ساتھ اسے کھانے میں مگن ہوگیا۔

جیسی نے معذرت طلب کی اور پارٹی سے رخصت ہولیا۔

☆☆☆

جیسی نے وھسکی کا ایک اور جام حلق سے نیچے اتار لیا۔ ''اور لاتے رہو۔'' اس نے بارٹینڈر سے کہا۔

تب اسے اپنے عقب میں ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ''کیا تمہارے خیال میں تم نے خاصی نہیں پی لی؟''

جیسی تیزی سے گھوم گیا اور اسٹول پر سے گرتے گرتے بچا۔ ''تم حرام زادے۔'' وہ الفاظ چباتے ہوئے بولا۔

نکسن اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''

''میں نے تمہیں اس کام کے لیے خاصی رقم ادا کی تھی۔''

''اور میں نے وہ کام نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے دیا۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے؟ سب نے میرے کام کو بے حد سراہا۔''

''بے شک۔ تم نے خود کو ایک زبردست کلاؤن ثابت کر دکھایا۔ غباروں کا جو فن تم نے پیش کیا، وہ حیرت انگیز تھا۔ تمہاری کارکردگی ناقابلِ یقین تھی کمینے۔'' جیسی نے کہا۔

''تو پھر تم کس بات پر اتنے اَپ سیٹ ہو؟ تم نے ایک پریمیم کام کی پریمیم قیمت ادا کی ہے۔ تمہیں مجھ سے بہتر اور کوئی پارٹی کلاؤن نہیں مل سکتا تھا۔ تمہیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا۔'' نکسن نے کہا۔

جیسی اٹھ کھڑا ہوا۔ نشے سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ''میں نے تمہیں ایک بے ہودہ پارٹی کلاؤن بننے کے لیے رقم ادا نہیں کی تھی۔''

''واقعی؟''

''تم بہ خوبی جانتے ہو کہ میں نے تمہاری خدمات اس مقصد کے لیے حاصل نہیں کی تھیں۔''

''تو پھر تم اس رقم کے عوض مجھ سے حقیقت میں کیا کام لینا چاہتے تھے؟'' نکسن نے معصومیت سے پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے۔''

''مجھے واقعی معلوم نہیں۔''

''مجھ سے بہانے بازی مت کرو۔ میں نے تمہاری خدمات جیک کو ایک بڑا سرپرائز دینے کے لیے حاصل کی تھیں۔ ہم دونوں ہی اس بات سے بہ خوبی واقف تھے کہ ہم حقیقت میں کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے، کم آن... تم ایک سابقہ چکمے باز رہے ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ میرا مقصد کیا تھا؟'' جیسی نے زچ ہو کر کہا۔

''اوہ... بجائے میری کلاؤن کی کارکردگی کے تم یہ توقع کر رہے تھے کہ میں...'' نکسن نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں، میں تم سے یہی توقع کر رہا تھا کہ تم اسے قتل کر دو۔ میں یہی چاہتا تھا کہ تم اس کمینے کے، سب مہمانوں کے سامنے چیتھڑے بکھیر دو۔'' جیسی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے جو رقم دی تھی، وہ تفریح مہیا کرنے کے لیے نہیں تھی۔ تم نے میری خدمات اپنے بزنس پارٹنر کو قتل کرنے کے لیے حاصل کی تھیں؟'' نکسن نے کہا۔

''تم اتنے احمق کیونکر ہو سکتے ہو۔ بے شک میں یہی چاہتا تھا، ایڈیٹ۔''

نکسن اسٹول پر سے کھڑا ہو گیا۔ ''جیسی! تمہیں خاموشی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر تم نے اس حق...''

''رک جاؤ... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' جیسی نے کہا۔

نکسن نے اپنی جیب سے ہتھکڑیاں نکال کر جیسی کے ہاتھوں میں پہنا دیں۔

''کیا تم پولیس مین ہو؟''

''ہاں۔'' نکسن نے جیب سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر جیسی کے سامنے لہرا دیا اور بولا۔ ''تم نے جو کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہو گے، وہ تمہارے خلاف عدالت میں استعمال ہو سکتا ہے اور ہوگا۔''

''حرام زادے!'' جیسی بڑبڑا کر رہ گیا۔

''اب بتاؤ کلاؤن کون ہے؟''

حساب کتاب

کاشف زبیر

ایسے معاشرے میں جہاں اکثریت کا شعار جھوٹ ہو... وہاں بلا ملاوٹ کے سچ کم ہی چمک کر ماحول کو روشن و منور کرتا ہے... جھوٹ سچ... اور مکر و فریب کی ایسی ہی گتھیوں میں الجھے ہوئے انسانوں کے تضادات... جو اپنے فائدے کی خاطر کسی کی تکلیف و مصیبت کو خاطر میں لانا پسند نہیں کرتے...

ہر طرح کی کمزوریوں اور تلخیوں کا احساس دلاتی ایک پراثر کہانی...

عطا فرید نے اپنی بائیک قطار میں کھڑی بائیکوں کے درمیان کھڑی کی۔ اگر یہ رش کا وقت ہوتا تو یہاں بائیک کھڑی کرنے کی جگہ بھی نہ ملتی۔ وہ بائیک کھڑی کرنے کے بعد اپنا بیگ لے کر مارکیٹ کی طرف بڑھا۔ یہ مرکزی شہر کی چند بڑی مارکیٹوں میں سے ایک تھی۔ اور چہار طرف سے مصروف ترین سڑکوں سے گھری ہوئی تھی۔ صبح گیارہ سے شام سات بجے تک یہاں لوگوں کا بے پناہ رش ہوتا تھا۔ لوگ دور دور سے خریداری کرنے آتے تھے۔ روز

.....کروڑوں اور سیزن میں اربوں روپے کی سیل ہوتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس مارکیٹ میں معمولی دکان کا مالک بھی کروڑ روپے کی حیثیت تو رکھتا تھا۔ مارکیٹ میں سیکڑوں دکانیں تھیں اور یہاں ہزاروں لوگ کام کرتے تھے۔ یہاں آنے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ اکثر لوگ خریداری کرنے آتے تھے لیکن کچھ عطا فرید جیسے بھی تھے جو یہاں سے کماتے تھے۔

عطا کا سپلائی کا کام تھا۔ وہ مارکیٹ کی دکانوں پر مختلف اشیا کی سپلائی کرتا تھا۔ سپلائی کے لیے کوئی مخصوص چیز نہیں تھی وہ ہر دکان پر جا کر پوچھتا اور جسے جو چیز درکار ہوتی، وہ نوٹ کر کے اگلے دن یا جب اسے درکار ہوتی، لا دیتا تھا۔ ادائیگی کبھی فوری لیتا اور کبھی ایک ہفتے بعد لے لیتا تھا۔ بعض بڑے کسٹمرز تھے جو ہر بار اسے کچھ نہ کچھ آرڈر کرتے تھے، وہ ان سے مہینے کے مہینے حساب کر لیتا تھا۔ عطا فرید زیادہ عمر کا نہیں تھا مشکل سے پچیس سال کا تھا۔ خوش شکل اور جسامت متناسب تھی۔ کپڑے ہمیشہ بہترین اور صاف ستھرے پہنتا تھا۔ سامان اچھے طریقے سے پیک کر کے لاتا اور ہمیشہ وقت پر پہنچاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس مارکیٹ کا سب سے مشہور سپلائر تھا۔ دکاندار کہتے تھے کہ جو چیز کوئی دوسرا نہیں لا پاتا، وہ عطا لے آتا تھا۔ اس کے ریٹ بھی سب سے مناسب ہوتے تھے اور اس کی لائی ہوئی چیز معیاری ہوتی تھی۔ لوگ اس پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے تھے۔

عطا فرید گزشتہ دس سال سے اس بزنس میں تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپ فرید احمد یہ کام کرتا تھا۔ عطا اس کی سب سے بڑی اولاد تھا اور وہ میٹرک میں تھا جب فرید کام کے دوران ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گیا۔ فرید احمد گھر کا واحد کفیل تھا۔ سب سے بڑا عطا پندرہ سال کا تھا۔ جس دن فرید احمد کا انتقال ہوا، عطا کا میٹرک کا آخری پیپر تھا۔ وہ صبح باپ کا جنازہ گھر میں چھوڑ کر پیپر دینے گیا اور واپس آ کر اس نے باپ کو لحد تک پہنچایا۔ اس کا باپ اسے پڑھانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش کے احترام میں عطا نے اس حالت میں جا کر پیپر دیا تھا۔

فرید احمد روز کا کمانے والا شخص تھا۔ وہ کماتا تھا تو اس کے گھر کا چولہا جلتا تھا۔ نوجوانی میں اس نے بہت بُرے حالات بھی دیکھے جب مارکیٹ دنوں کے حساب سے بند ہوتی تھی۔ آئے دن حالات خراب، قتل و غارت گری اور کرفیو ہوتا تھا۔ ان دنوں بعض اوقات اس کے بیوی بچوں کو فاقے بھی کرنا پڑے تھے مگر پھر حالات کسی قدر بہتر ہوئے۔ امن و امان بحال ہو گیا۔ شہر کی رونقیں لوٹنے لگی تھیں۔ اسی لحاظ سے بزنس بھی بہتر ہوا تھا مگر فرید احمد نے اس وقت محسوس کر لیا تھا کہ شہر کا یہ امن و امان عارضی ہے۔ وہ بیوی سے کہتا۔ ”نیک بخت! تو اس وقت کو روتی ہے، مجھے لگ رہا ہے ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس شہر میں آدمی جانوروں کی طرح رہے گا۔ وہ بس زندہ رہے گا، اس کے لیے عزت سے سر اٹھا کر جینا ممکن نہیں ہو گا۔ اس کی جان، مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں ہو گی۔“

زرینہ سہم جاتی تھی۔ ”اللہ نہ کرے... حالات اب بہت بہتر ہو گئے ہیں۔“

”بہتر نہیں ہوئے ہیں جو چھوٹے پیمانے پر ہوا، اس کی اب بڑے پیمانے پر کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ یہ شہر غریب پرور ہے مگر اب درندے اس پر دانت تیز کر رہے ہیں۔“

زرینہ کی سمجھ میں فرید کی باتیں نہیں آتی تھیں۔ فرید زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اسے زندگی کی بہت سمجھ تھی۔ اس نے اپنے بچوں کی پرورش اچھے انداز میں کی تھی۔ انہیں زندگی کی اونچ نیچ بہت کم عمری میں سکھا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ اچانک دنیا سے رخصت ہوا تو عطا کم عمری کے باوجود سمجھدار تھا۔ اس سے چھوٹے تین بہن بھائی تھے۔ فرید احمد ان کے لیے جو ایک اثاثہ چھوڑ کر گیا تھا، وہ یہ مکان تھا۔ زرینہ کو بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ مکان فروخت کر کے اس سے ملنے والی رقم انویسٹ کر دے اور خود کرائے کے مکان میں رہے اور ملنے والی رقم سے اپنا اور بچوں کا گزارہ کرے۔ یہ تجویز دینے والے خود اس مکان پر رال ٹپکا رہے تھے۔ اگر زرینہ مان جاتی تو وہ خود خریدار بن جاتے اور مارکیٹ سے کم قیمت پر حاصل کر لیتے۔ لیکن عطا نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”ہم کسی صورت یہ مکان نہیں بیچیں گے۔“

ہراساں زرینہ نے پوچھا۔ ”تب ہمارا گزارہ کیسے ہو گا؟“

”امی... میں ہوں نا۔“ عطا نے عزم سے کہا۔ ”ہم کیوں اپنا مکان چھوڑ کر کرائے کے مکانوں میں دھکے کھائیں اور پھر سود پر گزارہ کریں۔ آپ کو پتا ہے ابو نے کبھی سود والا کام نہیں کیا۔ دوسرے سپلائر پیمنٹ لیٹ ہونے پر سود لیتے ہیں، ابو نے کبھی ایک پیسا اوپر نہیں لیا۔ انہوں نے کبھی ہمیں حرام نہیں کھلایا تو ہم ان کے بعد کیوں حرام کھائیں۔“

”پھر تو کیا کرے گا؟ اس عمر میں اور اتنی تعلیم کے ساتھ تجھے نوکری کون دے گا؟“

”امی، میں نوکری نہیں اپنا کام کروں گا۔ ابو والا کام۔“ عطا نے جواب دیا۔ ”مجھے پتا ہے یہ کام کیسے کرتے ہیں اور ابو مجھے بتاتے بھی رہے تھے۔“

”پر اس کے لیے پیسا چاہیے... وہ کہاں سے آئے گا؟“

فرید احمد کی جمع پونجی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مکان کے بعد واحد اثاثہ اس کی موٹر سائیکل تھی یا پھر زرینہ کے پاس کچھ زیور تھا لیکن یہ اس نے بچیوں کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ عطا نے سوچا اور اس نے موٹر سائیکل فروخت کر دی۔ جو لوگ اس کے مکان پر نظر لگا کر بیٹھے تھے اور اس بہانے خریدنا چاہ رہے تھے، وہ مایوس ہوئے اور انہوں نے زرینہ سے کہا کہ یہ لڑکا موٹر سائیکل بیچ کر پیسے اڑا دے گا مگر زرینہ کو عطا پر اعتماد تھا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے عطا پر بھروسا ہے۔ وہ کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔“

عطا نے ایک سائیکل لے لی اور اس نے بچ جانے والی رقم ماں کو دی اور سائیکل پر مارکیٹ جانے لگا۔ اسے پتا تھا کہ اس کا باپ کہاں کام کرتا تھا اور کہاں سے سامان لیتا تھا۔ پہلے کئی دن تک وہ ایک ایک دکان پر گیا۔ باپ کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنے باپ کی جگہ کام شروع کر دیا ہے اور اگر ان لوگوں نے کچھ منگوانا ہے تو وہ لا کر دے گا۔ شروع میں لوگوں کا ردِعمل زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے ترس کھا کر کچھ کام دیا تھا لیکن زیادہ تر نے ایک کم عمر لڑکے پر بھروسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ٹھیک ہے فرید احمد بہت اچھا سپلائر تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ اس کا بیٹا بھی اتنا ہی اچھا سپلائر ثابت ہوتا جبکہ اس میدان میں اسے عملی تجربہ بھی نہیں تھا۔ عطا کو جو آرڈر ملے، انہیں پورا کرنے کے لیے وہ سائیکل پر میلوں جاتا تھا۔ سامان لیتا، اسے پیک کرتا اور پھر دکان تک پہنچاتا تھا۔

ابتدائی چند آرڈر پورے کرنے کے بعد اسے ترس کھا کر کام دینے والوں کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی طرح اپنے باپ سے کم نہیں۔ اس نے پیسوں کا تقاضا بھی فوری نہیں کیا۔ جیسا کہ فرید کرتا تھا۔ ایک ہفتے کا کریڈٹ کرتا تھا، اس نے بھی ایک ہفتے کا کریڈٹ دیا۔ اس سے دکاندار اور بھی متاثر ہوئے۔ رفتہ رفتہ اسے کام ملنے لگا۔ شروع کے چند مہینے سخت گزرے۔ اس دوران میں بعض دفعہ اس کے گھر والوں کو ایک وقت کے کھانے پر بھی گزارہ کرنا پڑا مگر پھر حالات بہتر ہو گئے۔ عطا کالج میں نہیں پڑھ سکتا تھا کیونکہ صبح سے شام تک وہ مصروف ہوتا تھا لیکن ایک سال بعد اس نے ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ صبح کی چند کلاسز اٹینڈ کر کے مارکیٹ آ جاتا۔ جن مضامین کی وہ کلاس نہیں لے پاتا تھا، ان کی خود تیاری کرتا تھا۔ وہ ذہین تھا اس لیے اس نے اچھے نمبروں سے آئی کام کیا اور پھر بی کام میں داخلہ لیا۔

وہ اٹھارہ سال کا تھا اور اس دوران میں اس نے کام بھی جما لیا تھا۔ عطا کی محنت سے زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگی۔ زرینہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے لوگوں کے کہنے میں آ کر مکان فروخت نہیں کیا تھا۔ کچھ پیسے ہاتھ میں آنے لگے تو وہ ماہا کی شادی کی تیاری کرنے لگی۔ ان کے ہاں خاندان میں شادی کا رواج تھا۔ عطا اور ماہا کے رشتے بچپن میں ہی طے ہو گئے تھے۔ عطا کے لیے اس کے چچا کی بیٹی سونیا تھی اور ماہا کا رشتہ اس کے تایا کے بیٹے سے طے تھا مگر شادی کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔

دو سال پہلے زرینہ نے اس کی اور ماہا کی شادی ایک ساتھ نمٹانے کا فیصلہ کیا۔ ماہا کو انٹر کے بعد گھر بٹھا لیا تھا کیونکہ اس کے تایا کی طرف سے اس سے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ سونیا آئی تو عطا کی زندگی مکمل ہو گئی۔ اس کے خوش رنگ ساتھ نے عطا کی برسوں کی تھکن اتار دی۔ شادی کے پہلے ہی سال اس کا بیٹا ہوا۔ اس نے اس کا نام دادا کے نام پر فرید رکھا۔ اگلا سال اچھا ثابت نہیں ہوا۔ ایک طرف حالات خراب تھے۔ شہر میں آئے دن ہنگامے اور قتل و غارت گری معمول بن گئی تھی۔ چوری اور چھینا جھپٹی اتنی عام تھی کہ لوگ اب اس کے عادی ہو گئے تھے۔ مگر کام کے دنوں میں شہر بند ہونے سے عطا جیسے بہت سے لوگوں کا کام رک جاتا تھا۔

انہی دنوں زرینہ کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اسے کھانسی کی شکایت تھی اور جب مسلسل علاج سے کھانسی ٹھیک نہیں ہوئی تو عطا اسے اسپیشلسٹ کے پاس لے گیا اور اس نے ابتدائی ٹیسٹ کے بعد زرینہ کو کینسر کے ماہر کو ریفر کر دیا۔ اس نے تصدیق کی کہ زرینہ کو گلے کا کینسر تھا اور یہ ابتدائی مرحلے میں تھا۔ ابھی اس کا علاج ہو سکتا ہے مگر یہ علاج سستا اور آسان نہیں تھا۔ اس میں عطا اور زرینہ دونوں کو بہت مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا۔ عطا نے ایک بڑے نجی اسپتال سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ علاج پر تقریباً تین لاکھ روپے خرچ ہوں گے اور وہ اتنی رقم نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تو

اس کے سر سے وہ قرض اترا تھا جو اس نے اپنی اور ماہا کی شادی کے موقع پر لیا تھا مگر زرینہ کا علاج بھی ضروری تھا۔ وہ ماں کو بہت چاہتا تھا، اسے مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک ٹرسٹ اسپتال سے معلوم کرایا تو خرچ کم ہو کر ایک لاکھ رہ گیا تھا مگر ایک لاکھ بھی آسان نہیں تھا۔ ہاں، وہ قرض ادھار کر کے علاج کرا سکتا تھا۔ یہ قرض وہ بعد میں ادا کر سکتا تھا۔

اس نے چند واقف کاروں سے بات کی۔ کچھ رقم رشتے داروں نے دی اور اس نے زرینہ کا علاج شروع کروایا۔ کیونکہ کینسر ابتدائی مرحلے میں تھا، اس لیے بغیر آپریشن، دواؤں اور کیموتھراپی سے علاج ہو رہا تھا۔ زرینہ کو نہایت تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ خاص طور سے جب اسے کیموتھراپی سے گزرنا پڑتا تو اس کی حالت خراب ہو جاتی۔ اس کے سر کے بال جھڑ گئے تھے۔ اس کے لیے کچھ کھانا پینا محال ہو جاتا ہمہ وقت متلی اور درد کی کیفیت رہتی تھی۔ مگر علاج کے ان مراحل کے بعد اس کی حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ تین کیموتھراپیوں کے بعد ڈاکٹر نے مزید تھراپی روک دی کیونکہ کینسر بہت کم رہ گیا تھا اور اب اس کا علاج دواؤں سے بھی ہو سکتا تھا۔ جس دن ڈاکٹروں نے زرینہ کو صحت یاب قرار دیا، اس دن عطا کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ اس نے مٹھائی بانٹی اور شکرانے کے نفل ادا کیے۔ اس کے بعد اسے خیال آیا کہ اسے کئی لوگوں کی ادھار کی رقم لوٹانی ہے۔

عطا نے پہلے سے زیادہ محنت شروع کر دی۔ پہلے وہ اسی مارکیٹ میں کام کرتا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ یہاں کے آرڈرز بھی مشکل سے پورے کر پاتا تھا۔ مارکیٹ کا تقریباً ہر دکاندار پہلے عطا کو کال کرتا تھا، اس کی طرف سے معذرت کے بعد کسی دوسرے سپلائر کو پکڑتا تھا۔ دوسرے سپلائر جو عطا کی اس مقبولیت اور ترقی سے جلتے تھے، وہ طنزاً کہتے کہ انہیں عطا کا بچا کھچا کھانے کو ملتا ہے۔ نزدیک ایک آبادی میں ریڈی میڈ گارمنٹس کے چھوٹے چھوٹے یونٹ لگے ہوئے تھے۔ عطا نے ان یونٹس کے مالکان سے رابطہ کیا اور ان کی ضرورت کی چیزیں سپلائی کرنے لگا۔ اس سے اضافی آمدنی ہونے لگی تو وہ اس سے قرض اتارنے لگا۔ اس نے پچاس ہزار کا قرض اتارا تھا کہ سونیا کی طبیعت خراب ہوئی اور پتا چلا کہ وہ پھر امید سے ہے جبکہ بیٹا ابھی صرف آٹھ مہینے کا تھا۔ ابھی عطا سونیا کی فکر کر رہا تھا کہ زرینہ کی طبیعت بھی خراب ہوئی اور اس نے فوراً اسے اسپیشلسٹ کو دکھایا کیونکہ اس نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ کینسر پلٹ کا دوبارہ حملہ کر سکتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا بہت ضروری ہے۔

عطا کا خدشہ درست نکلا۔ کینسر دوبارہ نمودار ہوا تھا اور اس بار اس نے گلے کا زیادہ حصہ متاثر کیا تھا۔ اگرچہ ابھی بھی اس کی نوعیت ابتدائی تھی اور اس کا علاج ہو سکتا تھا۔ عطا کو دوبارہ قرض لینا پڑا اور زرینہ کے علاج کی بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ عطا ہی گھر کا بڑا مرد تھا۔ ماجد ابھی پندرہ سال کا تھا، وہ ڈاکٹروں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ عطا اکثر صبح سویرے پہلے زرینہ کو اسپتال لے جاتا پھر وہاں سے واپسی کام پر جاتا۔ جب سے اس نے ریڈی میڈ گارمنٹس کو سپلائی شروع کی تھی، وہ رات نو دس بجے سے پہلے واپس نہیں آتا تھا۔ اس دوران میں اسے سونیا کو بھی اسپتال میں لے جانا پڑتا تھا۔ گھر کا سارا کام بے چاری صبا دیکھ رہی تھی، وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ بھائی کے حالات دیکھتے ہوئے اس نے بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی تھی۔ شام کو آٹھ نو بچے اس سے پڑھنے آتے تھے۔ ان کی ٹیوشن سے وہ اپنا خرچ پورا کر لیتی تھی۔ وہ انٹر کے آخری سال میں تھی، ماجد میٹرک کر رہا تھا۔ وہ بھی ٹیوشن کرتا تھا مگر پھر بھی عطا پر بہت بوجھ تھا۔

انتخابات کے بعد حالات مزید خراب ہو گئے۔ سیزن کا آغاز ہو چکا تھا اور شہر کی مارکیٹس سونی پڑی تھیں۔ تاجروں نے اس امید میں کہ خریدار آئیں گے، کروڑوں کا مال دکانوں میں ڈال لیا تھا اور آرڈر کر دیا تھا۔ سیزن میں عطا کا کام بھی زیادہ چلتا تھا مگر اس بار سیزن شروع ہی نہیں ہو رہا تھا اس لیے عطا کا کام بھی ٹھنڈا تھا اور آمدنی بھی کم ہو رہی تھی۔ صرف کام ہی کم نہیں تھا بلکہ اسے ادائیگی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ جو پہلے ہاتھ کے ہاتھ یا ہفتہ دس دن میں ادائیگی کر دیتے تھے، وہ بھی ہاتھ روک کر بیٹھ گئے حالانکہ عطا کا بل زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ عام طور سے یہ دس ہزار تک بھی نہیں پہنچتا تھا۔ دس ہزار سے اوپر والے آرڈر مہینے میں تین چار سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ ظاہر ہے اگر اس سے زیادہ کے سامان کی ضرورت ہو تو دکان والے خود لے لیتے تھے مگر وہ اپنا وقت اور محنت بچانے کے لیے ایسے کام سپلائرز کے سپرد کر دیتے۔ پچاس ہزار یا لاکھ والے آرڈر مہینوں میں جا کر ملتے تھے۔ عام طور سے ان کی ادائیگی مہینے بعد ہوتی تھی مگر عطا کچھ رقم پیشگی لیتا تھا۔

ایک مہینے سے اسے تیس فیصد ریکوری بھی نہیں ہوئی تھی اور تقریباً دو لاکھ کی رقم پھنسی ہوئی تھی۔ یہ رقم مل جاتی تو وہ پیچھے ادائیگی بھی کر سکتا تھا اور اس کے کئی مسئلے حل ہو

جاتے۔ زرینہ کو جب اسپتال لے جاتا تو خاصی رقم لگتی تھی۔ اسی طرح سونیا کے علاج اور دیکھ بھال پر بھی مستقل رقم خرچ ہو رہی تھی۔ عطا ہر ممکن جگہ سے پہلے ہی قرض لے چکا تھا۔ اسے مزید قرض ملنے کا امکان نہیں تھا۔ جن سے سامان لیا تھا، وہ تقاضا کر رہے تھے اور وہ انہیں ٹال رہا تھا۔ بعض شریف تھے، آسانی سے مان جاتے تھے لیکن بعض تند و تیز لہجے پر اتر آتے تھے۔ کچھ سے عطا کا جھگڑا بھی ہو چکا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ آج کل کے خراب حالات میں کوئی بھی پیسا ایک حد سے زیادہ نہیں پھنسا سکتا تھا۔ لوگ جلد از جلد اپنا پیسا واپس چاہتے تھے۔

عطا کے خیال میں اس صورتِ حال کے ذمے دار وہ دکان دار تھے جنہوں نے اس سے سامان لیا تھا اور اب ادائیگی سے گریز کر رہے تھے۔ وہ غریب سپلائر تھا اور جن سے سامان لیتا تھا وہ بھی بڑے کاروباری نہیں تھے۔ ان کے سامان کی لگی بندھی قیمت ہوتی تھی، وہ سیزن کا فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ بڑے کاروباری مارکیٹ میں بیٹھے لوگ تھے، وہ سیزن کا بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ دس روپے کی چیز پچاس میں اور سو والی چیز پانچ سو میں بیچتے تھے۔ اس کے باوجود خریدار نہ ہونے کا بہانہ بنا کر وہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ادائیگیاں روک لیتے تھے۔ رمضان کا آغاز ہو گیا تھا اور عطا ابھی تک رقم کے لیے پریشان تھا۔ عید کی تیاری کا تو ذہن میں خیال بھی نہیں تھا۔ اسے سب سے زیادہ فکر ماں اور بیوی کی تھی۔ وہ عید پر پرانے کپڑے پہن سکتے تھے لیکن وہ دونوں علاج کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ زرینہ کینسر سے مر جاتی اور سونیا کے لیے ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اس کی دوا یا خوراک میں کوتاہی کی گئی تو بچہ ضائع ہونے کا امکان ہے۔

مارکیٹ کے کپڑے والے حصے میں شیخ نورالدین کی دکان نور کلاتھ تھی۔ شیخ صاحب تقریباً ساٹھ کے پیٹے میں تھے لیکن صحت شاندار تھی۔ اپنے بڑے پیٹ اور بڑی سی گھنی داڑھی کی وجہ سے وہ دکان دار سے زیادہ مولانا لگتے تھے۔ وہ چالیس سال سے اس مارکیٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے باپ نے جب اس دکان کا آغاز کیا، اس وقت یہ چھ بائی چھ فٹ کی چھوٹی سی جگہ میں تھی اور جگہ بھی کرائے کی تھی لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہی اور آج یہ دکان تقریباً سو گز یعنی نو سو مربع فٹ پر پھیل چکی تھی۔ اس نے آس پاس کی دکانیں ہی نہیں، ایک چھوٹی گلی بھی کھا لی تھی۔ دکان میں شیخ صاحب کے تین بیٹوں کے ساتھ دو پوتے اور چار ملازم کام کرتے تھے۔ دکان میں ہر طرح کا کپڑا ابھرا پڑا تھا۔ چھ سو والے لان کے سوٹس سے لے چھ ہزار تک کے سوٹ تھے۔ عام دنوں میں سیل لاکھوں میں جاتی تھی۔ عطا کا اندازہ تھا کہ وہ مہینے میں پچاس لاکھ سے اوپر کماتے تھے۔ ان کا شہر کے مہنگے ترین علاقے میں ذاتی بنگلا تھا جس میں وہ اپنے خاندان سمیت رہتے تھے۔ شیخ صاحب اور ہر بیٹے کے پاس الگ گاڑی تھی مگر پارکنگ کے مسئلے کی وجہ سے وہ ایک ہی گاڑی میں آتے تھے۔ ایک پوتا بائیک پر آتا تھا کیونکہ گاڑی میں پانچ افراد سے زیادہ کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔

سیزن کے دنوں میں دکان بے پناہ چلتی تھی۔ نور کلاتھ کا ایک نام تھا اور یہاں آنے والا ہر فرد پہلے یہیں آتا تھا۔ اتفاق سے دکان تھی بھی بہت موقع کی جگہ پر۔ جو مارکیٹ میں آتا پہلے اسی پر نظر جاتی تھی۔ اندر اس سے بھی بڑی اور شاندار دکانیں تھیں مگر وہ نظر میں آنے سے رہ جاتیں۔ وہاں وہی جاتے تھے جو پہلے سے جانتے تھے مگر کماتے اندر والے بھی کم نہیں تھے البتہ نور کلاتھ کی بات الگ تھی۔ عطا سے پہلے شیخ صاحب کی فرید احمد سے اچھی سلام دعا اور کاروباری تعلق تھا۔ وہ فرید احمد سے ہی سامان منگواتے تھے۔ سوائے کپڑے کے ان کی دکان کی ہر چیز پہلے فرید احمد اور اب عطا سپلائی کرتا تھا۔ وہ بڑے کسٹمر تھے اس لیے عطا خاص خیال رکھتا تھا۔ وہ اسے مہینے میں ادائیگی کرتے تھے کیونکہ ان کا بل اچھا خاصا بنتا تھا اس لیے عطا مہینے کا کریڈٹ بھی کر لیتا تھا۔ ایک ساتھ رقم ملتی تو وہ گھر کے بڑے اخراجات پورے کر لیتا تھا۔

مگر اس بار شیخ صاحب کی طرف سے دو مہینے گزر جانے کے باوجود اسے ادائیگی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے پاس پچاسی ہزار کی رقم تھی۔ عام طور سے عطا پہلی ادائیگی تک کسی دکان والے سے دوسرا آرڈر نہیں لیتا تھا مگر شیخ صاحب سے اس نے بغیر ادائیگی کے تین آرڈر لیے تھے اور ابھی تک کسی ایک کی رقم بھی نہیں ملی تھی۔ کل رقم کا چالیس فیصد سے زیادہ شیخ صاحب کے پاس پھنسا ہوا تھا۔ عطا کو آج شام سونیا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا، اسے انجکشن لگتا اور ڈرپ چڑھتی۔ یہ کوئی تین چار ہزار کا نسخہ تھا اور اس کی جیب میں ابھی ہزار روپے بھی نہیں تھے۔ اگر شیخ صاحب سے رقم مل جاتی تو وہ ان کے سامان کی پیچھے ادائیگی کر کے نو ہزار سے زیادہ بچا سکتا تھا۔ اس کے سر سے بوجھ بھی کم ہو جاتا۔ دو دن بعد زرینہ کو اسپتال لے جانا تھا۔ اس کے لیے بھی پانچ ہزار کی ضرورت تھی۔ آج اسے بہر صورت رقم کی ضرورت

تھی۔ یہی سوچتا ہوا وہ مارکیٹ میں داخل ہوا۔

شیخ صاحب کی دکان پر ویرانی تھی۔ صرف ایک عورت بیٹھی ہوئی بے دلی سے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ عطا نے دیکھا تھا، رمضان کے آغاز سے پہلے اس دکان پر عورتوں کا ازدحام ہوتا تھا۔ آج تین رمضان کو بھی دکان خالی تھی۔ گزشتہ دن مارکیٹ حالات کی خرابی سے بند رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ آج بھی نہیں نکلے تھے۔ شیخ صاحب ایک کونے میں فکرمند بیٹھے تھے اور دوسرے کونے میں ان کے بیٹے آپس میں سر جوڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ عطا کو دیکھ کر شیخ صاحب پھیکے انداز میں مسکرائے۔

"آؤ میاں... بس تمہاری کسر رہ گئی تھی۔"

عطا ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ "خیریت شیخ صاحب... میری آمد ناگوار گزری ہے؟"

"نہیں میاں! تم ان لوگوں میں سے ہو جو اس وقت بھی اچھے لگتے ہیں جب وہ رقم وصول کرنے آتے ہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"میاں، مارکیٹ کا حال دیکھ رہے ہو... کاروبار پر اتنی بری حالت پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔"

عطا کا تجربہ تھا کہ ہر بار جب حالات خراب ہوتے تھے اور مارکیٹ بند ہوتی تھی تو دکاندار یہی کہتے تھے کہ اس سے برا وقت نہیں آیا۔ حالانکہ چند دن بعد حالات بہتر ہوتے ہی وہ اس سے زیادہ کما لیتے تھے جتنا نقصان ہوا ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے کپڑے لینا ہوتے تھے، وہ ایک دو دن کی تاخیر سے لے لیتے تھے۔ رش کا فائدہ اٹھا کر دکاندار رعایت دینے سے گریز کرتے تھے۔ یوں زیادہ فائدے میں رہتے تھے، اس کے باوجود روتے رہتے تھے۔ عطا نے کہا۔

"شیخ صاحب! جتنا آپ کپڑا بیچنے کے لیے بے تاب ہیں، گھروں میں بیٹھی عورتیں کپڑا خریدنے کے لیے اس سے زیادہ بے تاب ہیں۔ اگر حالات کی وجہ سے مردوں نے منع نہ کیا ہوتا تو وہ جان پر کھیل کر بھی مارکیٹ آجاتیں۔ حالات تو ہم جیسوں کے خراب ہیں جن کے پیسے پھنس گئے ہیں۔ جمع پونجی کچھ نہیں ہے اور قرض ادھار کا سہارا ابھی نہیں ہے۔"

شیخ صاحب کچھ کھسیائے کیونکہ عطا نے بہت موزوں الفاظ میں ان کو آئینہ دکھا دیا تھا مگر وہ ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ اس مارکیٹ میں پہلے دن سے ان کا اصول تھا کہ ایک روپے کی ادائیگی بھی وہ دکان سے کما کر کریں گے۔ بے شک گھر میں یا بینک میں کروڑوں روپے پڑے ہوں۔ "میاں کیسی بچت اور کہاں کی جمع پونجی... حالات کی خرابی نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ اب تو دکان سے کمانے کے بجائے لگا رہے ہیں۔ لگاتے لگاتے یہ حال ہو گیا ہے کہ اب گھر کا خرچ بھی مشکل سے چل رہا ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے یہی حالات رہے تو دکان بند کرنا پڑے گی۔"

"شیخ صاحب! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کی سیل فکس ہے، آج نہیں تو کل ہو جائے گی۔ میں بھی اسی مارکیٹ میں بڑا ہوا ہوں۔ دکان نہیں ہے تو کیا ہوا، جانتا تو سب ہوں۔ بات یہ ہے کہ اب معاملہ میری اوقات سے باہر ہو گیا ہے۔ مجھے بہر صورت رقم چاہیے۔ آدمی روٹی کے بغیر رہ سکتا ہے لیکن علاج کے بغیر مر جاتا ہے۔"

شیخ صاحب جانتے تھے کہ عطا کی ماں اور بیوی بیمار ہیں اور دونوں کا علاج جاری ہے۔ یوں تو وہ بڑے کھلے ہاتھ کے آدمی تھے، ہر سال لاکھوں کی زکوۃ نکالتے تھے اور لاکھوں ہی صدقات میں دیتے تھے مگر اسے وہ اپنا اور اللہ کا معاملہ سمجھتے تھے۔ ابھی یکم رمضان کو انہوں نے دو لاکھ زکوۃ کی مد میں دیے تھے اور تقریباً ڈھائی لاکھ روپے کا راشن غریب اور مستحق لوگوں میں تقسیم کیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ اللہ سے تجارت تھی۔ اس کے بندوں سے معاملات کے لیے انہوں نے اللہ کے طے کیے ہوئے راستوں سے ہٹ کر اپنے کچھ اصول وضع کیے ہوئے تھے۔ ان اصولوں کا بنیادی نکتہ مفاد تھا۔ کاروبار میں ذاتی مفاد کے لیے سب جائز تھا اور سوائے نقصان کے سب چلتا تھا۔ عطا ان کے نزدیک ایک کاروباری فریق تھا اس لیے وہ اس سے کاروباری اصولوں کے مطابق پیش آتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کس قدر ضرورت مند ہے اور وہ جھوٹ بول کر رقم لینے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ شیخ صاحب کے نزدیک وہ صدقے کے لائق نہیں تھا۔ جن سے کاروبار کرتے تھے، ان کو قرض حسنہ وہ دیتے نہیں تھے۔

عطا نے آج تک بہت وقار سے کام کیا تھا حالانکہ پیسے نکلوانے کے لیے دوسرے سپلائرز دکانداروں کے سامنے گڑگڑا بھی لیتے تھے، جھوٹی سچی مگر دل گداز کہانیاں بھی بنا لیتے تھے۔ عطا نے کبھی یہ کام نہیں کیا تھا، وہ ہمیشہ سیدھے اور سادہ الفاظ میں اپنی رقم کا تقاضا کرتا تھا۔ کہانیاں اس نے کبھی نہیں سنائی تھیں اور نہ ہی گڑگڑا کر کسی کو جذباتی طور پر بلیک میل کیا تھا۔ اس وجہ سے مارکیٹ کے اکثر لوگ اسے پسند کرتے تھے کہ وہ ان کے اعصاب پر سوار نہیں ہوتا مگر اس وقت وہ پھنسا ہوا تھا اس لیے اس نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ "شیخ صاحب! آپ جانتے ہیں میں جھوٹ بولنے والا شخص نہیں ہوں۔ نہ مجھے ذاتی مشکلات دوسروں کے سامنے رکھنا اچھا لگتا ہے مگر یہ سچ ہے کہ میں بہت پریشانی میں ہوں۔ شیخ صاحب! اللہ نے آپ کو چالیس برس میں بہت نوازا ہے۔ صرف چند دن کے خراب حالات کی وجہ سے اس کی یہ مہربانیاں ختم تو نہیں ہو گئی ہوں گی۔ آپ میرا بل آسانی سے دے سکتے ہیں۔"

عطا کی اس عاجزانہ درخواست پر شیخ صاحب کے تیور بدل گئے۔ انہوں نے کسی قدر روکھے انداز میں کہا۔ "میاں، تم ہمیں جھوٹا قرار دے رہے ہو۔ جب ایک بار بتایا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں تو تمہیں ہماری بات پر اعتبار کرنا چاہیے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" عطا نے بدستور نرمی سے کہا۔ "آپ جانتے ہیں، میں زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے کریڈٹ پر کام کرتا ہوں اور آپ کے دیے آخری آرڈر کو بھی ایک مہینے سے اوپر کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ کے پاس پچاسی ہزار پھنسے ہیں۔ پیچھے مال والے بیٹھے ہیں، ان کے پیسے رکے ہیں۔ میرا کمیشن بھی پھنسا ہوا ہے۔ آپ بڑے آدمی ہیں، میں چھوٹا آدمی ہوں۔ آپ گھر بیٹھ کر بھی کھا سکتے ہیں۔ میں گھر بیٹھوں تو میرے گھر میں فاقے ہوں گے۔"

"میاں، ہم حالات سمجھتے ہیں لیکن ابھی ہم خود مجبور ہیں۔" شیخ صاحب نے بھی چالاکی سے لہجہ نرم کر لیا۔ وہ کسی سے بگاڑ کے قائل نہیں تھے۔ لڑائی جھگڑا بھی بہت نرم اور میٹھے لہجے میں کرتے تھے مگر بہ وقتِ ضرورت آنکھیں ماتھے پر بھی رکھ لیتے تھے جیسا کہ اس وقت کیا۔ "میاں، ہمارے پاس تمہارا نمبر ہے۔ جیسے ہی رقم آئے گی ہم خود کال کر لیں گے۔ تم جانتے ہو ہمیں کسی کا ایک روپیا مارنے کی عادت نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں شیخ صاحب۔" عطا نے کسی قدر مایوسی اور تلخی سے کہا۔ "آپ کسی کا ایک روپیا نہیں رکھتے لیکن اگر بندے کو ضرورت کے وقت ایک روپیا نہ ملے تو بعد میں دس روپے بھی اس کے لیے بیکار ہو جاتے ہیں۔"

شیخ صاحب سے مایوس ہو کر عطا اندر مارکیٹ میں آیا۔ وہاں بھی گاہک نہ ہونے کے برابر تھے۔ البتہ دکاندار پریشان اور ہراساں تھے۔ عطا کھٹکا، یہ غیر معمولی بات تھی۔ شیخ صاحب کی دکان پر بھی ماحول خلافِ معمول تھا مگر اس نے اپنی پریشانی میں توجہ نہیں دی تھی۔ البتہ مارکیٹ کے اندر وہی ماحول پا کر وہ چونکا۔ اس نے کچھ دکانداروں سے سلام دعا کے بہانے پوچھا لیکن وہ ٹال گئے۔ تب عطا، شریف کے پاس آیا۔ شریف کی مارکیٹ میں بیڈ شیٹ اور پردوں کی دکان تھی۔ وہ واحد فرد تھا جس سے عطا کا تعلق کاروبار سے زیادہ دوستی کا تھا۔ شریف نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ "عطا! کہاں غائب ہے یار... دکھائی نہیں دے رہا آج کل؟"

"بس یار بھاگ دوڑ میں لگا ہوں۔ تجھے پتا ہے ماں اور بیوی کا... اوپر سے حالات سیٹ نہیں ہیں۔ پیسا پھنسا ہے، لوگ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"بس یار ہر جگہ یہی چل رہا ہے... پر تیرے ساتھ زیادہ ہی پریشانی ہے۔"

"اسے چھوڑ یہ بتا کہ مارکیٹ میں کیا ہو رہا ہے... سب کے بارہ بجے ہوئے ہیں؟"

شریف نے اسے غور سے دیکھا۔ "تجھے نہیں معلوم؟"

"نہیں۔"

شریف ذرا آگے آیا اور سرگوشی میں بولا۔ "پوری مارکیٹ کو بھتے کی پرچی آئی ہے۔"

عطا گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "تو یہ بات ہے۔ میں بھی کہوں کہ سب پریشان کیوں ہیں۔ کیا سب کو پرچی آئی ہے؟"

"نہیں، ابھی تو بس چند بڑی دکان والوں کو آئی ہے، پر یار ایسا تو ایک دن ہونا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! میرے والد اللہ انہیں جنت نصیب کرے، وہ کہتے تھے کہ آدمی کو اللہ جو دیتا ہے وہ ادائیگی کے لیے دیتا ہے اگر آدمی ٹھیک سے ادا کر دیتا ہے جس کا جو جو حق ہے، وہ ادا کر دیتا ہے تو اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ حق ادا نہیں کرتا، کہیں ڈنڈی مارتا ہے تو پھر اسے آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، اس دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ کاروبار میں لوگ جو کرتے ہیں، اس سے وہ بہت کڑھتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ لوگ جو کر رہے ہیں، ایک وقت آئے گا جب انہیں دنیا میں ہی اس کا دگنا حساب دینا ہوگا اور آخرت کا حساب تو الگ سے ہوگا ہی۔"

"یہ تو ہے۔" عطا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تیرے خیال میں کیا خرابی ہے؟"

"پہلی چیز ناجائز منافع خوری... ایک کی چیز دس میں فروخت کرنا اور اس کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا جبکہ قسم کھانے والوں کو اچھی طرح پتا ہے کہ ہمارے دین نے منع کیا ہے، کاروبار میں دیانت اور سچائی اولین شرط ہے۔"

شریف نے کہا۔ ''یہ چادر میں ڈھائی سو روپے کی لیتا ہوں اور چھ سو بولتا ہوں تو مجھے ساڑھے چار سو ملتے ہیں اور کبھی کوئی زیادہ بولے تو چار بھی کر دیتا ہوں۔ میں ڈائریکٹ چار بولوں تو مجھے تو قیمتِ خرید بھی نہیں ملے گی۔''

''تو پھر لوگوں کا بھی قصور ہوا نا؟'' عطا نے کہا۔

''یار! گاہکوں کا مزاج بھی تو ہم بناتے ہیں۔ کوئی احمق نہیں ہوتا ہے۔ لوگوں کو پتا نہ بھی ہو تب بھی ان کی عقل بتاتی ہے کہ کون سی چیز کتنے کی ہوگی۔ ایک بار ہم سچ بولنا شروع کر دیں تو لوگ بھی خود بہ خود سچائی کے قائل ہو جائیں گے۔ اس ملک سے نکل جاؤ تو شاید ہی کسی ملک میں بیچنے اور خریدنے والے کے درمیان ایسی بداعتمادی ہو۔ یہ تو ایک خرابی ہے، دوسری چیز بجلی کی چوری ہے۔ پوری مارکیٹ نے کنڈے لگا رکھے ہیں۔ ایک ایک دکان میں ہزاروں واٹ کی لائٹنگ ہو رہی ہے مگر بل سیکڑوں واٹ کا بھی نہیں دیا جا رہا ہے۔''

خود شریف کی دکان میں کئی تیز روشنی والے بلب تھے۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔ کپڑے اور رنگوں کو نمایاں کرنے کے لیے انہیں لائٹ تیز رکھنا پڑتی تھی مگر شریف پورا بل دیتا تھا۔ اس نے کوئی کنڈا نہیں لگایا تھا۔ عطا نے کہا۔ ''یہ مجبوری نہیں ہے۔ لوگ اتنا کماتے ہیں، بجلی کا بل ادا کر سکتے ہیں۔''

''پھر کوئی ٹیکس نہیں دیتا ہے۔ سب کو پتا ہے کہ سیلز ٹیکس سے لے کے انکم ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس تک کئی طرح کے ٹیکس ان پر لگتے ہیں لیکن اس بازار میں ٹیکس ادا کرنے والے سو میں سے دس لوگ بھی نہیں ہیں۔ اور جو ادا کرتے ہیں، وہ بھی بس خانہ پُری کرتے ہیں۔ ایک ملازم پیشہ آدمی جو مہینے کی تیس چالیس ہزار روپے تنخواہ لیتا ہے، اس کی آمدنی سے سارے ٹیکس کٹتے ہیں مگر یہ جو یہاں سے لاکھوں کروڑوں کماتے ہیں، ایک روپیا ٹیکس نہیں دیتے۔ کیا یہ چوری نہیں ہے... ان پر عذاب نہیں آئے گا؟'' شریف کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''لیکن تم تو ٹیکس دیتے ہو۔'' عطا نے کہا۔

''جب خدا کی چکی حرکت میں آتی ہے تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔'' شریف نے کہا۔ ''اور ایسا لگ رہا ہے کہ خدا کی چکی حرکت میں آچکی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں باہر چلا جاؤں، اس سے پہلے کہ حالات قابو سے باہر ہو جائیں۔''

شریف مارکیٹ میں سب سے الگ تھا۔ اس کی باتوں اور خیالات کی وجہ سے دوسرے اس سے دور رہتے تھے۔ وہ مارکیٹ یونین کا ممبر بھی نہیں تھا۔ عطا نے تائید کی۔ ''تو ٹھیک کر رہا ہے یار... یہاں اب کچھ نہیں رہا ہے۔ لگ رہا ہے آنے والے وقت میں حالات مزید خراب ہوں گے۔''

''سامنے کی بات ہے کیونکہ ہم اپنی حرکتیں درست کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ آج یہ منہ لٹکائے بیٹھے ہیں، کل گاہک آئے گا تو اس کی کھال اتارنے پر تیار ہو جائیں گے۔''

عطا نے اسے بتایا کہ اس کی کتنی رقم پھنسی ہے اور دکان والے پیسے نہیں دے رہے ہیں۔ شریف نے کہا۔ ''یہ جان کے خوف سے بھتا دے سکتے ہیں، اللہ کے خوف سے حق داروں کو ان کا حق نہیں دے سکتے۔''

اس دن عطا کو مشکل سے دس ہزار کی رقم ملی اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب وہ ماں اور بیوی کو ڈاکٹر کے پاس تو لے جا سکے گا۔ اس بار زرینہ کے علاج پر زیادہ خرچ ہو رہا تھا۔ پہلے کچھ رشتے داروں نے مدد کی تھی لیکن وہ بھی ان کی طرح متوسط طبقے کے تھے، بار بار مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے سب عطا کو خود کرنا پڑ رہا تھا۔ سارے رمضان وہ بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ رقم کے لیے بار بار دکان والوں کے پاس جاتا کیونکہ سیزن میں اسے کام ملتا تھا اور اب یہ حال ہو گیا تھا کہ اسے مال دینے والے صاف انکار کر چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پہلے والے پیسے ادا کرے، اس کے بعد مال کی بات کرے۔ اسے کیش پر بھی مال نہیں ملے گا۔ دکان داروں سے جو رقم مل رہی تھی، وہ گھر اور علاج کے اخراجات میں لگتی جا رہی تھی۔ جو دکاندار اسے سامان کا آرڈر کرتے تھے، وہ پہلے سے پیسا دینے کو تیار نہیں تھے۔ ہوتے ہوتے رمضان کے بعد تک وہ ایک لاکھ روپے کا مقروض ہو گیا۔ یہ وہ رقم تھی جو اس نے دکان والوں سے وصول کی تھی اور گھر میں خرچ ہو گئی۔ اب اسے سامان مہیا کرنے والوں کو رقم ادا کرنی تھی اور اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خود کو انتہائی بے بس اور لاچار محسوس کیا۔ اس کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا اور دونوں طرف سے اس کے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ اس کا تو کام ہی تعلقات کی بنیاد پر چلتا تھا۔

عید کے فوراً بعد شریف اپنی دکان فروخت کر کے دبئی چلا گیا۔ اس کا ارادہ وہاں کاروبار کرنے کا تھا۔ وہ ملک اور

شہر کے حالات سے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اس سے امید تھی کہ وہ عطا کی مدد کر سکتا ہے لیکن اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ عید کے دس دن بعد شیخ نورالدین نے اسے بلایا اور بہت باتیں سنانے کے بعد اسے صرف پندرہ ہزار دیے۔ ان کا کہنا تھا کہ سیزن بالکل اچھا نہیں گزرا تھا اور آمدنی سے زیادہ خرچ ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ سراسر غلط بیانی کر رہے تھے۔ عطا تقریباً روز مارکیٹ آرہا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ نور کلاتھ نے آخری دنوں میں بہت اچھا کاروبار کیا تھا۔ دکان گاہکوں سے بھری رہتی تھی۔ عطا نے احتجاج کیا۔

''شیخ صاحب! یہ زیادتی ہے۔ بل پچاسی ہزار کا ہے اور آپ صرف پندرہ ہزار دے رہے ہیں۔ میرے ستر ہزار کب ملیں گے؟''

''شکر کرو یہ بھی مل گئے ہیں ورنہ دوسروں کو یہ بھی نہیں ملے ہیں۔'' وہ رکھائی سے بولے۔

عطا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے تھے... جب انہوں نے کمایا تھا تو اسے کیوں نہیں دے رہے تھے؟ اس کا راز ان کی دکان پر کام کرنے والے ایک ملازم اصل خان نے فاش کیا۔ وہ اتفاق سے عطا کو بس اسٹاپ پر کھڑا مل گیا تھا۔ عطا نے اسے لفٹ دی۔ وہ اس کے گھر سے ذرا آگے رہتا تھا۔ راستے میں اس نے انکشاف کیا کہ شیخ صاحب کو بھی بھتے کی پرچی آئی تھی اور انہوں نے دس لاکھ روپے ادا کیے تھے۔ اس پر وہ بہت بھنائے ہوئے تھے اور انہوں نے تمام ادائیگیاں روک دی تھیں.... عطا دنگ رہ گیا۔ ''بھتا ادا کر دیا اور لوگوں کا حق روک لیا؟''

''جی عطا بھائی! بھتے والا جان لیتا ہے لوگ بے چارے کیا کریں گا؟'' اصل خان نے سادگی سے حقیقت بیان کی۔ عطا کو شریف کی بات درست لگنے لگی۔ شیخ صاحب نے بھتا خوروں کے ڈر سے دس لاکھ دے دیے تھے مگر اسے پچاسی ہزار نہیں دیے تھے اور اب بھی وہ اس بہانے اسے اور اس جیسے حق داروں کو تنگ کر رہے تھے۔ عید کے بعد عطا کا اصل امتحان شروع ہوا، زرینہ کے علاج کا مشکل مرحلہ شروع ہو گیا تھا اور اس کے لیے خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ اب اس کے پاس رقم کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ مکان فروخت کر کے اتنی رقم کر سکتا تھا کہ ماں کا علاج کرا سکے مگر زرینہ نے انکار کر دیا۔

''میں مکان فروخت نہیں کروں گی۔ یہ میرے بچوں کی چھت ہے۔''

''ہماری چھت، زمین، دیوار سب آپ ہیں۔'' عطا نے ماں سے کہا۔ ''آپ نہیں ہوں گی تو ہم گھر ہوتے ہوئے بھی بے گھر ہوں گے۔''

''میرے بچے، میں عمر کے آخری حصے میں ہوں۔ آج کینسر سے بچ بھی گئی تو چند سال بعد مجھے اس دنیا سے گزرنا ہے لیکن مکان چند سال کیا دسیوں سال میں بھی نہیں بنے گا۔ آج کل اپنا مکان بنانا ناممکن ہو گیا ہے۔''

عطا اور دوسرے بچوں نے زرینہ کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی نہ، ہاں میں نہ بدلی۔ مسئلہ یہ تھا کہ مکان زرینہ کے نام پر تھا اور وہ اس کی مرضی کے بغیر اسے فروخت بھی نہیں کر سکتے تھے ورنہ شاید ایسا کر گزرتے۔ وہ زرینہ کو مرتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اب تک اس کا علاج ہو رہا تھا لیکن آگے یہ علاج مشکل نظر آرہا تھا۔ عطا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ کس طرح سے گھر چلائے؟ کس طرح سے ماں اور بیوی کا علاج کرائے؟ سونیا کی دوائیں بند ہو گئی تھیں کیونکہ اب اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ وہ تو سونیا کے ماں باپ نے دوائیں لا دی تھیں ورنہ شاید اس کی حالت بھی خراب ہو جاتی۔ عطا کا کام تو تقریباً بند ہو گیا تھا، ساتھ ہی اس کا مارکیٹ کے کئی لوگوں سے جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ خاص طور سے شیخ صاحب سے اس کی منہ ماری ہو گئی تھی اور ان کے مشتعل بیٹے اسے مارنے کو دوڑے تھے لیکن شیخ صاحب نے روک لیا اور عطا سے کہا۔

''یہاں سے چلے جاؤ... اس سے پہلے کہ میرے بیٹے تمہیں اسپتال پہنچا دیں۔''

''یہ بھی کر لیں۔'' عطا نے تلخی سے کہا۔ ''میری تباہی میں سب سے زیادہ ہاتھ آپ کا ہے۔ آپ کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ یہ اللہ کا عذاب ہے جو آپ جیسے حق مارنے والوں پر آیا ہے۔ آگے بھی آئے گا۔ ہم جیسے غریبوں کا حق مار کر دوسروں کو ناحق دینا پڑے گا۔ اس سے بھی زیادہ ہوگا۔''

عطا اس روز مارکیٹ سے نکلا تو بہت مایوس اور روہانسا تھا۔ اسے لگا اس کی محنت اور حلال روزی کمانے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ دم بہ خود رہ گیا۔

☆☆☆

شیخ صاحب دکان پر تھے۔ دکان کچھ پہلے کھل گئی تھی۔ ملازم مال سیٹ کر رہے تھے اور شیخ صاحب بیٹوں کے ہمراہ گزشتہ روز کی سیل کا حساب کر رہے تھے۔ حساب

کتاب کے بعد ان کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ آگئی۔ یہ ایوریج سیل سے چالیس فیصد زیادہ تھی۔ شادیوں کا سیزن شروع ہو گیا تھا اور ان کی کوشش تھی کہ بھتے میں دیے دس لاکھ روپے جلد از جلد وصول کرلیں۔ انہوں نے تمام سوٹوں پر قیمت دس سے بیس فیصد بڑھا دی تھی۔ اب کسی چیز کی قیمت بڑھانے کے لیے بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ حکومت سے لے کر ہول سیلر تک کسی کو بھی الزام دیا جا سکتا تھا اور کچھ نہیں تو ٹرانسپورٹ کا کرایہ بڑھ جانے کا بہانہ کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں نے اب مہنگائی کو ایک اجتماعی عذاب سمجھ لیا ہے جس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی طبقہ مزے میں ہے تو وہ دکاندار اور تاجر طبقہ ہے۔ شیخ صاحب اپنی گدی پر بیٹھے تھے کہ ان کے موبائل کی بیل بجی۔ انہوں نے نمبر دیکھا۔ یہ اجنبی نمبر تھا، انہوں نے کال کاٹ دی۔ چند لمحے بعد اسی نمبر سے میسج آیا۔

"بڈھے کال ریسیو کر۔"

اس طرزِ تخاطب پر شیخ صاحب کے ماتھے پر شکنیں آئیں مگر وہ فکر مند ہو گئے۔ کوئی ان سے اس طرح سے بات نہیں کرتا تھا۔ اسی لمحے بیل بجی اور نمبر دیکھ کر انہوں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کسی نے بدتمیز اور اجڈ لہجے میں کہا۔ "کال کیوں نہیں اٹھاتا... تو چاہتا ہے تیری دکان تجھ سمیت پھونک دیں؟"

شیخ صاحب ڈر گئے پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم... اس طرح سے بات کیوں کر رہے ہو؟"

"ابھی تو بہت شرافت سے بات کر رہا ہوں۔" بولنے والے نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "جب تو ہمارا مطالبہ نہیں مانے گا تب تجھ سے ٹھیک سے بات کریں گے جس کے تو قابل ہے۔"

"کیسا مطالبہ؟"

"مطالبہ اور گولی دونوں تیری دکان کے دائیں والے شٹر کے اوپر رکھا ہے، کسی سے اتروا کے دیکھ لے۔" کہتے ہی دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی اور شیخ صاحب نے اپنے بڑے بیٹے کو بلایا جو نزدیک تھا اور غور سے باپ کی گفتگو سن رہا تھا، اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"ابا جی! کوئی مسئلہ ہے؟"

"ہاں، کسی نے دائیں شٹر کے اوپر کچھ رکھا ہے، وہ اٹھا لو مگر کسی کو خبر نہ ہو۔"

بیٹے نے ہوشیاری سے اوپر لگے جالے صاف کرنے کے بہانے شٹر کے اوپر والے حصے میں رکھا کاغذ کا گولہ اٹھا لیا جس میں ایک پستول کی گولی لپٹی تھی اور کاغذ پر پانچ لاکھ روپے لکھا تھا۔ شیخ صاحب کا چہرہ ست گیا۔ "ابھی تو دس لاکھ دیے تھے۔ یہ نئی مصیبت کہاں سے آگئی؟"

ذرا دیر میں ان کے تینوں بیٹوں کو پتا چل گیا اور وہ شیخ صاحب کے پاس جمع ہو گئے۔ منجھلے نے غصے سے کہا۔ "ابھی تو دس دیے تھے اب پانچ دیں تو ہمارے پاس کیا بچے گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" سب سے چھوٹے نے کہا۔

"تو کیا انکار کر دیں؟" بڑے نے کہا۔ "جانتے ہو آج کل کیا ہو رہا ہے۔ انکار پر گولی مار جاتے ہیں، دکان میں بم پھینک دیتے ہیں۔"

"تب ٹھیک ہے، دکان پر بورڈ لگا دیتے ہیں جن جن حضرات کو بھتا چاہیے، وہ رجوع کر کے لے لیں۔" منجھلے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپس میں مت لڑو۔" شیخ صاحب نے مداخلت کی۔ "اس مسئلے کا حل سوچو۔"

"اب اس کا فون آئے تو اس سے بات کریں کہ رقم کچھ کم کرے۔" بڑے نے کہا۔ منجھلا اور چھوٹا مخالف لگ رہے تھے لیکن بڑے بیٹے نے کہا۔ "یہ بلٹ کاغذ میں لپیٹ کر بھیجنے کے بجائے اگر پستول سے چلایا جائے تو ہم میں سے کوئی بھی اس کا نشانہ بن سکتا ہے۔"

یہ سنتے ہی دونوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایسے کئی واقعات ہو چکے تھے جب تاجروں اور دکانداروں نے بھتا دینے سے انکار کیا تو انہیں بے دریغ قتل کر دیا گیا یا ان کے کاروبار پر حملے ہوئے۔ ایک سال کے دوران اس مارکیٹ کے تین افراد مارے جا چکے تھے اور پولیس کسی ایک کے قاتل کو بھی گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ بھتا مافیا اتنی طاقتور ہو گئی تھی کہ اس کے آدمی اب کھلے عام آکر پرچیاں دے کر جاتے تھے۔ کوئی انہیں پوچھنے اور روکنے والا نہیں تھا۔ ایسے میں شیخ صاحب اور بیٹوں کا فکر مند ہونا لازمی تھا۔

گاہک آتے رہے اور دکان کا کام چلتا رہا۔ ساتھ ہی شیخ صاحب سوچتے رہے کہ کیا کریں۔ بیٹوں نے فیصلہ ان پر چھوڑ دیا تھا۔ رات جب وہ دکان بند کرنے کی تیاری کر رہے تھے تو پھر اسی نمبر سے کال آئی۔ "کیا سوچا بڈھے...؟"

"دیکھو، ابھی ایک پارٹی کو دس لاکھ دیا ہے۔"

"اسے دس لاکھ دیا، ہمیں پانچ لاکھ دیتے ہوئے

موت آرہی ہے؟" بولنے والے نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "لگتا ہے دوسری گولی تیرے بھیجے میں اتارنی پڑے گی۔ تو کیا سمجھتا ہے بس ایک گولی تھی جو تجھے بھیج دی؟ نہیں، ایسی ہزاروں گولیاں ہیں تیرے جیسوں کے لیے۔"

"میں انکار تو نہیں کر رہا۔" شیخ صاحب اس آدمی کے غصے سے ڈر گئے۔ "پر ابھی گنجائش نہیں ہے۔"

"گنجائش کی بات کرتا ہے موٹے پیٹ والے۔" وہ دہاڑا۔ "تیرے بارے میں سب جانتا ہوں۔ یہ بھی کہ تو نے رات کیا کھایا تھا۔ لوگوں کو لوٹ لوٹ کر بہت مال جمع کیا ہے۔ غلطی ہوگئی جو تجھ سے پانچ مانگے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تجھے اب دوسری پرچی بھیجتے ہیں بم میں لپیٹ کر، اس سے تیرا دماغ درست ہوگا۔ یہ پانچ رکھ لے تیرے کفن دفن میں کام آئیں گے۔"

"نہیں... نہیں۔" شیخ صاحب کی ہمت جواب دے گئی۔ "میں دیتا ہوں... پانچ لاکھ دیتا ہوں۔"

اتفاق سے اس وقت دکان میں کوئی گاہک نہیں تھا، ملازموں کی شام کے وقت رش کم ہوتے ہی چھٹی کردی گئی تھی۔ بیٹے شیخ صاحب کے پاس جمع تھے اور کال سن رہے تھے۔ شیخ صاحب کی طرف سے رضامندی پاتے ہی اس نے کہا۔ "رقم تیار رکھنا... ہم بتائیں گے کہ رقم کیسے لینی ہے؟"

☆☆☆

موبائل بند کر کے عطا نے اس میں لگی سم نکال لی۔ یہ سم اس نے بہت پہلے لی تھی جب سم بغیر شناختی کارڈ کے مل جاتی تھی۔ اس نے اسے بہت کم استعمال کیا تھا اور یہ نمبر کسی بھی کاروباری بندے کے پاس نہیں تھا۔ جب شیخ صاحب نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا اور وہ حد سے زیادہ مایوس ہوا تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ جو گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکل رہا، کیوں نہ اسے ٹیڑھی انگلیوں سے نکالے۔ جیسے جیسے وہ سوچتا گیا، اس کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ اس نے آج تک ایک روپیا حرام نہیں کمایا تھا، کبھی ناجائز نفع یا کمیشن نہیں لیا تھا مگر اب اس کے حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ حرام کھانے سے لے کر جرم کرنے تک کو تیار ہو گیا تھا۔ گولی کا حصول مسئلہ نہیں تھا۔ اس شہر کے بعض حصوں میں اسلحہ کھلے عام بکتا ہے اور ہر فرد وہاں سے لے سکتا ہے بشرطیکہ وہ دام ادا کر سکتا ہو۔

زرینہ کو چند دن بعد ایک اہم تھراپی سے گزرنا تھا اور اس کے لیے دس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ سونیا کا علاج اس کے ماں باپ نے اپنے ذمے لے لیا تھا مگر اس کی خوراک اور دوسرے اخراجات تو تھے۔ خوراک کی کمی اسے کمزور کر رہی تھی۔ عطا اسے اور ماں کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اسے خیال آتا کہ وہ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ شاید اسی لیے وہ اس جرم کی ہمت کر سکا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر کی پکار نظر انداز کر دی تھی۔ اس نے اگلے دن صبح کے وقت شیخ صاحب کو کال کی۔ وہ آواز بدل کر اور جاہلانہ انداز میں بات کرتا تھا، جیسے نچلے درجے کا کوئی گھٹیا مجرم ہو۔ اس وقت بھی اس نے ایسے ہی بات کی اور شیخ صاحب سے رقم کا پوچھا۔ "بڈھے، رقم تیار ہے؟"

"ہاں، تیار ہے۔ اب تم جیسے چاہو لے لو۔"

"تو ایک بندہ، بائک اور رقم تیار رکھ... میں بتاؤں گا رقم کہاں بھیجنی ہے۔"

"تینوں چیزیں تیار ہوں گی۔" شیخ صاحب نے یقین دلایا۔

"تو نے خود کو بچا لیا۔" عطا نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

شیخ صاحب نے پانچ لاکھ روپے پانچ ہزار کے نوٹ والی گڈی کی صورت میں دیے تھے۔ یوں رقم چھوٹی سی گڈی میں آگئی۔ اسے انہوں نے ایک موٹے خالی لفافے میں رکھ کر اسے ٹیپ سے بند کیا۔ وہ فکرمند سے بیٹھے تھے۔ بھتے والے کے فون کے بعد انہوں نے اپنے قابلِ اعتماد ملازم شفیع محمد کو بلایا اور اس سے کہا۔ "شفیع! تمہیں ایک کام کرنا ہے۔"

"حکم کریں سیٹھ۔"

"ایک امانت پہنچانی ہے۔"

"لے جاؤں گا۔" شفیع محمد نے مستعدی سے کہا۔ وہ کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا جو کہا جاتا، وہ کرتا۔ پھر شیخ صاحب کو اس پر اعتماد بھی تھا۔ وہ اس کام کے لیے اپنے بیٹوں یا پوتوں میں سے کسی کو بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ بھتا خور گروہ بڑا ہوا تو وہ اغوا بھی کر سکتا تھا اور بھتے کے بعد انہیں تاوان بھی دینا پڑتا۔ دوسری کے بعد تیسری ضرب انہیں بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ وہ اکیلے بیٹھے سوچ رہے تھے اور ان کے بیٹے، پوتے اور ملازم آنے والے گاہکوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی جان پہچان والے سے بس علیک سلیک کر لیتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے اور انہیں نہ جانے کیوں رہ رہ کر عطا یاد آرہا تھا۔ انہوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ بے شک اس نے بھی

بدتمیزی کر دی تھی اور شیخ صاحب برداشت نہیں کر سکے تھے مگر زیادتی ان کی طرف سے بھی تھی۔ وہ اسے رقم دے سکتے تھے، دکان سے بھی دے سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے اسے ضرورت ہے۔ اس کی بیوی اور ماں دونوں بیمار ہیں۔ اس کا کام تقریباً ختم ہو گیا ہے، اس کے باوجود انہوں نے اسے دھتکار دیا جیسے وہ بھیک مانگ رہا ہو۔ آخری بار اس نے کیسے کہا تھا کہ اس کی تباہی کے ذمے دار وہ تھے۔ ان کے ساتھ ٹھیک ہو رہا تھا اور آگے اور ہوگا۔ وہ بے چین ہو گئے۔ کیا انہیں عطا اور اس جیسے غریبوں کی آہ لگی تھی جن کی وہ رقم دبا کر بیٹھے تھے؟

اب انہیں خیال آرہا تھا کہ کیا تھا جو وہ اسے رقم دے دیتے۔ ان کو کوئی کمی نہیں آتی لیکن عطا کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ وہ اچھا سپلائر تھا۔ اس کے لائے سامان میں شاذ ہی کوئی مسئلہ آتا تھا۔ اپنا کام پوری ذمے داری سے اور وقت پر کرتا تھا۔ دوسرے سپلائرز نہ تو اتنے ذمے دار تھے اور نہ وقت کے پابند تھے۔ اس سے کاروبار میں خلل آتا تھا۔ اب انہیں دکان کے لیے بعض چیزوں کی اشد ضرورت تھی اور انہوں نے ایک سپلائر سے کہا تھا مگر وہ اب تک سامان لے کر نہیں آیا تھا۔ عطا کے بعد انہوں نے مختلف سپلائرز سے کام لیا تھا مگر وہ کسی سے مطمئن نہیں تھے۔ نہ سامان اچھا تھا، نہ سروس اور نہ ریٹ ٹھیک تھے۔ پچاسی ہزار ان کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک دن میں اس سے زیادہ کما لیتے تھے۔ جیسے جیسے وہ عطا کے بارے میں سوچ رہے تھے، ان کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ پتا نہیں اس کی ماں کا علاج کیسے چل رہا ہوگا یا وہ بغیر علاج گھر میں پڑی ہوگی؟ اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اور بے چین ہو رہے تھے۔

☆☆☆

صرف شیخ صاحب نہیں، عطا بھی بے چین ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جرم کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر کو دبا لیا تھا مگر وہ دبا نہیں تھا۔ اب وہ عطا کو بے چین کر رہا تھا۔ اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ بے شک اس کی ماں بیمار تھی، موت سے لڑ رہی تھی۔ سونیا کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اور گھر میں تقریباً فاقوں کی نوبت آگئی تھی لیکن یہ سب بھی اس ایک جرم کا جواز نہیں تھا جو اس سے ہوا تھا اور آگے ہونے جا رہا تھا۔ اس کے باپ نے اسے ہمیشہ حلال کھلایا اور حلال کھانے کی تلقین کی۔ آج وہ اپنے باپ کی تربیت بھی بھول گیا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر وہ سم نکالی جس کی مدد سے اس نے یہ کام کیا تھا۔ اس کے بغیر وہ اتنی آسانی سے یہ سب نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ یہ سم توڑ دے، اسے ضائع کر دے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہو جائے گا کیونکہ پھر وہ شیخ صاحب سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف اپنے حالات کا خیال اس کے ہاتھ روک رہا تھا۔ اچانک اس کے موبائل نے بیل دی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے موبائل دیکھا۔ اس پر شیخ صاحب کا نام آرہا تھا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ اسے کیوں کال کر رہے تھے؟ کیا وہ کچھ جان گئے تھے؟ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔" اس کی آواز مرتعش تھی۔

"عطا میاں بول رہے ہو نا؟" شیخ صاحب نے کہا۔

"جی شیخ صاحب! بات کر رہا ہوں۔"

"ہم شیخ نورالدین بات کر رہے ہیں۔"

"میں نے پہچان لیا شیخ صاحب... آپ کا نمبر میرے پاس محفوظ ہے... حکم کریں؟"

"میاں تم ابھی دکان پر آسکتے ہو...؟"

"شیخ صاحب! کوئی ضروری بات ہے؟"

"ہاں میاں، بہت ضروری بات ہے۔" شیخ صاحب نے کہا۔ "تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

عطا کے دل میں خدشے سرسرانے لگے۔ اس نے حلق صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن کیوں شیخ صاحب؟ آپ مجھے واضح جواب دے چکے تھے، انکار میں۔"

"اسے بھول جاؤ میاں، اس وقت تمہارا آنا بہت ضروری ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تم نہیں آئے تو ہم پولیس بھیج کر بلوا لیں گے۔"

پولیس کے نام پر عطا کا دل پھر حلق میں آیا اور اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "پولیس...؟"

"ہاں، اگر تم نہیں آئے تو ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔"

اب عطا کو یقین ہو چلا تھا کہ شیخ صاحب کو پتا چل گیا ہے۔ شاید اس نے کبھی یہ نمبر انہیں دیا ہو جس سے بات کی تھی اور شیخ صاحب کے پاس وہ نمبر محفوظ ہو۔ وہ جان گئے تھے کہ بھتے کے لیے کال اس نے کی تھی۔ اگر وہ نہ جاتا تب بھی فرق نہیں پڑتا۔ شیخ صاحب اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے پولیس کو رپورٹ کر دیتے۔ اس کے بعد پولیس اس کے گھر تک آجاتی۔ وہ کہیں نہیں چھپ سکتا تھا۔ اس کے پاس تو چھپنے کے وسائل بھی نہیں تھے۔ اسے شیخ صاحب کی دکان تک جانا ہی تھا، اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

"شیخ صاحب، شام تک نہیں آسکتا؟"

''نہیں، ابھی اور ایک گھنٹے کے اندر... شام کو مسئلہ ہو جائے گا۔ تم چار بجے تک لازمی ہمارے پاس پہنچ جاؤ۔''

عطا نے سرد آہ بھری اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں شیخ صاحب۔''

عطا نے خراب ترین حالات میں بھی بائیک بیچنے کا نہیں سوچا تھا کیونکہ آج کل کے دور میں وہ بیمار ماں اور بیوی کو لے کر ٹیکسی کے منہ مانگے کرائے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس آمد و رفت کا واحد ذریعہ بھی بائیک تھی۔ وہ مارکیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ دکان پر پہنچا تو وہاں خاصا رش تھا۔ شیخ صاحب اپنے مخصوص کونے میں بیٹھے تھے۔ عطا کا دل ڈوبنے لگا، اتنے لوگوں کے درمیان وہ اس کا پول کھولیں گے۔ پھر مارکیٹ کا ایک ایک دکان دار اسے جانتا تھا۔ شاید پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے شیخ صاحب اپنی بھڑاس نکالنا چاہتے تھے۔ وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ عطا پاس پہنچا تو پہلے شیخ صاحب کے ایک بیٹے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آیا اور خراب لہجے میں بولا۔ ''تم... یہاں کیوں آئے ہو؟''

''وہ شیخ صاحب...''

اسی لمحے شیخ صاحب نے اسے دیکھ لیا۔ انہوں نے آواز دی کہ عطا کو آنے دو۔ وہ ان کے سامنے جا بیٹھا۔ وہ سہما ہوا تھا، وہ اتنا فکر مند تھا کہ سم ضائع کرنا بھول گیا تھا اور اب وہ اس کی جیب میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ واپس جا کر اسے کہیں پھینک سکے۔ اب وہ ثبوت بھی ساتھ لیتا آیا تھا اور کسی مجرم کی طرح شیخ صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پولیس کے حوالے کیا جاتا تو سم بھی پولیس کے ہاتھ آجاتی۔ شیخ صاحب خاموش تھے۔ غالباً وہ سوچ رہے تھے کہ اسے کس طرح بے عزت کریں۔ کچھ دیر بعد اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''جی شیخ صاحب! آپ نے مجھے یاد کیا؟''

''ہاں میاں۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ''آج تمہارا خیال آیا اور سوچا تمہیں بلوا لیتے ہیں۔ یہ بتاؤ تمہاری والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ابھی تک تو ٹھیک ہے۔'' عطا نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پر شاید اب ٹھیک نہیں رہے گی۔''

''کیا خدانخواستہ مرض بڑھ رہا ہے؟''

''نہیں، علاج رک جائے گا۔ جہاں تک میں کرا سکتا تھا، اب اس کے بعد میری استطاعت ختم ہو گئی۔ جب علاج نہیں ہوگا تو وہ ٹھیک کیسے رہیں گی۔'' عطا خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ اسے حیرت تھی کہ شیخ صاحب کیسی باتیں کر رہے تھے۔ شاید وہ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''عطا میاں، ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے دنوں میں تمہارے ساتھ کچھ تلخ کلامی ہوئی اور ہم تمہاری رقم بروقت ادا نہیں کر سکے۔'' شیخ صاحب نے کہا تو عطا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''جی شیخ صاحب...''

''ہاں، زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم بڑے تھے۔ عمر میں بھی اور حیثیت میں بھی مگر ہم نے اس کا خیال نہیں کیا۔ اب ہم اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔'' شیخ صاحب نے کہتے ہوئے ایک چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لاکھ کا چیک ہے، فوراً جا کر کیش کرا لو۔ ابھی بینک کا وقت ہے۔''

عطا بوکھلا گیا۔ یہ اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ''لیکن شیخ صاحب میرے تو ستر ہزار تھے۔''

''تیس ہماری طرف سے تلافی سمجھ لو اور ہاں، کل آنا۔ دکان کی ری نیوویشن کا کچھ کام ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کام بھی تم کرو۔ کوئی تیس چالیس ہزار کا کام ہے۔ اس کی ادائیگی بھی پیشگی کریں گے۔''

عطا کے ہاتھ کانپنے لگے اور اسے اپنا گلا نم ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''شیخ صاحب... میں آپ کا احسان...''

''میاں کوئی احسان نہیں کیا، تلافی کی کوشش کی ہے۔ اب جاؤ ورنہ بعض دفعہ بینک والے کسٹمرز زیادہ ہونے کی وجہ سے بینک کلوز کر دیتے ہیں۔''

عطا دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ باہر آیا اور بینک کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے نہیں معلوم کہ شیخ صاحب میں یہ تبدیلی کیسے آئی تھی لیکن اس کا رُواں رُواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اس نے اسے گناہ اور جرم سے ہی نہیں بچایا تھا۔ اسے ایک موقع اور دیا تھا کہ وہ اپنے کام کو دوبارہ شروع کر سکے۔ بینک سے چیک کیش کرا کے نکلا تو اسے سم کا خیال آیا۔ اس نے اسے جیب سے نکالا اور توڑ کر سڑک پر پھینک دیا۔ شیخ صاحب کو اگرچہ دس لاکھ کی چوٹ لگی تھی لیکن ان کی ایک نیکی نے ان کو پانچ لاکھ ادا کرنے سے بچا لیا تھا۔

فقیرانہ قتل

منظر امام

اردو کے قالب میں نئے قالب کو ڈھالنے کا عزم رکھنے والے استاد کی استادی......

اُستاد کی رنگ و آہنگ میں ڈھلی زندگی کا ہر ورق کسی نہ کسی واقعے کی یادوں میں ڈوبا ہوا ہے... ان کی درویش صفت طبیعت نے اس بار ایک درد کو اپنے دل کا روگ بنالیا ہے...

اُستاد میرے پاس ایک بہت ہولناک خبر لے کر آگئے تھے۔

اس خبر کی ہولناکی کا اندازہ ان کی حالت سے ہو رہا تھا۔ وہ پورے بدن سے کانپ رہے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے پانی طلب کیا اور چار پانچ گلاس پانی پی گئے۔

''خیر تو ہے اُستاد۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا... آپ کو؟''

اس پر استاد نے مجھ پر اور اپنے آپ پر کرم فرماتے ہوئے بتایا۔ ''میں اجل رسیدہ بھکاری و گداگر ہو گیا ہوں خونِ تازہ کی نمو ہی میرے ہاتھ دست خود دہانی خود ہے۔ فرمائش قتل کر دیا ہے کسی کا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں استاد۔ آپ نے کسی کا قتل کر دیا ہے؟''

''ہاں۔'' استاد اور بھی کانپنے لگے۔ ''یہ حرکتِ نادیدہ وچکیدہ سرزد ہو گئی ہے۔''

''خدا کے لیے استاد یہ معاملہ سیریس لگ رہا ہے۔ آپ بتائیں آپ نے کس کا خون کر دیا۔''

اس پر استاد نے ایک لمبی چوڑی تقریر کے بعد انکشاف کیا کہ ان کے ہاتھوں ایک بھکاری کا قتل ہو گیا تھا اور اس کی لاش جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی ہے۔

یہ سن کر میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ استاد جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ ان کی حالت ظاہر کر رہی تھی کہ انہوں نے واقعی کسی کا خون کر دیا ہے۔

''استاد...... یہ...... یہ سب کیسے ہو گیا؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میاں میں اب داستانِ صحرانورد و گردیاد ہونے والا ہوں۔ تم میرے ساتھ براجمان ہو جاؤ سوئے تھانہ و کچہری کے میں خود کو مثال خاک تھانے کر جاؤں۔''

مطلب یہ تھا کہ استاد کو اب اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی اور وہ اپنے آپ کو تھانے جا کر پولیس کے سامنے اعتراف کرنے والے تھے۔

میں نے بڑی مشکلوں سے استاد کو روکا۔ ''چلیں استاد پہلے چل کر دیکھ لیں کہ واقعی ایسا کچھ ہوا ہے یا نہیں۔''

استاد اس طرح میرے ساتھ چل پڑے جیسے وہ بکرا جسے قربانی کے لیے لے جاتے ہیں۔ استاد نے جو مقام بتایا تھا اس کا فاصلہ وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔

ایک پتلی سی سڑک تھی جس کے کنارے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ یہ ایک کچی سڑک تھی جو سیدھی بس اسٹاپ کی طرف جایا کرتی تھی۔

اور وہیں جھاڑیوں کے پاس ایک لاش تھی جو دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اردگرد بہت سے لوگ تھے کچھ پولیس والے تھے۔ استاد جوش کے عالم میں آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا کر رہے ہیں استاد رک جائیں۔''

''وہ آدمی واصلِ چرخِ بالا میری وجہ سے ہوا ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''میں اس کی سلاجیت اور سلاطین نہیں کر سکتا۔ اب پتا نہیں سلاجیت اور سلاطین سے کیا مراد تھی لیکن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ استاد کو اپنے جرم کا مکمل احساس ہے اور وہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے جا رہے تھے۔

صورتِ حال بہت تشویشناک تھی استاد جیسے بے ضرر انسان نے کسی کا خون کر دیا تھا۔ جو ان کے مزاج اور ان کی فطرت کے بالکل خلاف تھا۔

یہ درست تھا کہ انہیں کبھی نہ کبھی خود کو پولیس کے حوالے کر دینا تھا لیکن اس سے پہلے میں استاد سے سارا ماجرا سننا چاہتا تھا تاکہ ان کے بچاؤ کا کوئی انتظام کیا جا سکے۔

میں استاد کو ان کے محل میں لے آیا تھا۔

''استاد۔ اب آپ دھیرے دھیرے بڑے سکون کے ساتھ یہ بتا دیں کہ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ آپ ایسے آدمی تو نہیں ہیں پھر اسے کیوں مار دیا۔''

استاد نے اپنے جناتی اسٹائل میں بتانا شروع کیا۔ ''میں کہ اس جانب سے روزانہ گزران گزرگاہ شیر فروش تھا کہ وہ ہاتھ پھیلائے دامن گیر و بحال ہو جاتا کہ ملبوس کون و مکاں کو کفن بردوش ہے اور پاپوش ہے جب کہ خرگوش ہے۔''

پتا نہیں استاد کیا بولے جا رہے تھے لیکن اتنا پتا چل گیا تھا کہ استاد جب بھی اس طرف سے گزرتے، وہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔

استاد کی باتیں سمجھنے کی تکنیک یہی تھی کہ بس خاموشی سے سنتے چلے جاؤ اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔

''پھر ایک دن وہ گل بد اندام پشیمانِ مرغزار ہو گیا۔ کہنے لگا کہ اگر میں بھی بھکاری ہو جاؤں تو خاطر احباب کو تفریںہ بہار ہو جائے اور جبلت سیر طفیل سے عاری اور جاری ہو۔

یعنی اس بھکاری نے استاد سے کہا کہ وہ بھی اگر اس کے ساتھ بیٹھ کر بھیک مانگنی شروع کر دیں تو ان کی آمدنی دگنی ہو جائے گی اور کچھ دنوں میں حالات بھی بدل جائیں۔

''میں کہ خانوادۂ چراغِ بہادر شاہ ظفر ہوں۔'' استاد جوش کے عالم میں بولے چلے جا رہے تھے۔ ''اور وہ فقیران تند و بے حال ایسی خرافات دلپذیر اور دستگیر کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا اے قلقل، اے بلبل سوختہ سامان ہو جا تو نہیں جانتا کہ منکہ آنم کہ خاک دانم میں غارت گر ہوش و ایمان ہوں اور کوہ نور کا وارث بے سکون ہوں۔ لال قلعہ میرے اجداد کی نشانی اور کہانی ہے کہ عالم جاودانی ہے اور زنجیرِ لافانی ہے۔''

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ استاد نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ مغلیہ خاندان کے چشم چراغ ہیں اور وہ کم بخت انہیں بھیک مانگنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

''پھر کیا ہوا استاد؟''

''پھر داخلِ سوختہ و اینٹ بے محل ہو گیا کہ پائیدار رسید کیا۔ میں نے قریبا بالخیر اہتمام کر کے اسے مصروف بے مہار کر دیا اور وہ نوشتۂ دیوار بے جان ہو گیا۔''

بہت دیر کے بعد سمجھ میں آیا کہ استاد کو اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے پاس پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری اور اس کا انتقال ہو گیا۔

بہت ہی خطرناک پوزیشن تھی۔ ان کے ہاتھوں ایک آدمی کا خون ہو گیا تھا چاہے وہ بھکاری ہی کیوں نہ ہو اور اس نے کیسی ہی غلط بات کی ہو۔

ویسے یہ قتل اشتعال کی وجہ سے ہوا تھا جس کا افسوس استاد کو بھی ہو رہا تھا اور ان کا صاف اور معصوم ضمیر انہیں پولیس کے پاس جا کر اعتراف کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

واردات واقعی ہو گئی تھی کیونکہ لاش میں خود دیکھ آیا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے میں استاد کو مشورہ دینے لگا۔ ''استاد جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں۔ آپ کو کسی نے ایسی واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بس خدا سے معافی مانگتے رہیں آپ کے لیے اتنا بہت ہے کیونکہ آپ نے اسے جان بوجھ کر نہیں مارا تھا۔''

میرا خیال ہے کہ اتنی دیر میں خود استاد کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے میرے مشورے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا تھا۔

پولیس اس بھکاری کے قاتل کو تلاش کر رہی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس طرف استاد نے میری جان کھا رکھی تھی۔ ''میں سپنے میں عندلیب و خواب ہو رہا ہوں۔'' ایک دن انہوں نے مجھے بتایا۔ ''چراغِ کینہ کی طرح وہ بھکاری بھوت خانہ بن کر تارِ عنکبوت ہو جاتا ہے اور فروغ شام کو قاتل دست ہو جاتا ہے۔''

مقصد یہ تھا کہ وہ بھکاری خواب میں بھوت بن کر بابا کو پریشان کرنے لگا ہے۔

اب وہ بھکاری بھوت بن کر بابا کو پریشان کرتا ہوا

انتظار

نرس: ''یہ ایمرجنسی میں آپریشن کس کا ہو رہا ہے؟''

وارڈ بوائے: ''ایک غریب آدمی کا جو گالف کورس کے قریب سے گزرتے ہوئے جماہی لے رہا تھا۔ سیٹھ صاحب نے ہٹ لگائی اور بال سیدھی اس کے پیٹ میں چلی گئی۔''

نرس: ''اچھا، وہ صاحب جو آپریشن تھیٹر کے باہر بے چینی سے ٹہل رہے ہیں وہ شاید اس کے رشتے دار ہیں۔''

وارڈ بوائے: نہیں تو، وہ تو سیٹھ صاحب ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں کہ آپریشن مکمل ہو تو وہ بال لے کر کھیل مکمل کریں۔''

☆☆☆

قابل غور معصومیت

لوگوں کا سرمایہ ہضم کر کے غائب ہو جانے والی ایک انویسٹمنٹ کمپنی کا مالک پکڑا گیا۔ اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج صاحب نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی، جن لوگوں نے تم پر اعتماد کیا تم ان کا پیسا کھا کر بھاگ گئے؟''

''سر! آپ خود سوچیں، جو لوگ آپ پر اعتماد نہ کرتے ہوں ان کا پیسا کیسے کھا سکتے ہیں؟''

کمپنی کے مالک نے معصومیت سے سوال کیا۔

(ریاض بٹ، حسن ابدال کی خوشیاں)

خبر

ڈاکٹر نے مریض کو سے کہا: ''لیبارٹری رپورٹ کے مطابق میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔ رپورٹ کے مطابق آپ صرف چوبیس گھنٹے مزید زندہ رہ سکتے ہیں۔''

مریض نے تشویش سے پوچھا۔ ''یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ آپ کے خیال میں اب کیا ہوگا؟''

ڈاکٹر نے فوراً جواب دیا۔ ''یہی بات بتانے کے لیے تو میں گزشتہ دو روز سے آپ کو تلاش کر رہا تھا۔''

(کورنگی سے حمیرا اقبال)

نہ کرتا ہو لیکن اتنا ضرور تھا کہ مجھے بابا کی طرف سے پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ وہ کہیں پولیس کے پاس نہ پہنچ جائیں۔

ایک دن استاد نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''تم ذرا میرے ساتھ سمند ناز تو کرو۔'' یعنی میرے ساتھ چلو۔

''وہ کیوں استاد؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کہاں لے جا رہے ہو؟''

''مقام وارداتِ قلبی کے پاس۔'' استاد نے فرمایا۔ ''میرا مشاہدہ دل گیر ہے کہ اس مرحوم و مغفور و رنجور کی بیوی نفاست زیبا ہو رہی ہے۔''

''خدا کے لیے استاد ایسے موقع پر اردو بول لیا کریں۔''

پھر بڑی مشکلوں سے استاد یہ سمجھانے میں کامیاب ہوئے کہ وہ مجھے اس جگہ لے جانا چاہتے تھے جہاں انہوں نے اس بھکاری کا خون کیا تھا۔ کیونکہ اس جگہ اب بھکاری کی بیوہ بیٹھا کرتی تھی۔ استاد اسے پہچانتے تھے۔ اسی لیے استاد اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کوئی خطرہ ہوتا۔ اسی لیے میں استاد کے ساتھ ہو لیا۔

ٹھیک اسی جگہ اب ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ استاد نے اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دعائے رنجش و مغفور کر دینا۔''

''کیا بولا صاحب؟''

''امتزاج مرحوم کو ایصالِ بدخشاں کر دینا۔'' استاد نے پہلے جملے سے بھی زیادہ مشکل بات کہہ دی۔

استاد مارے جوش کے اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے۔ اسی لیے میں استاد کو وہاں سے کھینچ لایا۔

اس دن کے بعد سے استاد کا وطیرہ ہو گیا تھا وہ بہانے بہانے اس جگہ پہنچ جاتے اور اس عورت کو کچھ نہ کچھ دے آتے۔ اس عورت نے بھی استاد کو حاتمِ دوراں سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے وہ ان کے آنے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔

ایک دن میں نے استاد سے پوچھا۔ ''استاد آخر آپ کب تک اس کی مدد کرتے رہیں گے۔ اب چھوڑ دیں اس کو۔''

''یہی تو افشائے راز ہے۔'' استاد نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں کس طرح فقیہانِ اقتالِ دجال سے چشم پوشی کر سکتا ہوں۔''

یعنی وہ کس طرح اس کی مدد کرنا چھوڑ سکتے تھے۔

ایک دن پھر استاد کو جوش چڑھا اور وہ میرے پاس پہنچ گئے۔ ''بس اب بہت سیر چشمی ہو چکی۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں بکارِ خاص ہونے جا رہا ہوں۔''

''کیا مطلب استاد؟''

''میں ماجرائے دردِ دل اس عورت کے گوش گزار کر دوں گا۔'' استاد نے فرمایا۔

میں نے بہت سمجھایا لیکن استاد کی کوئی رگ پھڑک اٹھی تھی۔ وہ یہ تو مان گئے تھے کہ وہ پولیس کے پاس نہیں جائیں گے لیکن ان کا فیصلہ تھا کہ وہ اس عورت سے ضرور اپنے اس جرم کی معافی مانگ لیں گے۔

میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

بہرحال ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہ عورت اسی جگہ موجود تھی۔ استاد نے اس کو دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''اے دل گرفتہ، دست بریدہ، میں مجبور و مقہور لرزہ بداندام کو دستنام شرمندگانِ عالیہ ہوں کہ تو جوہرِ حیات سے تقدیر و تاخیر ہو چکی ہے اور تیرا دردِ دل درد و جگر بن کر مغزِ سر میں گوشہ نشین ہو گیا ہے۔''

استاد کی اس بے مثال تقریر نے اس بھکارن کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے کبھی استاد کو دیکھتی اور کبھی مجھے پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''بابو صاحب یہ پاگل آدمی کیا بول رہا ہے۔''

اس موقع پر میں نے اس بھکارن کی پریشانی دور کی۔ ''دیکھو یہ صاحب پاگل نہیں ہیں۔ یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ بھی ہیں، یہ تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے علم سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ تم بیوہ ہو چکی ہو۔ تمہارے شوہر کسی حادثے میں مر چکے ہیں۔''

''ہاں جی ہاں۔'' اس عورت نے جلدی سے گردن ہلائی۔ ''وہ مر گیا ہے جی ہم بہت پریشان ہیں۔''

استاد نے فوراً اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں دس روپوں کی بہت اہمیت تھی۔ آج کے پانچ سو سمجھ لیں۔

دس روپے پاتے ہی اس عورت کی دعاؤں کی مشین گن چل پڑی۔ اس نے استاد کے پورے خاندان کو دعائیں دے ڈالیں۔

اس دن کے بعد سے استاد نے اپنا معمول بنا لیا وہ ادھر سے گزرتے ہوئے اس عورت کو دس کا ایک نوٹ دے دیتے اور اس کی دعائیں لے کر واپس آ جاتے۔

ایک دن استاد نے میرے پاس آ کر ایک روح فرسا

انکشاف فرمایا۔ ''میں اس عورت کو اسپغول عالم تاب کرنے جا رہا ہوں۔''

''کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

اس بار استاد نے بڑی مشکلوں سے آسان کرتے ہوئے یہ بتایا کہ وہ اس عورت سے شادی کرنے جا رہے ہیں۔

''کیا......!'' میں تو یہ سن کر پاگل ہو گیا...... ''کیا فرما رہے ہیں استاد؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''بس یہی ایک رہ گزر جام و مینا اور سفینہ ہے۔'' استاد نے بتایا۔

مقصد یہ تھا کہ استاد نے اس عورت سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس کا شوہر استاد ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

''خدا کے لیے ایسا مت کرنا استاد۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ ایک بھکارن ہے آپ اس کی مدد کرتے ہیں۔ آپ کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔''

استاد نے پھر کچھ نہیں کہا۔

ایک صبح وہ تشریف لائے تو بہت بوکھلائے ہوئے تھے۔ ''وہ۔ وہ فرستادہ براجمان گوشہ کنارہ ہو رہا ہے۔'' استاد نے بتایا۔ ''وہی جو ماورا نہر ہو گیا تھا اور خاک عالم سے بقائے دوام ہو کر چلا گیا تھا۔''

استاد کی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ استاد نے اس بھکاری کو اس عورت کے پاس دیکھ لیا تھا جس کو وہ مار چکے تھے۔

میں نے ان سے کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی استاد وہ کوئی اور ہو گا۔''

''نہیں میں اتنا لیلِ بے ہوش و گمان نہیں ہوں۔ چشم ساقی سے دیکھ کر تشریف فرما ہو رہا ہوں۔'' مطلب یہ تھا کہ وہ پاگل نہیں تھے اور خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ کر آ رہے تھے۔

صورتِ حال جاننے کے لیے میں خود وہاں پہنچ گیا۔ استاد قریب نہیں گئے۔ وہ اس وقت سخت خوفزدہ ہو رہے تھے۔ وہ عورت چونکہ مجھے پہچاننے لگی تھی۔ اسی لیے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ استاد نے جس کو مارا تھا وہ بھی اس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

''یہ کون ہے تیرا۔'' میں نے عورت سے اس بھکاری کے بارے میں پوچھا۔

''یہ میرا بھائی ہے جی۔'' اس عورت نے بتایا۔

''تم یہاں پہلی بار آئے ہو۔'' میں نے اب اس آدمی سے پوچھا۔

''نہیں جناب، پہلے میں یہاں کھڑا ہوتا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک بندے سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اس ظالم نے میرے سر پر اینٹ مار دی، میں بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔ برادری والے اٹھا کر لے گئے پھر اپنے گاؤں چلا گیا اور اب واپس آیا ہوں۔''

''تو تم مرے نہیں تھے۔'' میں کچھ حیرت اور کچھ خوشی سے پوچھ رہا تھا۔

''نہ جی، میرا بھائی کیوں مرنے لگا۔ ہاں اسی ٹیم اس جگہ اپنی برادری کے ایک بندے کا خون ہو گیا تھا۔ کسی نے اسے چھری مار دی تھی۔''

''اوہ خدا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو معاملہ کچھ یوں تھا۔ بے چارے استاد خود کو گنہ گار اور مجرم سمجھتے رہے تھے جب کہ مرنے والا ہٹا کٹا سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''تم نے تو بتایا تھا کہ تمہارا شوہر کسی حادثے میں مر چکا ہے۔''

''ہاں جی۔ تو اس میں کون سا جھوٹ ہوا۔ وہ بے چارہ گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔''

اب ساری باتیں واضح ہو چکی تھیں۔

میں نے جب استاد کو یہ سب کچھ بتایا تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''یہ تو مقام تشکر و سنجاب ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''بے مایہ بے حساب اور آفتاب عالم تاب ہے۔''

''ہاں، شکر کریں۔ آپ کی جان اور عزت دونوں بچ گئی اور آپ بھی خوامخواہ اس عورت کو اتنے دنوں تک پیسے دیتے رہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہی بہانہ میری نجات کا ہو گیا ہو۔'' استاد نے یہ جملہ انتہائی رواں اور شستہ اردو میں فرمایا۔ ''استاد آپ تو سیدھی زبان بھی بول لیتے ہیں۔''

''ہاں۔'' استاد مسکرا دیے۔ ''بس فروزِ واردِ افتخارِ مینا سے جب جنگ فریاب دہانی تازہ تازہ نمودار کہ واردان باغیچہ اور غالیچہ ہوتا ہے تو۔''

استاد بولتے رہے اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔
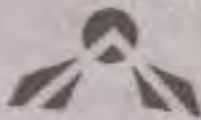
زرخیز زمین

شیخ ابو یحییٰ

سرزمین کہیں کی بھی ہو... قانون شکن اور قانون کے پاسدار ہمیشہ اپنے ارادوں کی مضبوطی کے ساتھ چوکس کھڑے نظر آتے ہیں... ایسے ہی لوگوں کی عکاسی کرتی تحریر... جن کا کہنا تھا کہ انسان کو صرف دو صورتوں میں جھکنا چاہیے... کسی بہتے ہوئے چشمے سے پیاس بجھانے کے لیے یا پھر کسی شاخ پر کھلا ہوا کوئی پھول توڑنے کے لیے... وہ بھی اپنے مقصد کی خاطر اسی طرح جما کھڑا تھا...

وطن عزیز کے رکھوالوں کا امتحان جو زندگی سے دور اور موت کے قریب تھے

موٹر سائیکل سوار نے غیر متوقع طور پر پولیس پر فائر کر دیا۔ پستول سے نکلی ہوئی گولی دوست دشمن کی تمیز نہیں کرتی۔ اس کی نظر میں قانون شکن ہو یا قانون کے محافظ... سب برابر ہوتے ہیں۔

موٹر سائیکل سوار کی گولی بھی سامنے کھڑے قانون کے محافظ کو چاٹ گئی۔

فائر کے دھماکے سے ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ جس کے جہاں سینگ سمائے بھاگ لیا۔ موٹر سائیکل سواروں کو شاید اسی نتیجے کی توقع تھی۔ انہوں نے بھی راستہ کھلا پایا تو ایک جانب موٹر سائیکل دوڑا دی۔

بقر عید قریب تھی اور محافظوں کی بھتا خوری کی مہم زوروں پر تھی.... ایک عرصے سے ملک اور شہر دہشت گردی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے دہشت گردوں کا تو بال بھی بیکا نہیں کر پائے تھے، سارا نزلہ بے چارے دہشت گردی کا شکار مظلوم عوام پر گرتا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ڈبل سواری پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور ...... پولیس کی بن آئی تھی۔ دہشت گرد گرفتار ہوں یا نہ ہوں، جیب خرچ زبردست بن جاتا تھا۔ سب انسپکٹر دانش بھی اوپر کی ہدایات کے مطابق موبائل لیے کھڑا تھا۔ حسب معمول آدھے سے زیادہ روڈ پر پولیس موبائل ترچھی کھڑی کر دی گئی تھی اور ہر آنے جانے والے سے حسب توفیق نذرانہ لیا جا رہا تھا۔ اوپر کے احکامات بہت سخت تھے لہٰذا ڈبل سواری والوں کو جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ پولیس ناکے کے لیے یہ جگہ سب انسپکٹر دانش کو بہت پسند تھی۔ وہ کبھی یہاں سے مایوس نہیں لوٹا تھا۔ یہ روڈ ایک جانب تو شہر کے مرکز سے ہوتا ہوا آتا تھا تو دوسری جانب علاقے کی سب سے گنجان آبادی تھی۔ اس مقام سے پیچھے ہی پہلے ایک بڑا بازار تھا جہاں کئی شاپنگ سینٹر آباد تھے۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے موبائل ڈیوٹی پر موجود حوالدار اور تینوں سپاہیوں کو جمع کیا اور ایک تقریر کر ڈالی۔

دانش اگر پولیس میں سب انسپکٹر نہیں ہوتا تو شاید سیاست میں ہوتا یا کسی جگہ استاد ہوتا۔ اسے موقع بے موقع تقریر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ یہ شوق اب اس کی عادت بن چکی تھی۔ یہاں بھی جب سب پہنچ گئے تو اس نے سب کو جمع کیا اور تقریر کے لیے اسٹارٹ لیا۔

''صاحب جی... طارق کو تو بلا لیں۔'' ایک سپاہی نے سامعین کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے موبائل میں بیٹھے ڈرائیور کی جانب اشارہ کیا۔

''ہاں، اس کو بھی بلاؤ... بہت ضروری پیغام ہے۔''

وہ سپاہی جھٹ طارق کو بلانے موبائل تک دوڑا۔ طارق کو شاید سارا دن گشت کے دوران اس کی تقریریں سننا پڑتی تھیں۔ وہ پہلے ہی بیزار تھا۔ ادھر دانش کا اصرار تھا کہ سامعین کی تعداد میں اضافہ ہو جائے۔

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات... سب انسپکٹر دانش علاقے میں گشت کا اور موبائل کا انچارج تھا۔ طارق کو بات ماننا ہی تھی۔

''اور دیکھو گاڑی بند مت کر دینا... ورنہ تم ہی لوگوں کو دھکے لگانا پڑیں گے۔'' دانش نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دور ہی سے ہانک لگائی۔

''پتا ہے... پتا ہے۔'' طارق نے کان پر بیٹھی مکھی اُڑائی۔

پولیس موبائل کا حال بھی پولیس کی کارکردگی جیسا ہی تھا۔ اگر انجن بند ہو جائے تو خود سے اسٹارٹ نہیں ہوتا تھا۔ دھکے کھانے والے سپاہیوں سے دھکے کھا کر، نخرے دکھا کر بڑی مشکل سے اسٹارٹ لیتا تھا۔

''بقر عید قریب ہے اور اطلاعات کے مطابق علاقے میں دہشت گردی کا شدید خطرہ ہے۔'' سب انسپکٹر دانش نے نفری پوری ہوتے ہی تقریر شروع کی۔

''ہر سال ہی ایسی اطلاعات آتی ہیں... کون سی نئی بات ہے۔'' ایک سپاہی بڑبڑایا۔

''آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارا پورا خطہ دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔'' دانش ایک پُرجوش سیاست داں کی طرح بولے جا رہا تھا۔

''ان حالات میں ہمارے کاندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے علاقے میں اور ہمارے تھانے کی حدود میں حالات بہت بہتر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر والوں کو ہم سے بہت زیادہ توقعات ہیں۔ حالات کے لحاظ سے بھی، دہشت گردی کے لحاظ سے بھی اور... اور بقر عید کے لحاظ سے بھی۔ آپ لوگ تجربہ کار اور سمجھ دار ہیں... امید ہے میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے اور ہمیں ایک گڈے کی رقم اوپر بھی پہنچانی ہے۔ تھانے کا اور اپنا انتظام بھی کرنا ہے۔''

''اور گاڑی میں ڈیزل بھی ڈلوانا ہے۔'' طارق زور سے بولا۔

اسے خطرہ تھا مبادا گاڑی کے ڈیزل کی بات گول نہ ہو جائے۔ بات یہ نہیں تھی کہ ڈرائیور کو ڈیوٹی سے یا گشت سے کوئی خاص دلچسپی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ تھانے میں بننے اور بٹنے

والا حصہ تو اسے مل ہی جاتا تھا، ڈیزل کی مد میں وہ علیحدہ سے اپنی خرچی بنا لیتا تھا۔

”ہاں... ہاں... سب یاد ہے۔“ دانش بولا۔

”میرے سپاہیو! تیار ہو جاؤ، ہدف سامنے رکھو اور ٹوٹ پڑو دشمنوں پر۔“ دانش چنگھاڑا۔

”ایک... منٹ... ایک منٹ صاحب۔“ محمد بخش بولا۔ ”صاحب! عید قریب ہے... ٹائم کم ہوتا ہے اور آدھے مرغے آپ یوں ہی تقریر سنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہماری محنت اور ہماری مزدوری سب ماری جاتی ہے۔“

”ہاں... ہاں... مجھے پتا ہے تم لوگوں کی شکایتیں۔“

”شکایتیں نہیں صاحب... یا تو رحم دلی کر لیں یا ڈیوٹی کر لیں۔“ دوسرا سپاہی بھی بولا۔

”ٹھیک ہے بے... زیادہ بکواس مت کرو... میں وہاں پان والے کے پاس کھڑا ہوں... رئیس تمہارے ساتھ ہے اور آج تم آزاد ہو... لیکن دیکھو، ہمارے پاس صرف تین گھنٹے ہیں۔“

”بہت ہیں صاحب... ہم ڈھائی گھنٹے میں ہی آپ کو رزلٹ دیں گے۔“ محمد بخش بولا۔ وہ ایک سینئر سپاہی تھا۔ مختلف وجوہات کی بنا پر اس کی عمر اور مدتِ ملازمت بڑھتی رہی اور عہدہ بڑھ بڑھ کر گھٹتا رہا۔ اس کی لالچی طبیعت نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا، گھر والوں اور جاننے والوں کی نظروں میں اس کا وقار اور ادارے میں اس کا عہدہ کبھی نہ بڑھ سکا۔

اسپاٹ چیکنگ شروع ہو گئی۔ ڈبل سواری پر پابندی تھی اور موٹر سائیکل سوار ہی چیکنگ کے لیے اصل ہدف تھے۔ ایسے میں حوالدار رئیس خان نے دیکھا کہ دو مسٹنڈے ڈبل سواری چلے آ رہے ہیں۔ اس نے محمد بخش کو اشارہ کیا۔ وہی سب سے آگے کھڑا تھا۔ پوزیشن کچھ یوں تھی کہ محمد بخش سب سے آگے تھا۔ اس کے تقریباً ساتھ ہی دوسرا سپاہی اللہ ڈنو پھر حیات خان اور سب سے آخر میں حوالدار رئیس۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا فارغ البالی کا مظہر تھا۔ غمِ دنیا کو سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں اڑا رہا تھا۔ موبائل کے بعد اس تمام تر کارروائی کا انچارج سب انسپکٹر دانش ... بے فکری سے فٹ پاتھ کے ساتھ بنی پان کی دکان پر کھڑا مفت کے پان سگریٹ اڑا رہا تھا۔

ترچھی کھڑی موبائل نے ٹریفک کی روانی کو شدید طور پر متاثر کیا تھا۔ لوگوں کے رکنے اور تلاشی دینے کے باعث بھی ٹریفک جام ہوتا جا رہا تھا۔

حوالدار رئیس خان کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ دو مسٹنڈے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل پر سوار ٹریفک جام کا فائدہ اٹھاتے ایک خاص انداز میں ایک جانب سے نکلے آ رہے تھے۔ رئیس نے محمد بخش کو اشارہ کیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کی بھیانک غلطی کرنے جا رہا ہے۔ یہ اشارہ اس کی زندگی کا آخری اشارہ تھا۔

رئیس خان اور دانش ایک ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ دونوں میں دور پار کی رشتے داری بھی تھی۔ دونوں بہت اچھے دوست بھی تھے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کی پوسٹنگ، ڈیوٹی اور رہائش بھی قریب ہی تھی۔

رئیس کے اشارے پر محمد بخش موٹر سائیکل سواروں کی جانب لپکا۔ وہ رئیس کا اشارہ تو نہیں دیکھ پائے تھے لیکن انہوں نے محمد بخش کو اپنی جانب آتا دیکھ لیا تھا۔ محمد بخش اپنی پتلون سنبھالتا خالی ہاتھ انہیں روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ محمد بخش ایک حیرت انگیز دلیری کا مظاہرہ کرتا تھا، وہ اپنے پاس کبھی اسلحہ نہیں رکھتا تھا، یہاں تک کہ ایک ڈنڈا بھی نہیں، اس کا خیال تھا کہ مجرموں کے لیے اس کی بارعب شخصیت ہی کافی ہے۔ دونوں جوان بہت ہوشیار نکلے۔ انہوں نے ایک خاص انداز میں موٹر سائیکل جھکائی اور بڑی صفائی سے نکلتے چلے گئے۔

آگے حیات خان کھڑا تھا۔ حیات خان اس پوری ٹکڑی کا سب سے جیالا اور سب سے باصلاحیت اہلکار تھا۔ وہ ایک اسپورٹس مین تھا...... ملکی سطح پر وہ بے شمار مقابلے جیت چکا تھا۔ اسپورٹس ہی کی بنیاد پر پولیس میں اس کی تقرری ہوئی تھی۔ پھر اس کی ڈیوٹی تھانے میں لگا دی گئی۔ پولیس ٹریننگ کے دوران وہ بلا کا پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس کی خداداد صلاحیت یہ بھی تھی کہ وہ ایک عمدہ نشانے باز تھا۔ گریجویشن کر چکا تھا۔ اب اس نے ایک مقامی یونیورسٹی میں کرمنالوجی میں ماسٹرز کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ دانش کا کہنا تھا کہ وہ ترقی کرے گا۔

رئیس کے پاس رائفل تھی۔ وہ رائفل کے ساتھ ہی ڈیوٹی کرنے کا عادی تھا۔ اس کی ایک بری عادت یہ بھی تھی کہ موقع بے موقع شہریوں پر رائفل تان لیتا تھا... شہریوں کو ہراساں دیکھ کر اس کے نہ جانے کس جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔

آج بھی اس نے موٹر سائیکل سواروں پر رائفل تان لی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی رائفل کبھی بھی لوڈ نہیں ہوتی

تھی۔ اگر ضرورت پڑنے پر ٹریگر دبا بھی دیا جائے تو فائر نہیں ہو سکتا تھا۔ آج بھی اس نے دور ہی سے آنے والوں کو دیکھ کر رائفل سونت لی۔

پیچھے سے محمد بخش اور اللہ ڈنو غل غپاڑا مچاتے دوڑے چلے آ رہے تھے۔

”بھاگو... پکڑو... جانے نہ پائیں۔“

عام افراد کے لیے اتنا شور و غل کافی ہوتا ہے۔ وہ بدحواس ہو جاتے ہیں۔ خوف کے مارے ان کے اعصاب شل ہو جاتے ہیں اور وہ حرکت نہیں کر پاتے، لیکن یہ نہ جانے کون لوگ تھے، کس مٹی کے بنے ہوئے تھے، ان پر کسی بھی بات کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا، نہ یہ کسی شور شرابے سے متاثر ہوئے اور نہ ہی حیات خان کی رائفل سے۔

موٹر سائیکل سوار نے ایک جھٹکے سے موٹر سائیکل کی رفتار میں اضافہ کیا۔ چشم زدن میں وہ رائفل تانے حیات خان کے سر پر تھا پھر نہ جانے کیا ہوا، کس طرح اس نے چلتی موٹر سائیکل سے لات بلند کی اور تاک کے اس زور سے حیات خان کے سینے پر ماری کہ وہ اڑتا ہوا پیچھے جا گرا... افراتفری اور شور میں اضافہ ہو گیا۔

یہ تمام تر ایڈونچر رئیس کے سامنے تھا۔ اس نے فوری طور پر سروس ریوالور نکالا اور للکارتا ہوا موٹر سائیکل سواروں کی جانب لپکا۔ بہرحال اس وضاحت کی تو ضرورت نہیں کہ پولیس کی للکار میں للکار کم اور مغلظات زیادہ ہوتی ہیں۔ دوسری جانب موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے شخص نے بھی خطرہ بھانپ لیا تھا۔ آگے جگہ تنگ تھی اور رئیس ریوالور لیے ان کے سر پر کسی بھی لمحے پہنچ سکتا تھا۔ اس نے تیز رفتاری اور مشاقی سے پستول نکالا۔

فاصلہ کچھ اور گھٹ چکا تھا۔ رئیس کا ہاتھ کچھ اور بلند ہو رہا تھا۔ وہ دونوں نشانے پر تھے۔ موٹر سائیکل سوار نے بڑے اسٹائل سے پستول نکال کر موٹر سائیکل چلانے والے کے کاندھے پر ٹکایا، نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

فائر کا دھماکا ہوا۔ گولی رئیس خان کی پیشانی پر لگی اور اس کا بھیجا بکھیرتی ہوئی سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا۔ کئی ہوائی فائر بھی کر ڈالے۔ رش اور بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی۔ وہ تیزی سے نکلتے چلے گئے۔

طارق غمِ دنیا کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا رہا تھا۔ اچانک اسے کچھ غیر معمولی احساس ہوا۔ وہ دھوئیں اور سوچ کی دنیا سے باہر آیا۔ گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کے نہایت قریب ایک ہولناک منظر تھا۔ اس کے ساتھی، قانون کے محافظ دو موٹر سائیکل سواروں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ ایک پارٹی کو جل دے کر، دوسرے کو لات مار کر اور... اور... اوہ خدایا! یہ تو کوئی بہت ہی خطرناک لوگ ہیں۔ انہوں نے رئیس کو گولی مار دی تھی اور ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے نکلتے چلے جا رہے تھے۔

طارق نے روایتی عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ خوف یک بہ یک اسے جکڑے جا رہا تھا۔ وہ غڑاپ سے سیٹ کے نیچے ہو گیا۔ سیٹ کے نیچے ہوتے ہوئے اس نے جو آخری منظر دیکھا، وہ اس کے قریب ہی اس کے قریبی ساتھی حوالدار رئیس خان کی لاش تھی۔

یہ عبرت ناک منظر دیکھتا ہوا طارق سیٹ کے نیچے دبکنے لگا تھا۔ اس جیسے کمزور اور بزدل ڈرائیور سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے لیکن خدا جانے اس منظر نے طارق کے ذہن کے کن گوشوں کو متحرک کر دیا۔ اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر اچانک ہی اس میں غصہ اور جنون بھر گیا۔

وہ سیٹ سے یوں ابھرا جیسے سورج طلوع ہوتا ہے۔ فائرنگ جاری تھی۔ بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ موٹر سائیکل سوار نکلتے چلے جا رہے تھے۔

طارق اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ جذباتی انسان اس وقت شدید جذبات کی رو میں بہہ رہا تھا۔ نہ جانے کس جذبے نے یا کس تعلق نے اس سے فوری فیصلے کروائے۔ اسٹارٹ موبائل کو گیئر میں ڈال کر طارق پوری جان سے ایکسلریٹر پر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی وقت تھا جب موٹر سائیکل سوار آگے بڑھ رہے تھے۔ راستہ تقریباً صاف تھا۔ تیز رفتار موٹر سائیکل کسی بھی لمحے انہیں لے کر شہر کی گہما گہمی میں گم ہونے والی تھی۔

عین اسی لمحے موبائل ایک آواز سے غرا کر اچھلی اور پوری قوت سے موٹر سائیکل سواروں سے جا ٹکرائی۔ موٹر سائیکل سوار زمین پر گرے لیکن بھلا اتنا بھاری اور پاورفل ڈیزل انجن کہاں رکنے والا تھا جبکہ طارق پورے وزن سے ایکسلریٹر پر گویا کھڑا تھا۔

موبائل موٹر سائیکل چلانے والے پر چڑھ گئی اور اسے لے کر گھسیٹتی ہوئی سامنے فٹ پاتھ تک پہنچی۔ زور سے فٹ پاتھ سے ٹکرائی اور انجن بند ہو گیا۔

یہ بہت ہی خوفناک منظر تھا۔ موٹر سائیکل چکنا چور ہو گئی تھی۔ موٹر سائیکل چلانے والا بری طرح کچلا گیا تھا۔ ڈبل سواری بیٹھنے والا موٹر سائیکل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کا

سر سڑک سے یا فٹ پاتھ سے ٹکرا کر شدید زخمی ہوا تھا۔ موبائل کی ٹکر بہت شدید تھی۔

فائرنگ، قتل اور پھر یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر لوگ چیخیں مارتے ہوئے دور بھاگنے لگے۔

موبائل رک چکی تھی۔ جذبات سے چور طارق کا چہرہ عجیب سا ہو چکا تھا۔ وہ اب بھی ایک ٹانگ سے ایکسلریٹر دبائے کھڑا تھا۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ دانش، حیات خان اور دیگر دوڑتے ہوئے قریب آئے۔ دانش سب سے پہلے رئیس خان کی طرف لپکا۔ اس کی لاش دیکھتے ہی دانش کو چکر آنے لگے۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح موٹر سائیکل تک آیا۔ موبائل موٹر سائیکل چلانے والے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پیچھے والا البتہ بری طرح زخمی حالت میں تھا۔ اس کی کراہیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔

دانش نے کسی طرح خود کو سنبھالا۔

''گاڑی پیچھے ہٹاؤ۔'' وہ چلایا۔ مگر طارق ہوش میں نہیں تھا۔ دانش بھاگتا ہوا طارق کے پاس آیا، وہ آنکھیں پھاڑے گم صم اسٹیچو بنا ایکسلریٹر دبائے کھڑا تھا۔ دانش نے موبائل کا دروازہ کھولا۔ طارق کا ہاتھ پکڑا اور نیچے گھسیٹ لیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ دانش نے اس کے گالوں پر تھپڑ مارے۔ سر سہلایا، تب کہیں اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس دوران حیات خان، محمد بخش اور اللہ ڈنو نے دھکا لگا کر موبائل کو کچھ پیچھے کیا۔ دانش نے طارق کو کسی نہ کسی طرح اسٹیئرنگ پر بٹھایا۔ اب اس کے حواس بحال ہونے لگے تھے۔

دھکا لگا کر موبائل اسٹارٹ کی گئی۔ سب سے پہلے رئیس خان کی لاش کو آنسوؤں اور احترام کے ساتھ رکھا گیا پھر زخمی کو بڑی بیدردی سے گھسیٹ کر موٹر سائیکل کے نیچے سے نکالا اور پھینکتے ہوئے موبائل میں ڈالا۔

ایمبولینس کے سائرن تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔ شاید کسی نے انہیں اطلاع کر دی تھی۔

''تھانے خبر کر دی؟'' دانش بولا۔

''جی صاحب... میں نے اطلاع کر دی ہے۔'' محمد بخش نے جواب دیا۔

''صاحب! یہ اسلحہ برآمد ہوا ہے۔'' اللہ ڈنو ملزمان کے پاس سے برآمد ہونے والا اسلحہ لے کر آیا۔

''اوہ...'' دانش نے پستول دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے صاحب؟'' اللہ ڈنو بولا۔

''یار... یہ... یہ دنیا کا مہنگا ترین اور خطرناک اسلحہ ہے... یہ ہمارے علاقے میں کہاں... اسے فوراً سائڈ کرو۔'' دانش بولا۔

''لیکن پھر...'' اللہ ڈنو ہکلایا۔

''کچھ نہیں... اس نے میرے بھائی کو مارا ہے... فی الحال یہ میری ذاتی کسٹڈی میں رہے گا۔ مرنے والے کے ہاتھ میں خالی ٹی ٹی پکڑا دو... وہ موبائل کے آگے والے ڈبے میں مل جائے گی... جاؤ۔'' دانش بولا۔ اتنے میں ایک جانب ایمبولینس تو دوسری جانب تھانے سے نفری پہنچ گئی تھی۔

حیات خان زخمی سے استفسار میں لگا ہوا تھا، وہ بھی پلٹ آیا۔

''افغانی ہے...'' دانش نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ میرے ساتھ آئیں۔'' وہ اسے لے کر موبائل تک آیا۔ وہاں سیٹوں پر۔ رئیس کی لاش تھی اور نیچے اپنے ہی خون میں لت پت نیم برہنہ ملزم پڑا تھا۔

''صاحب! یہ افغانی ہے... نہ پاکستانی... یہ تو... غیر ملکی ہے۔''

☆☆☆

تھانے میں دانش کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ جیسے ہی وہ موبائل سمیت تھانے... پہنچا، اسے فوراً ہی ایس ایچ او نے طلب کر لیا۔

''کہاں مر گئے تھے؟'' وہ دانش کو دیکھتے ہی دہاڑا۔

''مر نہیں گئے تھے، مرتے مرتے بچے ہیں۔ صرف رئیس شہید ہوا ہے۔'' دانش نے سیلیوٹ کر کے جواب دیا۔

''تم پورے ایک گھنٹے بعد یہاں پہنچے ہو جبکہ پندرہ منٹ کا راستہ ہے۔ اور تمہارا موبائل کیوں بند ہے؟''

''سر! ٹریفک میں پھنسے تھے۔ سیدھے یہیں آ رہے ہیں اور ان حالات میں موبائل کا ہوش کسے رہتا ہے۔''

ایس ایچ او نے گھنٹی بجائی۔

سپاہی شاید دروازے ہی سے لگا کھڑا تھا۔ وہ فوراً اندر داخل ہوا۔

''زخمی کو میری گاڑی میں ڈالو، فوراً۔'' اس نے سپاہی کو حکم دیا۔

''کون سا زخمی صاحب... تھانے میں تو کوئی زخمی نہیں ہے۔'' سپاہی نے حیرت سے سوال کیا۔

''ابے... ابھی موبائل میں جس زخمی کو دانش لایا ہے۔'' ایس ایچ او نے گالی دیتے ہوئے سپاہی کو کہا۔

''سر! یہ تو صرف رئیس کی لاش لائے ہیں، ان کے ساتھ کوئی زخمی نہیں ہے۔'' سپاہی بولا۔

''ہیں... زخمی کہاں گیا؟'' ایس ایچ او چلایا۔ ''زخمی کہاں ہے؟'' ایس ایچ او نے دانش کا گریبان پکڑ لیا۔

''سر! وہاں کوئی زخمی نہیں تھا۔ ایک شخص تھا، وہ گاڑی سے ٹکرا کر ہلاک ہو گیا...'' دانش نے کہا۔

ایس ایچ او سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ دانش کو رسید کیا اور گالیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ شدید طیش میں تھا۔

''سر! میں آپ کو پہلے ہی رپورٹ کر چکا ہوں... ایک موٹر سائیکل سوار نے پولیس پارٹی پر فائرنگ کر دی جس سے حوالدار رئیس خان شہید ہو گیا۔ مجرم خود پولیس موبائل سے ٹکرا کر ہلاک ہوا، اس کی لاش میں ساتھ لے آیا ہوں۔ دوسری گاڑی میں اس کی موٹر سائیکل بھی پہنچ گئی ہے... وہ اکیلا تھا، اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔'' دانش تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور...... اطمینان کے ساتھ اپنی بات دہرائی۔ اس کے چہرے پر ایک گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔ اس سے قبل اس حال میں اسے نہیں دیکھا گیا تھا۔

ایس ایچ او نے اسے مزید گالیاں دیں۔

''ارے محمد بخش وغیرہ کو بلاؤ... سب کو...'' وہ دہاڑا۔

تھوڑی ہی دیر میں سب حاضر تھے۔

''تم لوگ سچ بتاؤ... کہاں ہے وہ زخمی؟''

''کون سا زخمی سر...؟'' حیات خان فوراً بولا۔

''محمد بخش...'' سب سے مایوس ہو کر ایس ایچ او نے محمد بخش کی طرف دیکھا۔

''زخمی مر چکا ہے سر اور... گاڑی میں پڑا ہے۔ حکم دیں تو لاش کارروائی کے لیے اسپتال بھجوا دی جائے۔'' محمد بخش نے کہا۔ اسی وقت ایس ایچ او کا موبائل بجنے لگا۔

''یس سر۔'' اس نے موبائل آن کرتے ہی سیلیوٹ مارا۔

''جی سر... جی سر... نو سر... پارٹی کا کہنا ہے کہ موٹر سائیکل پر صرف ایک بندہ تھا... سر مجھے بھی پتا ہے... یہ جھوٹ بول رہے ہیں... لیکن کیا کریں... او کے سر... ٹھیک ہے سر... سر! یقین جانیں اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ سب صرف اور صرف دانش کی چالاکی ہے... میں سمجھاتا ہوں سر۔''

اس نے موبائل آف کیا۔ گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ میز پر پڑا سگریٹ اٹھایا، لائٹر سے سگریٹ جلاتا ہوا وہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

''تم لوگ جاؤ...'' اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور دانش کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''بیٹھو۔''

ابھی دانش بیٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اردلی پھر کمرے میں داخل ہوا۔

''اب کیا ہے؟''

''صاحب! پریس والے کب سے منتظر ہیں... اب تو وہ سیدھے آپ کے پاس آ جائیں گے۔''

''او کے... دانش یہ سب کیا دھرا تمہارا ہی ہے... جاؤ جو مناسب سمجھتے ہو، انہیں بیان دے دو... کوئی سینئر اس لمحے سامنے آنے کو تیار نہیں۔''

''سر! وہ دانش صاحب ہی سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔'' اردلی نے کہا۔

ایس ایچ او نے ہاتھ ہلا کر اجازت دے دی۔

دانش باہر آیا۔ تھانے کے صحن میں کئی افراد کیمرے اور مائک کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔

دانش کا اعتماد دیکھنے والا تھا... وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کیمرے کا سامنا کر رہا تھا لیکن مجال ہے جو اس کے چہرے پر ذرا ہچکچاہٹ ہو۔

''ہم معمول کی چیکنگ میں مصروف تھے کہ ملزم نے پستول نکال کر پولیس پر فائرنگ کر دی۔ ہمارا حوالدار رئیس خان موقع ہی پر شہید ہوا۔ ایک اور اہلکار زخمی ہوا اور خود ملزم تیز رفتاری اور بوکھلاہٹ کے باعث پولیس موبائل سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ فٹ پاتھ سے اس کا سر ٹکرایا اور وہ ہلاک ہو گیا۔''

''ہم نے سنا ہے کہ اسے موبائل سے کچلا گیا ہے؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''ہمیں فوٹیج ملی ہے جس کے مطابق ملزم کو کچل کر ہلاک کیا گیا ہے اور موبائل کے ڈرائیور نے یہ کام کیا ہے۔''

''کہانیاں بنانا آپ کا کام ہے، ضرور کریں... کوئی ایسی فوٹیج ہو تو اپنے اپنے چینل پر چلائیں۔ میں بھی دیکھ ہی لوں گا... بائی دا وے... میں علاقے کا سب انسپکٹر ہوں... مجھے پتا ہے کہ کون سا سی سی ٹی وی کیمرا کام کر رہا ہے اور کون سا نہیں... اور ہاں... ڈرائیور کوئی نہیں تھا، میں خود موبائل چلا رہا تھا۔''

''ہم نے سنا ہے کہ آپ پان کی دکان پر تھے؟''

''بالکل درست... میں پان لینے گیا تھا لیکن پھر

آ گیا تھا۔ تھانے سے لے کر پورا علاقہ جانتا ہے کہ گشت پر اکثر موبائل میں خود چلاتا ہوں۔"

"ملزم کون ہے... کس تنظیم سے تعلق ہے اور اس کا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟" ایک اور صحافی نے سوال کیا۔

"اس سلسلے میں تفتیش جاری ہے... ملزم اکیلا تھا۔"

"کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ملزمان دو تھے۔" ایک اور صحافی نے اصرار کیا۔

"خیالات پر آپ اپنا چینل چلائیں۔ ہمیں تفتیش کرنے دیں۔ جونہی کوئی بات سامنے آئی... آپ کو ضرور بتائی جائے گی۔"

دانش واپسی کے لیے پلٹ آیا...

اسی وقت تھانے کے دو سپاہی دائیں بائیں اسے لیے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے تک پہنچے۔ ایس ایچ او نے دانش کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "اب کہیں لاش بھی غائب مت کر دینا۔"

دانش خاموش رہا۔

"دانش! تم آگ سے کھیل رہے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ معاملہ کتنا حساس ہے... اگر تم سمجھتے ہو کہ اکیلے ہی... کسی سے ڈیل کر کے کچھ زیادہ مال بنا لو گے تو اسے بھول جاؤ... میں اس وقت براہِ راست آئی جی صاحب سے رابطے میں ہوں... اور وہ چاہتے ہیں کہ زخمی کو ہر حال میں ان تک پہنچایا جائے۔"

"سر! آپ آئی جی صاحب سے رابطے میں ہوں یا منسٹر سے... نہ کوئی بندہ تھا... نہ میرے پاس ہے۔"

"سوچ لو... بہت نقصان اٹھاؤ گے۔"

"سر! اگر آپ بھی مجھے دھمکیاں دینے لگیں گے تو میں کہاں جاؤں گا؟" دانش نے کہا۔

"دھمکیاں نہیں دے رہا، سچ بتا رہا ہوں۔"

"سر! میں سب جانتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔ ابھی مجھے رئیس کے کفن دفن کی فکر بھی کرنی ہے۔"

"او کے... دس منٹ ٹھہرو... پھر چلے جانا۔"

اس کے جانے کے بعد ایس ایچ او اپنے موبائل فون پر مصروف ہو گیا پھر اس نے تھانے کے اہلکاروں کو بلا کر رئیس خان اور ملزم کی لاشوں کے حوالے سے خصوصی احکامات دیے اور پھر دانش کو بلوایا۔

"دانش! تمہیں ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے۔ وہاں چلنا ہو گا... ابھی فوراً۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"آپ کے ساتھ؟"

"ہاں۔"

"کیا میں خود کو زیرِ حراست سمجھوں؟"

"اس وقت تک جب تک تم ہیڈ کوارٹر نہیں پہنچ جاتے... تمہاری قسمت کا فیصلہ وہیں ہو گا۔"

"چلیں۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

ایس ایچ او کی چمچماتی نئی کار کھڑی تھی۔ ذاتی ڈرائیور اور ذاتی محافظ بھی موجود تھا۔ ایس ایچ او نے تھانے سے اپنے اعتماد کے ایک سب انسپکٹر کو ساتھ لیا۔ یہ تینوں کار کی پچھلی نشست پر اس طرح بیٹھے کہ دانش درمیان میں تھا۔

"دانش! تم سمجھ نہیں رہے، تم کیا کر رہے ہو؟ کس کے کہنے پر کر رہے ہو؟ کیوں کر رہے ہو؟ میں تو بالکل سمجھ نہیں پا رہا۔ کافی عرصے سے ہم ساتھ کام کر رہے ہیں۔ مجھے تم سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی، میرا برادرانہ مشورہ ہے کہ مجھے یا ہیڈ کوارٹر میں جس کو چاہو اعتماد میں لو اور ہمیں وہ بندہ دے دو۔" گاڑی چلی تو ایس ایچ او نے ناصحانہ انداز میں دانش کو مشورہ دیا۔

"میں سمجھتا ہوں سر... لیکن میں صرف آپ سے ایک ہی درخواست کروں گا۔ میرا بھروسا کریں۔"

"میں پھر صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم بال بچے دار آدمی ہو، آگ سے مت کھیلو۔"

ایس ایچ او کو نہیں پتا تھا کہ آگ و خون کا کھیل کیا ہوتا ہے۔ ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ سائڈ روڈ سے ایک بڑا ڈمپر تیز رفتاری سے آیا .... اس نے ایس ایچ او کی گاڑی کے اگلے حصے کو دائیں جانب سے زوردار ٹکر ماری۔

گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی۔ ہمارے ہاں سیٹ بیلٹ باندھنے کا رواج نہیں ہے۔ پچھلی سواریاں بے طرح آپس میں پیوست ہو گئیں۔ ڈمپر چونکہ اگلے حصے سے ٹکرایا تھا، لہٰذا ڈرائیور اور نجی محافظ کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اسی وقت گاڑی کے اطراف شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائرنگ، لوگوں کی چیخیں، بھگدڑ اور گاڑیوں کے ٹکرانے کی آوازیں۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی لیکن شاید پیش گوئی کرنے والا زندہ نہیں تھا۔

دانش کے حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ گاڑی الٹ چکی تھی اور وہ سیٹوں اور افراد کے درمیان بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اسے کہاں کہاں چوٹ آئی

ہے اور جسم کے کس کس حصے سے خون بہہ رہا ہے۔

دانش کو فائرنگ کی آواز اور قریب سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے کچھ ہلنے جلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اچانک کسی نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ پھر شاید ایک سے زائد افراد نے کھینچ کر ایس ایچ او کو باہر نکالا۔ یہی کارروائی دوسری جانب بھی کی گئی۔ گاڑی کے پچھلے ہوئے دروازے کو کسی طرح کھول کر ساتھ بیٹھے سب انسپکٹر کو کھینچ کر نکالا گیا۔

پھر وقفے وقفے سے گاڑی کے دونوں اطراف میں فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید دونوں پولیس اہلکاروں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ دانش کو اپنا انجام بھی مختلف نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ہاتھ اس کی طرف بڑھے، کچھ فائر ہوئے اور مکمل اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

طارق تھانے سے باہر آیا تو اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اسے آج کے گزرے ہوئے ہنگامہ خیز لمحات ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ اسے سب کچھ تھوڑا تھوڑا یاد ضرور آ رہا تھا لیکن اس کے سوچنے سمجھنے اور فیصلے کرنے کی قوت جواب دے گئی تھی۔ نہ وہ کچھ سمجھ پا رہا تھا... اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ذہن اور جسم ایسے شل تھے کہ وہ کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ڈیوٹی سے واپسی پر اس کا معمول تھا کہ گنے کا رس نکالنے والی مشین تک جاتا تھا۔ وہاں حساب کتاب کر کے پھر گھر جاتا۔ طارق نے ایک ہوشیاری یہ بھی کر رکھی تھی کہ پولیس کی ملازمت کے علاوہ اس نے ایک ذاتی کام بھی شروع کر رکھا تھا۔ اس نے کچھ پیسے جمع کر کے نزدیکی بازار میں ایک گنے کے شربت کی مشین لگا رکھی تھی۔ وہاں ایک شخص ملازم تھا جو تمام دن کام کرتا رہتا تھا۔ طارق شام کو یا ہر دوسرے دن جا کر حساب کر لیتا تھا۔ ملازم کی اجرت منہا کر کے وہ اپنا منافع لیتا ہوا گھر چلا جاتا تھا۔

مشین پر کام کرنے والے لڑکے نے طارق کو دور ہی سے آتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً قریب ہی پڑا گندا سا اسٹول اٹھایا اور ایک میلے سے کپڑے سے اسے جھاڑنے لگا۔ پھر اس نے طارق کو زوردار سلام جھاڑا۔ اور وہیں فٹ پاتھ پر اسٹول یوں جما کر لگا دیا گویا وہ کوئی بادشاہی کرسی ہو۔

"ہاں بھئی کیا رہا؟" طارق حسبِ معمول بولا۔

"زبردست صاحب... موسم بھی گرم ہے لیکن مہنگائی کی گرمی نے سب کا بُرا حال کر دیا ہے۔"

"ابے مہنگائی کے بچے! کچھ کمائی بھی کی... یا مفت کی بجلی ہے تو صرف مشین ہی گھمائے جا رہا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا تو طارق پھر بولا۔

"اچھا لا حساب دے... گنا کتنا لایا تھا؟"

طارق نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا حساب کتاب بھی قریب ہے۔ کچھ افراد تھانے ہی سے اس کے پیچھے ہیں اور مناسب موقع کی تاک میں ہیں۔ اب شاید وہ موقع آ گیا تھا۔ وہ گنے کی مشین کے ساتھ فٹ پاتھ پر اسٹول پر بیٹھا تھا کہ اس کے عین سامنے ایک وین آ کر رکی۔

دروازہ کھلا اور وین سے تین افراد برآمد ہوئے۔ تینوں تیزی سے طارق کے دائیں بائیں اور پیچھے کھڑے ہو گئے۔

ان سب کے ہاتھوں میں موجود خوفناک ہتھیار تو طارق کو سب سے پہلے نظر آئے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان ہتھیاروں کے علاوہ اسے کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ طارق کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آج جن حادثات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، یہ بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہے۔

وہ ڈر رہا تھا کہ کیا سلسلہ اس کی موت ہی پر ختم ہو گا؟

"کھڑے ہو جاؤ... اور چپ چاپ وین میں جا کر بیٹھ جاؤ۔" پیچھے کھڑے ہوئے فرد نے پستول طارق کی کمر میں گڑاتے ہوئے حکم دیا۔

طارق کا دل چاہا کہ کسی طرح وہاں سے بھاگ جائے لیکن یہ بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔

وہ لرزتی ٹانگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

عین اسی وقت ایک لرزا دینے والا دھماکا ہوا، بہت ہی قریب شاید فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی موٹر سائیکلوں میں سے کسی میں۔ دھماکا شدید تھا۔ اس کے ساتھ ہی گرد کا ایک بادل اٹھا۔

طارق پولیس اہلکار تھا۔ وہ یہ تو سمجھ ہی گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دھماکے کے فوراً بعد جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ محفوظ ہے تو سب سے پہلا خیال اسے اپنے تحفظ کا تھا۔ اس نے سوچا ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ ایک کوشش کر لی جائے۔ اس نے جھکائی دی اور پیچھے بازار میں دوڑ لگا دی۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی اور لوگ دوڑ رہے تھے لیکن اس بھاگ دوڑ میں بھی طارق کو اپنے پیچھے آتے ہوئے قدموں کا احساس تھا۔

سگریٹ پینے والوں کے لیے تیز چلنا محال ہوتا ہے کجا یہ کہ بھاگنا۔ طارق کا سینہ دھونکنی کی طرح پھولنے پچکنے لگا۔ دم بھر آیا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اب مزید نہیں دوڑ سکے گا۔ دھماکے کے اثرات سے اعصاب کشیدہ تھے۔ اچانک اسے چکی نظر آئی۔ ایک چھوٹی دکان میں قائم کی گئی اس آٹا چکی سے وہ ایک دو مرتبہ آٹا بھی لے چکا تھا۔ بازار کی تقریباً تمام ہی دکانیں ایک رویہ تھیں۔ یہ چکی شاید واحد تھی جو آر پار تھی۔

طارق یک لخت وہاں داخل ہوا، تیزی سے دوسری جانب گلی میں نکلا اور آگے دوڑتا چلا گیا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ طارق کو سب سے پہلا دروازہ جو کھلا نظر آیا، اس نے وہیں داخل ہو کر کنڈی چڑھا دی۔ وہ پلٹا بھی نہیں تھا کہ آواز آئی۔

''ہینڈز اَپ... پلٹنا مت۔''

☆☆☆

حیات خان نے اپنی موٹر سائیکل لی اور تھانے سے باہر نکل آیا۔ وہ تھانے سے گھر تک موٹر سائیکل پر آتا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ پرانی موٹر سائیکل تھی لیکن چلنے میں لاجواب تھی۔ حیات خان اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ کچھ لوگ تعاقب میں ہیں۔ تھانے میں اسے کچھ دیر رکنا پڑا تھا۔ تھانے کے دیگر سب انسپکٹر.... اور سپاہیوں کے لیے دانش اور پوری ٹیم کا رویہ غیر معمولی تھا۔ خاص کر وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے کہ اوپر والے اور ایس ایچ او جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اکثر کا خیال تھا کہ کوئی بہت اہم معاملہ ہوا ہے اور سب انسپکٹر دانش بالا ہی بالا کوئی بہت اہم ڈیل کرنا چاہتا ہے۔

حیات خان آنے والے خطرات سے بے پروا اپنے خیالات میں گم جانے پہچانے راستوں پر چلا جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ رک کر پیٹرول پمپ سے موٹر سائیکل میں پیٹرول بھی بھروایا۔ پیٹرول بھروا کر وہ ابھی پمپ سے نکلا بھی نہیں تھا کہ اس کے موبائل پر کال آئی۔

''ہیلو۔''

''حیات...؟''

''ہاں بول رہا ہوں... کون صغیر؟''

''ہاں... یار تو کہاں ہے... خیریت سے تو ہے نا؟''

صغیر تھانے کا ایک اور سپاہی تھا۔ اس کے حیات سے..... اچھے تعلقات تھے۔ انہیں گہرا دوست بھی کہا جاسکتا ہے۔

''ہاں، ہاں... میں ٹھیک ہوں... تو گھبرایا ہوا کیوں ہے؟''

''یار... تو اپنا خیال رکھ... اور... مجھے نہیں پتا کہ تجھے کیا کرنا چاہیے... تو فی الحال روپوش ہو جا... یا فوراً ہیڈ کوارٹر چلا جا۔''

''ارے بھائی... کچھ بتا بھی تو... ہوا کیا؟'' حیات خان، صغیر کے لہجے ہی سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔

''یار! کوئی بڑی گڑبڑ ہے اور تم لوگوں سے ہی متعلق ہے... ایس ایچ او ناصر اور سلمان جس گاڑی میں ہیڈ کوارٹر جا رہے تھے، اس گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ڈرائیور اور صاحب کا گارڈ شدید زخمی ہیں... شاید مر بھی گئے ہوں... ایس ایچ او صاحب اور سلمان کو گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا ہے... اور... اور دانش غائب ہے۔''

''کیا؟'' حیات خان کو یقین نہیں آیا۔

''ہاں... بالکل سچ بتا رہا ہوں... اور سن... ہیڈ کوارٹر سے تم سب کی گرفتاری کے آرڈر آئے ہوئے ہیں۔ محمد بخش اور اللہ ڈنو کو تھانے ہی میں روک لیا گیا ہے، صرف تو اور طارق باہر ہیں۔'' اسی دوران حیات خان کو موبائل پر ایک اور کال آنے لگی۔ حیات نے ایک لمحے کے لیے موبائل کان سے ہٹایا اور نمبر دیکھا۔ ''صغیر... تھانے سے کال آ رہی ہے۔''

''سوچ سمجھ کر فیصلہ کر... تو اپنا بھائی ہے... تیرے کئی احسان بھی ہیں مجھ پر... میں نے سوچا تجھے اطلاع کر دوں۔'' صغیر کے فون نے حیات کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ صغیر نے اطلاع دے کر فون بند کر دیا تھا۔ وہ بھی شاید جلدی میں تھا یا شاید چھپ کر فون کر رہا تھا۔

اسی وقت موبائل دوبارہ جاگا۔ چانا موبائل کی تیز آواز نے حیات کو چونکا دیا۔ اس کے اعصاب شدید دباؤ کا شکار تھے۔ اب تھانے کا منشی اپنے ذاتی نمبر سے فون کر رہا تھا۔

''ہیلو... ہیلو... حیات۔'' آواز آئی۔

''جی بول رہا ہوں۔'' حیات نے جواب دیا۔

''حیات! کہاں ہو آپ...؟''

''سر! میں... قریبی پیٹرول پمپ پر ہوں۔''

''ٹھیک ہے... تم فوراً تھانے پہنچو... ایمرجنسی ہے... اپنا موبائل انگیج مت رکھنا... فوراً آؤ۔''

''او کے سر۔'' اس نے کال منقطع کی۔ حیات کا دماغ گھوم رہا تھا۔

صغیر کم از کم اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

گرفتاری کے آرڈرز... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہیڈ کوارٹر ان کی گرفتاری کے احکامات کیوں اور کیسے دے سکتا ہے؟

ایس ایچ او کا قتل، دانش کا فرار... کچھ بھی سمجھ میں آنے والا نہ تھا۔ اس نے موٹر سائیکل ایک جانب کر کے کھڑی کی۔ نزدیک ہی لگے ٹھنڈے پانی کے بڑے سے واٹر کولر کے پاس جا کر پانی پیا اور منہ دھویا۔ اس دوران میں وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ تھانے بہرحال نہیں جا رہا تھا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے سب سے پہلے اپنا موبائل بند کر دیا۔ اب کوئی فوری طور پر اس سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹینڈ سے اتاری، کک مار کر اسٹارٹ کی اور پمپ سے باہر نکل آیا۔

جونہی وہ روڈ پر آیا، ایک وین نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھی اور حیات خان کی راہ میں کچھ اس طرح حائل ہوئی کہ اگر وہ فوری طور پر بریک نہ لگاتا تو ٹکر لازمی تھی۔ حیات اسپورٹس مین تھا۔ اس نے بریک تو لگایا لیکن اس کی تمام حسیات بیدار تھیں۔ اس نے وین سامنے آتے اور اس کا دروازہ کھلتے دیکھ لیا تھا۔ وین میں کئی افراد کے ہیولے اسے نظر آ رہے تھے اور نہ جانے کیوں وہ سب اسے غیر دوستانہ محسوس ہو رہے تھے۔

اس نے موٹر سائیکل رکتے رکتے ہی گیئر تبدیل کیے۔ انتہائی حد تک مخالف سمت میں بائک جھکائی اور تیزی سے ایکسلریٹر گھما دیا۔ موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور حیات وین کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ ٹریفک میں بڑی مشاقی سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ چلا کیا رہا تھا، اڑا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وین نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ حیات نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب کسی حد تک ڈھیلے پڑے۔ جس رفتار سے موٹر سائیکل بھاگ رہی تھی، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے حیات کا ذہن کام کر رہا تھا۔

وین میں سادہ پولیس والے نہیں تھے۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیوں اس کے پیچھے پڑے ہیں؟

اچانک اسے بڑی اور بھاری موٹر سائیکلوں کا شور سنائی دیا۔ اس نے دیکھا، اس کے دائیں بائیں بڑی اور بھاری موٹر سائیکلیں پہنچ چکی تھیں۔ ہر ایک پر دو دو افراد سوار تھے۔

''گاڑی سائڈ پر لگاؤ۔'' ان میں سے ایک نے چیخ کر حیات کو حکم دیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی بھاری موٹر سائیکل اس طرح حیات کے قریب کی کہ اسے اپنی موٹر سائیکل ایک جانب ہٹانی ہی پڑی۔

اسی دوران میں حیات کو اندازہ ہوا کہ بھاری موٹر سائیکل سوار اس کے دائیں بائیں ہی نہیں پیچھے بھی ہیں۔ اسے ان کے ہاتھ میں خوفناک اسلحہ بھی نظر آ رہا تھا۔

اس صورتِ حال کے باوجود حیات نے موٹر سائیکل کی رفتار کم نہیں کی تھی۔ وہ مسلسل اسے ایک جانب کو دباتے چلے گئے۔ یہ سارا علاقہ حیات خان ہتھیلی کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ وہ اپنی حکمتِ عملی میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ آگے بچت بازار لگا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل بچت بازار کے عین وسط میں جا کر روکی۔

یہ بچت بازار ہفتے میں دو دن لگتا تھا اور بالکل رواں دواں سڑک کے ساتھ۔ لوگوں کا ایک ہجوم خریداری کے لیے آ جا رہا تھا۔ حیات خان نے موٹر سائیکل فٹ پاتھ کے کنارے لگائی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اس کے قریب آتا، تیز رفتار اسپرنٹر نے ایک جست لگائی اور لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

وہ بہت تیزی سے بھاگا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھاگتا چلا گیا۔ پیچھے سے فائر کیے جانے کا خطرہ تھا لیکن وہ تمام خطروں سے بے پروا دوڑتا چلا گیا۔ اس وقت تو گویا اس کے پَر لگ گئے تھے۔

حیات کے ذہن میں پورا نقشہ تھا۔ بچت بازار کے فوراً بعد ایک چھوٹا سا روڈ تھا جس کے بعد آبادی تھی اور اس کے بعد ایک متروکہ ریلوے لائن۔ حیات کا خیال تھا کہ وہ تیز رفتاری سے چلتا ہوا اس متروکہ ریلوے لائن تک پہنچ کر وہاں سے اپنے گھر کی طرف چلا جائے گا۔ حیات خریداروں کے ہجوم میں بچت بازار سے باہر آیا۔ تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے جب ایک پی کیپ اور دھوپ کے چشموں کا اسٹال اس کے سامنے آیا تو اس نے تیزی سے دوڑتے ہوئے ایک پی کیپ اٹھالی تھی۔ یوں فوری طور پر دور سے پہچانے جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

روڈ کراس کر کے وہ آبادی میں داخل ہوا اور چھوٹی گلیوں سے ہوتا ہوا تیزی سے ریلوے لائن تک پہنچا۔

اب وہ پٹریوں پر چلتا ہوا اپنے گھر کی جانب رواں دواں تھا۔ یہاں سے کسی دور میں ریلوے کی گاڑیاں گزرتی تھیں۔ اب تو عرصہ دراز سے یہ متروک تھی۔ لائن کے ساتھ ساتھ کچرے ....اور تھیلیوں کے ڈھیر لگے تھے۔

حیات کو اپنی موٹر سائیکل کی بھی فکر تھی جسے وہ بچت

بازار میں چھوڑ آیا تھا لیکن اسے زیادہ دیر فکرمند رہنا نہیں پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے ان موٹر سائیکلوں کی آوازیں سنائی دیں جنہیں وہ جان جوکھم میں ڈال کر بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

یہ کئی افراد تھے اور مختلف اطراف سے اچانک نمودار ہوئے تھے۔ حیات ایک جانب کو بدک کر بھاگا۔

کسی جانب سے ایک فائر ہوا اور حیات گر گیا۔

☆☆☆

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تھانے پر حملہ ہو جائے گا۔ محمد بخش اور اللہ ڈنو تو یہ بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ تھانے پر حملہ ان کے لیے ہوگا۔ یہ ایک غیر یقینی بات تھی۔ یہ دونوں عام سے سپاہی تھے۔ عام افراد کے لیے نہ کوئی ریلیف ہوتا ہے، نہ قانون اور نہ ہی تحفظ۔ ان کے لیے کوئی کیوں تھانے پر حملہ کرنے لگا۔

ایس ایچ او تھانے سے جانے سے قبل غالباً کچھ خاص ہدایات جاری کر گیا تھا۔ ویسے تو آج تھانے کی فضا غیر معمولی ہی معلوم ہو رہی تھی۔ ساتھ کے سپاہی بھی اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔

منشی نے محمد بخش اور اللہ ڈنو دونوں کو پابند کر دیا کہ وہ رات کی ڈیوٹی پر تھانے ہی میں رہیں گے۔

کچھ دیر بعد سینئر انسپکٹر بچایو آیا اور انہیں چائے کے بہانے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ وہاں وہ عام سے انداز میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران میں چائے اور بسکٹس کا آرڈر بھی دے دیا گیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ شاید ان لوگوں نے کھانا ہی نہ کھایا ہو۔

"کھانا کھایا ہے تم لوگوں نے؟" بچایو نے پوچھا۔

"نہیں سائیں... کھانا نہیں کھایا۔" اللہ ڈنو فوراً بولا۔

بچایو نے ایک سپاہی کو بلا کر کچھ پیسے دیے۔

"جاؤ ان دونوں کے لیے بہترین بریانی لے کر آؤ۔ جب یہ کھانا کھالیں تو پھر چائے لانا۔"

پھر وہ ان دونوں کی جانب متوجہ ہوا۔

"تم لوگ کھانا وانا کھا کے چائے شائے پی لو... میں کچھ ضروری کام کر کے واپس آتا ہوں... تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" محمد بخش اور اللہ ڈنو نے سر ہلا دیا۔ بچایو کے کمرے سے جانے کے بعد وہ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے رہے۔ ایسی آؤ بھگت اور اتنی عزت تو ان کی کبھی سسرال میں بھی نہیں ہوئی ہوگی۔

محمد بخش کو سب کچھ بہت ہی ہولناک لگ رہا تھا۔

"سائیں... کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔" اللہ ڈنو بولا۔

"ہاں... آندھی سے پہلے کی خاموشی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی اندر آیا۔ "صاحب نے تم لوگوں کے موبائل منگوائے ہیں۔"

انہوں نے خاموشی سے اپنے اپنے موبائل نکالے اور اس کے حوالے کر دیے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ اقدام محض اس لیے ہے کہ وہ کسی سے رابطہ نہ کر سکیں۔

"ابے تو کیوں مرا جا رہا ہے... جو ہونا ہے ہو جائے گا۔" محمد بخش سے اللہ ڈنو کی مسکینی صورت نہیں دیکھی جا رہی تھی، اس نے حوصلہ دیا۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں بریانی آ گئی۔

"سائیں! آپ کو یاد ہے نا... بقر عید قریب ہے... اور... قربانی کے جانور کو قربان کرنے سے پہلے چارا، پانی ضرور دکھاتے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو... تمہاری قربانی جائز نہیں ہے۔" محمد بخش نے ایک پھیکا سا قہقہہ لگایا اور دونوں کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

ابھی وہ چائے سے فارغ ہی ہوئے ہوں گے کہ تھانے میں غیر معمولی حرکت کے آثار نظر آئے۔

وقت گزرتا رہا، نہ کوئی ان کی طرف آ رہا تھا اور نہ ہی ان میں ہمت تھی کہ کمرے سے اٹھ کر باہر نکلتے۔ حالانکہ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں وغیرہ سب کھلی تھیں۔

مزید کچھ انتظار کے بعد بچایو ایک مرتبہ پھر کمرے میں داخل ہوا اور قریب ہی موجود ایک جھلنگا سی چارپائی پر ڈھے گیا، بچایو کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

تھانے کا ماحول اور بچایو کے چہرے کو دیکھ کر ان کے اضطراب میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔

"محمد بخش! تم مجھ سے بھی سینئر ہو... تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ کوئی ادارے سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ تم پولیس سے نہیں لڑ سکتے، خواہ کتنے بڑے ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔"

"جی صاحب... لیکن ہم نے کیا کیا ہے؟"

"ایس ایچ او صاحب اور سلمان کو قتل کر دیا گیا ہے... اور دانش غائب ہے۔" بچایو نے کہا۔

"کیا؟" محمد بخش اور اللہ ڈنو دونوں کھڑے ہو گئے۔

"جی ہاں... جس گاڑی میں یہ لوگ دانش کو ہیڈ کوارٹر لے جا رہے تھے اس کا زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے، ایک ڈمپر کے ساتھ... ڈرائیور اور گارڈ شدید زخمی ہیں۔

ایس ایچ او صاحب اور سلمان کو کسی نے گولیاں مار کر قتل کر دیا ہے اور دانش کو جسے ہیڈ کوارٹر بلایا گیا تھا، وہ غائب ہے... تم دانش کے ساتھ گشت پر ہوتے ہو... آج بھی تھے... مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

ساری اطلاعات ان کے لیے غیر معمولی اور پریشان کن تھیں۔ "ایس ایچ او صاحب نے تو تم دونوں کو اپنے طور پر روکا تھا... لیکن اب ہیڈ کوارٹر سے احکامات آئے ہیں کہ تم دونوں کو حراست میں لے لیا جائے۔"

"لیکن ہمارا قصور کیا ہے؟" اللہ ڈنو گڑگڑایا۔

"یہ تو مجھ سے بہتر تم لوگ سمجھتے ہوگے... تم ہی بتاؤ مسئلہ کیا ہے... اور دیکھو، میں نے پہلے بھی کہا ہے، ڈپارٹمنٹ سے ٹکر لینے کی کوشش بالکل مت کرو۔"

اسی وقت بچایو کا موبائل بجنے لگا۔

"یس سر۔" اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"جی سر! ان سے بات چیت جاری ہے۔ سر! طارق کی کوئی اطلاع نہیں ہے... اس کا موبائل بند ہے... جبکہ... حیات سے بات ہو گئی ہے، وہ پہنچنے والا ہے... میں میسیج کر چکا ہوں... اوکے سر۔" پھر وہ دوسری جانب کی بات سننے لگا۔

"ٹھیک ہے سر... اوکے سر..." اس نے کہا اور موبائل بند کر دیا پھر وہ ان کی طرف پلٹا۔

"ہاں بھئی... تم لوگ سوچ لو... ہیڈ کوارٹر سے فون تھا... تم لوگوں کو لینے کے لیے وہاں سے اسپیشل بکتر بند آ رہی ہے۔" بچایو نے کہا اور پھر شاید کچھ انتظامات کے لیے باہر چلا گیا۔

"سائیں! اب کیا ہوگا؟" اس کے جاتے ہی اللہ ڈنو بولا۔

"مجھے کیا پتا کیا ہوگا... دانش نے اچھا نہیں کیا۔"

"ہاں دانش نے اچھا نہیں کیا۔"

"ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے... وہاں پوچھ ہوگی... کیا کہوگے؟"

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ انہیں کہیں قریب ہی سے زبردست فائرنگ کی آواز آئی۔

"اللہ ڈنو..." محمد بخش نے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... جوابی فائرنگ تھانے سے ہو رہی ہے۔"

"تو کیا... تو کیا کسی نے تھانے پر حملہ کر دیا ہے؟"

اس وقت تک فائرنگ مزید شدت اختیار کر چکی تھی۔

دونوں اضطرابی حالت میں باہر کی جانب لپکے۔

عین اسی وقت راکٹ لانچر زوردار آواز سے ٹکرایا۔ زوردار دھماکا ہوا... ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ اسی اندھیرے میں ایک یا دو دستی بم پھٹنے کی آواز آئی۔ فائرنگ یک بہ یک رک گئی۔

ہر طرف دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے... سائیں؟" اللہ ڈنو کی کپکپاتی آواز آئی۔

محمد بخش کو کیا پتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اسی وقت زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ دو افراد جدید ترین اسلحے سے لیس کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے چہروں پر عجیب سے ماسک تھے۔

دونوں کو دیکھ کر نامعلوم انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کیا اشارہ کیا۔ فوراً ہی...... ایک اور فرد ہاتھ میں ایک عجیب سا آلہ لیے نمودار ہوا۔ یہ آلہ پولورائیڈ کیمرے جیسا تھا۔ اس نے شاید اس کی مدد سے ان دونوں کی تصویریں اتاریں یا شاید ان دونوں کو شناخت کیا پھر اس نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلایا اور زور سے کچھ بولا۔

اس کے پیچھے کھڑے انہی جیسے نقاب پوش نے محمد بخش اور اللہ ڈنو پر بے دریغ فائر کر ڈالے۔ دونوں کے ذہن تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے۔ وہ ہر فکر و غم سے بے پروا ہو گئے۔ تھانے پر اور تھانے والوں پر کیا گزری؟ یہ کون افراد تھے؟ سب کچھ تاریکی میں دفن ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

"ہینڈز اَپ... ہلنا مت۔"

طارق نے للکار سنی۔ اس سے کب ہلا جا رہا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

آخر کو کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی جانب گھمایا۔ طارق کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

"ارے طارق... تم۔" ایک شناسا سی آواز آئی تو اس نے بھی آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ سامنے اس کا ہم جماعت سمیع کھڑا تھا۔

"ابے ٹڈے... تم... تم یہاں کہاں؟"

"تم بتاؤ... تم کہاں... میرا تو گھر ہے... میں تو اپنے گھر میں ہوں... چوروں کی طرح تو تم آئے ہو؟"

"بتاتا ہوں... ذرا دم تو لینے دو۔"

"آؤ... اندر آ جاؤ۔"

"اسے تو ہٹاؤ۔" طارق نے سمیع کے ہاتھ میں

پکڑے پستول کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ تو نقلی ہے۔"
دونوں اندر آئے۔ ڈرائنگ روم میں ایک آرام دہ صوفے پر طارق تو ڈھے گیا اور سمیع گھر کے اندرونی حصے کی جانب چائے پانی کا انتظام کرنے چلا گیا۔
سمیع واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں شربت کا گلاس تھا۔ طارق نے روایتی پولیس والے کا مظاہرہ کیا اور ایک ہی سانس میں سارا گلاس غٹاغٹ پی گیا۔ اس دوران میں اس کا سانس بھی قدرے بحال ہو چکا تھا۔
"خدا کا شکر ہے ٹڈے، یہ تمہارا گھر ہے... مگر تم تو عازم آباد میں رہتے تھے۔"
"تو کیا میں یہاں منتقل نہیں ہو سکتا... اس پر بھی قانون کی کوئی دفعہ لاگو ہوتی ہے کیا...؟"
"نہیں بھائی تم جہاں چاہو جاؤ... جہاں چاہے رہو۔"
"تم تو پولیس میں ہو نا...؟"
"ہاں۔"
"تو پھر یہ چوروں کی طرح کیوں چھپتے پھر رہے ہو... اور... یہ دھماکا کیسا تھا؟ شاید بازار میں کوئی بم بلاسٹ ہوا ہے۔"
"ہاں... میرے نزدیک ہی... میں بال بال بچا ہوں... لیکن کچھ مجرم میرے پیچھے لگ گئے تھے... وہی مجھے دوڑا رہے تھے۔" طارق نے وضاحت کی۔
"واہ... یہ اچھے مجرم ہیں جو پولیس کو دوڑا رہے ہیں۔"
"یار! بہت طاقت ور گروہ لگتا ہے..."
"یہ بم دھماکے اور ہلاکتیں... کبھی ختم بھی ہوں گی؟" سمیع عرف ٹڈے نے اپنی دانست میں اہم ترین سوال کیا۔
"ابے مجھے کیا پتا... میں تو ڈرائیور ہوں... تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے ٹاک شو میں اینکر پرسن آئی جی صاحب سے سوال کرتا ہے۔"
اسی وقت ایک بچہ زوردار سلام جھاڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے پانی اور دیگر لوازمات تھے۔
تمام پلیٹیں صاف کر لینے کے بعد اور چائے ڈکار لینے کے بعد بھی طارق کچھ دیر صوفے پر پڑا اینڈتا رہا۔ آخر کو اس نے جانے کے لیے پر تولنا شروع کیے۔
"اچھا بھائی... اب میں چلتا ہوں... میں علاقے کے تھانے میں ہی ہوتا ہوں... اگر اب کوئی چور آئے تو تم مجھے اطلاع کرنا۔"
"تم اپنا ہی کچھ کر لو تو مہربانی ہوگی... مجھے بخشو۔"
"اچھا بابا... خدا حافظ۔"
دونوں نے الوداعی مصافحہ کیا اور باہر آ گئے۔ طارق ایک جانب کو چلتا چلا گیا۔ یہاں رکشا اسٹینڈ تھا۔ اس نے ایک رکشا کیا... گھر کا پتا بتایا اور رکشے میں بیٹھ گیا۔ وہ اندر سے اب بھی خوف زدہ تھا۔ وہ رکشے میں بھی کچھ اس طرح دبک کر بیٹھا تھا کہ باہر سے ایک دم دیکھ لیا لینا آسان نہیں تھا۔
علاقے میں چونکہ قریب ہی بم دھماکا ہوا تھا تو ایک سراسیمگی کی فضا تھی۔ رکشا اپنی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں رکشا آگے بڑھ رہا تھا، طارق کا خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے دور اور نزدیک سے ایمبولینسوں کے سائرن بھی سنائی دے جاتے تھے۔
رکشا اب ایک پل پر چڑھ رہا تھا۔ رکشے والا ایکسلریٹر گھماتے ہوئے بار بار خود بھی ہلتا تھا اور ایسی حرکتیں کرتا جیسے رکشے کے ننھے منے انجن کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی زور لگا رہا ہو۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔
اسی لمحے طارق کو عقب سے ایک ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا۔ نہ معلوم کیوں اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں اور اعصاب تن سے گئے۔
رکشا پل پر چڑھ چکا تھا۔ اسی لمحے ایمبولینس قریب آئی... طارق کا دل چاہا کہ وہ رکشے سے چھلانگ لگا دے۔ اچانک ایمبولینس نے رکشے کو سائڈ ماری۔ رکشا فوراً ہی پلٹ گیا، ایمبولینس کے بریک چرچرائے۔ دروازے کھلے... کچھ افراد تیزی سے اترے... ان میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں پولورائیڈ کیمرے جیسا آلہ تھا۔ اس وقت تک ایمبولینس سے اترنے والے دیگر افراد رکشا سیدھا کر چکے تھے۔ یہ سب جثے میں بھاری بھر کم تھے اور ان کے جسموں پر طبی امداد دینے والوں کی وردیاں بھی نہیں تھیں۔
ایک آدمی نے طارق کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا۔ جھٹکے سے اس کا منہ کیمرے جیسے آلے کی جانب کیا گیا۔ آلہ پکڑنے والے نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا سر کیا ہلا، طارق کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ نہ جانے کس چیز کا وار تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔
تیزی سے طارق کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی کسی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

وہ سب نیم تاریک کمرے کے فرش پر پڑے تھے۔

یکے بعد دیگرے انہیں ہوش آتا چلا گیا۔
ہوش میں آنے والوں کے کانوں سے سب سے پہلی آواز جو ٹکرائی، وہ دانش کی تھی۔ وہ بول رہا تھا اور مسلسل بول رہا تھا۔ اس کی نہ ختم ہونے والی تقریر جاری تھی۔ اسے اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا کہ اس کے بیشتر ساتھی اس کے آس پاس ہی بے ہوش پڑے ہیں۔ ایک ایک کر کے سب ہوش میں آتے چلے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک نیم تاریک اور خنک سے کمرے میں مقید ہیں۔
"صاحب! خدا کے لیے... یہاں تو چپ ہو جاؤ۔"
طارق کو شدید الجھن ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہوا جو دانش چپ ہو گیا۔
"ہم پانچوں ہی یہاں پر ہیں۔" حیات بولا۔
"ہاں... جو ناکے پر تھے، صرف وہی افراد۔" محمد بخش بولا۔
"کیا ہم ہیڈ کوارٹر میں ہیں؟" طارق نے پھر سوال کیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔
"ابے ہیڈ کوارٹر والے اس طرح بلاتے ہیں؟" دانش نے الٹا سوال کیا۔ "تم لوگ کیسے پھنسے؟"
جواباً فرداً فرداً سب نے اپنی کتھا سنا ڈالی۔ کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ ایک دوسرے کے حیرت انگیز احوال سے واقف ہو کر وہ سب حیران پریشان نظر آنے لگے۔ بالآخر کچھ دیر بعد دانش نے ہی سکوت توڑا۔
"یار! یہ کون لوگ ہیں؟"
"ہاں... یہ اغوا برائے تاوان والے تو نہیں ہو سکتے۔" طارق نے لقمہ دیا۔
"جب بھی بولے گا بے تکا ہی بولے گا... حیرت انگیز ترین بات یہ ہے کہ جب تم لوگ ان کے چنگل میں آتے آتے بھاگ نکلے تو انہیں تمہاری صحیح لوکیشن کس طرح معلوم ہوئی... انہیں کیسے پتا چلا کہ تم رکشے میں ہو اور فلاں پل پر ہو... انہیں کیسے پتا چلا کہ حیات انہیں چکما دینے کے بعد کس متروکہ ریلوے لائن پر دوڑ رہا ہے؟"
"ہاں سائیں... یہ بات تو ہے، یہ تو کوئی پکا مخبر لگتا ہے۔" اللہ ڈنو مارے استعجاب سے بولا۔
"آپ کے موبائل فونز کے ذریعے۔" کمرے میں ایک مدھر آواز گونجی۔
سب ہکا بکا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ طارق تو گھبراہٹ میں کھڑا ہو گیا۔
عین اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شعلہ جوالا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس طرح کمرے میں آئی تھی جیسے تاریک راتوں کے بعد کسی کے آنگن میں چاند اتر آیا ہو۔ ایک پتلی بھڑکتی موی شمع اس کے ہاتھ میں تھی۔ منقش شمع دان پر ایستادہ تنی ہوئی گردن، اٹھی ہوئی نظر، ہر دیکھنے والے کو اس کے جلوے الگ ہی نظر آتے تھے۔
اس کے ساتھ دو مشٹنڈے اور بھی تھے۔ وہ سب خالی ہاتھ تھے۔ دروازہ ان کے پیچھے خودکار انداز میں بند ہو گیا۔ آنے والے تینوں افراد سفید فام تھے۔
اس محشر بداماں کی آمد سے قبل ہی دیواروں سے پھوٹتی اس کی آواز نے ہی سب کو حیران کر دیا تھا۔
"آج کے جدید دور میں یہ کوئی حیران کن بات نہیں۔ ہمارے ڈیٹا بیس میں آپ کے.... اداروں کے تمام ریکارڈ محفوظ ہیں۔ خاص کر فورسز کے حوالے سے۔ وہاں سے آپ کے موبائل نمبر چند لمحوں میں مل گئے اور آپ کے موبائل کے ذریعے مصنوعی سیارہ ہمیں آپ کی ہر ہر جگہ موجودگی کی خبر دیتا رہا۔"
"لیکن... لیکن میرا موبائل تو بند تھا؟" حیات نے کہا۔
"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تک آپ کی سم موبائل میں موجود ہے آپ ٹریس ایبل ہیں۔" وہ طارق کی سادہ لوحی پر مسکرائی۔
"واہ سائیں واہ... لیکن ہمیں تو گولی ماردی گئی تھی پھر آپ نے ہمیں زندہ کیسے کیا؟" اللہ ڈنو بولا۔ پھر وہ اپنے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "زخم کا بھی کوئی نشان نہیں ہے... زبردست سائنس ہے سائیں... زبردست۔"
وہ کھلکھلا کر ہنسی جیسے جلترنگ سی بجی ہو۔ جیسے سنگ مرمر کے کسی فرش پر موتیوں کی لڑی ٹوٹ کر بکھرتی چلی گئی ہو۔
"آپ میں سے کسی کو بھی گولی نہیں ماری گئی تھی۔ وہ تو ڈارٹ گن کے فائر تھے۔ یہ صرف بے ہوش کرنے کے لیے تھے۔"
سب انسپکٹر دانش کے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ دانش کی جون یک بہ یک پھر تبدیل ہو گئی ہے جس طرح وہ تھانے میں پراعتماد اور متحمل دکھائی دیا تھا بعینہٖ اس وقت بھی وہ متحمل اور بردبار نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ہم جیسے دو ٹکے کے پلسیوں پر یہ عنایات کیوں؟ سیٹلائٹ سے موبائل ٹریکنگ، ڈارٹ گن، تھانے پر حملہ وغیرہ یہ سب کچھ سمجھ میں آنے والا نہیں ہے؟"
"سب کچھ سمجھا دیا جائے گا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر

کہا۔ ”دانش! آج تمہیں ایس ایچ او نے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی، اگر تم سمجھ جاتے تو بہت فائدے میں رہتے... تم سب کو خوب اندازہ ہے کہ تم یہاں کیوں ہو... ہمیں ہمارا آدمی واپس چاہیے۔“

دانش زور سے ہنسا۔ اس کے اس طرح ہنسنے کا انداز بھی غیر معمولی تھا۔ کم از کم اس کے ساتھیوں کے لیے اجنبی۔

”کس بندے کی بات کررہی ہیں آپ... محترمہ...؟“

”نشاط... تم مجھے شاط کہہ سکتے ہو۔“

”جی محترمہ نشاط صاحبہ! ہمارے پاس کوئی بندہ نہیں ہے۔“ دانش پُرسکون انداز میں بولا۔ ”آپ کس کی بات کررہی ہیں؟“

جواباً نشاط بھی ہنسی۔

”میرا خیال تھا کہ تم لوگوں میں کچھ نہ کچھ عقل تو بہرحال ہوگی ہی... لیکن افسوس... کیا تم ہماری قوت کا اب تک اندازہ نہیں کر پائے؟ تمہارا کیا خیال ہے تمہیں یونہی اٹھوالیا گیا ہے اور اب تم یونہی یہاں سے ہنستے کھیلتے واپس گھر چلے جاؤ گے؟“

”ہمارے اندازوں کو رہنے دیں... آپ اپنا تعارف کروائیں کہ کون ہیں... اور یہ سب کیا ہے... پولیس والوں کو دھمکانے کا مطلب آپ کو معلوم ہے؟“

”دیکھیں آپ لوگ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کررہے ہیں۔“ اس دوران دانش، حیات وغیرہ خفیہ اشاروں میں ان تینوں پر حملے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

انہیں اندازہ تھا کہ ایک خاتون اور دو افراد پر قابو پانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ان پر قابو پاکر وہ بہ آسانی اس طاقت ور گروہ کے چنگل سے نکل سکتے تھے۔ بس پانچوں نے اشارہ کیا اور ایک ساتھ ہلا بول دیا۔

دانش نے تیزی سے خاتون پر حملہ کیا اور وہ سب سے زیادہ نشاط ہی کے قریب تھا لیکن نہ جانے اچانک کیا ہوا۔ خاتون کی لات ہیل سمیت اس زور سے اس کے منہ پر پڑی کہ اسے دن میں تارے نظر آگئے اور پھر یوں تابڑتوڑ اس پر گھونسے اور لاتیں پڑیں کہ وہ ہاتھ اٹھانا بھی بھول گیا۔ آخرکار نشاط کی ایک زوردار سوئپ دانش کو فرش پر لے آئی۔

دوسری جانب ان دونوں نے دو دو کو سنبھال رکھا تھا۔ ان پانچوں میں سے ہر ہر فرد مخالفین کو چھو لینے کی حسرت ہی دل میں لیے زمیں بوس ہوتا چلا گیا اور ہر ایک نے اپنی کوشش ترک کردینے میں ہی عافیت جانی۔ طارق اور اللہ ڈنو تو دوبارہ بے ہوش بن کر لیٹ گئے۔

لمحوں میں پانچوں کی طبیعت سے ٹھکائی لگا دی گئی۔ دانش کا تو مارے شرمندگی کے برا حال تھا کہ وہ ایک عورت کے ہاتھوں پٹا تھا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ کس سپر پاور سے ٹکرانے کی کوشش کررہے ہو۔“ نشاط بولی۔ اتنی مار پیٹ کے باوجود اس کا سانس ذرا سا نہیں پھولا تھا۔ بس لہجے میں ہلکا سا تموج تھا۔

”سپر پاور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔“ دانش پڑے پڑے کراہا۔

”ہم بھی خدا کو مانتے ہیں... وہ تو سپریم پاور ہے۔ لیکن دیکھ لو، زمین پر خدا کس کے ساتھ ہے۔“ نشاط نے کہا۔

”دنیاوی کامیابیوں سے دھوکے میں مت آؤ، کسی وقت میں فرعون تم سے زیادہ طاقت ور تھا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ خدا کا پسندیدہ بندہ تھا۔“ دانش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں تو جذبۂ خیرسگالی کے لیے آئی تھی... تم ہی نے پہل کی تھی۔ اب بھی وقت ہے، دیکھو اپنے آدمی کو تو ہم پاتال میں سے بھی نکال لائیں گے... تم نے اگر عقل مندی کا مظاہرہ کیا تو تم فائدہ اٹھالوگے۔“

”پاتال میں تو تم لوگ جانے والے ہو... اپنی فکر کرو۔“ دانش نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

نشاط کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

”اپنی حالت دیکھو، خود پر نہیں تو اپنے بیوی بچوں ہی پر رحم کھاؤ۔“

”تمہاری اردو بہت اچھی ہے۔“

”میں خود بھی بہت اچھی ہوں۔“

”گڈ... اور کیا کیا آفر ہے؟“ ان سب میں صرف دانش ہی بول رہا تھا۔

”جو کچھ تم چاہو... جو تم سب سوچ سکتے ہو اسے دو سے ضرب دے لو... اور ہاں، اس کے علاوہ ترقی علیحدہ۔“

وہ سب آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھے لیکن تھے زمین ہی پر۔ نشاط کے ساتھ آنے والے دونوں افراد یوں غیر متعلق کھڑے تھے گویا جو کچھ بھی ہورہا ہے، اس سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

”بہت کم قیمت لگارہی ہو تم۔“ دانش بولا اور اس کے کئی ساتھیوں کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔

”کیا مطلب... یہ کم قیمت ہے... تم کیا چاہتے ہو؟“

دانش ہنسا۔ ”تمہارا اردو کا لہجہ بھی بہت اچھا ہے۔“

”اور میری لات...؟“

”جواب نہیں صاحب... کیا کہنے۔“ دانش نے ہاتھ اٹھا کر داد دی۔

”تو پھر کیا خیال ہے؟“

”لات کے بارے میں...“

”وقت ضائع مت کرو... ڈیل ابھی ڈن کرو۔“

نشاط کو رفتہ رفتہ غصہ آتا جا رہا تھا۔

”میم صاحب!“ دانش کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ تمہارے ٹکڑوں پر پلنے والے لیکن سمجھ لو کہ یہاں سب کچھ بکاؤ نہیں ہے... ہم مر تو سکتے ہیں لیکن اپنے ملک سے غداری نہیں کر سکتے... میری ماں نے مجھے ملک سے وفاداری سکھائی ہے، غداری نہیں... اور بیوی بچوں کی دھمکی کسی اور کو دینا... کتنے ہی بیوی بچے تم اور تمہارے اندھے ڈرون... پہلے ہی نگل چکے ہیں... ہم قربانی دینے والے لوگ ہیں، ایسے کئی بیوی بچے... اس دھرتی پر قربان...“

کھٹاک... ابھی دانش کی تقریر یہیں تک پہنچی تھی کہ اس کے منہ پر نشاط کی بھرپور لات پڑی۔

دانش تیورا کر گرا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اس میں نہ جانے کہاں سے ہمت آگئی تھی۔ وہ پھر تیزی سے کھڑا ہوا اور بولا۔

”تم اس تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے... اور وہ کبھی آسمان نہیں دیکھ سکے گا... ہاں، ہم رشوت خور ہیں... لیکن ہم غدار نہیں... تم لوگ ہمیں غدار بنانے آئے ہو، یہ کبھی نہیں ہو سکے گا... آہ...“

اس مرتبہ لات پہلو پر پڑی۔ وہ ہاتھ رکھ کر چیخا اور چیختا چلا گیا۔

”اور مارو۔“ وہ دوبارہ کھڑا ہوا۔ ”یہ تو... یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”اس سے زیادہ مار تو ہم تھانے میں مرغی چور کی لگاتے ہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے بلایا۔ ”آؤ... اور مارو... شاید اسی طرح مجھ گناہ گار کے کچھ عذاب کم ہو جائیں۔“

حیات نے دیکھا کہ اللہ ڈنو کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ واقعی ان سب سے اپنے افسر کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ سب دوبارہ سامنے والوں پر ٹوٹ پڑتے کہ کمرے میں ایک عجیب سی آواز گونجی۔

نشاط اور اس کے ساتھیوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ اور وہ جانے کے لیے پلٹ گئے۔

”ارے کہاں چلیں... جانِ من... کہیں پائے نازک میں موچ آنہ جائے... دلِ سخت جاں کو مسلتے مسلتے۔“

دانش باوجود لہولہان ہونے کے مسلسل بکواس کر رہا تھا۔ نشاط جاتے جاتے ایک لمحے کو رکی... اس کے ساتھ دونوں افراد بھی رکے... نشاط نے نہایت غصیلی نگاہوں سے دانش کی طرف دیکھا۔

دانش پورے قد سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ کمرے پر ہولناک سناٹا طاری تھا۔ پھر نشاط اور اس کے ساتھی کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

پریس نے ایک ہنگامہ برپا کیا ہوا تھا۔ شام کے اخبارات ضمیمے نکال رہے تھے۔ ٹی وی چینل چیختی چنگھاڑتی بریکنگ نیوز دیتے نہیں تھک رہے تھے۔ صرف ایک دن میں شہر میں پے در پے دہشت گردی کی اتنی کارروائیاں ہو گئی تھیں کہ شہر تو شہر پورا ملک اس سے متاثر ہوا تھا۔ تھانے پر حملہ اور وہاں سے دہشت گردوں کو چھڑا کر لے جانا۔ سب سے زیادہ زیرِ بحث تھا۔ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ناقص کارکردگی پر شدید تنقید کی جا رہی تھی۔

دانش اور اس کی ٹیم کے ہاتھوں موٹر سائیکل سوار کے ہلاک ہونے والے واقعے کے بعد پورے شہر اور ملک میں ایک اشتعال سا پھیل گیا۔ جگہ جگہ فائرنگ کے واقعات اور جلاؤ گھیراؤ کے واقعات ہوئے۔ مشتعل افراد کئی جگہ سڑکوں پر نکل آئے اور پولیس کے خلاف نعرے بازی کی۔ سوشل میڈیا پر مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ جن پولیس والوں نے نوجوان کو اپنی موبائل کے نیچے کچل کر ہلاک کر دیا انہیں فوراً حراست میں لیا جائے اور میڈیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ میڈیا کا کہنا تھا کہ پولیس ڈپارٹمنٹ مزید مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اس نے نوجوان کے قتل میں ملوث پولیس اہلکاروں کو روپوش کر رکھا ہے۔

جلاؤ گھیراؤ کے واقعات کے ساتھ ایک بم دھماکا بھی ہوا تھا اور خبر رساں اداروں کو اطلاعات تھیں کہ ابھی اس طرح کے کئی دھماکے اور ہو سکتے ہیں۔ دہشت گردوں کی طرف سے مزید دھماکوں کا الٹی میٹم دیا جا چکا تھا۔ یہ خبر کس طرح لیک ہوئی کسی کو علم نہیں تھا۔ ذرائع نامعلوم تھے لیکن دھمکی کی اطلاع زبانِ زدِ عام ہو چکی تھی۔

شہر میں ہونے والے دیگر واقعات میں اگر ایس ایچ او کی ہلاکت کی خبر بھی شامل تھی لیکن یہ اہم خبر کسی طرح بھی زیادہ کوریج نہ حاصل کر سکی۔ تھانے پر حملے کے واقعے نے البتہ میڈیا پر جگہ بنائی۔

سیاست دانوں کے لیے سیاست چمکانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ حزبِ مخالف کی ایک ہی رٹ تھی کہ یہ حکومت کی نااہلی ہے وہ فوراً مستعفی ہو جائے۔ حکومتی حلقوں کا خیال تھا کہ حالات تقریباً نارمل ہیں، اِکا دُکا واقعات کہاں نہیں ہوتے۔

لیکن ایک بات تھی کیا عوام کیا خواص، کیا میڈیا کیا سوشل میڈیا، سیاست دان، مبصر، دانشور ہر ایک پولیس پر ضرور برس رہا تھا۔

ادھر پولیس ہیڈ کوارٹر میں اعلیٰ سطحی اجلاس جاری تھا۔ اجلاس میں اہم پولیس اہلکاروں کے ساتھ ساتھ گورنر اور وزیرِ اعلیٰ کے نمائندے بھی شریک تھے۔

”پولیس کی بہت بدنامی ہو رہی ہے۔“ ایڈیشنل آئی جی بولے۔

”یقیناً ایسا ہے... پولیس کی بہت بدنامی ہو رہی ہے۔ لیکن سر! ہمارا خیال ہے کہ یہ سب کچھ کسی گہری سازش کا حصہ ہے۔“ ڈی آئی جی نے وضاحت کرنا چاہی۔

”کسی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی ناقص کارکردگی اس طرح کے بہانوں سے نہیں چھپا سکتے۔ سازش... سازش... سازش... یہ ایک آسان بہانہ ہے... جب سے ملک آزاد ہوا ہے ہم کسی نہ کسی سازش کی زد میں ہی رہتے ہیں۔ آج لوگ پولیس کو چوڑیاں پہننے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ پولیس کی حفاظت کے لیے ایک اور پولیس فورس کے قیام کا طعنہ دے رہے ہیں... تف ہے اس کارکردگی پر۔“ ایڈیشنل آئی جی غصے میں بولتے چلے گئے۔

سب خاموش تھے۔ زیادہ تر چہروں پر ایک گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں... لیکن یہ واقعات کسی اور ہی طرف اشارہ کرتے معلوم ہو رہے ہیں۔ سر! مسئلہ کوئی بڑا ہی لگ رہا ہے۔ دیکھیے حوالدار رئیس خان کی ہلاکت اور گولی لگنے کے واقعے کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہو رہا۔ ہم نے اس حوالے سے ایک پریس نوٹ بھی جاری کیا، وہ کہیں شائع نہیں ہوا۔ بعد کی اطلاعات سے پتا چلا کہ وہ نوٹ راستے ہی سے غائب ہو گیا۔ وہ کون سے خفیہ ہاتھ ہیں یہ پتا لگانا ابھی باقی ہے۔ مرنے والے ایس ایچ او سے تو خود آئی جی صاحب کی بات ہوئی تھی اور اس نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ مرنے والا غیر ملکی تھا۔ کیا اس نے نہیں بتایا تھا کہ اس نے شبے کو یقین میں بدلنے کے لیے لاش کی بے حرمتی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برہنہ کر کے تصدیق کی تھی۔ کیا یہ بات کسی طور بھی سامنے آئی۔ سب کے سامنے تو صرف ایک شریف اور معصوم نوجوان کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت کا قصہ ہے۔ کسی کو کیا پتا کہ اس بدمعاش نے ہمارے ایک حوالدار کو شہید کیا، وہ غیر ملکی تھا اور اس کے پاس ممنوعہ بور کا غیر ملکی ہتھیار تھا۔ خطرناک ترین اسلحہ۔ اور پھر تھانے پر حملہ ہوتا ہے اس غیر ملکی کی لاش غائب ہو جاتی ہے۔ ہمارے دو پولیس اہلکار جو اس واقعے میں ملوث تھے اغوا کر لیے جاتے ہیں اور تھانے سے ایک کیل بھی غائب نہیں ہوتی۔ لاک اپ میں موجود ایک ملزم بھی غائب نہیں ہوتا۔

”دانش اور اس کے تمام ساتھی صفحۂ ہستی سے اس طرح غائب کر دیے جاتے ہیں جیسا ان کا وجود ہی نہ ہو۔ نہیں سر! یہ واضح طور پر کوئی گریٹ گیم ہے۔“

ایک اور ڈی آئی جی نے طویل بات کی۔ ”سر! میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“ میٹنگ میں مدعو ایک ایس پی نے جسارت کی۔ آئی جی جو اجلاس کی صدارت بھی کر رہے تھے، انہوں نے سر کے اشارے سے بات کرنے کی اجازت دی۔

”سر! میں یہ اطلاع دے چکا ہوں کہ دانش اور اس کی پوری ٹیم اغوا کر لی گئی ہے۔ سر! یہ تصدیق بھی ہو گئی ہے کہ دانش اور اس کے ساتھ کی نفری نے اپنے حوالدار کی ہلاکت کے بعد موٹر سائیکل سواروں کو موبائل کی ٹکر مار کر گرا دیا تھا۔ ایک ہلاک ہو گیا اور ایک زخمی۔ دانش مرنے والے کی لاش تھانے لایا لیکن اس نے زندہ فرد کو کہیں غائب کر دیا۔ کہاں اور کیوں؟ کوئی نہیں جانتا... یہ بھی تصدیق ہو چکی ہے کہ یہ دونوں غیر ملکی تھے اور یقینی طور پر بلیک واٹر جیسی کسی بدنام زمانہ تنظیم کے دہشت گرد ہوں گے۔“

پہلے والے ایڈیشنل آئی جی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ایس پی کے خاموش ہونے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا۔

”اس بات میں وزن ہے سر... جب یہ خبر پھیلی بھی نہیں تھی اسی وقت مجھے ایک نامعلوم کال... میرے ذاتی موبائل فون پر ریسیو ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ زخمی کو فوراً رہا کر دو ورنہ شہر کو کھنڈر بنا دیا جائے گا۔“

آئی جی صاحب اور نمائندے سنجیدگی سے بات سن رہے تھے اور صرف گردن ہلا رہے تھے۔

اجلاس جاری تھا کہ بند دروازہ کھلا، ایک اہلکار دبے قدموں داخل ہوا اور اس نے ایڈیشنل آئی جی کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور واپس چلا گیا۔

آئی جی صاحب کی تیوریوں پر بل تھے۔ انہوں نے استفسارانہ انداز میں دیکھا۔

"سر! میڈیا پر دانش اور اس کے ساتھیوں کی تصویریں چلائی جا رہی ہیں۔ محکمۂ پولیس کے اعلامیہ کے ساتھ کہ ان پولیس اہلکاروں نے غفلت کا مظاہرہ کیا اور دانستہ ایک معصوم شہری کو ہلاک کیا۔ پھر باز پرس کے خوف سے روپوش ہو گئے۔ ان کی گرفتاری میں مدد دینے والے کو معقول انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔" ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جسے وہ دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے وہ کاغذ آئی جی صاحب کو پیش کر دیا۔

"لیکن ہم نے تو ایسا کوئی اعلامیہ جاری نہیں کیا۔" آئی جی صاحب بولے۔

"نہیں سر! لیکن میڈیا کا اصرار ہے کہ انہیں ای میلو... پولیس ہیڈ کوارٹرز ہی سے آئی ہیں۔"

"اوہ... اس میں یقیناً عالمی قوتیں ملوث ہیں۔" آئی جی صاحب بولے پھر ان کا رخ گورنر اور وزیر اعلیٰ کے نمائندگان کی طرف ہو گیا۔

"میری درخواست ہے کہ فوری طور پر ایک اعلیٰ سطحی اجلاس وزیر اعلیٰ سیکریٹریٹ میں بلوا لیا جائے... جس میں گورنر، وزیر اعلیٰ اور دیگر حساس اداروں کے اہلکاروں کی شمولیت لازمی ہے... ہم اپنا لائحہ عمل طے کر کے وہیں آ رہے ہیں۔" دونوں نے سر ہلائے۔

"کیا خیال ہے جناب! کیا فوج..." گورنر کے نمائندے نے استفسار کرنا چاہا۔

"یقیناً۔" آئی جی صاحب بات کاٹ کر بولے۔

"فوج ہماری ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ معاملات بہت خطرناک ہیں۔ ہمیں مل جل کر ہی کوئی کام کرنا ہوگا۔ ہم اپنے فیصلے اور رینجرز سے بات کر کے... وہیں آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وفاق سے بھی بات کرنا ہوگی۔ کچھ اطلاعات میرے پاس بھی ہیں جو میں یہاں ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ وہیں بات ہو گی۔"

دونوں نمائندے میٹنگ سے اٹھ گئے۔

آئی جی صاحب اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوئے۔

"اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ یہ عالمی سطح کا کوئی مسئلہ ہے۔ ہمیں اپنا ایکشن پلان مرتب کر لینا چاہیے۔"

"یس سر... اور میڈیا کو اس طرح گمراہ کرنا بہت ہی غلط ہے... ہمیں محکمے کی کالی بھیڑوں سے آغاز کرنا چاہیے اور اس اعلامیے کی تردید جاری کر دینی چاہیے۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

"نو سر!" آئی جی صاحب نے سختی سے تردید کی۔ "ہمارے ہاں کالی بھیڑیں بہت ہیں... لیکن اتنی کالی بھی نہیں ہیں کہ وہ ایسا اقدام کریں۔ کمپیوٹرز ہیک کرنا اور کسی کی طرف سے بھی ایسی ای میلو جاری کر دینا کمپیوٹر ہیکرز کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ جو چل رہا ہے وہ چلنے دیں۔ اس سے اب ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ البتہ میڈیا کو اب ہم یہ ہدایت کر دیں گے کہ ہمارے اعلامیے سہ طرفہ تصدیق کے بغیر جاری نہ کرے اور اس کا طریقہ بھی ہم وضع کر لیں گے تاکہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ میں البتہ یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حربہ صرف اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ دانش اور باقی نفری شاید اب اغوا کاروں کے پاس بھی نہیں ہے... خدا انہیں حفظ و امان میں رکھے۔"

آئی جی صاحب بہت جذباتی لگ رہے تھے۔

"دشمن چاہتا ہے کہ پولیس، عوام، میڈیا اور دہشت گرد سب کے سب دانش اور اس کی ٹیم کے پیچھے پڑ جائیں اور اسے پاتال سے بھی کھود نکالیں تاکہ وہ اس سے اپنا زخمی واپس لے سکیں۔"

"سر! یہ بھی تو ممکن ہے... کہ... سودا ہو گیا ہو۔"

"نہیں۔" آئی جی صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، یہ آواز ان کے حلق سے نہیں دل سے نکلی تھی۔

"میرے سپاہی ملک و قوم کے غدار نہیں ہیں۔ انہیں تلاش کرو اور ان کی حفاظت کرو۔"

پھر اجلاس میں آئندہ کا لائحہ عمل طے ہونے لگا۔

☆☆☆

نشاط اور اس کے ساتھیوں کے نکلتے ہی دانش جھپٹ کر دروازے تک پہنچا۔ پہلے اس نے تالے پر زور آزمائی کی پھر دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے لگا۔ پھر وہ پلٹا۔

"محمد بخش... ادھر آؤ۔"

محمد بخش جلدی سے وہاں پہنچا۔

"تم تالے تو کھول لیتے ہو نا؟"

"جی ہاں۔"

"یہ تالا کھولو۔"

محمد بخش نے ڈرتے ڈرتے چھت پر اور چاروں طرف نظر گھمائی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ انہیں سی سی ٹی وی کے ذریعے کہیں دیکھا جا رہا ہے اور ان کی آوازیں بھی سنی جا رہی ہیں۔

"ڈرو مت... میں کھڑا ہوا ہوں یہاں۔" دانش پھر بولا۔

"سر! تار... تار چاہیے۔"

"تار کہاں سے لاؤں؟"

پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے کے درمیان آیا۔ یہاں نشست کے لیے چند صوفے رکھے تھے۔ اس نے تیزی سے ایک صوفہ پلٹا اور اس کے نیچے کا کپڑا اپھاڑ ڈالا۔ اسپرنگ اس کے سامنے تھے۔ کسی طرح اس نے ایک پورا اسپرنگ کھینچ کر باہر نکال لیا۔

"یہ لو۔"

محمد بخش نے گردن ہلائی۔ دوڑ کر اسپرنگ لیا اس کا ایک سرا تالے کے سوراخ میں گھمانے لگا۔

سب سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک خوف زدہ تھا۔

محمد بخش مصروف رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اسپرنگ کے دوسرے سرے کو بھی بڑی مشکل سے گھما کر تالے کے سوراخ میں ڈالا اور کوشش کرتا رہا۔

محمد بخش اتنی مشقت نہیں کر رہا تھا جتنا اس کا سانس پھول رہا تھا۔ آخر کار کامیابی نے قدم چومے اور دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ اچھل کر یوں پیچھے ہٹا گویا کرنٹ لگا ہو۔

"کیا ہوا۔" دانش نے پوچھا۔

"کچھ نہیں صاحب... یہ کھل گیا ہے۔" وہ مزید پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

دانش آگے بڑھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ گردن باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سب اتنی تیزی سے باہر آئے کہ اگر کہیں دیر ہو گئی تو وہ اندر ہی رہ جائیں گے اور دروازہ دوبارہ مقفل ہو جائے گا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھے، انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہیں۔ یہ کئی کمرے تھے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ سامنے کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

کھلے دروازے سے جو منظر نظر آیا، وہ ان لوگوں کی سٹی گم کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ کمرا کیا اسلحہ خانہ تھا۔ الماریوں میں جدید ترین اسلحہ یوں سجا تھا گویا فوجوں کے لیے محاذ پر استعمال کرنے کے لیے صاف کر کے رکھا گیا ہو۔ انہوں نے تیزی سے بہت سا اسلحہ اور میگزین اٹھا لیے۔

جب وہ اسلحہ لے کر باہر آئے تو دانش دوبارہ اندر گیا۔ اس کے ہاتھ میں دو ڈارٹ گنیں تھیں۔ اس نے ایک خود رکھی اور ایک حیات خان کو دے دی۔

وہ آگے بڑھے۔ آگے چند ایک سونے کے کمرے تھے۔ ہر کمرا کھلا ہوا تھا۔ وہ کچھ اور آگے بڑھے تو انہیں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ یہ آخری کمرا تھا۔ کمرے کے دروازے سے پہلے ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں موٹا شیشہ لگا تھا۔ کھلے دروازے سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

دانش نے سب کو پیچھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود شیشے میں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ وہ نیچے بیٹھ چکا تھا اور کھڑکی کے ایک کونے سے اندر کا منظر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

نشاط اور دونوں آدمی اندر تھے۔ کمرے کا منظر عجیب سا تھا جیسے کوئی آپریشن روم ہوتا ہے۔ مختلف کمپیوٹر اور اسکرینیں لگی تھیں۔ عجیب عجیب آلات تھے جن سے دانش قطعی لاعلم تھا۔

اس نے دیکھا کہ تینوں ایک مشین سے جڑی ایک بڑی سی اسکرین کے سامنے کھڑے ہیں۔ کمپیوٹر کا ماؤس نشاط کے ہاتھ میں تھا جسے وہ گھما گھما کر روشن اسکرین پر کسی گھر کے اندرونی مناظر دیکھ رہی تھی۔ گھر بالکل خالی پڑا تھا۔ یہاں تک کہ وہ گھر کے بڑے سے داخلی دروازے کے منظر دیکھنے لگی۔ دروازے سے رینجرز کے جوان باہر جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"یہ یہاں پہنچے کیسے؟" نشاط بولی۔ اس کی زبان فرنگی اور لہجہ خالص غیر ملکی تھا۔

"وہ تو معلوم نہیں لیکن یہ یہاں سے بے نیل و مرام جا رہے ہیں۔"

"ان کی باتوں سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ غلط گھر میں آ گئے۔"

"آئے کیوں... کیسے؟" نشاط غرائی۔

دانش انگریزی سے قطعی نابلد تو نہیں تھا لیکن اتنی رواں انگریزی سمجھنا اس کے لیے بہت ہی مشکل تھا۔ انگریزی میں تو اسے افسران بالا کی صرف گالیاں سننے کی عادت تھی۔

دانش نے خود بھی ڈارٹ گن نکال لی اور حیات خان کو اشارے سے آگے بلایا۔ دونوں خاموشی سے اٹھے اور کمرے میں داخل ہو گئے۔

اسی لمحے نشاط نے منظر تبدیل کیا۔ اب اس کمرے کا منظر سامنے تھا جہاں کچھ دیر پہلے یہ لوگ تھے۔ صوفہ الٹا ہوا تھا اور کمرا خالی تھا۔

''یہ کہاں گئے؟'' نشاط چیخی اور کھڑی ہوگئی۔

جونہی وہ مڑے، دانش نے ڈارٹ گن سے فائر کر دیا۔ دوسرا فائر حیات نے کیا۔ تیسرا فرد تیزی سے دوڑتا ہوا ان کی جانب بڑھا۔ وہ شاید اچھل کر فلائنگ کک مارنے جا رہا تھا۔ اسی وقت حیات کے بائیں ہاتھ میں دبے پستول نے شعلہ اگلا اور وہ وہیں دھپ سے نیچے گر گیا۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ تینوں شاید تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے ساتھ ایسا ہوگا۔ وہ تینوں نہتے تھے۔

''سر! کیا...'' حیات پستول سیدھا کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں... ڈارٹ گن تمہیں اس لیے تو نہیں دی تھی کہ انہیں ختم کرنا ہے... ان دونوں کو ان کے ساتھی کے پاس پہنچانا ہوگا۔ چلو اٹھاؤ۔''

نشاط اور اس کا ساتھی فوراً ہی بے ہوش ہوگئے تھے۔ اس میں کوئی سریع الاثر دوا تھی۔ ان کے جسموں سے ڈارٹ نکالے گئے اور انہیں کمرے سے اٹھا لائے۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے دانش نے گرد و پیش پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

تہ خانے سب سینٹرلی ائر کنڈیشنڈ تھے۔ حبس اور گھٹن کا ذرا احساس نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گھوم پھر کر انہوں نے سارے کمرے دیکھ ڈالے لیکن انہیں ان تہ خانوں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔

''سر! زیادہ دیر یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے... ہم پھنس سکتے ہیں۔'' اللہ ڈتو بولا۔

''وہی دیکھ رہا ہوں۔'' دانش نے کہا۔ وہ سب پھر آپریشن روم میں آگئے۔ ایک ایک چیز غور سے دیکھتے رہے۔

''سر! ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں ہوش میں لائیں اور ان سے پتا کریں۔'' طارق بولا۔

''ضرورت نہیں ہے۔'' حیات بولا اور ساتھ ہی اس نے ایک میز کے قریب لگا لیور دبا دیا۔ نزدیکی دیوار میں ایک بے آواز خلا نمودار ہوا۔ لفٹ سامنے ہی تھی۔ سب دوڑ کر اس میں بھر گئے۔

''ارے انہیں بھی تو اٹھا کر لاؤ۔'' دانش چیخا۔ پھر بمشکل سب نیچے اترے، نشاط اور اس کے ساتھی کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لفٹ تک لائے۔ سب کسی نہ کسی طرح ٹھنس ٹھنسا کر سوار ہوئے اور پہلی منزل کا بٹن دبا دیا۔

پہلی منزل پر لفٹ ایک بیڈ روم میں رکی سب اتر گئے۔ لفٹ کا دروازہ بند ہوا، ساتھ ہی دیوار بے آواز انداز میں برابر ہوتی چلی گئی۔ وہ سب بیڈ روم سے باہر آئے۔ یہ تو وہی کمرا تھا جو وہ سی سی ٹی وی پر دیکھ رہے تھے۔

''تم نے راستہ خوب تلاش کیا۔'' دانش نے ستائش کی۔

''تلاش کیا کرنا تھا سر! لیور کے ساتھ ہی سرخ رنگ سے موٹا موٹا ''ایگزٹ'' لکھا ہوا تھا۔''

''پھر بھی شاباش... بڑی بات ہے تم نے دیکھ لیا۔ ہم تو سب ہی وہیں کھڑے تھے۔'' دانش نے کہا۔

وہ عمارت سے باہر آئے، یہ ایک بڑی کوٹھی تھی۔ پورچ میں ایک وین اور دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سب گاڑیوں میں چابیاں لگی تھیں۔ وہ سب ایک وین میں بھر گئے۔ وین چل پڑی۔ باہر آنے کے کچھ دیر بعد حیات نے کہا۔

''سر! ان لوگوں کے پاس جدید نظام ہے۔ ہوسکتا ہے گاڑیوں میں ٹریکر لگے ہوں۔ جب یہ موبائل سے ہمیں ڈھونڈ سکتے ہیں تو اس گاڑی کے ذریعے تو فوراً ہم تک پہنچ جائیں گے۔''

وین کے بریک چرچرائے۔ پیچھے آنے والی گاڑی ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ''صحیح کہہ رہا ہے یہ، نیچے اترو۔'' دانش نے گالی دے کر کہا۔

سب کے سب اسلحہ لہراتے ہوئے نیچے اترے جس بیدردی سے انہوں نے نشاط اور اس کے ساتھی کو وین میں ٹھونس رکھا تھا، اسی بیدردی سے گھسیٹ کر نیچے اتارا گیا اور فٹ پاتھ کے قریب سڑک پر ڈال دیا۔

اتنی دیر میں دو ٹیکسیاں روکی جا چکی تھیں۔ سب ٹیکسیوں میں بیٹھے اور روانہ ہوگئے۔

نشاط اور اس کے ساتھی سے غیر ملکی ہونے کی کوئی رعایت نہیں کی جا رہی تھی۔

ٹیکسیاں آگے پیچھے دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ دانش جس ٹیکسی میں بیٹھا تھا اس کے ڈرائیور نے جی کڑا کر کے دانش کو مخاطب کیا۔ ''صاحب! آپ لوگوں کی فوٹو... ہر چینل پر چل رہی ہے۔''

''کیوں؟'' دانش کی سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ ''وہ کیوں؟''

''آپ لوگوں پر انعام رکھا گیا ہے... آپ وہ پولیس والے ہو جو پولیس کو مطلوب ہو۔''

''اچھا۔'' دانش نے طویل سانس لی پھر ڈرائیور کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ جمایا۔ ''دماغ ٹھنڈا رکھنا ورنہ یہیں اِن کاؤنٹر کر کے باہر پھینک جاؤں گا۔'' دانش غرا کر

بولا۔ وہ ویسے بھی اس وقت بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ لہولہان زخمی چہرہ عجیب تاثر پیش کر رہا تھا۔ دانش بڑی مشکل سے چل پھر رہا تھا۔ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ خاص کر نشاط نے جو پہلو میں لات ماری تھی۔ دانش کا خیال تھا کہ شاید اس کی ایک آدھ پسلی ٹوٹ گئی ہے۔

دونوں ٹیکسیاں رینجرز ہیڈ کوارٹر کے بڑے سے دروازے پر جا کر رک گئیں۔ دانش تیزی سے نیچے اترا اور دروازے پر بنی چوکی کی طرف بڑھا۔ وہ اب تک پولیس ہی کی وردی میں تھا۔ وہ دیر تک وہاں کھسر پھسر کرتا رہا۔ پھر اندر کہیں فون کیے گئے۔

ابھی دانش وہیں کھڑا تھا کہ اندر سے ایک چھوٹا ٹرک آتا دکھائی دیا۔ ٹیکسیاں خالی کر کے وہ سب ٹرک میں سوار ہوگئے۔ ٹرک کے ساتھ رینجرز کے کچھ جوان بھی تھے۔ بے ہوش نشاط اور اس کے ساتھی کو انہوں نے سنبھال لیا اور ٹرک ہیڈ کوارٹر میں غائب ہوگیا۔

☆☆☆

دانش کرنل صاحب کے دفتر میں موجود تھا۔ اس کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ پسلی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ نہا دھو کر اور آرام کر کے وہ تازہ دم ہوگیا تھا۔

''یہ تمہاری نشاط آپا تو بہت گہری نکلیں۔'' کرنل صاحب دانش کو بتا رہے تھے۔ ''یہ گزشتہ دس برس سے ہمارے ہی ملک میں رہ رہی ہیں۔ نہ صرف انہوں نے یہاں شادی کر کے ایک شریف آدمی کا گھر بسایا ہوا ہے بلکہ ان کے دو بچے بھی ہیں۔''

''کیا؟'' دانش حیران تھا۔

''جی ہاں... اور تو اور یہ ایک این جی او بھی چلاتی ہیں جس کے فلاحی کارناموں کے سب ہی معترف ہیں۔ اس طرح انہوں نے بعض مقتدر حلقوں میں بھی جگہ بنالی ہے۔''

''میں نے جو پتا بتایا تھا...'' دانش نے کرنل صاحب سے کہا۔

''وہاں ہم چھاپا مار چکے تھے۔ تھانے پر حملے کے وقت ہمارے دو اہلکار نزدیک ہی تھے۔ سارا واقعہ ان کے سامنے پیش آیا۔ جب یہ لوگ تھانے سے صرف اللہ ڈتو اور محمد بخش کو لے کر باہر نکلے تو انہوں نے تعاقب کیا۔ یوں ہمیں پتا چلا کہ تم لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے لیکن جب ہم نے چھاپا مارا تو گھر خالی تھا۔ تہ خانوں کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ ہم سمجھے ہم سے اندازے کی غلطی ہوئی ہے۔''

''سر! خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے... اصل عمارت کے عین نیچے تہ خانوں کا جال تھا۔ ہمیں وہیں رکھا گیا تھا۔ جونہی رینجرز کوٹھی میں داخل ہوئی انہیں اطلاع ہوگئی۔ وہ اس وقت ہمیں زدوکوب کر رہے تھے۔ وہ فوراً اپنے کنٹرول روم پہنچے۔ بس ہمیں نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔'' دانش نے کہا۔

''لیکن وہ بھی ان کا اصل ٹھکانا نہیں ہے۔ سمجھو علاقائی مرکز ہے۔ وہاں انہوں نے دنیا کا جدید ترین نظام لگا رکھا تھا۔ اب وہ سب ہمارے قبضے میں ہے۔ اس سے ہمیں بڑا فائدہ ہوگا۔ تھوڑے سے وقت میں بڑا کام ہو چکا ہے۔ ہم نے مارکیٹ سے لڑکے اٹھوا لیے تھے۔ ان بچوں نے تو حیران کر دیا۔ لمحوں میں کمپیوٹرز کا سارا ڈیٹا کھول کر رکھ دیا۔ یہاں ان کے کم و بیش دس بارہ ٹرینڈ ایجنٹ ہیں۔ زیادہ تر دہشت گردی کے واقعات میں یہی لوگ ملوث تھے۔ وہ سب گرفتار ہو چکے ہیں لیکن ابھی ایک مسئلہ ہے...''

''وہ کیا کرنل صاحب؟''

''ان تینوں نے ہی زبان نہیں کھولی ہے۔''

''پہلے والے کو تو آپ لوگ ہی دیکھیں... نشاط اور اس کے ساتھی کو میرے حوالے کریں۔''

''ٹھیک ہے... تینوں کو ہی تم لائے ہو... تم بھی کوشش کرلو۔''

''سر! یہ آپ کی مہربانیاں ہیں۔ نہ آپ موقع دیتے نہ ہی یہ کامیابیاں ہوتیں۔''

''نہیں... اللہ نے ان تینوں خبیثوں کی گرفتاری تمہارے ہاتھ سے لکھی تھی۔ ہمارے جوان تو ان کے پیچھے تھے ہی لیکن موٹر سائیکل سوار انہیں چکمہ دینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ تم لوگوں نے انہیں نہ صرف پکڑ لیا بلکہ ہماری بات مان کر انہیں سب کی نظروں سے اوجھل کر کے یہاں لے آئے۔''

''سر! اس کا فائدہ ہی ہوا نا... تھانے میں جب تک ہمیں پتا چلتا کہ یہ عالمی دہشت گرد ہیں، اس وقت تک یہ ہمیں جل دے کر بھاگ چکے ہوتے۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ رئیس کی موت کا ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے لیکن رئیس کی شہادت نے ان کا پورا نیٹ ورک بے نقاب کر دیا۔ جاؤ تم بھی تفتیش کرو۔''

☆☆☆

نیم تاریک سا گودام، اونچی چھت... باہر سے روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی۔ گودام کا فرش کچا تھا اور شاید اس کے چاروں طرف گھنے درخت تھے۔ نشاط اور اس کا ساتھی

فرش پر پڑے تھے۔ دونوں کو زدوکوب کیا گیا تھا۔ انہیں دور سے دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زخمی بھی ہیں۔

دانش، محمد بخش اور اللہ ڈتو کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نشاط سر اٹھا کر آنے والوں کو دیکھنے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ لہولہان تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ بڑی بڑی باتیں مت کرو۔ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ آج دیکھو، تمہارا سارا نیٹ ورک تباہ ہوگیا ہے۔ تمہاری برسوں کی محنت اور کروڑوں کی انویسٹمنٹ ضائع ہوچکی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، ایسا ہوتا ہے۔ مشن کامیاب بھی ہوتے ہیں... ناکام بھی۔“ نشاط نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

”یہ ناکامی تم سب کو مدتوں یاد رہے گی۔ تم اس پر ریسرچ کیا کرو گے کہ یہ ناکامی ہوئی کیسے... میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ یہ ناکامی کیسے ہوئی۔ صرف تکبر کی وجہ سے تم خود کو سپر سمجھنے لگے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی معراج پر ناقابلِ شکست سمجھا... دیکھو خدا نے ہم جیسے جاہلوں کے ہاتھوں تمہیں کیسی شکست سے دوچار کیا ہے۔“

”اب تم بڑی بڑی باتیں کرلو۔“

”اللہ کی پناہ... ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہم جیسے گناہ گاروں سے اللہ نے کام لے لیا اور بس...“

”بس بس... زیادہ مولوی بننے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارا سارا ریکارڈ پڑھ لیا ہے۔ میں جانتی ہوں تم کتنے ایمان دار ہو۔“

”میں نے کب کہا کہ میں ایمان دار ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم تنخواہ بھی لیتے ہیں... پیسے بھی لیتے ہیں اور تم بھی پیسوں ہی کے لیے ایسی بدنامِ زمانہ تنظیم سے منسلک ہو... لیکن کبھی غور کرنا... پیسا تمہارا ایمان ہے اور ہمارے لیے صرف ضرورت کی چیز۔“

”تو اپنی ضرورتیں پوری کرو۔ میں اب بھی تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ باز آجاؤ، اب بھی وقت ہے ورنہ عبرت کا نشان بنا دیے جاؤ گے۔“ نشاط نے کہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی نخوت کے آثار تھے۔

”کیا تم اب بھی یہی سمجھتی ہو کہ بچ جاؤ گی؟“ دانش نے حیرت سے پوچھا۔

”سمجھنا کیا ہے، تم دیکھ ہی لوگے۔“

”ٹھیک ہے لیکن ابھی تو میں صرف تم سے تمہارے گروگھنٹال کا پتا لینے آیا ہوں۔“

”کوشش کرلو۔“

”ہاں بھئی تم کچھ تعاون کرو گے یا یونہی گم صم رہو گے؟“ وہ فرد جوابا خاموش رہا وہ واقعی گم صم دانش کو دیکھتا رہا۔

”کوئی بات نہیں، ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ ابھی دیکھنا یہ فرفر بولنے لگیں گے۔“

ان کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے۔

”دیکھو نشاط... میں تمہیں آخری موقع دینا چاہتا ہوں۔ اب بھی اگر تم رضا کارانہ تعاون پر تیار ہوجاؤ تو تمہیں وعدہ معاف گواہ بنایا جاسکتا ہے۔“

نشاط نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

”لاؤ بھئی ہمارے آلاتِ تشدد لاؤ۔“ دانش نے اللہ ڈتو سے کہا۔

اللہ ڈتو پلاسٹک کا ڈبا لیے فوراً حاضر ہوگیا۔ ”اس ڈبے میں تمہارا لنچ ہے... لنچ بکس۔“ دانش بولا۔

دانش اب رسیوں سے بندھے فرد کے عین سامنے تھا۔ اس نے اللہ ڈتو کی طرف رخ کرکے تھوڑا سا ڈبا کھولا اور اس میں ہاتھ ڈال کر چٹکی سے پکڑ کر کچھ نکالا۔

نشاط مارے تجسس کے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”اوغ۔“ اسے فوراً ابکائی سی آگئی۔

دانش کے ہاتھ میں ایک چھپکلی لہرا رہی تھی۔

”محمد بخش اس کی ناک بند کرو... انہوں نے بہت ناک میں دم کر رکھا ہے۔“

محمد بخش نے اس زور سے ناک پکڑی کہ فرنگی کا سرخ چہرہ اور بھی سرخ ہوگیا۔ ذرا ہی دیر میں اس کا دم گھٹنے لگا۔

اضطراری طور پر اس نے سانس لینے کے لیے منہ کھولا۔ دانش تو اسی لمحے کے انتظار میں سر پر سوار تھا۔ اس نے جھٹ چھپکلی اس کے منہ میں ڈال دی۔ نشاط زور سے چیخی۔ اسی لمحے محمد بخش نے اس کی ناک چھوڑ کر جبڑا جکڑ لیا اور ایک پٹی اس طرح کس کر جبڑے اور منہ کے گرد کس دی گئی کہ اس کے لیے منہ کھولنا ممکن نہیں رہا۔ ذرا سی دیر میں اس نے گردن جھٹکنا اور تڑپنا شروع کردیا۔ نشاط نے کسمانا اور بڑبڑانا شروع کردیا تھا۔

”اس ڈبے میں چھپکلیاں ہیں۔ تین تمہارے لیے اور تین تمہارے لیے۔ اس کے بعد چھ اور آئیں گی۔ آج تم دونوں کا لنچ یہی ہے۔“

”اوغ۔“ نشاط کو دوبارہ ابکائی آئی۔ دانش نے محسوس کیا کہ شاید اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہے۔ جسے چھپکلی کھلائی گئی تھی، اس کی ناک سے سرخ وسیاہ

رطوبت بہنا شروع ہوگئی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا تڑپنا بڑھتا جارہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی نشاط کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ اللہ ڈتو اور محمد بخش شیطانی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے نشاط کی جانب مڑے۔

دانش نے ایک مرتبہ پھر پھرتی سے ڈبے میں ہاتھ ڈالا۔ جب ہاتھ باہر آیا تو ایک اور چھپکلی اس کے ہاتھ میں لہرا رہی تھی۔ نشاط کے منہ سے باقاعدہ چیخ نکل گئی۔

محمد بخش کی گہری مونچھیں اس وقت خوفناک تاثر پیش کررہی تھیں۔

''کرنل اسٹیورٹ، یہاں عبدالحفیظ کریم کے نام سے ہیروں کے تاجر کے طور پر رہ رہا ہے۔'' پھر اس نے پتا بھی فرفر دہرا دیا۔ ''یہی اس ملک میں آپریشنل انچارج ہے۔''

دانش نے جھٹکے سے ہاتھ نیچے گرالیا۔ ''محمد بخش! تم اس کے پاس رکو۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا۔

دروازے کے باہر کرنل کھڑے تھے۔ انہوں نے دانش کو گلے لگالیا۔

''کمال کردیا تم نے...''

کرنل بہت خوش تھے اور ان کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔

''سر! یہ دیکھیے۔'' دانش نے ڈبا اٹھایا۔

''یہ بچوں کی پلاسٹک کی چھپکلیاں ہیں، میں نے بس ان کے پیٹ میں مرچوں کا پانی بھردیا تھا۔''

☆☆☆

یہ رینجرز ہیڈکوارٹر کا ایک بڑا سا کمرا تھا۔ کمرے میں ایک لمبی میز بچھی تھی، جس کے اطراف کرسیاں لگی تھیں۔ یہاں ایک اہم میٹنگ جاری تھی۔ اس میٹنگ کی سربراہی رینجرز کے کرنل کررہے تھے۔ دروازہ کھلا اور دانش اندر داخل ہوا۔

''آؤ جوان بیٹھو۔'' کرنل اس کی جانب متوجہ ہوکر پذیرائی کے جملے ادا کیے۔

دانش انہیں سیلیوٹ کرکے، ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''عبدالحفیظ بتائے گئے پتے پر موجود نہیں تھا۔'' کرنل نے کہا۔

''کیا وہاں اس نام کا کوئی فرد نہیں رہتا؟ کیا نشاط نے جھوٹ بولا تھا؟'' دانش نے سوال کیا۔

''نہیں، وہاں عبدالحفیظ کی رہائش ہے لیکن اب وہ لاپتا ہوگیا ہے۔ اس نے اپنا موبائل بھی بند کررکھا ہے۔ اس کے دوست احباب، جاننے والے کوئی بھی نہیں جانتے کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔'' ایک اور رینجرز اہلکار نے جواب دیا۔

''اوہ... اب کیا کیا جائے؟'' دانش نے خود سے سوال کیا پھر خود ہی جواب دیا۔ ''متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او سے بات کرتے ہیں۔''

''ہاں، ہم نے تھانے بات کی تھی۔ ایس ایچ او نے عبدالحفیظ کے موبائل نمبر اور مزید دو پتے بتائے تھے۔ وہ وہاں بھی نہیں ہے اور موبائل تو اس کا مسلسل بند جارہا ہے۔''

''اب کیا ہونا چاہیے؟'' دانش بڑبڑایا۔

''ہم اس کے ملنے جلنے والوں کو ٹریس کررہے ہیں۔ ان کی فہرست بن رہی ہے اور ان سب سے متعلق تحقیقات شروع کردی گئی ہیں۔ اس کے موبائل اور گھر سے اور جہاں سے وہ فون کرسکتا ہے ہر جگہ سے اس کا کال لاگ اور کال کی گئی جگہ اور افراد پر تیزی سے کام چل رہا ہے۔'' ایک اور اہلکار نے دانش کو بتایا۔

''بڑی بات ہے جناب! آپ لوگ تو بڑی تیزی سے کام کررہے ہیں۔'' دانش بڑا متاثر دکھائی دیتا تھا۔

''ہاں... ہمارا خیال ہے کہ وقت کم ہے... وہ کسی لمحے بھی ملک سے باہر جاسکتا ہے، کسی بھی راستے اور کسی بھی نام سے۔'' کرنل صاحب نے بتایا۔

''سر! ائرپورٹ...'' دانش نے لب کشائی کی۔

''ہاں بھئی، تم پریشان مت ہو۔ سب کا خیال سب سے پہلے ائرپورٹ ہی کی جانب جاتا ہے۔ ہم نے اس کا انتظام سب سے پہلے کیا ہے۔''

پھر کرنل صاحب نے دانش سے مخاطب ہوکر نسبتاً دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے تھانے یا آئی جی صاحب کے آفس سے تو کوئی فون نہیں آیا؟''

''نو سر۔'' دانش نے کہا۔

''ٹھیک ہے... ہم سب رابطے میں ہیں۔ انہیں علم ہے کہ تم ہمارے ساتھ مصروف ہو۔''

''تھینک یو سر۔''

''اٹس اوکے۔''

پھر وہ سب ہی مصروف ہوگئے۔ میٹنگ روم رفتہ رفتہ ایک آپریشن روم میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ کرنل صاحب اور ان کے اہلکاروں کے حکم پر مختلف کمپیوٹر اور مختلف اسکرینیں وہاں لگادی گئی تھیں۔ یہ ایک پرانی طرز کا کمرا تھا۔ بڑا سا، اونچا سا، اس کی چھت بھی غیر معمولی بلند تھی اور اس کی دیواریں بھی بہت موٹی تھیں۔

تمام کمپیوٹرز ایک دوسرے سے منسلک تھے اور مختلف

کمپیوٹرز مختلف روشن اسکرینوں سے منسلک تھے۔ اسکرین مختلف اعداد و شمار اور کاغذات کو بڑا کرکے دکھا رہی تھیں۔ ایک اسکرین پر کرنل اسٹیورٹ عرف عبدالحفیظ کی تصویر نمایاں تھی۔ اس سے متعلق بہت سا ڈیٹا بھی... نکال لیا گیا تھا جو اسکرین کی ایک جانب نظر آرہا تھا۔

کرنل اسٹیورٹ ایک خطرناک شخص تھا۔ اپنی نوجوانی میں اس نے ویت نام کی جنگ میں بھی شرکت کی تھی لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر ہمیشہ اسے ڈبل ایجنٹ سمجھا جاتا رہا۔ نہ تو یہ بات کبھی ثابت ہوسکی اور نہ ہی کوئی اسے ہلاک کرپایا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں اس ڈبل ایجنٹ کے نامعلوم کتنے دشمن ہیں لیکن یہ بڑی آزادی سے کسی بھی بھیس میں کہیں بھی گھومتا رہتا ہے اور اپنی کارروائیاں کرتا رہتا ہے۔ یہ کئی علوم و فنون کا ماہر... اور کئی زبانوں پر قدرت رکھنے والا حیرت انگیز آدمی ہے۔

کرنل اسٹیورٹ سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کا ڈیٹا حاصل کیا جارہا تھا۔ ہر شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سب کی فہرست تیار کرلی گئی تھی۔

وقت بہت تیز رفتاری سے گزر رہا تھا۔ دانش حیرت زدہ سا یہ تمام تر انتظامات دیکھ رہا تھا اور انہیں سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ بڑی دیر سے ایک بڑی سی اسکرین کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ دراصل ایک بڑا سا نقشہ تھا۔ اس نقشے کا مرکز کرنل اسٹیورٹ کی رہائش گاہ اور شوروم تھا۔ وہاں سے جال کی طرح سے رنگین لکیریں نکل رہی تھیں اور مختلف مقامات اور افراد کی نشاندہی کررہی تھیں۔ دانش کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نوٹ بک تھی اور وہ اس پر پین سے کچھ لکھتا جارہا تھا۔

یہاں ہر فرد اپنے کام میں محو تھا۔ کسی نے نہ اس کی جانب توجہ دی تھی اور نہ ہی دانش کسی کی جانب خصوصیت سے متوجہ تھا۔

دانش بہت دیر تک کچھ سوچتا اور سر ہلاتا رہا۔ وہ خود کبھی بھی اتنی ذہنی ورزش کا قائل نہیں تھا۔ بس کام کا ماحول دیکھ کر اس کا بھی کچھ موڈ بن گیا تھا۔ بنیادی طور پر کام چور نہیں تھا۔ جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو اس نے کرنل صاحب کا رخ کیا۔

''سر! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں... ہاں... کہو۔''

''سر! اسٹیورٹ نے ہائی وے فارم ہاؤس پر بھی ایک کال کی تھی۔''

''کب... کہاں؟''

دانش نے لیزر لائٹ اٹھائی اور نقشے پر ایک جگہ نشاندہی کرنے لگا۔

''یہ کون سی جگہ ہے... کیا اسٹیورٹ وہاں گیا تھا یا صرف فون کیا تھا؟'' کرنل صاحب نے فوراً ہی پوچھا۔

کمپیوٹر پر بیٹھے جوان نے فوری طور پر اسکرین پر اس جگہ کو بڑا کرکے دکھایا۔

''سر! یہ ہائی وے کے تقریباً درمیان میں ہائی وے فارمز ہیں۔ یہاں گزشتہ برس اسٹیورٹ نے صرف ایک مرتبہ... کال کی تھی۔''

''کیا یہ جگہ چیک ہوگئی ہے؟''

''نو سر! اب تک نہیں ہوئی۔''

''اوکے جوان! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''سر! جو ٹیم وہاں جائے گی میں اس کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔'' دانش نے جواب دیا۔

''وہ کیوں؟'' کرنل صاحب نے استفسار کیا۔

''سر! ہم پولیس والے ہیں، جرم کو اور مجرم کو دور ہی سے سونگھ لیتے ہیں۔ سر! میرا خیال ہے ہمارا مطلوبہ مجرم یہیں روپوش ہے۔'' دانش نے مضبوط لہجے میں کہا۔ سب کو یوں محسوس ہوا گویا کمرے کے سناٹے میں مزید اضافہ ہوگیا ہو۔

☆☆☆

رینجرز کی گاڑیاں تیز رفتاری سے ہائی وے پر دوڑی... جارہی تھیں۔ چار گاڑیوں کا کارواں تھا جس میں رینجرز کے کئی جوان مکمل تیاری اور اسلحے سے لیس... تھے۔ ان سب کے درمیان سب انسپکٹر دانش بھی دبکا بیٹھا تھا۔ یہ سب ہیڈکوارٹر سے مسلسل رابطے میں تھے۔

جلد ہی وہ اپنے مقررہ مقام تک جا پہنچے۔ یہ ایک بڑا اور خوب صورت سا فارم ہاؤس تھا۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا۔ یہ فارم ہاؤس ہائی وے سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس کے چاروں طرف قدیم طرز کی چوبی باڑ نصب کی گئی تھی۔ یہ باڑ قدِآدم نہ تھی۔ باہر کھڑے ہوکر اندر کا منظر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ دور بنا سوئمنگ پول، گولف کورس اور دیگر سہولیات نظر آتی تھیں۔ فارم ہاؤس میں جدید طرز کے چار کاٹیج تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنائے گئے تھے۔

قافلہ فارم ہاؤس کے داخلی دروازے سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ جوان تیزی سے اتر کر پوزیشنز لینے لگے۔

آپریشن کے انچارج کیپٹن نے سب کو ہدایات دیں۔

”آدھے سے زیادہ جوان دو دو کی ٹکڑیوں میں فارم ہاؤس کے چاروں طرف پھیل جائیں، اس طرح کہ کوئی پرندہ بھی نظروں میں آئے بغیر باہر نہ جا سکے۔ معاملہ بہت حساس ہے۔ جو بھی نظر آئے، اسے فوراً گرفتار کرلیں۔ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ کسی مرحلے پر فائر کرنا ناگزیر ہو جائے تو پیروں پر فائر کریں۔“ کیپٹن نے کہا۔

رینجرز کے جوان تیز رفتاری سے اطراف میں پھیلتے چلے گئے۔

”ہمیں ایک ایک عمارت کو مکمل طور پر چیک کرنا ہو گا۔“ کیپٹن نے باقی جوانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

فارم ہاؤس کے اطراف میں دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ فارم ہاؤس اور اس کے کاٹیج بھی سنسان نظر آرہے تھے۔ کوئی ملازم بھی کام کرتا نظر نہیں آرہا تھا۔ دانش کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روپوشی کے لیے جگہ تو بڑی آئیڈیل ہے۔

”سر! کیوں نہ اندر داخل ہونے سے پہلے کسی مقامی شخص سے کچھ اطلاعات لے لی جائیں۔“ دانش نے بن مانگے مشورہ دیا۔

”وہ کس لیے؟“ کیپٹن نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”بس یونہی جناب، احتیاط اچھی چیز ہے... چھاپے سے پہلے اندر کی اطلاع مل جائے تو کیا حرج ہے؟“

”اور وہ اطلاع ہمیں کون دے گا... یہ آس پاس کے درخت... یہ پرندے؟“ کیپٹن نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔

اسی وقت ایک گوالا دور سے آتا دکھائی دیا۔ ہائی وے سے ایک کچی سڑک فارم ہاؤس تک آتی تھی جو فارم ہاؤس کے مرکزی دروازے کے سامنے سے گزرتی سیدھی آگے کہیں چلی جاتی تھی۔ شاید آگے کوئی گاؤں تھا۔

گوالا موٹر سائیکل کے دونوں جانب دودھ کے بڑے بڑے ڈول لٹکائے... آرہا تھا۔ معاً اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ علاقے میں رینجرز کے جوانوں کی موجودگی اور چار چار ٹرکوں پر آمد یقیناً ایک غیر معمولی ہی بات تھی۔ گوالے کو روک لیا گیا اور کیپٹن کے سامنے پیش کیا گیا۔

”دانش صاحب! آپ ہی انکوائری کریں۔ یہ تو آپ لوگوں کا کام ہے۔“ کیپٹن نے دانش کو آگے کر دیا۔

”اوکے سر۔“ دانش نے مستعدی سے سیلوٹ جھاڑا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ دانش گوالے کے پاس پہنچ گیا۔

”جی، سائیں داد۔“

”سائیں داد! کہاں جا رہے ہو؟“

”صاحب اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔“

”کہاں ہے تمہارا گاؤں اور تم کہاں سے آرہے ہو؟“

”سر! آگے پانچ کلومیٹر بعد میرا گاؤں ہے اور ہائی وے پر جو ہوٹل ہے، وہاں دودھ پہنچا کر آرہا ہوں۔ سر! یہی ہمارا روزگار ہے۔ روز کا کام ہے۔“ گوالا گھگیایا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ... یہ فارم ہاؤس کس کا ہے؟ اور کوئی اس میں ہے یا نہیں؟“ دانش نے پوچھا۔

”سر! یہ ہمارے وڈیرے سائیں کا ہے... اور شہری لوگ اس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن یہ کیسے پتا چلے گا کہ آج کل یہاں کوئی ہے یا نہیں؟“

”سائیں، یہ کون سا مشکل کام ہے۔ آپ حکم کرو میں ابھی دیکھ کر آجاتا ہوں۔“ گوالے نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔“

گوالے نے موٹر سائیکل دوڑا دی۔ لکڑی کا بنا آرائشی سا مرکزی دروازہ یوں بھی نیم وا تھا اور وہ قطعی ایسا نہ تھا کہ اس کے پار نہ دیکھا جا سکے۔ گوالا دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہوتا چلا گیا۔

دانش اور رینجرز اہلکار اس کی حرکات و سکنات بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے کاٹیج دیکھتا چلا گیا۔ جونہی وہ چوتھے اور آخری کاٹیج کی جانب بڑھا، کاٹیج سے اس پر فائرنگ کر دی گئی۔

گوالا بوکھلا گیا۔ اس سے موٹر سائیکل گرتے گرتے بچی۔ لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بچ گیا ہے تو موٹر سائیکل گھمائی اور پھر جو بھاگا ہے تو پلٹ کر نہیں دیکھا۔ سیدھا رینجرز اہلکاروں کے پاس آکر ہی دم لیا۔

کیپٹن نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

”شاباش جوان... اب تم جاؤ... کسی سے کوئی بات مت کرنا... باقی ہم خود ہی دیکھ لیں گے۔“ پھر کیپٹن نے ایک اہلکار سے کہا۔

”اسے بٹھا کر پانی وانی پلاؤ... نارمل ہو جائے تو جانے دینا۔“

پھر ہیڈ کوارٹر واقعے کی اطلاع دی گئی اور ہدایات لی جانے لگیں۔ اس دوران رینجرز اہلکار اپنا گھیرا مکمل کر چکے تھے اور کسی بھی قسم کی کارروائی کے لیے تیار تھے۔

گوالا پانی پی کر جانے لگا تو دانش نے اسے روک لیا۔

”فارم ہاؤس کے مالک کو فوراً یہاں بھیج دو۔“ اس نے گوالے کو حکم دیا تو گوالا روانہ ہو گیا۔

یہ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے اور فارم ہاؤس میں داخل ہو گئے۔

رینجرز کے ٹرک چوتھے کاٹیج سے ایک مناسب فاصلے پر رکے اور جوان تیزی سے پوزیشنز لینے لگے۔ یہ کاٹیج سب سے آخری تھا اور فارم ہاؤس کے اندر کی جانب تھا۔

عین اسی لمحے دانش کو موبائل پر ایک نئے نمبر سے کال آئی۔

”ہیلو دانش اسپیکنگ۔“

”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میں تمہارا مطلوبہ ہدف کرنل اسٹیورٹ ہوں۔ کیا تم مجھے حاصل کر پاؤ گے۔“

”کیوں نہیں، نہایت آسانی سے۔“ دانش نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

”ہیرو تو تم بن ہی گئے ہو لیکن اب زیرو بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ تلخ لہجے میں کہا گیا۔ ”فوراً کیپٹن سے بات کرواؤ۔“ حکم دیا گیا۔

دانش نے خاموشی سے فون کیپٹن کی طرف بڑھا دیا۔

”کرنل اسٹیورٹ کی کال ہے۔“

”اسپیکر آن کرو۔“ کیپٹن نے کہا۔

دانش نے اسپیکر آن کر دیا۔

”کرنل اسٹیورٹ بول رہا ہوں۔ تمہارے شہر اور تمہارے ملک کے مشہور سیاست داں مع اہل و عیال میرے مہمان ہیں۔ فوری طور پر میری سرحد پار روانگی کا انتظام کرو ورنہ تم جانتے ہو میری تو چند گولیاں ضائع ہوں گی مگر تمہارے ملک میں فسادات پھوٹ پڑیں گے۔“

پھر اس نے معروف سیاست داں کو فون دیا۔

”آپ جو بھی ہیں خدارا ہماری مدد کریں۔“ سیاست داں کی آواز آئی۔ پس منظر میں بچوں کے رونے چیخنے کی آوازیں بھی تھیں۔

وہ ملک کے معروف سیاست داں تھے اور نیک نامی کے علاوہ اپنا اچھا خاصا حلقۂ اثر رکھتے تھے۔ ان کو خاندان سمیت گزند پہنچنا یقیناً ناقابل تلافی ہو سکتا تھا۔

فوری طور پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا گیا اور جواباً کرنل سے ایک گھنٹے کی مہلت لی گئی۔ کچھ مذاکرات کے بعد کرنل نے محض تیس منٹ کا وقت دیا۔

ہیڈ کوارٹر نے یہ کنفرم کر دیا تھا کہ معروف سیاست داں مع اہل و عیال لاپتا ہیں۔ نیز کرنل اسٹیورٹ کو الجھائے رکھنے اور مذاکرات جاری رکھنے کا کہا گیا تھا لیکن کرنل اسٹیورٹ نے فون کرنے کے بعد اپنا موبائل بند کر دیا۔

دانش اس وقت اس شخص کی جانب متوجہ ہوا جو ابھی ابھی وہاں پہنچا تھا اور فارم ہاؤس کا مالک تھا۔

”تم نے یہ کاٹیج کسے کرائے پر دیا ہے؟“

”سر! میں اس کے شناختی کارڈ کی کاپی لایا ہوں۔ سر! شریف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ شہر میں رہتا ہے۔ گھر والے اور بچے بھی ساتھ ہیں۔“

کیپٹن نے ایک نظر شناختی کارڈ پر ڈالی اور واپس کر دیا، یہ عبدالحفیظ کے نام سے تھا۔ دانش فارم ہاؤس کے مالک سے مزید کرید میں لگ گیا۔ وہ خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ جب اس کے کچھ حواس بحال ہوئے تو اس نے کہا۔

”سر! میں سمجھ گیا... اندر جو آدمی ہے وہ بہت خطرناک آدمی ہے اور اس نے ہمارے سائیں کو اغوا کر رکھا ہے۔“

”ہاں لیکن تم اب کیا کر سکتے ہو؟“ دانش نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”سر! ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم آپ کو اس کاٹیج کے اندر پہنچا سکتے ہیں۔“ وہ بڑے دعوے سے کہنے لگا۔

”وہ کیسے؟“ دانش نے کہا۔

”سر! جب ہم یہ کاٹیج بنا رہے تھے تو ہم نے ان سب کاٹیجز میں تہ خانے بھی بنائے تھے گرم موسم سے بچنے کے لیے اور وہ تمام تہ خانے اندر سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں... زیر زمین۔ ہم اس کاٹیج میں داخل ہوں گے اور عین اس بدمعاش کے سر پر پہنچ جائیں گے۔“

دانش نے کیپٹن کو یہ بات بتائی۔

فوری طور پر چھ کمانڈو تیار کیے گئے۔ انہیں تمام راستے فارم ہاؤس کے مالک نے سمجھائے۔ ہیڈ کوارٹر اطلاع کی گئی اور آپریشن شروع کر دیا گیا۔

کیپٹن، رینجرز اہلکار اور دانش کاٹیج کے سامنے دم سادھے بیٹھے تھے، مشکل سے بارہ یا تیرہ منٹ گزرے

ہوں گے کہ کاٹیج کا مرکزی دروازہ وا ہوا اور ایک سو برسا شخص سفاری سوٹ پہنے گول شیشوں کا چشمہ درست کرتا ہوا باہر برآمد ہوا۔

”فائر مت کرنا۔“ کیپٹن نے تنبیہ کی۔

اس نے کھڑے ہو کر آس پاس نگاہ دوڑائی اور پھر اسے پیچھے سے ایک زوردار دھکا تھا۔

یہ کرنل اسٹیورٹ تھا۔ رینجرز کے کمانڈو اسے دھکیلتے ہوئے لیے چلے آرہے تھے۔

☆☆☆

کرنل اسٹیورٹ عرف عبدالحفیظ کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اسے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ وہ بھی بڑی بڑی باتیں کررہا تھا۔ لاف وگزاف سے جب کب کام نہیں بنا تو دھمکیوں پر اتر آیا۔ آخرکار اسے بھی دانش اور اس کی ٹیم کے حوالے کیا گیا۔

”تم نے کس قانون کے تحت مجھے گرفتار کیا ہے؟ کیا ثبوت ہے میرے خلاف... بتاؤ جواب دو۔“ وہ دانش کو دیکھ کر برسنے لگا۔

”تمہیں شاید پتا نہیں کہ میں گوری چمڑی سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔“ دانش نے گرج کر جواب دیا اور دل ہی دل میں خود کو کہنے لگا۔ ”شاباش، اچھا ڈائیلاگ ہے۔“

”تم جانتے ہو میں کون ہوں؟“ دانش پھر گرجا۔

”لوگ مجھے اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ کہتے ہیں... تمہارا خیال ہے تمہیں عدالت میں پیش کیا جائے گا... یوں... تمہیں بھی کتے بلیوں کی طرح مار کر پھینک دوں گا جیسے تم لوگ ہمارے شہری مارتے ہو۔“ پھر اس کے اشارے پر حیات خان آگے بڑھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔

اس کے سامنے لائن سے سب سے پہلے گرفتار ہونے والا زخمی، نشاط اور اس کا ساتھی اور کرنل اسٹیورٹ بندھے ہوئے تھے۔ کرنل اسٹیورٹ کے علاوہ سب کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا۔

”شوٹ کردو۔“ حیات خان نے نشانہ لیا اور فائر شروع کردیے۔ یکے بعد دیگرے فائر کے دھماکے ہوتے رہے اور لوگ مرتے رہے۔ یہاں تک کہ اسٹیورٹ کا نمبر آنے سے پہلے ہی گولیاں ختم ہوگئیں۔

حیات خان نے خالصتاً فلمی اسٹائل میں پستول ہوا میں اچھال کر پھینکا۔ بائیں ہاتھ کا پستول اچھل کر دائیں ہاتھ میں آیا اور اس نے اسٹیورٹ پر فائر کھول دیے۔ اسٹیورٹ زور سے چیخا۔ ”رک جاؤ... رک جاؤ... میں بتاتا ہوں۔“ دانش نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا لیکن اسٹیورٹ کے دونوں گھٹنے تو چھلنی ہو ہی چکے تھے۔ دانش نے دیگر اہلکاروں کو قریب بلایا۔

”اس کا بیان ریکارڈ کرنے سے قبل اس کا علاج شروع نہیں ہونا چاہیے۔“

دانش باہر آگیا۔ دوسرے دروازے سے نشاط وغیرہ کو اٹھا کر لایا جارہا تھا۔ تینوں بے ہوش تھے لیکن ان کی سانسیں چل رہی تھیں۔

”آپ نے تو سر پوری فلم کی شوٹنگ کروادی... نقلی گولیوں نے بھی کام کر دکھایا۔“ حیات خان دانش سے بولا۔

”ہم بے جا قتل و غارت گری پسند نہیں کرتے۔“ رینجرز کے کرنل بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا۔

”سر! خدا کا شکر ہے... ہم کامیاب ہوئے۔ اب شہر میں امن ہوجائے گا۔“ دانش نے کہا۔

”یقیناً اس کا بڑا اثر ہوگا۔ لیکن ایسی پتا نہیں کتنی تنظیمیں اور کتنے افراد ہیں جو ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارا مشن جاری رہے گا۔“

”اللہ مالک ہے سر... اس مملکتِ خداداد کو اللہ ہی نے بنایا ہے وہی اس کی حفاظت بھی فرمائے گا۔“ دانش بولا۔

”یقیناً... تمہارے آئی جی اور دیگر افسر بہت ناراض ہیں۔“

”سر! یہ تو میں نے آپ سے کہا ہی تھا۔“ دانش نے کہا۔

اسی وقت کرنل کا موبائل بجا۔ کرنل نے فون ریسیو کیا۔

”السلام علیکم! سر بڑی عمر ہے آپ کی... ابھی آپ کا ذکر ہورہا تھا۔ لیجیے اپنے جوان سے بات کیجیے۔“ کرنل صاحب نے فون دانش کو دیا۔

”تمہارے آئی جی صاحب ہیں۔“

”السلام علیکم سر!“ دانش نے فون کان سے لگاتے ہی سلیوٹ جھاڑا گویا وہ سامنے ہی کھڑے ہوں۔

”شاباش نوجوان! تم نے پوری فورس کا سر فخر سے بلند کردیا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر اپنی نفری سمیت مجھ سے ملو... تمہاری ترقی اور بطور ایس ایچ او تعیناتی کی سمری بھیجی جاچکی ہے۔“

”تھینک یو سر۔“ دانش بمشکل تمام بولا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ اسے حوالدار رئیس خان یاد آرہا تھا۔

عکس لہورنگ

احمد اقبال

بعض لوگوں کی زندگی اس قدر پُرہنگام اور انقلاب آفریں ہوتی ہے کہ ہر واقعے... ہر تغیر پر فسانے کا گمان ہوتا ہے... حالات کے نشیب وفراز اور واقعات کے اصل پس منظر نگاہوں سے اوجھل ہی رہتے ہیں... پیش جو دکھارہا ہوتا ہے... اس کا تعلق جذبہ واحساس سے نہیں جڑتا... ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی عکس در عکس پہیلے سلسلوں کی کتھا... جو ماضی کی یادوں کو سینے میں چھپائے مستقبل کے سہانے خوابوں کو اپنی مرضی کی تعبیر سے ہمکنار دیکھنا چاہتے تھے...

ایک طویل زندگی کی داستان جو... زمانے کے ساتھ ساتھ کتنے ہی مقامات کا احاطہ کرتی ہے......

ایملڈ عرف ایمی نے بھی وہی بنیادی غلطی کی تھی جو اس سے پہلے کئی لڑکیاں کرچکی تھیں۔

گوری تو خیر ہر میم ہوتی ہے لیکن لندن میں گورے رنگ کے بھی اتنے ہی شیڈ ملتے ہیں جتنے ہم کالوں کے ملک میں کالے رنگ کے۔ ہلکے سے نمک والی ملاحت سے گندمی اور سانولے رنگ تک اور افریقی برانڈ کے زلفِ محبوب کی سیاہی جیسے رنگ تک... یہاں گورا رنگ شلجم جیسا بھی تھا۔ پھٹے دودھ جیسا جس میں قریب سے دیکھنے پر داغ داغ اجالا دکھائی دیتا ہے۔ اور کفن کے لٹھے جیسا... لیکن وہ جو گلاب اور مرمر کی آمیزش والا شفاف رنگ ہوتا ہے... وہ خال خال نظر آتا ہے۔ ایمی کا ایسا ہی بدن تھا۔ اس کے بال سنہری تھے اور آنکھوں میں کاغان کی جھیلوں کا شفاف پانی تھا جس میں آسمان کی نیلاہٹ اتر آئے۔ وہ دراز قد اور خوش ادا تھی۔ اسی لیے وہ میری سابقہ تمام گرل فرینڈز کے ریکارڈ

توڑ کے پوری شِشماہی میرے دل کے خراب خانے میں مقیم رہی تھی جس پر عموماً ایک سہ ماہی کے بعد ہی ”کرائے کے لیے خالی ہے“ کا بورڈ لگ جاتا تھا۔

وہ اپنی ایک دور کی کزن کو ساتھ لے آئی تھی۔ وہ کسی دور افتادہ مقام سے لندن پہنچی تھی اور ایمی کے ساتھ ”ادھار“ پر مقیم تھی۔ کوئی اچھا کام مل جانے کے بعد اسے کرائے کا قرض اتارنا تھا۔ اچھے کام سے اس کی مراد تھی ماڈلنگ، اداکاری، سیکریٹری شپ... چونکہ اس نے صرف عمومی تعلیم حاصل کی تھی اس لیے وہ اپنے حسنِ بے مثال کی ڈگری کی بنیاد پر ایسی ہی جاب تلاش کرتی تھی۔ اس کا نام میری تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ ”تم مجھے میری پکار سکتے ہو۔“ یہ انگریزی کی خاص ادا ہے۔ ایملڈا مورگن دو چار دن مس مورگن بنی رہی۔ پھر اس نے خود ہی اجازت نامہ جاری کر دیا کہ میں اسے ایمی کہہ سکتا ہوں جس کا مطلب تھا کہ میں قریبی دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گیا ہوں۔ یہ کسی بھی اجنبی کو قریب آنے یا بے تکلف ہونے کی دعوت دینا ہوتا ہے۔

میری نے دو اسباب کی بنا پر مجھے مجبور کیا کہ میں عشق کرنے کے لیے اپنا رخ اس کی طرف کرلوں۔ ایک تو وہی کہ ایمی کا قیام غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا تھا اور میں مجبور تھا۔ درمیان میں جو امیدوار کے طور پر سامنے آئیں، وہ مسترد ہو گئیں۔ آدمی کا ذوق اور معیار بھی کوئی چیز ہے۔ میری کو سامنے لانا ایمی کے حق میں ایک سیاسی غلطی ثابت ہوا، جیسی عموماً منتخب وزیراعظم اپنی پسند کا آرمی چیف لا کے کرتا ہے۔ وہی اس کا تختہ الٹتا ہے۔

دراصل میری کے بارے میں اس کو پورا یقین ہوگا کہ ایک سانولی سی کچھ مادھوری ڈکشٹ جیسی اور کاجل بھراری بڑی بڑی آنکھوں اور ساون کی گھٹا جیسے بالوں والی یہ لڑکی مجھے کیسے اچھی لگ سکتی ہے جو خالص ولایتی حسن کے نمونوں پر فریفتہ ہو... جس نے کبھی اپنی ہم وطن لڑکیوں کو گھاس نہ ڈالی ہو اور انتقاماً بھی دشمن ملک بھارت کی پریا نکا چوپڑا، ماڈل حسیناؤں کو نظر اٹھا کے نہ دیکھا ہو... وہ میری کے سامنے یوں چِت سے گر کے جان و دل نذر کر دے گا۔

ایمی بھول گئی تھی کہ انسان کی ایک جنونی جبلت بدلتی نہیں۔ جیسے گدھا گھاس چھوڑ کے شامی کباب انجوائے نہیں کر سکتا اور بھوکا شیر گھاس بھی کھا لیتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ گوشت کی خواہش بھی چھوڑ دے۔ میری کیفیت ایسی ہی تھی۔ لندن میں برگر اور پیزا یا سینڈوچ کھانا مجبوری تھی مگر کہیں سے پلاؤ یا قورمے کی خوشبو بھی آجائے تو قدم رک جاتے تھے۔ میں خواب میں سرِراہ ساگ چٹنی کی روٹی دیکھتا تھا۔

ابتدائی تعارف کے بعد ایمی نے میرے بارے میں بڑے فخر اور اعتماد کے ساتھ انکشافات کا سلسلہ شروع کیا۔ ”نام تو اس کا یوسف خان ہے مگر سب اسے دلیپ کہتے ہیں۔ دلیپ کمار کا بھی یہی نام ہے اور دونوں میں کتنی مشابہت ہے دیکھو۔“ یہ مشابہت اتنی ہی تھی جتنی زرداری اور نواز شریف میں۔

میری نے آنکھیں میری طرف یوں گھمائیں جیسے کیمرے کے ساتھ سرچ لائٹ مجھ پر مرتکز ہو گئی ہو۔ ”واقعی؟“

”اور... تم یقین نہیں کرو گی۔ یہ ایک اصلی پرنس ہے۔ اس کے دادا آج بھی ایک اسٹیٹ کے حکمراں ہیں... نوّے سال کی عمر میں۔“

”اس کا باپ ہے؟“ میری نے معصومیت سے سوال کیا۔

یہ ایک اشتعال انگیز سوال ہوتا اگر پاکستان میں کیا جاتا۔ ولایت میں بن باپ کے بچے عام ہیں۔ ”کیوں نہیں... وہ پچاس سال کی عمر میں ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے ہمارے چارلس کی طرح تم بھی ہمیشہ پرنس ہی رہو گے۔ اگر آج داداجی دنیا کی جان چھوڑ دیں تو پھر اباجی مزید چالیس سال کے لیے تخت سے چپک جائیں گے۔“

مجھے کوئی فوری جواب نہ سوجھا۔ اگر میں کہتا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو مطلب ہوتا کہ اباجی اتنا ٹائم نہیں لیں گے یا میں انہیں اتنا ٹائم نہیں دوں گا۔ میری مشکل ایمی نے آسان کی۔ ”دادا نے ساٹھ سال کی عمر میں انتظامِ سلطنت اس کے ابا کو سونپ دیا تھا۔ دس سال بعد یہ بھی حاکم ہوگا، روایت کے مطابق...“ شاید اس سے میں نے یہی کہا ہوگا۔

میں نے سر ہلا کے اس کی توثیق کی۔ ”میری حیثیت وہی ہوگی جو منتخب صدر کے ہوتے ہوئے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ہوتی ہے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“ میری نے پوچھا۔

میں نے دوسری مثال فوراً پیش کر دی۔ ”جیسے ملکہ تو ملکہ ہے... مگر انتظامی امور سب وزیراعظم سنبھالتا ہے۔ نام کا سربراہ رہ جاتا ہے ہماری ریاست کا نواب بھی۔“

ایمی نے پھر موضوع بدلا۔ ”اور پتا ہے ان کے گیراج میں مرسیڈیز، بی ایم ڈبلیو، رولز رائس اور فراری کھڑی ہیں... مگر یہ وہاں شاہی سواری کے لیے ہاتھی استعمال کرتے ہیں۔“

”جیسے ملکہ بگھی کرتی ہے۔“ میں نے فوراً ایمی کو سپورٹ کیا۔

ایک بار پھر میری نے بڑی سادگی و پرکاری سے کاری وار کیا۔ ”حرم میں کتنی بیویاں اور کنیزیں رکھو گے تم... حاکم بن جانے کے بعد... اپنے باپ اور دادا کی طرح۔“

ایک بار پھر ایمی نے مجھے بچایا۔ ”اس نے حلف اٹھا کے وعدہ کیا ہے مجھ سے... یقیناً اس کے ہاتھ میں ان کی کتاب مقدس ہوگی کہ یہ صرف میرا وفادار رہے گا۔ دو چار سال میں یہ تعلیم وغیرہ مکمل کر کے واپس جائے گا تو ہم شادی کر چکے ہوں گے... مجھے مسلمان بننا ہوگا۔“

تعلیم میں نے گزشتہ دو چار سال میں کتنی حاصل کی تھی کہ اگلے دو چار سال میں پی ایچ ڈی ہو جاتا۔ بس وقت اچھا گزر رہا تھا۔ نام بھی طلبا میں شامل رہتا تھا کیونکہ ہر سیمسٹر کی فیس وقت پر ادا کر دی جاتی تھی۔ کورس بدلتا رہتا تھا۔ داخلہ لینے کے بعد مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرح نئے کورس کی کتابیں تو زیادہ صحت مند اور بھاری ہیں۔ دہشت کے باعث میں ان کو کھول کے ہی نہیں دیکھتا تھا۔ اصل وجہ وقت کی کمی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ مارننگ، آفٹرنون اور نائٹ شفٹ کی گرل فرینڈ الگ تھیں اور ان کو ایک دوسرے سے بے خبر رکھنا سب سے بڑا امتحان ہوتا تھا۔ جب ان پر میری ”سچی محبت“ کا راز افشا ہوتا تھا تو وہ منگنی کی انگوٹھی میرے منہ پر اور فرائی پان، ٹیبل لیمپ یا گلدان جیسی کوئی چیز میرے سر پر مار کے رخصت ہو جاتی تھیں اور میں صبر سے کام لیتا تھا کیونکہ کسی عقلمند کا قول ہے لڑکی اور بس کے لیے کیسی پریشانی... ایک گئی تو دوسری آتی ہوگی۔

ایمی کے اچانک سوال نے مجھے میری سے نظر ہٹانے پر مجبور کر دیا۔ ”ڈارلنگ! کتنے شیر مارے ہیں اب تک تم نے؟“

”صرف تین۔“ میں نے انکساری سے اعتراف کیا۔

میری نے روئے سخن ایمی کی طرف رکھا۔ ”میں نے نیشنل جیوگرافک کی رپورٹ دیکھی تھی۔ شیر پاکستان میں صرف چڑیا گھر میں ہیں اور انڈیا میں کوئی محفوظ SANCTUARY بنا دی ہے جہاں کوئی جا نہیں سکتا۔ سوائے ٹورسٹ کے... شکار سنگین جرم ہے۔“

میں نے وضاحت کی۔ ”وہ... دراصل پاکستان میں ہم شکار کے لیے اپنے شیر امپورٹ کرتے ہیں۔“

میری پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ میرے بارے میں کتنا جانتی ہے اور اس ملک یا ریاست کے ماحول اور حالات سے کتنی باخبر ہے، ایمی نے اسے بتایا کہ انڈیا ابھی تک پُراسرار ہے... سپیرے گلی گلی سانپ گلے میں ڈالے بین بجاتے پھرتے ہیں۔ ہر چوک میں قوالی ہوتی ہے یا کتھک اور بھارت ناٹیم کی پرفارمنس چلتی رہتی ہے۔

میری صرف مسکراتی رہی۔

میں نے کہا۔ ”اب تم بھی کچھ بولو۔“

”میں کیا بولوں؟“ اس نے انکساری سے کہا۔ ”میرے گرینڈ فادر تقسیم کے وقت مشرقی پنجاب کے کسی ضلع میں کلکٹر تھے۔ فادر ابھی چار سال پہلے تک برٹش لائبریری اور قونصلیٹ سے منسلک رہے۔ ہم نے اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں کافی وقت گزارا۔ میری ابتدائی تعلیم راولپنڈی میں ہوئی پھر کراچی گرامر اسکول میں۔ مجھے مری، کاغان اور سوات بہت یاد آتے ہیں۔ میری ماں پاکستانی ہے۔“

میری نوابی کا غبارہ جو آسمان میں بہت اونچا اڑ رہا تھا، ایک دم پھٹ کے زمین پر آگرا۔ یا میرے مولا! اے کی پے گیا رولا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”اوہ... تو تم جانتی ہو پاکستان کے بارے میں؟“

”شاید تم سے زیادہ۔“ وہ بولی۔ ”میری ماں کا نام تھا رضیہ سلطانہ۔ میرا نام مریم داؤد رکھا گیا۔ میرے والد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ شادی سے پہلے وہ ڈیوڈ تھے۔ آج کل وہ فارمنگ کرتے ہیں۔ میں اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہوں اور اکلوتی۔“

مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے مگر میں نے اپنی خوش مزاجی کو برقرار رکھا۔ ”گریٹ... یعنی یہ مشرق اور مغرب کا ملاپ تھا۔“

”ہاں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ناممکن ہے۔“ وہ بولی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا تم اردو بول سکتی ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ میرے اردو میں کیے گئے سوال کا

جواب اس نے اردو میں دیا تو روشن ہونے والے طبق اٹھائیس ہو گئے۔ ”میری ماں نے تو اردو ادب بھی پڑھا۔ اس نے ایم اے کیا تھا۔ میرے والد برٹش لائبریری میں تھے۔ وہ پڑھ تو نہیں سکتے مگر اب ماں کے ساتھ رہ کے صاف بولنے لگے ہیں۔ میری تعلیم ہوئی انگلش میڈیم اسکولوں میں... ٹوٹی پھوٹی بولتی ہوں۔“

”یہ ٹوٹی پھوٹی کہاں، خاصی اچھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بس سمجھنے کا فرق ہے۔“

”میں تمہیں اپنے والدین سے ملواؤں گی۔ بھائیوں سے بھی ملواتی اگر وہ یہاں ہوتے۔ وہ امریکا میں سیٹل ہو گئے ہیں۔“

”وہاں وہ کیا کرتے ہیں؟“

”ایک ہوسٹن میں ہیوی ویٹ باکسنگ کا مقامی چیمپئن ہے۔ دوسرا میامی میں ہے، اسے تم فری اسٹائل ریسلنگ کے شو میں دیکھ سکتے ہو۔“

ایمی نے جام کو دھڑ سے میز پر مارا۔ ”یہ کیا بداخلاقی بلکہ بدتمیزی ہے۔ تم کب سے کسی جناتی زبان میں باتیں کر رہے ہو... میری موجودگی کا خیال کیے بغیر۔“

میں نے فوراً معذرت کرلی۔ ”اتفاق سے میری ہم وطن نکل آئی۔“ اور پھر میری سے مخاطب ہوا۔ ”خدانخواستہ تم جوڈو کراٹے کی ماہر تو نہیں ہو؟“

وہ ہنسی۔ ”تمہارے اندیشے غلط نہیں ہیں۔“

اب اگر عقل ساتھ دیتی تو میں میری پر فریفتہ ہونے کی غلطی کبھی نہ کرتا لیکن اس قلمی محبت کے دور میں بھی کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا... جو چچا غالب نے ڈیڑھ سو سال پہلے فرما دیا تھا پتھر پر لکیر ہے۔ میں ہزار جان سے میری پر اسی طرح عاشق ہوا جیسے گزشتہ ششماہی میں ایمی پر ہوا تھا اور خود ایمی پر اسی دن بلکہ اسی لمحے یہ دل شکنی کی حقیقت عیاں ہوئی کہ اس سے سچی محبت کا ڈھول پیٹنے والا بے پیندے کے لوٹے کی طرح میری کی طرف لڑھک گیا ہے۔ اس کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہ تھا کہ اس کی سہیلی اور کرائے دار اس کے غرور عشق کا ٹریڈ ٹاور نائن الیون کا انتظار کیے بغیر مسمار کر دے گی۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا۔

میری سے پہلی ملاقات ختم ہونے تک ایمی کا خوف یقین میں بدل گیا کہ شاید اس کی اور میری یہ آخری ملاقات ہوگی۔ میں نے تو پہلے ہی تسلیم کرلیا تھا کہ یہ سب نوشتۂ تقدیر ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ میں زیادہ بے خوف بلکہ بے شرم ہو گیا۔

میں نے میری کو اپنا کارڈ اپنے دل کی طرح پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”پردیس میں مل جائے کوئی ہم وطن تو کتنی خوشی ہوتی ہے۔“

ایمی نے خفگی سے کہا۔ ”یہاں تمہاری ایک لاکھ ہم وطن ہوں گی، ان سے مل کے تو تم کبھی خوش نہیں ہوتے۔“

میں نے اپنی متانت میں فرق نہیں آنے دیا۔ ”ان میں اور میری میں وہی فرق ہے جو گوبھی کے پھول اور گلاب کے پھول میں ہوتا ہے۔“ اور پھر روئے سخن میری کی طرف کر کے اردو میں کہا۔ ”مجھے بھی اپنا نمبر دو۔“

ایمی کے کان کھڑے ہو گئے، نمبر انگریزی لفظ تھا۔ وہ خطرے کی گھنٹی صاف سن رہی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔

”میں خود تم سے رابطہ کرلوں گی اگر ضروری ہوا۔“

میری نے میرا کارڈ اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

میں نے محبت کے سارے جذبات آنکھوں میں بسا کے اور لہجے میں سمو کے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤ... میری طرح۔“

ایمی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم مجھے چھوڑ رہے ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہیے۔“

”کیا تم نے اپنے سابقہ بوائے فرینڈز کو چھوڑتے وقت شرم محسوس کی تھی؟“ میں نے رکھائی سے کہا۔

اس نے بیگ گھما کے میرے سر پر مارا اور احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گئی۔ میری اس کے پیچھے لپکی۔ ”ایمی! پلیز میری بات تو سنو۔“ مگر اب کہنے سننے کو کیا رہا تھا۔

دو دن ایسے گزر گئے جیسے ہر عشق کے آغاز میں گزرتے تھے۔ کارڈ پر میرا فون نمبر بھی تھا اور ایڈریس بھی مگر شاید اسے ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ میرے خیالوں میں بس گئی تھی اور میں سوتے جاگتے جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ اس چکر میں مجھ سے ایک فاش غلطی بھی ہوئی۔ میں نے پیچھے سے دیکھا تو وہ فٹ پاتھ پر اکیلی جا رہی تھی۔ میں نے چلا کے کہا۔ ”مریم۔“ اور پیچھے سے دوڑ لگائی تو اسے جا لیا۔ کسی تکلف کے بغیر میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ میرے روبرو ہو گئی۔ تب میں نے بڑے بڑے دانتوں والی اس ڈریکولا جیسی سیاہ فام بڑھیا کو دیکھا جو شاید مدراسی تھی۔ اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور مدراسی میں کچھ کہا تو میری روح فنا ہو گئی۔ مزید یہ ہوا کہ دوڑ لگاتے ہوئے میں نے ایک ولایتی بڑھیا کو تقریباً ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اس نے میری ”سوری“ کو قبول نہیں کیا تھا۔ اب اس نے اپنی چھتری سے میری گوشمالی شروع کی تو میں مشرق اور مغرب کے درمیان پھنس گیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ ایک پولیس والا دوڑا دوڑا آیا اور اس نے گن نکال کے میرے پیچھے رکھ دی۔ ”یو بلڈی پاکی... تم ان بوڑھی عورتوں کو تنگ کرنے کے الزام میں خود کو گرفتار سمجھو۔“ مطلب یہ کہ میں ان کے بیگ چھین لینا چاہتا تھا۔

میری گلوخلاصی خود ان بڑھیوں کی سفارش پر ہوئی۔

اس رات مجھے ایک ڈراؤنا خواب آیا۔ وہ کوئی ریسٹورنٹ تھا جہاں میں مریم کے ساتھ وہ کر رہا تھا جو محبت کرنے والے سڑک پر اور ہر پبلک پلیس پر آزادانہ کر سکتے ہیں... اتنے میں اس کے دو بھائی دو مختلف سمتوں سے نمودار ہوئے۔ ایک نے مجھ پر باکسنگ کے وہ پنچ آزمائے جو شاید صرف محمد علی کلے برداشت کر سکتا تھا۔ دوسرے نے مجھے فری اسٹائل ریسلنگ کے انداز میں اِدھر سے اُدھر پھینکا۔ غضب یہ کہ خود مریم قہقہے لگاتی رہی اور فرمائش کرتی رہی کہ صرف دائیں بائیں نہیں، مجھے اوپر نیچے بھی اچھالا جائے۔

ہمت کر کے میں نے ایمی کو فون کیا اور اس کی اصل مادری زبان سنی۔ پہلے وہ مادری زبان میں بولتی تھی تو کانوں میں شہد گھولتی تھی۔ یہ کریلے کا عرق اس نے فون پر پہلی بار پلایا تھا۔ اس کے باوجود ہمت کر کے میں نے اسے ایس ایم ایس کر دیا کہ آج رات فلاں جگہ میں ڈنر پر اس کا منتظر رہوں گا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔ شرفا کی طرح میں چاہتا تھا کہ ہم باعزت طریقے سے ایک دوسرے کو الوداع کہیں۔ ولایت میں یہ چلن عام تھا اور اب تک ایک ہی منگنی کی انگوٹھی تھی جو مجھے واپس ملتی رہی تھی۔

تاہم ایسا نہیں ہوا۔ میں بڑے معزز انداز میں ایمی کا منتظر تھا اور وہ ٹھیک وقت پر نمودار بھی ہوئی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ سات فٹ لمبا اور ساڑھے تین فٹ چوڑا کالا دیو تھا جس کا تعارف اس نے اپنے نئے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے کرایا۔ ”دس از ایلوس... بہت جلد نیشنل باسکٹ بال ٹیم میں ہوگا۔“

اب مجھے طیش آیا۔ ”میں نے صرف تمہیں ڈنر پر بلایا تھا۔ وہ بھی یہ بتانے کے لیے کہ اب ہم دوست نہیں رہے۔“

”میں بھی تمہیں یہ سب واپس کرنے آئی تھی اور ایک سبق پڑھانے... ایلوس! اب تم اسے فکس کر سکتے ہو۔“ اس نے منگنی کی انگوٹھی اور میرے دیگر تحائف میرے منہ پر مارے۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میری ناک تھوڑا سا دائیں طرف مڑی

ہوئی ہے۔ پہلے یہ کچھ بائیں طرف زیادہ تھی۔ ہنگامہ کرنے کے جرم میں مجھے بھی ایلوس کے ساتھ بند کر دیا گیا اور جج نے راضی نامے کے باوجود ہمیں فائن کیا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے جرمانہ دیا اور جج کے سامنے ہاتھ بھی ملایا۔ باہر نکل کے میں نے اسے پنجابی میں وہ بات کہی جس سے میرے دل کو قرار ملا اور نقصان بھی کوئی نہیں ہوا۔

صدمے سے میرا دل نڈھال تھا کہ میری کے عشق نے رسوا کیا زمانے میں برباد کر دیا... اور اس نے خبر تک نہ لی۔ لندن جیسے شہر میں مکمل پتے اور فون نمبر کے بغیر میری کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے کم نہ تھا۔ بھوسے کا ڈھیر میری نام کی خواتین کا ہوتا۔ یہ غالباً سارے یورپ، امریکا میں سب سے مقبول نام ہوگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس کا اصل نام تو مریم داؤد ہے۔ میں نے ہر ڈائریکٹری اور انکوائری سے پوچھا۔ مریم کے ساتھ دوسرے نام کی.... ایک سو ایک خواتین ملیں۔ مریم داؤد ایک بھی نہ تھی۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ایک کروڑ سے زیادہ کی آبادی رکھنے والے اس شہر میں لاکھوں میرے ہم وطن بھی تھے۔ کسی کو یہ نام رکھنے کی توفیق نہیں ہوئی اور لندن میں جو ایک ہی تھی، اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ آخر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ فون کرتی ہے مریم تو ٹھیک ہے ورنہ بھاڑ میں جائے۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی... مجھے اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے خوش رہنا چاہیے۔

لیکن دل کی طرف سے جو جواب آیا بہت واضح تھا۔ دل لگی تو تم نے بہت کی... لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا... یہ دل کی لگی ہے جو ایسے نہ مٹے گی جیسے تم نے ڈائری میں لکھے ہوئے انتالیس ناموں کو یاد سے حرف مکرر کی طرح اڑا دیا تھا۔ ڈائری میں میری رومانی فتوحات کا پورا ریکارڈ تھا۔ ہر سابق محبوبہ کے نام اور فون نمبر کے ساتھ اس کی ایک تصویر بھی۔ اتنی پرائیویٹ کہ زندگی میں کبھی میں بلیک میلر بننا چاہتا تو میری اچھی خاصی آمدنی ہوتی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ کب اور کہاں ملی تھی اور کب اس نے مجھے یا میں نے اسے خدا حافظ کہا۔

میری چالیسویں تھی اور چالیس کا عدد ہی ایسا تھا۔ سب سے پہلے تو جہلم کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا تھا کہ اپنایت کے سارے دعوے دار بڑے انہماک سے پلاؤ زردہ قورمہ نوش فرما رہے ہیں۔ پھر علی بابا کے چالیس چور تھے

جن کو ایک کنیز نے ابلتا ہوا تیل ڈال کے مٹکوں میں ہی چرغے کی طرح ڈیپ فرائی کر دیا تھا۔ یہ چالیسویں محبوبہ کسی عامل سے نہ اترنے والی بدروح کی طرح میرے خیالوں اور خوابوں میں گھس گئی تھی۔

اسے تلاش کرنے کے ذرائع کم نہ تھے۔ میں ہر اخبار میں اشتہار دے سکتا تھا کہ مریم داؤد جہاں بھی ہو مجھ سے رابطہ کرے۔ جیسے لندن میں مریم داؤد ایک ہی تھی۔ اپنا کراچی، لاہور ہوتا تو میں ہر رات سفیدی کوچی اور رنگ کا ڈبا لے کر نکل جاتا اور صبح تک شہر کی ساری دیواروں پر اس کا نام لکھ آتا۔ یہاں یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ میں ایک پلے کارڈ اٹھا کے شہر کے گلی کوچوں میں گشت شروع کر دوں جس پر مریم داؤد کا نام لکھا ہو۔

پھر مجھے ایک جان لیوا خیال آیا۔ کیوں نہ میں زرہ بکتر اور ہیلمٹ پہن کے ایمی کے فلیٹ پر پہنچ جاؤں جہاں وہ رہتی ہے۔ اس کا وہ نیا یار مجھے قتل تو نہیں کر دے گا۔ میں ہاتھ میں اصلی نظر آنے والا نقلی کھلونا پستول بھی لے جا سکتا ہوں۔ اگر وہ نہ ملی تو میں اپارٹمنٹ بلڈنگ کے دروازے پر کہیں بھی دھرنا دے سکتا ہوں۔ وہ بالآخر آئے گی... جائے گی کہاں؟

اس خیال نے مجھے ایک دم یوں چلا دیا جیسے گیئر میں ڈالتے ہی گاڑی چل پڑتی ہے۔ میں نے ایک ڈالر شاپ سے ذرا مہنگا مگر سو فیصد اصلی نظر آنے والا پستول خریدا اور کلمۂ شہادت پڑھ کے اس عمارت میں گھس گیا جس کی دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں ایمی رہتی تھی۔ گیٹ پر موجود ''جینی ٹر'' یعنی گارڈ نے مجھے نہیں روکا کیونکہ اسے ابھی تک ایمی کی طرف سے یہ ہدایات نہیں ملی تھیں کہ دلیپ یوسف زبردستی اندر آنا چاہے تو اسے بلاتکلف گولی ماردی جائے۔

میری دستک پر دروازہ خود ایمی نے کھولا اور مجھے دیکھ کے کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ گئی۔ ''تم... اب کیوں آئے ہو یہاں... دفع ہو جاؤ ورنہ...''

اس کے دروازہ میرے منہ پر مارنے سے پہلے ہی میں نے اپنا پیر بیچ میں اڑا دیا اور زبردستی اندر گھس گیا۔ ابھی تک اس نے چیخ کر نہ گارڈ کو یاد کیا تھا نہ ایلوس کو... میں کرمنل ٹریس پاس کے سنگین جرم کا مرتکب ہو چکا تھا اور وہ اودھم مچاتی تو مجھے لمبی جیل یاترا پر جانا پڑتا... وہ اپنی خوش فہمی میں ماری گئی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو! تم چاہو تو پولیس کو کال کر لو یا کہو اس کالے دیو ایلوس سے کہ میرا قیمہ بنا دے۔''

ایمی نائٹ شفٹ کے بعد سو کے اٹھی تھی اور لباس شب خوابی اس کا وہی تھا جو غسل کے دوران سب کا ہوتا ہے۔ اس نے ایک جام اور اپنے حلق میں ڈالا اور دوسرا مجھے لہرا کے دیا۔ ''نام مت لو اس کالے ریچھ کا... جاتے وقت وہ بیگ میں سے سارے پیسے بھی نکال کے لے گیا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا اور اسے پستول دکھایا۔

''آج وہ مارا جاتا میرے ہاتھوں۔''

''اوہ ڈیئر... رقابت کے جذبات نے تم کو اس حد تک پاگل کیا۔ مجھے پتا تھا کہ تم قطع تعلق کی بات کرو گے اور پچھتاؤ گے۔ چلو کوئی بات نہیں... ہم پھر دوست بن سکتے ہیں... میں اب بھی پیار کرتی ہوں تم سے۔''

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''میں یہاں تم سے نہیں... مریم سے ملنے آیا تھا۔''

وہ چلائی۔ ''مریم... اس کتیا کو تو میں نے اسی دن سامان سمیت سڑک پر پھینک دیا تھا۔ ادھار میں رہتی تھی اور احسان فراموشی کرتی تھی۔''

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ''وہ چلی گئی... کہاں؟''

''جہنم میں اور کہاں۔'' ایمی کا پارا پھر چڑھ گیا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس اس کا پتا یا فون نمبر تو ہوگا؟''

''کیوں، میں اس کی ہاؤس کیپر ہوں۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''اس کے ماں باپ کسی فارم ہاؤس پر رہتے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ سچ مچ پولیس کو بلا لوں گی میں اور آئندہ شکل مت دکھانا مجھے۔'' اس نے دھکیل کر مجھے باہر نکالا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

میری امیدوں کا سفینہ پھر مایوسی کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو مجھے افلاطون مل گیا۔ نام تو اس کا خالص دیسی شیر دین تھا اور وہ شیرانوالہ گیٹ لاہور کا باسی ہونے پر فخر بھی کرتا تھا لیکن دوستوں میں وہ افلاطون مشہور تھا۔ اب یہ نام اس کے اصل نام سے زیادہ شہرت پا رہا تھا۔ اسے ہر معاملے میں اپنی ماہرانہ رائے دینے کی عادت تھی۔ تسخیر محبوب کے نقش سے پولٹری فارمنگ اور اسٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ تک اسے ہر موضوع پر اپنی بات کو حرفِ آخر منوانے کی عادت تھی۔

اس نے مجھے اچانک چلا کے یوں پکڑ لیا جیسے میں اس

کی مفرور بیوی تھا۔ ''ارے دلیپ کمار... تم یہاں کہاں؟'' اور جھپٹ کے مجھ سے بھوت کی طرح چمٹ گیا۔ ''بس اتفاق سے میری نظر پڑ گئی تم پر ورنہ تم تو نظر چرا گئے تھے۔ میں تو آیا تھا کام سے یہاں... ایک میرے ماموں سگے نہیں ہیں ان کے داماد کے دوست نے شکار پوری اچار بنانے کو کہا تھا۔ میں نے کہا کہ بھئی سامان منگوا لو... آج بنا دیا اسے۔''

میں جملہ ختم ہوتے ہی بول پڑا۔ ''اچھا یار! پھر ملیں گے۔ آج کچھ پریشان ہوں میں۔''

پریشانی کا ذکر ہی میری غلطی ثابت ہوا۔ اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''پریشان تو تم بغیر وجہ کے بھی رہتے تھے۔ جب تم لکھ پڑھ رہے تھے... پھر چلے گئے تھے اکاؤنٹس کی طرف۔ آج کل ماحولیات پڑھ رہے ہو نا۔ اچھا ہے جتنا وقت مل جائے۔ جس دن اللہ کو منظور ہو گا ولایت کی کوئی ڈگری بھی مل ہی جائے گی۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ ایمی تمہیں چھوڑ کے کسی حبشی باسکٹ بال پلیئر کے ساتھ چلی گئی ہے... یہ ناک کو کیا ہوا تمہاری؟''

میں اس کی نہیں سن رہا تھا مگر اس آخری بات نے میرے کان بھی کھڑے کر دیے اور میں خود بھی کھڑا ہو گیا۔ ''افلاطون! میرا مسئلہ تو ہی حل کر سکتا ہے۔ سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے... بس تو پانچ منٹ کے لیے اپنی زبان روک لے تاکہ میں بول سکوں۔''

ایسٹ اینڈ کے ایک پرشور ہوٹل میں جہاں گلاسوں میں دودھ کے گاڑھے قوام والی چائے دی جاتی تھی اور پھٹے ہوئے اسپیکر کان پھاڑ آواز میں پرانے گانے سناتے تھے... میں نے بھی سب حاضرین سے اونچی آواز میں بول کر حالِ دل اس افلاطون کو سنایا۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اس نے شڑپ کر کے گلاس خالی کیا اور دھڑ سے میز پر مارا جو میرے دل کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ''یار! میں سمجھ گیا۔ اتنی لمبی کہانی کی ضرورت کیا تھی؟ مریم کو تلاش کرنا ہے نا؟ اس کے ساتھ کل ہی تیرے گھر آ جاؤں گا... شام پانچ بجے کال بیل بجے تو سمجھ لینا... تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔''

اگلے دن ٹھیک پانچ بجے گھنٹی بجی تو میں فرطِ جذبات سے... ارشمیدس کی طرح... میں نے پا لیا... میں نے پا لیا کہتا بھاگا۔ اس نے بھی غسل کرتے کرتے سونے کی کثافت دریافت کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا تھا۔ اسے بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ اس کے نئے سونے کے تاج میں کتنا کھوٹ ہے یہ بتائے ورنہ سر قلم کر دیا جائے گا... وہ جب بازاروں سے گزرا تو میری طرح ہی لباس فطرت میں تھا۔

میں نے عقل کا بریک لگا کے خود کو روکا اور ''آجا'' کا نعرہ لگا کے جو دستیاب ہوا زیب تن کر لیا۔ دروازہ کھول کے دیکھا تو عشق کے آتش فشاں جذبات پر ہمالیہ کی برف پڑ گئی۔ وہاں میری نہیں میرا ولایتی سانڈ جیسا لینڈ لارڈ کیلر کھڑا تھا جو کلر کہلاتا تھا کیونکہ جیسے فرشتۂ اجل روح قبض کیے بغیر نہیں ٹلتا، وہ بھی کرایہ لیے بغیر ٹلتا نہیں تھا۔ اس نے میرے سراپا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا۔ ''تم سارا دن پیتے رہتے ہو... خیر پیو۔ جتنی زیادہ پیو گے اتنے ہی جلد مرو گے۔ نیا کرائے دار آئے گا تو فل ایڈوانس دے گا اور تمہارا میری جیب میں الگ ہو گا۔''

میں نے عجلت میں ٹی شرٹ پہن لی تھی جس کے بٹن پیچھے چلے گئے تھے اور پتلون وہ جس کا آخری بٹن دو ہفتے قبل داغِ مفارقت دے چکا تھا۔ مجھے اپنی حالت پر یا لینڈ لارڈ کی خباثت سے زیادہ یہ صدمہ تھا کہ افلاطون بھی میرے درد کا درماں نہ کر سکا۔ اب کسے راہنما کرے کوئی...

لیکن پانچ منٹ بعد کال بیل پھر بولی تو میرے دل نے کہا کہ مجنوں کے گھوڑے... ذرا آہستہ چل... دیر سویر دنیا میں ہو جاتی ہے اور لندن جیسے شہر کے ٹریفک میں پانچ منٹ کی تاخیر کچھ نہیں... میں نے معقول لباس پہن کے دروازہ کھولا تو مجھے افلاطون کا فخریہ مسکراہٹ سے روشن چہرہ نظر آیا۔ اس نے کہا۔ ''یار پانچ منٹ دیر ہو گئی مجھے... سوری، یہ ہے تیری مریم۔'' اور اس نے میرے سامنے ساڑھے تین فٹ کی سرو قد اور ساڑھے تین سو پونڈ کی نازک اندام اس بھیانک چیز کو پیش کیا جو جتنی جامے کے اندر تھی اس سے زیادہ باہر تھی۔

''یہ... یہ وہ مریم تو نہیں۔'' میں اسے دیکھتا رہا جو مسکرانے کی کوشش میں اپنے بڑے بڑے دانتوں کی نمائش کر رہی تھی۔

''اب یہی ہے... مریم ڈیوڈ... داؤد اور ڈیوڈ ایک ہی بات ہے۔''

دیر آید درست آید... ایک تو میرا اس محاورے پر سے ایمان اٹھ گیا۔ دوسرے میرے اندر افلاطون کے تعلقات کا وہ آخری دن ثابت ہوا۔ حالانکہ میں نے بڑی شرافت سے اسے صرف یہ کہا تھا کہ مریم داؤد نہیں ملی تھی تو اپنی والدہ ماجدہ کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں غصے میں آتش فشاں بنا اپنے کمرے میں

سرگرداں رہا... اور کر عشق بیٹا! میں نے خود سے کہا۔ وہ وقت میری جان بہت دور نہیں ہے جب تو لندن کی سڑکوں پر اور گلیوں میں خاک سر دیوانہ وار مریم مریم چلاتا پھرے گا۔ یہ سب سزا ہے تیرے اعمال کی اور ان احتالیس کی بددعا جن کے دل تو نے آئین پاکستان سمجھ کے بار بار توڑے۔

اچھی بات یہ تھی کہ میں کسی بھی معاملے میں پولیس سے مدد لے سکتا تھا کیونکہ اپنے لاتعداد ہم وطنوں کی طرح میں غیر قانونی نہیں تھا۔ وارد تو میں گوروں کے دیس میں روایتی طریقے سے ہی ہوا تھا یعنی پاسپورٹ ویزا کے بغیر... طارق بن زیاد نے اسپین کے ساحل پر کشتیاں جلانے کے بعد کہا تھا کہ وطن... کیسا وطن... ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست... لیکن آج یہ جواب وہ لندن میں امیگریشن والوں کو نہیں دے سکتا تھا کہ سب ہمارے ملک ہیں کیونکہ ہمارے خدا کے ملک ہیں۔ سال بھر میں بھی عجیا دیتا رہا اور پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا لیکن اس عرصے میں ایک خالص میڈ ان برطانیہ لڑکی مجھے ایسی مل گئی جس نے بقائمی ہوش و حواس مجھ سے شادی کرلی۔ اسے لڑکی ہی کہا جاسکتا تھا۔

اس بیوی جیسی چیز سے میں اس وقت تک وفادار رہا تھا جب تک کہ اس نے عدالت میں حاضر ہو کے بیان حلفی نہیں دے دیا کہ میں ہی اس کا اکلوتا سگا اور قانونی شوہر ہوں۔ شہریت کی تصدیق ہوتے ہی میں نے جورو کی غلامی کا طوق گردن سے اتار پھینکا اور آزاد معزز برطانوی شہری بن گیا۔ یہ خوش خبری میں نے اپنے واحد سرپرست اعلیٰ دادا محترم کو سب سے پہلے دی اور ان سے درخواست کی کہ اب وہ بھی ولایت تشریف لے آئیں۔ حسب توقع انہوں نے کڑک کے کہا۔ ”اور یہاں میری قبر میں کون جا کے بسے گا... تیرا باپ۔“ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے باپ کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

سراغ رسانی میں برطانوی پولیس کی دھوم تھی کہ وہ تو جرم ہونے سے پہلے اس کا سراغ لگا لیتے تھے اور بعض اوقات قتل سے پہلے ہی مبارک باد دینے پہنچ جاتے تھے۔ قاتل کو بھی اور مقتول کو بھی کہ آپ دونوں بچ گئے۔ ایک قتل ہونے سے اور دوسرا پھانسی پر لٹکنے سے... ہمارے پیارے ملک کی پولیس کم نہیں... وہ تو اس قتل کا سراغ بھی لگا لیتے ہیں جو ہوا ہی نہیں اور قاتل کو پکڑ کے اس سے برضا و رغبت اعتراف جرم بھی کرا لیتے ہیں۔

لندن پولیس کے ایک افسر نے مجھے تلاشِ گمشدہ کے شعبے سے رجوع کرنے کو کہا۔ وہاں ایک مستعد خاتون افسر نے فوراً میری رپورٹ درج کرنے کی تیاری کی۔ ”تمہاری کیا چیز کھوگئی ہے... بلی... کتا یا پرس؟“

میں نے کہا۔ ”ایک لڑکی ہے... مریم داؤد۔“

اس نے فوراً قلم رکھ دیا۔ ”تمہیں لاپتا افراد کے شعبے میں جانا چاہیے تھا۔“

صحیح جگہ پر مجھے غلط آدمی سے واسطہ پڑا۔ ”اچھا... کب سے لاپتا ہے یہ مریم داؤد؟“

”تقریباً تین ہفتے ہوئے۔“

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”اب تک تم سوتے رہے... فوراً رپورٹ درج کیوں نہیں کرائی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”میرا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے تین ہفتے قبل ملی تھی اور لندن ہی میں ہے۔“

اس نے پھر لکھنا شروع کیا۔ ”او کے... وہ کون ہے تمہاری؟ رشتے دار، بیوی یا گرل فرینڈ؟“

”ان میں سے کچھ نہیں۔“

اس نے پھر قلم رکھ دیا۔ ”پھر تم اسے کیوں تلاش کررہے ہو؟“

”دراصل، میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں... سچی محبت۔“

وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ ”اور تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے... اس کا پتا، فون نمبر کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”یہ لوایٹ فرسٹ سائٹ کا کیس ہے۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”کیا یہ بات اسے معلوم ہے؟ ظاہر ہے نہیں... اگر یہ ہوتا تو وہ خود تم سے ملتی یا فون کرتی تمہیں...“

”میں نے تین ہفتے انتظار کیا اور اسے تلاش کیا۔“

”تمہارا نام، پتا اور فون نمبر تھا اس کے پاس؟“ وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں، میں نے اپنا کارڈ دے دیا تھا اسے۔“

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”مین... پھر تم کیوں اپنا وقت ضائع کررہے ہو... اور ہمارا... راہ چلتی لڑکی سے ہی سچی محبت کرنی ہے تو کارڈ کسی اور کو پکڑا دو لیکن پھر جاؤ اس کے پیچھے... اگر وہ تمہارے ساتھ نہیں جاتی اور نام پتا بھی نہیں بتاتی۔“

اب میں نے برہمی کا اظہار ضروری سمجھا۔ ”یہاں میں رپورٹ لکھوانے آیا ہوں، مفت مشورے لینے نہیں۔ یہ پولیس اسٹیشن ہے یا حکومت نے کوئی نیا لوافیئر ڈپارٹمنٹ قائم کیا ہے۔“

”آل رائٹ... آگے بولو۔ مریم داؤد کا کوئی حوالہ، سوشل سیکیورٹی نمبر... کوئی جان پہچان؟“

میں نے بتا دیا کہ وہ ایمی کی کرائے دار تھی جس نے اسے نکال دیا تھا کیونکہ وہ حسد میں مبتلا ہوگئی تھی۔ میں نے اس سے تعلق ختم کرلیا تھا۔

”مریم داؤد کی کوئی تصویر؟“

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار... اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ یہ جواب وہ سمجھ نہیں سکتا تھا چنانچہ میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اس نے رپورٹ مکمل کرلی اور بولا۔ ”جیسے ہی اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا، ہم تمہیں مطلع کریں گے۔ اب کیا میں آف دی ریکارڈ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بات کرسکتا ہوں؟“

”کوئی حرج نہیں... انسان تو لگتے ہو تم۔“

اس نے پیچھے والی پاکٹ میں پھنسا ہوا پرس نکالا اور اس کے کسی خانے سے ایک خاصی قابلِ اعتراض تصویر نکالی۔ ”یہ ہے نا ایک سو ایک فیصد جولیا رابرٹ... نام ہے اس کا کیٹ... کیتھرین کا مخفف۔“

”یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“

”وہی... انسانی ہمدردی کے نام پر... یہ میری گرل فرینڈ تھی جو اب نہیں رہی۔ بس ابھی ابھی میں نے تمہارے لیے اس کو چھوڑ دیا ہے۔ انسانی ہمدردی میں... تم اس سے محبت کرو، میں دوسری تلاش کرلوں گا... دفع کرو مریم داؤد کو...“

میں نے اسے سچی محبت کا فلسفہ سمجھانے کے لیے لیلیٰ مجنوں کے علاوہ رومیو جولیٹ کی مثال بھی دی مگر اس کوڑھ مغز نے کہا کہ میرا مزید وقت ضائع مت کرو اور تصویر کو واپس رکھنے کے بجائے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

اس کے بعد دن گزرتے گئے۔ ایک ہفتہ... دو ہفتے... ایک مہینے تک لاپتا افراد کے شعبے سے مجھے یہی بتایا گیا کہ تاحال وہ مریم داؤد کا سراغ لگانے میں ناکام ہیں۔ انہوں نے ایمی سے بھی رابطہ کیا تھا مگر وہ بھی کوئی حوالہ بتانے میں ناکام رہی۔ اس نے کہا کہ وہ جگہ کی تلاش میں تھی۔ اس نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسے آفر کردی، تفصیلات کے چکر میں پڑے بغیر۔

میں نے ان کو ایک اور کلیو یا سراغ دیا۔ اس کا باپ پہلے ڈیوڈ تھا جو اب داؤد ہے۔ ڈیوڈ کے آگے پیچھے کیا تھا یہ تو نہیں معلوم مگر اس کا کوئی فارم ہاؤس ہے اور اس کی بیوی ایک پاکستانی عورت رضیہ سلطانہ ہے۔ ڈیوڈ پہلے برٹش قونصل میں تھا اور کراچی، لاہور، اسلام آباد میں رہ چکا ہے۔

میری بات نے ایک سارجنٹ کو سخت جز بز کیا۔ ”یہ اتنی اہم بات تھی، تم پہلے نہیں بتا سکتے تھے۔ اب ہم اس کا سراغ لگالیں گے۔“

لیکن اس کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہوا۔ مزید کئی ہفتے بعد انہوں نے مایوسی کا اظہار کیا مگر ناکامی کا اعتراف نہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیس کو ہم کلوز نہیں کررہے ہیں۔ جیسے ہی مریم داؤد کا پتا چلا ہم آپ کو مطلع کریں گے۔

مجھے معلوم تھا کہ ان کا یہی طریقہ ہے۔ وہ کبھی اپنی ناکامی کا اعتراف نہیں کرتے اور کیس فائل کبھی کلوز نہیں کرتے۔

لندن میں عشق بھی فراغت کا مسئلہ ہے۔ طالب علم رہنے کا شوق تو دادا جی سے مسلسل تعلیمی اخراجات کے لیے رقم منگوانے کے لیے تھا۔ وہ زمانہ گزر گیا تھا جب میں رسماً کبھی ایک یونیورسٹی میں نام لکھواتا تھا اور کبھی دوسری میں اور بطور طالبِ علم جو کام ملتا تھا وہ اضافی آمدنی ہوتی تھی۔ اب میں اخراجات پورے کرنے اور عیاشی کے لیے باقاعدہ کام کرتا تھا... اور ہر کام کرتا تھا۔

شاید پڑھنے والوں کو یہ ناقابلِ یقین لگے کہ اس تمام عرصے میں میرے جیسے پیشہ ور عاشق نے کوئی نیا حسین سہارا تلاش نہیں کیا جو کہ لندن میں ہر قدم پر بہ آسانی دستیاب تھا۔ میں مریم داؤد کو تلاش کرتا رہا، معلوم نہیں یہ دعا ہوگی یا بددعا... اگر میں کہوں کہ خدا کرے کہ آپ پر بھی ایسا وقت آئے جب آپ کو وہی سچی محبت ہوجائے جس کے بارے میں چچا غالب کا فرمایا ہوا مستند ہے اور رہے گا کہ... کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

شروع شروع میں مریم سے میرے عشق جنوں پیشہ کی بات کچھ دوست احباب اور ان سب نے دلچسپی سے سنی جن کے ساتھ میں کام کرتا تھا پھر کچھ لوگ اخلاقاً مریم کا ذکر سنتے رہے اور اس کی تلاش میں میری ناکامی پر ہمت بھی بڑھاتے رہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو بے مروت تھے یا خود کو بہت حقیقت پسند کہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یار چھوڑو مریم کو.... دنیا میں وہی ایک لڑکی تو نہیں رہ گئی۔ ایک ملاقات میں کیا پتا چلتا ہے کہ اس نے کتنا جھوٹ کہا اور

کتنا سچ۔ کیا پتا اس کا نام کچھ اور ہو۔ ہوسکتا ہے وہ لندن میں ہی نہ ہو، مرکھپ گئی ہو۔ ہمارے کان پک گئے ہیں ہر وقت مریم مریم سنتے۔ اب کوئی اور بات کرو ورنہ تمہارے ساتھ ہم بھی پاگل ہوجائیں گے۔

دو چار نے سنجیدگی سے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس فریب خیال سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی ماہر نفسیات سے رجوع کروں۔ شاید مریم کا خیالی پیکر میں نے خود تراش لیا ہے اور میں اسے حقیقت سمجھ کے اسی طرح اس کا تعاقب کررہا ہوں جیسے صحرا کا پیاسا سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔ ظاہر ہے کچھ لوگوں سے میرے تعلقات خراب ہوئے۔ ایک جگہ مجھے جاب سے ہاتھ دھونا پڑے۔ میری بات سننے والوں میں کچھ خواب پرست قسم کی لڑکیاں بھی تھیں جو میری لیلیٰ بن کے مجنوں کی محبت کا سدابہار درخت اپنے آنگن میں لگانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے مجھے ورغلانے کے تمام جذباتی اور جسمانی کشش کے حربے آزمائے مگر کچھ عرصہ ان کے ساتھ گزار کے بھی میں مریم کو فراموش نہ کرسکا۔ زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی کوئی تصویر نہ ہونے کے باوجود مریم میرے تصور میں اسی طرح زندہ تھی جیسے ایک ریسٹورنٹ میں اپنی پہلی اور آخری ملاقات کے دوران... اس کا سراپا، اس کا ہر انداز، مسکرانے کا حسن، آواز کا جادو... سب کچھ میرے تصور میں اسی طرح زندہ تھا۔ ایک بار کسی سرِراہ بیٹھے مصور نے مجھے دعوت دی۔ ”آؤ دس منٹ میں اپنا اسکیچ بنوالو... صرف ایک پاؤنڈ میں۔“

میں رک گیا۔ ”کلر میں پورٹریٹ بناسکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔ اس کے لیے تمہیں میرے اسٹوڈیو میں آکے بیٹھنا پڑے گا۔ میرا اپارٹمنٹ ہی اسٹوڈیو ہے۔“

میں نے کہا۔ ”فرض کرو میں کسی اور کا خیالی پورٹریٹ بنانے کے لیے کہوں... جو صرف میرے خیال میں ہے۔“

”اگر اس کی کوئی تصویر ہوگی تو...“

”تصویر ہوتی تو میں تم سے کیوں خیالی تصویر بنواتا؟“ میں نے خفگی سے کہا۔

”او کے، تم آؤ... مجھے بتاؤ وہ کیسی ہے؟ ناک، کان، آنکھیں، بال... میں تصویر بناتا ہوں۔ جہاں غلط ہو تم بتاؤ کہ یہاں فرق آگیا۔“

”یہ کام تو پولیس بھی کرتی ہے، فرضی خاکے جاری کر کے۔“

”پولیس والے مصور نہیں ہوتے۔“ اب وہ خفا ہو گیا۔ ”میں ایک آرٹسٹ ہوں... لیونارڈو ڈاونچی اس صدی کا جو بدقسمتی سے یہاں فٹ پاتھ پر اپنا فن بیچ رہا ہے جس دن وہ ”مونالیزا“ کی طرح ابدی شہرت پالے گی... تم مجھے یاد کرو گے۔“

میں قائل ہوگیا اور ویک اینڈ پر اس کے دیے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک فضول سی آبادی کا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ تھا جہاں سب ایک بیڈروم میں آباد تھے اور بہت خوش تھے کہ گھر اپنا ہے۔ مجھے لندن کی ایسی تنگی دیکھ کے پاکستان میں اپنی رہائش گاہ یاد آتی تھی جو کوٹھی سے کچھ بڑھ کر حویلی جیسی وسعت رکھتی تھی۔ لان، باغ اور فوارے والی... وہاں دو گاڑیاں تھیں اور تین افراد کے لیے چار ملازم... یہاں ملازم یا ملازمہ صرف امیروں کی عیاشی تھی کیونکہ صفائی، کپڑے دھونے، برتن دھونے، کھانا پکانے ہر کام کے لیے الگ ملازم ہوتے تھے جو فی گھنٹا وہی پیسے وصول کرتے تھے جو مجھے ملتے تھے اور ان کے مزاج بھی نوکروں والے نہیں مالکوں والے ہوتے تھے۔ ہمارے خوابوں کی سرزمین امریکا کا حال اور بھی برا تھا۔ ایک سروے کے مطابق نیویارک میں پچاس ہزار افراد سرکاری ”شیلٹر ہوم“ میں رہتے تھے کیونکہ ڈبل ڈیوٹی کے باوجود وہ ایک بیڈ کے اپارٹمنٹ کا کرایہ ادا نہیں کرسکتے تھے جو ایک ہزار ڈالر تھا۔ ہمارے سکہ رائج الوقت کے مطابق ایک لاکھ سے اوپر۔

آرٹسٹ نشے میں دھت ہو کے مزید مکروہ ہوگیا تھا۔ اس کی بے تکی داڑھی ہو یا سر کے الجھے ہوئے لمبے بال... سب کاٹ چھانٹ مانگتے تھے۔ اس کے کپڑے اور ان میں پایا جانے والا جسم ایک سے غلیظ تھے اور ایک سی بو پھیلاتے تھے مگر یہ فنکار ہونے کی دلیل تھی۔

”آؤ آؤ، میرے سو پاؤنڈ کے چلتے پھرتے نوٹ...“ وہ بولا۔ ”جہاں جگہ ملے اور دل چاہے بیٹھ جاؤ۔ ہماری پرائیویسی ڈسٹرب نہیں ہوگی۔“

اس کے بیڈ پر مدہوش یا خوابیدہ پڑی لڑکی نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ ”پرائیویسی کی کیا ضرورت... تم تھوڑی دیر دیکھو اور انتظار کرو۔“

میں نے مجبوراً وہ سب دیکھا مگر میری دہری مجبوری تھی۔ میں بہت دور سے بہت کرایہ خرچ کر کے آیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ سو پونڈ میں مریم کا قالب کسی پورٹریٹ میں ڈھل جائے تو میری تلاش کو ایک واضح سمت مل جائے گی۔

ایک پورا دن میں نے بڑے صبر و تحمل سے گزارا۔ مصور نے مجھ سے مریم کے سراپا کا حال تفصیل سے سنا اور

پھر ایک خاکہ بنایا جسے میں نے مسترد کردیا۔ وہ مریم کے علاوہ کسی کا بھی ہوسکتا تھا۔ پھر اس نے مجھے ان گنت تصاویر دکھائیں۔ ماڈل، ایکٹریس، کال گرلز اور نہ جانے کون کون... اس کے پاس رسالوں کے انبار تھے جن کے کور پیج یا اندر کے کسی فیچر کی تصاویر کو وہ ریفرنس کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ سو پاؤنڈ کے لالچ نے اسے بھی برداشت سے کام لینے پر مجبور کیا۔ بالآخر اس نے پنسل سے ایزل پر ایک چہرہ بنایا اور اس کے خدوخال میرے کہنے کے مطابق تبدیل کرتا رہا۔

ایک وقت آیا جب اس نے اپنے بال نوچے۔ اسکیچ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔ ایزل کو لات مار کے گرایا اور چلانے لگا۔ ”میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ لیونارڈو ڈاونچی کیا، پکاسو بھی پاگل ہوجاتا اور وہ ننگے پاؤں دنیا میں پھرنے والا تمہارا ایم ایف حسین اپنے کپڑے بھی پھاڑ پھینکتا... جاؤ دفع ہوجاؤ۔“

میں چاہتا تو اس کی ایسی ٹھکائی لگاتا کہ آئندہ کے لیے وہ دعویٰ کرنے کے قابل نہ رہتا۔ سیکھے ہیں ماہ رخوں کے لیے ہم مصوری... وہ کسی ماہ رخ کے قابل بھی نہ رہتا مگر یہ اپنا پاکستان نہیں ولایت تھا چنانچہ میں اندر سے آتش فشاں کی طرح کھولتا ہوا اٹھا۔

اس نے دروازے کے سامنے آکے میرا راستہ روک لیا۔ ”میرا معاوضہ تو دے کے جاؤ... سو پاؤنڈ۔“

”کس بات کے سو پاؤنڈ؟“ میں نے آخر میں دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اسے اپنی مادری زبان کی بہترین گالی سے نوازا۔

”کیا؟ کس بات کے سو پاؤنڈ... میں نے سارا دن جھک نہیں ماری۔ یہ میرے وقت کی قیمت ہے۔“

”تم نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔“

”اور یہ سب کیا میں اپنے باپ کے لیے کررہا تھا؟“ اس نے درمیان میں عادت کے مطابق چند بے ضرر گالیاں دیں۔

”تم جھک مارتے رہے۔“

وہ چلانے لگا۔ ”ایک بوجھ ڈھونے والا بھی ہر گھنٹے کی اجرت لیتا ہے۔ ایک آرٹسٹ کیا اس سے بھی گیا گزرا ہے؟ سو پاؤنڈ تو تمہیں دینے ہوں گے حالانکہ کم سے کم اجرت کے قانون کے تحت یہ کم ہے۔“

”میرا تمہارا کون سا ایگریمنٹ تھا؟“ میں نے شیر کی طرح دہاڑ کے کہا۔ ”میرا راستہ چھوڑ دو ورنہ...“

”ورنہ کیا... تم مجھے قتل کر کے نکل جاؤ گے... یو ڈرٹی پاکی... یہ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔“

ہم دونوں کا انجام ایک ہی لاک اپ میں ہوا جیسے پہلے ایمی کے حبشی یار ایلوس کے کیس میں ہوا تھا۔ میری بدقسمتی کہ جو سزا مجھے فائن کی صورت میں ملی تھی، اس کا ریکارڈ لندن پولیس کے پاس تھا۔ میرے اس دوسرے جرم پر مجھے پندرہ دن جیل میں گزارنے کے بعد ایک مہینا سوشل ورک کر کے ثابت کرنا پڑا کہ میں اچھا صلح پسند شہری ہوں۔ مجھے اگلی بار کے لیے بتادیا گیا کہ سزا زیادہ سخت ہوگی۔ مجھے نفسیاتی علاج گاہ میں رکھا جائے... یا شہریت منسوخ کر کے ملک بدر کردیا جائے۔

اگر لوگ حیران تھے تو میں اس عشق سے پریشان تھا جو مجھے کسی نظر نہ آنے والی اور ناقابل تشخیص بیماری کی طرح لگ گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ دماغی بیماری تھی لیکن ابھی تک میں نے کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ ذہنی مریض کب تسلیم کرتا ہے کہ وہ ذہنی مریض ہے۔ کسی نے پاگل خانے میں ایک پاگل سے پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے۔ تم کہتے ہو لوگ پاگل ہیں تم نہیں اور لوگ تمہیں پاگل کہتے ہیں... اس نے آہ بھر کے کہا۔ چکر کوئی نہیں۔ اکثریت کی بدمعاشی چلتی ہے۔ مجھے بھی کوئی یہ مشورہ دیتا تو میرا کچھ ایسا ہی ردِعمل ہوتا۔

مریم کے عشق نے مجھے ذہنی طور پر ہی نہیں، مالی طور پر بھی دیوالیا کردیا تھا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود میں اس کے خیال کو دل سے نکال نہیں پاتا تھا۔ میں بے بس تھا۔ جو میں چاہتا تھا کہ نہ کروں، وہ بالآخر مجھے کرنا پڑتا تھا۔ ویک اینڈ پر میں نے لندن کے مضافات میں ہر فارم ہاؤس پر جا کے مریم کو تلاش کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کے باپ کا نام اب داؤد تھا۔ ڈیوڈ ہوتا تب بھی لوگ پوچھتے کہ صرف ڈیوڈ کیا؟ آگے پیچھے بھی تو کچھ ہوگا۔ اس کی ماں رضیہ سلطانہ کو کون جان سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ میں نے جھک ماری... اپنا وقت اور پیسا برباد کیا۔

اس عشق سے میری زندگی کے معمولات خراب نہیں ہوئے تھے۔ میں ٹھیک کھاتا پیتا تھا اور سوتا تھا اور اپنا کام بھی کرتا تھا۔ میں پوری کوشش کرتا تھا کہ لوگوں کو نارمل نظر آؤں۔ میں نے مریم کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا تھا لیکن وہ جو ایک خیال تھا، وہ OBSESSION بن گیا تھا۔ اس کا اردو متبادل کوئی نہیں... سودا کہیں جنوں کہیں وحشت کہیں جسے...

پاکستان میں میرے دو رشتے برقرار تھے۔ ایک دادا صاحب تھے جن کی دادا گیری کے آگے میری نہیں چلتی تھی۔ ایک تو رشتہ ایسا تھا، دوسرے میری پرورش سے ولایت میں تعلیم تک میری تمام فضول خرچیاں وہی برداشت کرتے تھے۔ ابھی بظاہر ان کا ایسا کوئی نیک ارادہ نہیں تھا کہ وہ اپنے دنیاوی مال و متاع کو اپنے اکلوتے وارث یعنی میرے سپرد کر کے خلد آشیانی کے درجے پر فائز ہوں۔ تاہم میں یہ بات جانتا تھا اور ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ ایدھی کو دے کر ثواب دارین حاصل کرنا بہتر سمجھیں مال و متاع کافی تھا۔

دوسرا رشتہ میری ماں کا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی جیسی کہ ہر ماں ہوتی ہے۔ سیدھی سادی۔ بظاہر کچھ نہ سمجھنے والی... جانتے بوجھتے بے وقوف بن کے ہر جھوٹ کو تسلیم کرنے والی اور ویسے حقیقت آشنا... وہ ایک خاموش طبع، پرسکون اور راضی برضا قسم کی مظلوم عورت تھی جس کو میں نے ہمیشہ تنہا ہی دیکھا تھا۔

دادا صاحب کے فون کم کم آتے تھے۔ پہلے ماں ہر روز فون کرتی تھی۔ اب میرے رویے کی وجہ سے ہر ہفتے کرتی تھی۔ اگرچہ کہنے سننے کو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ تم کیسے ہو... تم کیسی ہو... دادا کیسے ہیں... سب ٹھیک ہیں... گفتگو ختم۔ ابھی تک انہیں خبر نہ تھی کہ میری اعلیٰ تعلیم تو محض ولایت میں رکے رہنے کا بہانہ ہے اور اب میں شہریت حاصل کر چکا ہوں تو وہ بہانہ لاحاصل ہے۔ شہریت میں نے کیسے حاصل کی، اس کی حقیقت وہ نہیں جان سکتے تھے۔ اگر کبھی میں بتاتا تو یہ کہ وزیراعظم برطانیہ نے بار بار درخواست کی پھر خود آ کے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہمیں شہریت کا اعزاز عنایت فرمایئے مگر میں نے کہا کہ مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ بالآخر جب خود ملکہ برطانیہ نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا۔ آخر شرافت بھی کوئی چیز ہے۔ وہ ہیں تو دادا کی دادی جیتی۔

پھر ایک دن وہ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ماں نے اچانک کہہ دیا کہ بس اب واپسی اختیار کرو۔ ہم مزید تنہا نہیں رہ سکتے۔ یہ تنہائی کا مسئلہ نہیں تھا۔ میری تنہائی کی فکر تھی۔ ہر ماں کی طرح وہ میرے سر پر سہرا دیکھنے... بہوسے چونچیں لڑنے اور پوتوں سے دل بہلانے کا آئینی حق رکھتی تھیں۔ اصرار میں شدت آنے لگی۔ پھر دادا صاحب نے اپنے اختیار کا ڈنڈا چلایا اور خاصی دھمکیاں دیں جن میں خرچ بند کرنے سے اپنی وفات حسرت آیات تک پر دھمکی شامل تھی۔

دادا گیری ایک فن ہے جس کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ فلموں والے ممبئی کے دادا بہت سے بھائی رکھتے تھے اور ان کے انڈر گراؤنڈ ورلڈ سے سیاست دانوں، پولیس اور ہر طرح کی مافیا سے فرسٹ کزن والا رشتہ ہوتا ہے چنانچہ وہ سب کچھ کرتے ہیں یعنی کرا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے میری لینڈ لیڈی نے مجھے چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر گھر خالی کرنے کا حکم دیا۔ ''اپنا سامان اٹھاؤ ورنہ میں پھنکوا دوں گی۔''

''لیکن میرا قصور؟ اور یہ سراسر غیر قانونی ہے۔ میں ایڈوانس کرایہ دیتا ہوں اور تمہیں ایک مہینے کا نوٹس دینا چاہیے۔''

''اچھا تو رسید دکھاؤ... آخری کرایہ کب دیا تھا تم نے؟''

میں چلانے لگا۔ ''دیکھو، شرافت اور اعتماد میں رسید نہیں لی تھی میں نے... میں نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

''لیکن اب تمہارے خلاف شکایات کا انبار ہے میرے پاس۔''

''یہ کیا فضول بات ہے... کیا شکایت ہے تمہیں؟''

''ایک ہو تو بتاؤں۔ تم شراب پی کے غل غپاڑا کرتے ہو... مشکوک کردار کی عورتوں کو لاتے ہو، پڑوسیوں سے بدکلامی کرتے ہو۔''

''جھوٹ ہے یہ سب۔''

''میرے پاس سچ ثابت کرنے کو بہت کچھ ہے۔ تم نے ایک پڑوسی کے کتے کو لات ماری۔ اپنی ماں کی عمر کی عورت سے دست درازی کی کوشش کی اور اس کی مزاحمت پر...''

میں بہت چیخا چلایا کیونکہ یہ سب سفید جھوٹ تھا۔ معلوم نہیں اچانک بڑھیا کو اس الزام تراشی کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی۔ اس نے میری ایک نہیں سنی۔ مجھے دھمکی دی کہ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرا دے گی اور مشورہ دیا کہ میں اس کے خلاف عدالت میں جاؤں... اور مجھے سامان اٹھانا پڑا۔

دوسری جگہ چند دن ہی گزرے تھے کہ مالک مکان آدھمکا جو بڑا خبیث صورت اور شیطان صفت گورا تھا۔ ''تم تو بڑے خطرناک ہو۔ میں نے بڑی غلطی کی تمہیں رکھ کے... میرے پاس ابھی تمہاری سابق لینڈ لیڈی کا فون

آیا تھا۔ مگر دیکھو، وہ بوڑھی عورت تھی۔ تمہیں عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ میں گولی مار کے لاش باہر پھینک دیتا ہوں۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ کیا شیطانی چکر ہے۔ میں نے نہیں پوچھا کہ اب تک کتنے کرائے داروں کو مارا ہے اور مزید کتنے مارو گے؟ کیا لندن پولیس نے تمہیں قتلِ عام کا لائسنس تاحیات جاری کر رکھا ہے؟ تاہم میں نے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ بصورتِ دیگر سابق مالک مکان کے ساتھ یہ خبیث بھی مل جائے گا اور دونوں میرے خلاف متحدہ محاذ کھول لیں گے پھر تیسرے کو شامل کریں گے اور میں دربدر ہو جاؤں گا۔

میں نے ایک وکیل سے بات کی تو پہلے اس کی فیس سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ وہ میرا ہم وطن بھی تھا لیکن خود کو اس کا گرامیں ثابت کرنے سے بھی کچھ نہ ہوا۔ دوسرا گورا وکیل نسبتاً معقول تھا۔ اس نے سمجھایا کہ صلح کر لو ورنہ تم غیر ملکی اور ناپسندیدہ ہو۔ مقامی لوگوں نے بدبختی سے تمہارے خلاف محاذ قائم کر لیا تو انجام برا ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا... میرے خلاف ایک شخص نے مار پیٹ کا مقدمہ درج کرایا جسے میں نے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں تھا مگر میرا سابقہ ریکارڈ جج نے ضرور دیکھا۔

یہ خرابی کی انتہا نہیں تھی۔ میرے خلاف ایک شکایت درج کرائی گئی کہ میں ڈرگز استعمال کرتا ہوں اور غالباً اپنے ملک سے منگوا کے سپلائی بھی کرتا ہوں۔ معلوم نہیں اس خطرناک سازش کے تانے بانے کس نے بنے تھے اور کیوں؟ لیکن ایک بات مشترک تھی۔ وہ میرے بارے میں تمام معلومات رکھتے تھے۔ میری گرفتاری ہوئی اور پولیس نے میری موجودگی میں میرے کمرے سے منشیات برآمد کر کے دکھا دیں۔ یہ سازش مکان مالک کی تھی ورنہ میرے کمرے میں گھس کے کون منشیات رکھ سکتا تھا۔ دوسری چابی صرف اس کے پاس تھی۔

حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قانونی معاملات طے ہوئے۔ مجھے صفائی کا گواہ نہ ملا۔ وکیل نے فیس لے کر صحیح وکالت نہیں کی اور آخر میں سوری کہہ کر بھاگ گیا کہ تمہارے کیس میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تمام قانونی حقوق رکھنے کے باوجود کچھ نہ کر سکا۔ برطانیہ کا نظامِ انصاف بہت مضبوط ہے اور کسی بھی بے گناہ کو سزا نہیں ہوتی مگر مخالف گواہ اور ثبوت کیسے مسترد کیے جا سکتے ہیں۔ انجام کار مجھے ڈی پورٹ کیا گیا۔ پولیس مجھے دست بستہ ائرپورٹ لے گئی اور پاکستانی جہاز پر باکمال لوگ لاجواب پرواز سے واپس پاکستان بھیج دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب رسوائی اور سزا کا دیسی مرحلہ شروع ہوگا جب ائرپورٹ پر مجھے ایکسائز اور کسٹم والے اپنی تحویل میں لیں گے کہ ذرا ہم بھی تو پوچھ گچھ کریں کہ تم نے جو کیا کیوں کیا... مگر خلافِ توقع ائرپورٹ پر دادا صاحب بنفسِ نفیس موجود تھے اور وہ انتہائی شفقت کے ساتھ مجھے گاڑی میں بٹھا کے گھر لے گئے۔ انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ ان کا حکم مانتے ہوئے میں کمال سعادت مندی سے واپس لوٹ آیا۔ کچھ اسی قسم کے جذبات کا اظہار میری ماں نے کیا۔ اسے بھی یقین تھا کہ اس کا ہونہار فرمانبردار سپوت واپس آگیا۔ نہ اپنے ساتھ کوئی میم لایا اور نہ میم کے ساتھ میم زادہ... کسی نے نہیں کہا کہ جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔

میں نے انہیں لندن کے قانونی مسائل سے بالکل بے خبر رکھا تھا لیکن اپنی آمد کی اطلاع ضرور کر دی تھی چنانچہ ان کے نیک جذبات میں حیرت کی بات کوئی نہ تھی۔ لیکن چور میرے دل کے اندر تھا جو بار بار پوچھتا تھا کہ کیا واقعی کسی کو کچھ پتا نہیں؟

دادا صاحب نے تقسیم کے بعد جہاں اپنا گھر بنایا تھا، وہ جگہ شہر سے باہر تھی۔ وقت کے ساتھ جو باہر ہے، وہ اندر آجاتا ہے۔ ماڈل ٹاؤن آج بھی لاہور کا خوب صورت پوش اور پُرسکون علاقہ شمار ہوتا تھا۔ یہاں پرانی وضع کی وسیع و عریض کوٹھیوں کے گرد پرانے درخت سایہ فگن تھے اور دادا صاحب کی کوٹھی بھی قدامت اور روایت کا خوب صورت نمونہ تھی۔

میں لندن کی تنگ فضا اور چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہا تھا۔ اب مجھے اس لق و دق کوٹھی کی خاموشی اور ویرانی سے وحشت ہوتی تھی جہاں سکون بھی جمود محسوس ہوتا تھا۔ نوکر چاکر خاموشی سے دبے پاؤں ادھر ادھر آتے جاتے تھے اور سارے کام جیسے خود بخود ہو جاتے تھے۔ کوٹھی میں فالتو کمرے فالتو اسباب سے بھرے پڑے تھے۔ فانوس پردے سب پرانے تھے۔ گھر کے مالک بالکل فارغ اور بیکار نظر آتے تھے۔ دادا صاحب کا زیادہ وقت اپنی لائبریری میں گزرتا تھا۔ لاؤنج میں ٹی وی اماں کے سامنے رکھا رہتا تھا اور اماں ٹی وی کے سامنے۔ پتا نہیں کون کسے دیکھتا تھا؟

لندن میں زندگی بہت مصروف اور تگ و دو والی تھی۔ صبح اٹھ کے ناشتا خود بنانا، کپڑے خود استری کر کے دفتر پہنچنے

کا مرحلہ طے کرنا پھرتی اور مستعدی مانگتا تھا۔ دن بھر دفتر میں بمشکل تمام لنچ کا وقفہ ملتا تھا۔ پھر شام کو گھر واپسی زیادہ مشکل تھی۔ صبح میں فریش ہوتا تھا اور کام پر جانے والوں کے الگ الگ اوقات تھے۔ شام کو واپسی کا رش ایک دم پڑتا تھا۔ اس معمول سے الگ ویک اینڈ تھا جس میں تفریح بھی مہنگی اور مشکل تھی اور میں نے بھی اپنی تفریح کو کورٹ شپ تک محدود کر رکھا تھا۔ ہر ڈیٹ ایک ایڈونچر تھی۔ سیٹرڈے نائٹ اسپیشل تھی اور اس میں دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی والا معاملہ تھا۔ لڑکیاں بھی فارغ وقت گھر پر سونے یا آخرت سنوارنے کی فکر میں نہیں گزارتی تھیں۔ انہیں بھی یہی ہیجانی تفریح درکار تھی۔

یہاں مجھے یوں لگا کہ میں بیکار اور بے مصرف ہو گیا۔ اب کیا کروں... کہاں جاؤں... کس سے ملوں؟ راہ چلتے دل لگانے کا کوئی تصور نہیں۔ کرو تو باقاعدہ محبت کرو... پاکیزہ محبت کرو اور نبھاؤ۔ ابھی تو میرے لیے وہ بھی نہ تھی۔ کچھ پرانے یار دوست تلاش کیے تو مایوسی ہوئی۔ وہ بیوی کی تحویل میں دے دیے گئے تھے یا ہجرت کر گئے تھے۔ میں گاڑی میں جاتا تھا اور ادھر اُدھر جھک مار کے لوٹ آتا تھا۔ مریم کا خیال اپنی جگہ تھا لیکن اب وہ خیال و خواب سے پرے کی بات ہو گئی تھی۔

میں نے سوچا کہ اب مجھے کوئی کام کرنا چاہیے۔ کوئی کام جو مجھے اچھا لگے اور شایانِ شان ہو۔ نوکری کے لیے درخواست لیے پھرنا مجھے منظور نہ تھا کیونکہ میرے جیسوں کو شاید کلرکی بھی نہ ملتی۔ میرے پاس ایسی کوئی پیشہ ورانہ ڈگری نہیں تھی، نہ کسی خاص شعبے کا تجربہ... چنانچہ میں بزنس ہی کر سکتا تھا۔

اپنا مسئلہ میں نے دادا صاحب کے سامنے رکھا تو انہوں نے کتاب رکھ کے عینک ہٹائی اور بولے۔ ”جوان آدمی کو کچھ کرنا ضرور چاہیے۔“

”اگر میں بزنس کرنا چاہوں؟“

”ضرور کرو... اس میں محنت بھی ہے اور چیلنج بھی۔“

”لیکن دادا صاحب! مجھے کسی بزنس کا تجربہ نہیں۔“ میں نے کہا۔

”تجربہ تو آتا ہے۔ آدمی شادی کرتا ہے تو کون سا شادی کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ ایک کروڑ کی آبادی کا شہر ہر طرح کے بزنس کے لیے سوٹ کرتا ہے۔ تم دیکھو، جائزہ لو پھر بتاؤ۔“

میں نے مایوسی سے کہا۔ ”آپ گائڈ نہیں کریں گے؟“

”گائڈ ہی کر رہا ہوں۔ خود میں تو تھا ملازمت پیشہ آدمی۔ دنیا گھوم کے دیکھی تو پتا چلا کہ ہم تو کنوئیں کے مینڈک ہیں۔ تم ولایت میں پڑھنے گئے تھے۔ پڑھا تو خاک بھی نہیں، تجربہ تو حاصل کیا ہوگا۔ دیکھو یہاں کیا کر سکتے ہو اور کم سے کم کتنا سرمایہ چاہیے ڈبونے کے لیے؟“

”ڈبونے کے لیے... دادا صاحب! آدمی بزنس کرتا ہے منافع کے لیے۔“

”ہاں مگر نفع کمانا آتا ہے نقصان اٹھا کے... جوتے بیچو گے؟“

میں چونک پڑا۔ یوں جیسے دادا صاحب نے کہا ہو کہ جوتے کھاؤ گے۔ میں نے غوں غاں کر کے کہا۔ ”بزنس تو یہ بھی ہے۔“

”اچھا میرے ایک دوست ہیں میوہ شاہ کے قبرستان میں... مزنگ کی طرف سے جائیں تو سیدھے ہاتھ پر دوسرے راستے سے چند قدم کے فاصلے پر ہے ان کی قبر... ان کا یہی بزنس ہے۔“

”وہ قبرستان میں جوتے بیچتے ہیں... مُردوں کو؟“

دادا صاحب نے غرا کے کہا۔ ”پاگل کے بچے، ان کا بزنس اب ان کا بیٹا چلا رہا ہے۔ مجھے انکل کہتا ہے۔ گلبرگ میں دکان بھی ہے اور رہائش بھی۔ اس سے مل لو۔ ان کے بہت سے بزنس ہیں... فرنیچر، ہارڈ ویئر، آٹو پارٹس... اس کے بھائی، بہنوئی، کزن سب کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ وہ تمہیں ان سے بھی ملوا سکتا ہے۔ سنا ہے اس نے کوئی رئیل اسٹیٹ میں بھی ہاتھ ڈالا ہے... کنسٹرکشن وغیرہ۔“

”دادا صاحب! آپ سرکاری ملازم تھے۔ اس میں یہ سب کیسے کر لیا آپ نے؟“

”ابے گدھے... سرکاری ملازمت تو ہوتی ہے سونے کی کان... مجھے مل گئی تھی۔ گوروں کے زمانے میں تو نہیں... لیکن ان کے جانے کے بعد تو بہتی گنگا تھی، سب ہاتھ دھو رہے تھے۔ میں نے اشنان کیا۔“

میں جانتا تھا کہ دادا صاحب حد درجہ صاف گو بلکہ خاصے منہ پھٹ ہیں اور کسی کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر منہ پر وہ کہہ دیتے ہیں جو سچ ہو۔ ظاہر ہے سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن ان کے نزدیک مصلحت سے کام لینا منافقت کا دوسرا نام تھا۔ اسی لیے ان کی نہ رشتے داروں سے بنی نہ کسی اور سے۔ یہ ایک دوست نہ جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ ان کی عمر نوے برس ہو گئی تھی مگر وہ ذہنی طور پر سو فیصد فٹ تھے تو

جسمانی طور پر بھی اپنی عمر کے اعتبار سے اچھے تھے۔ یہ سچ انہوں نے بلاتکلف پہلے بھی بولا تھا کہ ان کی ساری کمائی حرام کی ہے۔ جب خوفِ خدا نہیں تھا تو خوفِ خلق کی کیا حیثیت ہے۔

دوسری بات جو میں جانتا تھا اور مجھے بُری بھی لگتی تھی، وہ میرے مرحوم باپ کے بارے میں ان کا جارحانہ رویہ تھا۔ وہ اکلوتی اولاد تھی جس کے بارے میں ان کے جذبات میں اپنایت کی جگہ کچھ عناد کا پہلو نمایاں رہتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ کسی نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا۔ وہ برہمی سے کہتے تھے کہ اب جو مر گیا اس کے بارے میں جان کے کیا کرے گا تو... مقبرہ بنوائے گا اس کا جہانگیر جیسا...

شوہر کے ذکر پر ماں آزردہ ہو جاتی تھی لیکن بتاتی کچھ نہیں تھی۔ ”دادا صاحب جو بتاتے ہیں، وہی ٹھیک ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے ماں... آخر وہ کتنا عرصہ رہے تمہارے ساتھ؟“

”بتایا تو تھا کہ بہت تھوڑے دن۔“

”اور انتقال کیسے ہوا تھا ان کا؟“

”جیسے سب کا ہوتا ہے۔ کیا فرق پڑے گا اگر میں کہوں کہ بیماری سے یا حادثے میں... کیوں کرتا ہے مجھ سے یہ باتیں؟ کیا تو نہیں جانتا کہ مجھے اچھا نہیں لگتا؟“ ان کا چہرہ دکھی ہو جاتا۔

اس کے بعد میں خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ دادا اپنے اکلوتے بیٹے کا ذکر میرے نام کے ساتھ بھی ایسے ہی کرتے تھے۔ گدھے کے بچے... سور کے بچے... کتے کے بچے... الو کے پٹھے... خبیث... بدمعاش... نامعقول وغیرہ بھی کہہ سکتے تھے مگر حوالہ میرے باپ کی طرف جاتا تھا۔ اس سے ان کی نفرت کا اندازہ ہوتا تھا۔

ماں کے پاس میرے باپ کی کوئی تصویر نہ تھی۔ شادی کی بھی نہیں۔ گھر میں ان کا ذکر بھی جیسے ناپسندیدہ موضوع اور ممنوع تھا۔ چھوٹا تھا تو میں ضد یا غیر معمولی تجسس کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرتا تھا لیکن دل میں یہ ارادہ ضرور رکھتا تھا کہ اس راز پر سے پردہ ضرور اٹھاؤں گا کہ آخر ایسا کیوں تھا؟ مجھے شک ہوتا تھا کہ وہ مرے نہیں یا طبعی موت نہیں مرے۔ دادا آج بھی بڑے دبنگ اور ہٹلر ٹائپ آدمی تھے۔ جوانی میں یا تیس چالیس سال قبل نہ جانے کیا ہوں گے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی بات پر مشتعل ہو کے خود انہوں نے بیٹے کو مار دیا ہو؟ اور ماں اب تک سچ بولتے ہوئے ڈرتی ہو۔

وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ وضع دار اور انسانیت پرست۔ نوکروں کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی مہربانی اور فیاضی کا رہتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سارے نوکر اس گھر میں میری پیدائش کے وقت سے تھے۔ انہوں نے بی اے، ایم اے تو نہیں کیا تھا مگر دوسرے بہت سے امتحان پاس کیے تھے جو اردو، فارسی اور عربی میں ان کی دسترس کا ثبوت تھے۔ وہ کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کے شوقین تھے چنانچہ ایک ہال جیسے کمرے میں چھت تک بنی الماریوں میں ہزاروں کتابیں بھری پڑی تھیں۔

سرِدست میرا مسئلہ مصروفیت کی تلاش تھا۔ اگر میں بزنس میں دادا صاحب کی سپورٹ حاصل کرتا تو پھر مجھے کامیاب ہو کے ہی دکھانا تھا اور میرا خیال تھا کہ کوئی لائن مل جائے تو میں محنت اور ذہانت سے آگے بڑھ سکتا ہوں۔ اس سے مصروفیت کے علاوہ میرا سوشل سرکل بدلے گا۔ کامیاب اور خوش حال لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہوگا تو مجھے تعلقات استوار کرنے کے مواقع ملیں گے۔ میری شام کسی ہوٹل یا کلب میں بسر ہوگی اور وہاں دل لگی کے ساتھ دل لگانے کے مواقع ملیں گے۔

گلبرگ کا پتا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے ولایت کی عادت کے مطابق فون کر کے وقت، ملاقات اور اپنی آمد کا مقصد بتا دیا تھا۔ اعجاز نے کہا کہ وہ آٹھ بجے تک دکان بند کر دیتے ہیں اور نو بجے گھر پہنچ کے رات کا کھانا فیملی کے ساتھ ضرور کھاتے ہیں۔ آج میں انہی کے ساتھ ڈنر کروں۔ اس خوب صورت سجے سجائے گھر میں ایک اعجاز کی ماں تھی۔ دوسری اس کی بے حد پھوس دادی جو دادا صاحب کی ہم عمر ہوگی لیکن وہ سیدھا چلتی تھی۔ صاف دیکھتی تھی اور صحیح سنتی تھی۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ اس کی یادداشت میں بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اعجاز کی بیوی خوش اخلاق عورت تھی اور ان کے دونوں بچے روایتی انداز کے بندر تھے، ماں باپ کے اشاروں پر چلنے والے۔ سلام کرو... ہاتھ ملاؤ... فلاں پوئم سناؤ... پرفارمنس دے کر وہ پھر بچے بن گئے اور کھانے کی میز پر انہوں نے خوب اودھم مچایا۔ ان کی ماں بلاوجہ بچوں کی بدتمیزی پر شرمسار رہی۔

کھانے سے فراغت ہوئی تو کام کی بات ہوئی۔

”ہاں، دادا صاحب میرے دادا کے فرینڈ تھے۔ پتا نہیں کیوں... انہیں ایک دوسرے کا دشمن ہونا چاہیے تھا۔ دادی بتاتی ہیں کہ ملتے تھے صرف لڑنے کے لیے مگر ملے بغیر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ دونوں ایک سکّے کے دو رخ تھے۔“

”دادا صاحب کا دوست ہونا دل گردے کا کام ہے۔“

”پھر بھی... وہ ہیرا ہیں ہیرا... جو خالص کاربن ہوتا ہے۔ وہ خالص سچے اور کھرے آدمی ہیں۔ یہ خوبی کے بجائے ان کی خامی شمار ہو رہی ہے۔“

”وہ حد سے زیادہ منہ پھٹ ہیں۔ ہر جگہ اتنا سچ بول کے وہ پتا نہیں کیسے چل رہے ہیں؟“

”ان کا سچ بعض اوقات خطرناک ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب وہ سیاست سے ہٹ کر مذہب پر آتے ہیں۔ مجھے بتا رہے تھے کہ میری سب حرام کی کمائی ہے۔“

”یہی میرے دادا کہتے تھے۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں کہاں ساتھ رہے۔ ایک دوسرے کا کچا چٹھا جانتے تھے۔ پھر انہوں نے میرے والد کو بزنس کرا دیا۔ اب دیکھ لو، اچھی گزر رہی ہے۔ ایک بھائی کا فرنیچر کا بزنس ہے گجرات میں... بائی پاس پر اس نے نیا شوروم بنوایا ہے۔ وہ سب ایکسپورٹ کرتا ہے یا پھر مخصوص طبقے کو بنا کر دیتا ہے۔ بہت مہنگا ہوتا ہے اس کا فرنیچر... سب سے چھوٹے کا آٹو پارٹس کا بزنس ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یو آر لکی... میرے والد تو مر گئے تھے میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی...“

اس نے مجھے نظر اٹھا کے عجیب سی نظر سے دیکھا اور قدرے تامل کے ساتھ بولا۔ ”ہیں، میں نے بھی یہی سنا ہے۔“

ہم نے کافی دیر بات کی جس میں تمام معاملات ڈسکس ہوئے۔ اعجاز اچھا بزنس مین ہی نہیں، اچھا آدمی بھی تھا۔ اس نے مجھے اگلے دن لبرٹی مارکیٹ میں اپنی دکان پر بلایا کیونکہ وہاں اس کے بہنوئی کو آنا تھا۔ وہ رئیل اسٹیٹ میں ڈیل کرتا تھا اور اب کنسٹرکشن کی طرف آ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے تینوں بھائیوں کے بزنس سے زیادہ رئیل اسٹیٹ میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ یہ پی آر کا بھی کام تھا اور اس میں فائدہ محدود نہیں تھا۔ بہت کچھ قسمت کی یاوری پر بھی منحصر تھا۔ کسی بے وقوف سے سستی پراپرٹی مل جائے، دوسرے بے وقوف گاہک سے اس کی اچھی قیمت تو وارے نیارے... اور طے شدہ طور پر دنیا میں بے وقوف واضح اکثریت میں ہیں جو چھوٹی اقلیت کو کامیاب بناتے ہیں۔ خواہ وہ بزنس مین ہوں... یا سیاست داں...

غلطی یہ ہوئی کہ میں نے وقتِ ملاقات طے نہیں کیا تھا۔ اعجاز نے کہا تھا کہ جب چاہو آ جاؤ۔ میں یہ بھول گیا کہ لبرٹی جیسی مارکیٹ میں بارہ بجے سے پہلے کوئی دکان نہیں کھولتا۔ لندن میں مارکیٹ صبح سویرے کھلتی تھی اور سرِشام بند ہو جاتی تھی۔ دنیا کا یہی قاعدہ تھا۔ جب میں مارکیٹ پہنچا تو عجیب ہو کا عالم تھا۔ اکا دکا دکاندار شٹر اٹھا رہے تھے۔

میں گاڑی میں جا بیٹھا اور وہاں بیٹھ کے انتظار کرنے کے بجائے کسی ریسٹورنٹ کی تلاش میں نکل گیا جہاں مجھے ایک کپ کافی مل جائے۔ ایک گھنٹا گزار کے میں پھر آیا تو ساری مارکیٹ کو کھلا دیکھ کے حیران ہوا۔ اب دکانوں کے سامنے پارکنگ بھی مشکل سے ملی۔ گاہک بھی اچانک ہی امڈ آئے تھے۔ میں گاڑی کو کچھ فاصلے پر کھڑی کر کے اترا ہی تھا کہ جیسے ایٹمی دھماکا ہو گیا۔

یہ اس قسم کا کوئی دھماکا نہیں تھا جس کی بریکنگ نیوز ہر وقت ہر چینل پر دیکھی جا سکتی تھی۔ مریم اچانک کسی گاڑی سے اتری اور سیدھی ایک پانچ منزلہ شاپنگ پلازا میں چلی گئی۔ ”مریم۔“ میں دیوانہ وار چلایا اور بھاگا۔ میری نظریں خیرہ ہو گئیں اور عقل خبط ہو گئی تھی چنانچہ میں نے راستے کی کسی رکاوٹ کو نہیں دیکھا۔ میں ازار بند اور سن گلاسز بیچنے والے ایک نوجوان سے ٹکرا گیا اور اسے فٹ پاتھ پر چت کر دیا۔ میں خود بھی گرا اور اٹھ کے پھر بھاگنا چاہتا تھا کہ تصادم سے متاثر ہونے والے شخص نے مجھے پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ مصنوعی جیولری کا خوانچہ فٹ پاتھ پر رکھنے والا شخص بھی شامل ہو گیا کیونکہ اس کا سامانِ تجارت بھی فٹ پاتھ پر بکھر گیا تھا۔

دیگر فٹ پاتھ پر بزنس کرنے والوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے نقصان کی تلافی کروں، ورنہ غیر قانونی ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤں۔ رائے عامہ بھی میرے خلاف تھی۔ پھر ایک بھتا وصول کرنے والا پولیس مین بھی آ گیا اور اس نے کہا کہ جناب اس غریب کا نقصان تو آپ کو پورا کرنا پڑے گا ورنہ قانونی ایکشن ہوگا۔

میں مریم مریم چلاتا ہوا بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں نے جیب سے سارے نوٹ نکالے اور انہیں تھما دیے۔ شاید وہ رقم بہت زیادہ تھی لیکن مجھے گننے کی اور حساب کرنے کی فرصت کہاں تھی۔ میں پھر بھاگا تو بہت سی نظریں مختلف سوال کر رہی تھیں کہ کیا یہ بندہ پاگل ہے؟ کوئی جان کا دشمن پیچھے لگا ہوا ہے یا پولیس؟ لگتا تو نہیں تھا مگر نشے میں تھا وہ... یا خود کسی کے پیچھے دوڑا تھا؟ میں بغیر بریک والی گاڑی کی طرح شاپنگ مال میں گھسا۔ ہر گلی سے گزرا اور ہر دکان میں جھانک کر دیکھتا رہا۔ وہ کہیں بھی نہ تھی۔ ایک جگہ چار چھ

خواتین کی پشت میری طرف تھی اور مجھے ایک پر شک گزرا کہ وہ مریم ہے۔ میں وحشت زدہ اندر گیا تو اس نے بھی پلٹ کر دیکھا لیکن اس سے پہلے ایک سیلز مین نے پوچھ لیا۔ ”کسے دیکھ رہے ہیں سر؟“

میں نے کہا۔ ”مریم... مریم تو نہیں آئی یہاں پر؟“ اور پھر باہر نکل گیا۔ ایک خاتون کا پُردرد تبصرہ میں نے سنا۔ ”ہائے کیا حال ہوتا ہے باپ کا بچی آگے پیچھے ہو جائے تو...“ فرسٹ فلور سے میں زینے کے راستے سیکنڈ پر گیا مگر سوچتا رہا کہ وہ لفٹ سے اتر گئی پھر؟ اب میں نے خود کو تھوڑا سا کنٹرول کر لیا تھا۔ میں نے اسی ترتیب کی مارکیٹ کے ہر فلور کی ہر دکان دیکھی۔ اوپر رش کم ہوتا گیا۔ مریم مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے سب سے اوپر بنے ہوئے فوڈ کورٹ میں ہر میز پر بیٹھے حضرات وخواتین کی شکلوں پر غور کیا۔ کسی میں مریم کی شباہت تک نہ تھی۔

مایوس ہو کے میں لفٹ سے نیچے گیا تو میں نے لفٹ چلانے والے سے مریم کے بارے میں پوچھا۔ ”ابھی کوئی لڑکی اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر گئی ہوگی؟“

ایسا احمقانہ سوال اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا ہوگا، وہ بولا۔ ”تو لڑکیاں اوپر نیچے جاتی رہتی ہیں ہر وقت... مارکیٹ ہی عورتوں کی ہے۔“

میں نے مریم کے سراپا کا تھوڑا سا نقشہ کھینچ کے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پوری غزل بن گئی۔ وہ بیزاری سے بولا۔ ”سب ہی ایسی ہوتی ہیں جی۔“ تب تک گراؤنڈ فلور آ گیا تھا۔ میں مایوس تھا مگر نا امید نہیں۔ میں باہر آ کے گاڑیوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ انہی میں سے کوئی گاڑی اس کی ہوگی اور وہ لوٹ کے یہیں آئے گی۔ اس میں صبح سے شام ہو گئی۔ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں بریکٹ بن گئیں اور اردگرد کے پتھارے والے مجھے گھورنے لگے کہ بھائی کس کا انتظار کر رہے ہو آخر؟

شاید میں رات تک کھڑا رہتا لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اعجاز کا کسی کام سے گزر ہوا اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ ”ارے یوسف بھائی... لو... میں سارا دن دکان سے نہیں ہلا کہ آپ آؤ گے... آپ یہاں کھڑے ہو؟“

میں نے معذرت کی۔ ”وہ دراصل... امی کو بازار لانا تھا۔ وہ اوپر گئی ہیں۔ میں انشاء اللہ کل آؤں گا۔“

وہ جلدی میں تھا اس لیے ہاتھ ہلا کے چلا گیا۔ اب مجھے ہلنا پڑا۔ اندیشہ یہ تھا کہ اعجاز پھر گزرا اور اس نے مجھے وہیں کھڑا ہوا دیکھا... زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد... تو پتھارے دار بھی کہیں گے کہ یہ گل محمد تو ادھر گڑا ہوا ہے۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور دل شکستگی کے ساتھ ساتھ عشق کی نئی ڈوز کے نشے سے سرشار اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ فریب نظر نہیں تھا۔ مریم جو لندن میں کھو گئی تھی، لاہور میں مل گئی ہے۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پاکستان کو بہت مس کرتی ہے اور اسے مری، سوات، کاغان بہت یاد آتے ہیں۔ سیزن ہوتا تو میں مری کے کوہساروں سے لے کر بازاروں کی فیشن پریڈ میں شریک ایک ایک لڑکی میں مریم کو تلاش کرنے جاتا لیکن ان دنوں وہ سب ”شمالی علاقے“ ویران تھے جو موسم گرما میں ملک بھر کے سیاحوں کو کھینچ لیتے تھے۔ وہ لاہور میں ہی تھی۔ تاہم لندن کے مقابلے میں لاہور کوئی پنڈ نہیں تھا۔ یہ بھی ایک کروڑ کی آبادی والا شہر تھا۔

اچانک گاڑی نے نزع کی ہچکی لی اور اس کا انجن دم توڑ گیا۔ دیکھا تو فیول میٹر کی سوئی زیرو سے بھی نیچے تھی اور نہ جانے کب سے تھی۔ میرے جذبۂ عشق کی گرمی یا حرارت ایمانی سے گاڑی نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ پیٹرول لوں تو یاد آیا کہ جیب خالی ہے۔ سینگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔ وہ بھی سو گز تک گاڑی کو دھکیل کر لے جانے کے بعد مگر اس نیک کام میں دو نوجوانوں نے فی سبیل اللہ میری مدد کی۔ ابھی میں نے ان کے حق میں جزائے خیر کی دعا کر کے شکریہ ادا کیا ہی تھا کہ انہوں نے پوچھ لیا کہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟

”ماڈل ٹاؤن کی طرف۔“ میں نے کہا اور پھر کیشیئر سے جھوٹ بولا۔ ”میری جیب کٹ گئی ہے چنانچہ وہ صرف پانچ سو روپے کا پیٹرول ڈال دے تو میں اپنا موبائل فون یا گھڑی اس کے پاس چھوڑ جاؤں گا اور کل پیسے دے کر واپس لے لوں گا۔ گھر پر صرف میرے بوڑھے دادا ہیں جو یہاں پیسے لے کر نہیں آ سکتے۔“

کیشیئر کا جواب سننے سے پہلے ایک نوجوان نے کہا۔ ”سر! آپ مجھ سے لے لیں پانچ سو۔“ اور فوراً پانچ سو مجھے تھما دیے۔

میں اس فرشتۂ غیب کا مزید احسان مند ہوا۔ ”میں ابھی تمہیں واپس کر دوں گا۔ کیا تم ادھر ہی جا رہے ہو؟“

”جی سر! ہمارا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔“ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ماڈل ٹاؤن شروع ہونے سے بہت پہلے ایک نے کہا۔ ”بس آپ یہاں گاڑی روک لیں۔“

رات کا وقت تھا اور وہ جگہ یوں سنسان لگ رہی تھی

کہ اسٹریٹ لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے تاریکی ہی تھی۔ میرے گاڑی روکنے کے باوجود کوئی نہ اترا تو میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے... تمہیں تو میرے ساتھ گھر جا کے پیسے لینے تھے؟“

”وہ ہم نے سوچا کہ یہیں وصول کر لیں۔“ ایک نے کہا۔

”یہاں؟ تم جانتے ہو میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ ایک نے بڑی پھرتی سے گاڑی کی چابی کھینچ لی۔ ”یہ موبائل تو ہے اور یہ گھڑی۔“ دوسرا بولا۔

موبائل فون میں نے لاہور پہنچ کے خریدا تھا اور خاصا مہنگا تھا۔ گھڑی میں نے لندن میں بڑے شوق سے لی تھی اور ایک ہزار پاؤنڈ کے یہاں ڈیڑھ لاکھ بنتے تھے۔ میں نے آگ بگولا ہو کے کہا۔ ”بدمعاش۔“

دوسرا لفظ میرے حلق میں پھنس گیا کیونکہ دوسرے نے خاموشی سے ریوالور نکال لیا تھا۔ ”ہم تمہاری گاڑی لے گئے تو نقصان زیادہ ہوگا۔ پیدل گھر جاؤ گے اور جب پولیس سے گاڑی ملے گی واپس تو اس کی صرف باڈی ٹھیک ہوگی۔ ٹائر، ڈیک، اے سی سب نہیں ہوں گے۔ اس میں دو چار مہینے لگیں گے اور دو چار ہزار خرچ بھی ہوں گے۔“

”اگر گاڑی مل گئی... تب۔“ دوسرے نے مجھے سمجھایا۔

میں نے ان کا مطالبہ پورا کر دیا اور گاڑی لے کر گھر چلا گیا۔ وہ مطمئن تھے کہ ان کا مطالبہ پورا ہوا۔ میں خوش تھا کہ جان بچ گئی۔ فہو المطلوب... میں نے پولیس میں رپورٹ نہیں لکھوائی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ پاکستان ہے لندن نہیں۔ کوئی میری رپورٹ تک نہیں لکھے گا۔ سو سوال الگ کریں گے۔ پتا چلے گا کہ میں ولایت پلٹ ہوں اور ماڈل ٹاؤن کا مکین تو سمجھ لیں گے کہ واہ مرغی موٹی ہے۔ سونے کا انڈا دے سکتی ہے۔ میں نے ماں سے یا دادا صاحب سے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ دادا صاحب کے سوالات زیادہ مشکل ہوتے۔ بعد میں یہ ایک غلطی ثابت ہوا۔

یہ سب مریم کی وجہ سے ہوا تھا بلکہ اس عشق کی وجہ سے جو میں غائبانہ طور پر مریم سے کر رہا تھا۔ اسے تو پتا بھی نہیں تھا کہ میرا کوئی مجنوں ہے جس کے جذبۂ عشق کی بلاخیزی نے مجنوں کی روح کو شرمسار کر دیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وقت نے مریم کے خیال کو شعور سے نکال کے لاشعور کے تہ خانے میں ڈال دیا ہے جہاں یادوں کی ان گنت تصویریں یوں رہتی ہیں جیسے ماضی کے قبرستان میں... وقت نامعلوم طریقے پر ان کو مٹاتا رہتا ہے۔ ان پر بے خیالی کی گرد ڈالتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مزید گہرائی میں غائب ہو جاتی ہیں جسے تحت الشعور کہتے ہیں اور یاد کرنے پر بھی فوراً یاد نہیں آتا کہ اس پر کس کا نام تھا۔

میرا یہ خیال ایک واہمہ ثابت ہوا تھا۔ سات سمندر پار کر کے وہ لاہور میں یوں نمودار ہوئی تھی جیسے لندن میں نظر آئی تھی۔ لیکن میں اسے واہمہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ زندہ جیتی جاگتی لڑکی سو فیصد مریم اور مریم کے سوا کوئی نہ تھی۔ بے شک وہ مجھے ملی نہیں تھی لیکن ایک بار پھر میرا یقین بحال ہو گیا تھا کہ وہ ملے گی۔ غالباً یہ تقدیر کا فیصلہ ہے اور مشیت ایزدی ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

اب کہاں وہ جوتے بیچنے یا دیواریں کھڑی کرنے کا بزنس۔ میں نئے سرے سے مریم کی لاہور میں تلاش کے منصوبے بنانے لگا تھا۔ یہاں وہ سب ممکن تھا جو لندن میں ناممکن تھا۔ میں واقعی کو چی سفیدی اور سیاہی لے کر نکلتا تو صبح تک لاہور کی دیواروں پر حکیموں اور عامل طوطا چشم بنگالی سے شاہ جی بغداد والے تک جو محبوب کو جنات کی مدد سے آپ کے قدموں لا گراتے ہیں، ان کے اشتہاروں کی جگہ مریم کا نام لکھا نظر آتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسی روز دادا صاحب، پولیس اور کارپوریشن والے مل کر مجھے پاگل خانے پہنچا دیتے۔

چھٹے دن میری پیشی دادا صاحب کے سامنے ہوئی۔ ”یہ کیا ڈراما چل رہا ہے گھر میں؟“

میں نے سادگی سے کہا۔ ”اماں کو پتا ہوگا... ڈرامے وہی دیکھتی ہیں ٹی وی پر۔“

”اماں نے ہی ایف آئی آر لکھوائی ہے۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے... کسی سے بات نہیں کرتا... کمرے سے نہیں نکلتا... یہ شیو نہیں بنائی ہے، کیا داڑھی رکھ کے کسی مسجد کی امامت کے لیے... منہ کب دھویا تھا؟ ابھی اعجاز کا فون آیا کہ تم اس سے پھر نہیں ملے۔“

میں نے مردہ آواز میں کہا۔ ”جی... ملوں گا۔“

”ابھی تو میرے ساتھ چلو ڈاکٹر کی طرف... تمہیں اندر باہر سے دیکھے کہ خرابی کہاں ہے... دماغ میں یا کہیں اور... دماغ تو میں درست کر دوں گا۔“

انکار یا بحث سے کچھ حاصل نہ تھا۔ مجھے چیک اپ کے لیے جانا پڑا۔ دو تین ڈاکٹروں نے ایکسرے جیسے آلات سے میرے دل میں جھانکا اور سی ٹی اسکین سے دماغ میں لیکن مریم کے عشق یا کسی دوسری جان لیوا بیماری کا سراغ

نہ ملا اور انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ مریض تو ہم سے بھی زیادہ فٹ ہے۔ واپس آنے کے بعد دادا صاحب نے مجھے انسان کا بچہ بن جانے کے لیے صرف ایک گھنٹا دیا اور پھر کھانے کی میز پر حاضر ہونے کا نادر شاہی حکم جاری کر دیا۔ شیف نے جو خانساماں کہنے پر رونے کے قریب ہو جاتا تھا، مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کھاؤں گا۔

میں نے بھنا کے کہا۔ ”خونِ دل پینے کو اور زخم جگر کھانے کو... یہ سزا ملتی ہے مریم ترے دیوانے کو۔“ لیلیٰ کی جگہ مریم کا نام خود ہی آ گیا تھا۔

وہ بھونچکارہ گیا۔ ”یہ دادا صاحب کا حکم تھا۔“

”حکم نہیں، ان کی دادا گیری... بناؤ میرے دل کا باربی کیو اور جگر کے تکے... دادا صاحب کے سری پائے پکاؤ یا مغز فرائی کرو جو میرے پاس تو ہے نہیں۔“

وہ پریشان لوٹ گیا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ میں ولایت سے آیا ہوں شرابی تو یقیناً تھا۔ آج کچھ اور بھی کھا گیا مثلاً بھنگ... تاہم اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ دادا صاحب کو ایسی بریکنگ نیوز دیتا کہ سر آپ کے پوتے کا دماغ چل گیا... بلکہ دوڑ گیا۔ اس نے میری ماں کو رپورٹ دی جو مجھ سے بھی زیادہ مظلوم اور لاچار نظر آنے والی مخلوق تھیں۔ میں نے دادا صاحب کے سامنے ڈٹ کے کھایا اور خوب باتیں کرتا رہا۔ ہنس ہنس کے انہیں لندن کے قصے سناتا رہا۔ وہ مجھے مشکوک نظروں سے گھورتے رہے۔ اب شاید انہیں شک ہو گیا تھا کہ میں دہری شخصیت کا کیس بن گیا ہوں۔ اسپلٹ پرسنالٹی۔

اور میں نے دو چار دن یہ ڈبل رول کیا۔ میں اعجاز سے بھی ملا اور اس سے ایسے بزنس پلان ڈسکس کیے کہ وہ چکرا گیا۔ مثلاً میں نے کہا کہ لیلیٰ مجنوں رنگین اور تھری ڈی میں بنائی جائے تو سپر ڈوپر ہٹ ہوگی یا اپنی یادگار پاکستان کو گرا کے اس کی جگہ ایفل ٹاور کھڑا کیا جائے اصل سے بھی اونچا، دنیا بھر کے ٹورسٹ آئیں گے وہاں... ذرا سوچیں کتنا زرمبادلہ آئے گا اور اس پروجیکٹ کے لیے تو کیپٹل بھی فراہم ہو جائے گا دبئی سے۔ وہ وہاں تاج محل بنانا چاہتے ہیں۔ ان سے کہیں گے کہ ایک ایفل ٹاور کو یہاں اسپانسر کر دیں، آخر برادر اسلامی ملک ہے۔

اعجاز طے نہ کر پایا کہ میں کس حد تک سیریس تھا لیکن اس نے میرے جیسے ہوائی قلعے بنانے والے کے ساتھ شراکت سے معذوری ظاہر کر دی۔ یہی نہیں اس نے سیکرٹ رپورٹ دادا صاحب کو بھی دی کہ میرا ذہن بالکل کاروباری اور پریکٹیکل نہیں ہے۔ اب میرا زیادہ وقت لبرٹی میں گشت کرتے گزرتا تھا۔ خصوصاً اس پلازا میں جہاں میں نے مریم کو دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شاپنگ کے لیے یہاں آتی ہو گی تو ہفتہ دس دن میں پھر نظر آ جائے گی۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ فٹ پاتھ پر پتھارے والے مجھے پہچان گئے تھے۔ چند دن اوپر پھرا تو دکاندار بھی شک میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے بلاوجہ خریداری کی۔ کبھی یہاں سے ایک سوٹ لے لیا تو کبھی وہاں سے... یہ زنانہ سوٹ میں نے اپنی ماں کو پیش کیے تو وہ پریشان ہو گئی کیونکہ وہ بہت سادہ لباس پہنتی تھی اور بہت ہلکے رنگوں والے... میں نے شوخ رنگ منتخب کیے تھے اور وہ سب بہت قیمتی جوڑے تھے۔

”یہ سب کس کے لیے کر رہا ہے تو؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارے لیے ماں۔“

”مجھے دیکھا ہے کبھی ایسے کپڑے پہنتے... دادا صاحب کو پتا چلا تو...“

”تو کیا کریں گے وہ؟ توپ دم کر دیں گے مجھے... ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈلوا دیں گے؟“

ماں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”آہستہ بول۔“

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”اچھا ماں! ان سے کہنا کہ میں اپنی بہو کے لیے لا رہی ہوں... منگوا رہی ہوں۔“

ماں کا چہرہ روشن ہو گیا۔ ”مجھے بتا کون ہے وہ؟ میں کرتی ہوں آج ہی بات دادا صاحب سے۔“

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”ابھی میں کیا بتاؤں ماں... کوئی ہو تو بتاؤں۔“

”اچھا تو میں تلاش کروں۔ دو ہیں میری نظر میں لیکن میں انتظار کر رہی تھی کہ تو خود کسی کا نام لے۔“

میں نے گھبرا کے کہا۔ ”میرا مطلب تھا تو تیاری کر... نام میں بتا دوں گا مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تم دادا صاحب سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ وہ سسر ہیں تمہارے مانا، ان کا احترام اپنی جگہ... لیکن یہ دہشت کیسی ان کی دادا گیری کی؟“

ماں نے دروازہ بند کر دیا۔ ”تو پاگل ہو گیا ہے؟“

”ہاں، میں یہ دادا گیری برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں میرے ساتھ؟ دادا تو بہت محبت کرتے ہیں پوتوں سے... دیوانے ہوتے ہیں ان کے... یہ تو مجھے پاگل کر رہے ہیں۔“

”یوسف! مت کر ایسی باتیں... تو کچھ نہیں جانتا اور نہ جانے تو اچھا ہے۔“ ماں خود بخود گر کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”تو نے شیف سے بھی الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔ اس نے بتایا مجھے۔“

میں ماں کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ”اسے کہا ہو گا آپ نے کہ دادا صاحب کو نہ بتائے۔“

ماں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ”اور کیا کرتی... تو جانتا نہیں یہ کیسے لوگ ہیں۔“

”کون لوگ کیسے ہیں؟“ میرا ماتھا ٹھنکا۔

”یہی جو یہاں کام کرتے ہیں۔ چوکیدار، مالی، شیف، شوفر اور دوسرے سارے۔“

میں نے غور سے ماں کو دیکھا۔ ”نوکر صرف نوکر ہوتے ہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ نوکر نہیں ہیں۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”پھر کون ہیں... مریخ کی مخلوق... جن؟“

”پھر بتاؤں گی تجھے... ابھی چل کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔“

کھانے کے دوران میں خاموش رہا۔ میرے دماغ میں ماں کی باتوں سے خیالات کی خانہ جنگی چل رہی تھی۔ سوال تھے جو باغیوں کی طرح سرکشی پہ مائل تھے۔ تجسس تھا جو باغی خیالات کو اکساتا تھا اور ہمت تھی جو باغی لشکر کو طاقت اور اسلحہ دے رہی تھی۔ دوسری طرف ماں کا خاموش چہرہ التجا کرتا محسوس ہوتا تھا کہ میں سارے سوالوں کی سپاہ کو روکے رکھوں۔ جو اس کوٹھی کے ماحول کا حصہ تھیں، وہی باتیں آج مجھے پراسرار اور غیر معمولی لگ رہی تھیں۔ میں کھانے کی میز سے کچھ فاصلے پر دست بستہ کھڑے بٹلر کو، شیف کو اور دوسرے خدمت گاروں کو دادا صاحب کے چشم و ابرو کے اک اشارے پر غلاموں کی طرح تعمیل کرتا دیکھتا تھا تو مجھے حیرانی ہوتی تھی۔ وہ سب پرانے وقتوں کے حبشی غلاموں جیسے تھے۔ مضبوط، تنومند، سپاٹ چہروں والے جو ”یس سر“ کے سوا جیسے کچھ بول ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے... خدمات کا کیا معاوضہ لیتے تھے؟ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے کبھی معلوم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کئی سال سے ملازم تھا۔ آج مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ دادا صاحب کا احترام نہیں کرتے تھے، ان سے ڈرتے تھے۔

دادا صاحب نے کھانے کی میز پر کہا۔ ”لندن میں تمہیں وہاں کے کھانوں کی عادت تھی تو شیف کو بتا دینا... وہ بنا دے گا۔“

”جی دادا صاحب۔“ میں نے کہا۔

”تم کہیں جاتے ہو تو اپنے ساتھ شوفر کو کیوں نہیں لے جاتے؟“

میں نے کہا۔ ”دادا صاحب! میں ڈرائیو کر سکتا ہوں اور شوفر میری پرائیویسی کو ڈسٹرب کرتا ہے۔“

”اس شہر میں بھی اب کراچی کی طرح اسٹریٹ کرائم بڑھ گئے ہیں۔ چھچھورے لڑکے بدمعاشی کرنے لگے ہیں۔ تمہیں اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔“

ماں نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا کہ میں ہاں کر دوں۔

دادا صاحب اٹھے۔ ”مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے... آؤ۔“

میں ماں کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلیے... کھانا تو میں کھا چکا ہوں۔“

ان کا کمرا ڈرائنگ روم کے عین مقابل تھا۔ درمیان میں دس فٹ چوڑا کوریڈور تھا۔ اس میں ڈرائنگ روم کا اندر والا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا، اس کے وسط میں کار پورچ تھا۔ دادا صاحب کے بیڈ روم کے بعد بھی بیڈ روم ہی تھا جس کو انہوں نے لائبریری میں تبدیل کر دیا تھا۔ جو بات مجھے عجیب لگتی تھی، وہ لائبریری کی ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بہت بڑی آفس ٹیبل تھی جس پر تین مختلف رنگوں کے فون رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف پہلے ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر تھا، اب لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا جس کی بیس انچ کی اسکرین تھی۔

میں نے پاکستان میں عمر رسیدہ افراد کو کمپیوٹر تو کیا، ٹچ اسکرین موبائل فون سے ایسے خوف زدہ دیکھا تھا جیسے اس کے استعمال سے کوئی خفیہ بیماری لگ جانے کا ڈر ہو۔ بیشتر تعلیم یافتہ بوڑھے بھی صرف فون کرتے تھے۔ انہیں ایس ایم ایس کرنا اور کسی کا نام سیو کرنا بھی نہیں آتا تھا اور وہ سیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس کے برعکس دادا کا خاصا وقت نیٹ پر گزرتا تھا۔ فیس بک، ای میل اور ٹویٹر کے علاوہ انہیں وائبر اور اسکائپ وغیرہ پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ کس کس سے، کہاں باتیں کرتے تھے اور کیا... یہ جاننے کی میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی اور میں جان بھی نہیں سکتا تھا۔ دادا صاحب کے لائبریری میں آنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم کے اندر سے ہی لائبریری میں پہنچ جاتے تھے۔ لائبریری یا آفس بالکل اٹیچ باتھ کی طرح تھے۔ اس عمر میں نیند کم آتی ہے چنانچہ میں انہیں آدھی رات کو بھی نیٹ

پر بیٹھا دیکھتا تو فرض کر لیتا کہ وہ دنیا کے اس حصے میں جہاں سورج چمک رہا ہے، کسی سے رابطے میں ہوں گے۔ کتابوں سے مجھے دلچسپی کبھی نہ تھی، چنانچہ میں نے شیشے کے پٹ والی الماریوں میں رکھی ہزاروں کتابوں کے بارے میں جاننے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

لائبریری کے وسط میں بلیک لیدر کا قیمتی صوفہ تھا جس کے اوپر ایک بہت بڑا گلوب روشن تھا۔ دادا نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ریموٹ دبا کر کچن میں شیف سے کافی لانے کو کہا۔

”لوگ پہلے پوچھتے تھے کہ بارہ برس دلّی میں رہے کیا بھاڑ جھونکا۔ تم سات سال لندن میں رہے... مجھے معلوم ہے تم کیا کرتے رہے۔“

میں نے کہا۔ ”جی، میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا تھا۔“

”اب تمہیں وہ تعلیم بھی یاد نہیں ہوگی جو تم نے یہاں حاصل کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے سوا تم سب کچھ کرتے رہے۔“

میں نے اعتراف کا کڑوا گھونٹ پی لیا۔ ”آپ جانتے ہیں؟“

”ہاں، تم کتنا عرصہ کس یونیورسٹی میں رہے... کس شعبے میں اور وہاں تمہیں کون ملا... ان میں کتنی لڑکیاں تھیں۔“

میں لاجواب ہو کے انہیں دیکھتا رہا۔ ”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”میں ان تمام لڑکیوں کے نام بھی بتا سکتا ہوں جن کے ساتھ تمہاری فرینڈ شپ رہی۔ زیادہ تر کو تم نے منگنی کا جھانسا دیا۔ انہیں بتاتے رہے کہ تم کسی ریاست کے پرنس ہو، وہ کہانیاں سناتے رہے جو یہاں سے واپس جانے والے انگریز حاکم اپنے گاؤں کے لوگوں کو سنا کے حیران کرتے تھے۔“ دادا صاحب مسکرائے۔

میں ہکا بکا بیٹھا رہا۔ ”پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے برطانوی شہریت لے لی تھی۔“

انہوں نے سر ہلایا اور شیف کے جانے کا انتظار کیا جو کافی لایا تھا۔ ”اس کے لیے تم نے شادی کی تھی۔ اچھا ہوا سستے میں چھوٹ گئے ورنہ مجھے کچھ کرنا پڑتا۔ بڑی بے وقوفی کی تھی تم نے۔“

”جو تعلیم کے لیے جاتے ہیں وہ برطانیہ میں قیام کے لیے یہ کرتے ہیں۔“

انہوں نے تیز آواز میں کہا۔ ”ہاں جو تعلیم اور پھر ملازمت کے لیے جاتے ہیں... میں نے تمہیں یہ دونوں کام کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔“

میرا منہ کھلا رہ گیا۔ ”پھر کس لیے بھیجا تھا؟“

”ضرورت تھی۔ تم محفوظ رہے۔ یہاں کے حالات خراب تھے، کچھ ہو جاتا تو میں تمہیں بچا نہیں سکتا تھا۔“

”آپ کا مطلب ہے سیاسی حالات؟“

”حالات سیاسی طور پر ہی خراب ہوتے ہیں۔ مار پیٹ پر پہلی بار تمہیں صرف فائن ہوا تھا اور وارننگ ملی تھی۔ دوسری بار جیل ہوئی تھی۔ تم کئی بار نوکری سے بھی برطرف ہوئے۔“

”کس نے بتایا آپ کو یہ سب میرے بارے میں؟“ میں نے کہا۔

”میرے ذرائع ہیں۔ مجھے تو یہ بھی روز بتایا جاتا تھا کہ آج تم کس لڑکی کو کہاں لے گئے تھے۔ ریسٹورنٹ یا بار اور ڈسکو میں۔“

”آپ نے کبھی مجھے ان ذرائع کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”کیوں بتاتا... ان دنوں میں خود انڈر گراؤنڈ تھا لیکن اپنے رابطوں سے کٹا ہوا نہیں تھا۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ”انڈر گراؤنڈ؟“

”ہاں، میں یہاں نہیں تھا اور نہ تمہاری ماں... ہم دوسری جگہ چلے گئے تھے اور کئی سال وہاں رہے۔“

”وہاں کہاں؟ ماں نے کبھی ذکر نہیں کیا۔“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”یہ کیا چکر ہے دادا صاحب؟“

”جو بات تمہارے سمجھنے کی نہیں وہ جان کے کیا کرو گے؟ بس سمجھو وہ وقت گزر گیا تو ہم لوٹ آئے۔ پھر میں نے بہتر سمجھا کہ اب تمہیں بھی بلا لیا جائے۔ تم ایک لڑکی کے چکر میں تھے۔ اس کا نام تھا مریم داؤد... تم نے اس کی تلاش کے لیے لندن پولیس سے بھی مدد لی تھی اور ناکام رہے تھے کیونکہ اس نام کی لڑکی کا لندن میں کوئی وجود نہیں تھا۔“

”وہ میرا وہم نہیں تھا دادا صاحب! میں اس سے ملا تھا، صرف ایک بار... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لندن میں اس نام کی ایک لڑکی بھی نہ ہو؟“

”ہوتی تو مل نہ جاتی۔ اسی کی وجہ سے تم واپس نہیں آنا چاہتے تھے لیکن تمہارا واپس آنا ضروری تھا۔ مجھے تمہیں ڈی پورٹ کرانا پڑا۔“

میں اچھل پڑا۔ ”آپ نے ڈی پورٹ کرایا مجھے؟“

انہوں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ”کافی پیو، ٹھنڈی

ہو رہی ہے۔“

پُرسکون ہونے کے لیے میں نے ایک وقفہ لیا اور کافی پی لی۔ ”کیا آپ مجھے بتائیں گے دادا صاحب کہ آپ نے یہ کیسے کیا؟“

”جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، تم جانتے ہو۔ مجھے وہاں کسی سے کہنا پڑا، اس نے سب کر لیا۔“

”یعنی، وہ سب کیس... سارے گواہ جو میرے خلاف تھے... آپ کی سازش تھی؟“ غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔

”ہر کام کے لیے یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہر جگہ... خود تو کچھ نہیں ہو جاتا۔ تمہارا واپس آنا یا تمہیں واپس لانا ایک ہی بات ہے۔ کان کو ادھر سے پکڑو یا ادھر سے۔“

”کیوں لانا ضروری تھا؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”اپنا جانشین بنانے کے لیے... کیا ہیں آخر آپ؟ کوئی ڈان؟ مافیا کنگ...؟“

وہ مسکرائے۔ ”بھارت کی زبان مت بولو۔ اور یہ مت سمجھو کہ میں اپنی جگہ تمہیں لانا چاہتا تھا۔ یہ ناممکن تھا اب... اس کے لیے میں تمہیں بہت پہلے سے تیار کرتا... مگر میں تمہاری زندگی کو محفوظ دیکھنے کا خواہش مند تھا۔“

”آپ کیا چاہتے تھے... میں کیا کروں؟“

”کچھ بھی جو تمہیں اچھا لگے۔ اس کا وقت اب آیا ہے اور تمہارے سامنے اوپن فیلڈ ہے۔“

میں بے یقینی کے صدمے سے دوچار کاٹھ کا الو بنا بیٹھا تھا اور اس شخص کو دیکھ رہا تھا جسے درحقیقت آج تک میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ ایسا ہی انکشاف تھا جیسے کسی سرسبز و شاداب پہاڑ پر رہنے والے کو بتایا جائے کہ تم جس پر بیٹھے ہو یہ آتش فشاں پہاڑ ہے جو کسی بھی وقت آگ اگل کے گرد و پیش کی آبادی کو راکھ کر سکتا ہے۔ نوّے سال کا وہ خاموش طبع وضع دار اور تعلیم یافتہ شخص جس کو میں دادا صاحب کہتا تھا، کسی انڈر ورلڈ مافیا کا ڈان ہے، ویسا ہی جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے... فرق صرف یہ تھا کہ نہ اس کا گینگ گولیاں چلاتا پھرتا تھا، نہ بم پھینکتا تھا اور نہ کسی سے محاذ آرائی... وہ کون تھے جو اس کے آلۂ کار تھے۔ کیا کرتے تھے... کتنے تھے اور کہاں کہاں تھے... یہ سب سوالات تو آج میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے... اور ان سوالات کی حد کوئی نہ تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”دادا صاحب! آپ کے تعلقات کا دائرہ یا آپ کا نیٹ ورک اتنا بڑا اور موثر ہے دنیا بھر میں تو یہاں بھی ہوگا۔ کیا یہاں بھی مجھے واچ کیا جاتا ہے؟“

”نہیں، اس کی ضرورت محسوس نہیں کی میں نے۔“

”ورنہ آپ کو ضرور پتا چل جاتا کہ میرے ساتھ کیا واردات ہو چکی ہے۔“

وہ چونکے۔ ”واردات؟ کیا ہوا تھا؟“

میں نے انہیں مختصراً گھڑی اور موبائل فون چھن جانے کا بتایا۔ ”وہ تو معمولی اٹھائی گیرے تھے۔“

وہ مسکرانے لگے۔ ”ہاں، اس سے تو کوئی محفوظ نہیں۔ اچھا کیا تم نے کہ مزاحمت نہیں کی۔ ویسے تو یہ نقلی پستول سے کام چلاتے ہیں مگر کیا پتا اصلی ہو۔“

خواہش کے باوجود میں ان سے یہ سوال نہ پوچھ سکا کہ آپ کا گینگ کیا کرتا ہے۔ وہ صحیح جواب نہ دیتے۔ شاید خفا ہو جاتے پھر بھی ان سے ایک سوال کر لیا۔ ”دادا صاحب! دنیا میں لوگ آپ کو کس نام سے جانتے ہیں؟“

”تم کیا کرو گے جان کر... تمہارے لیے میں دادا صاحب ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟“ ان کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ ”اور دیکھو... میں نے تمہیں یہاں اس لیے نہیں بلایا تھا کہ تم میرے بارے میں تحقیقات شروع کر دو۔ ایک تو میں چاہتا تھا کہ تم بزنس کے معاملے میں سیریس ہو جاؤ۔ بہت آوارہ گردی اور دل لگی کر لی۔ یہ بھی کرتے رہنا مگر صرف یہ نہیں... اعجاز سے پھر ملو یا خود فیصلہ کر کے بتاؤ۔ ایک مہینا دے رہا ہوں تمہیں۔ دوسری بات یہ بتاؤ کہ تم اپنی بری کے جوڑے لا رہے ہو... شادی کرنی ہو تو مجھے بتانا... سب ہو جائے گا مگر ابھی شادی کو بھول جاؤ۔ ہاں اپنی ماں کو بتا دو لڑکی کون ہے۔ ہم بات پکی کر لیتے ہیں۔ کورٹ میرج کرنا چاہو تو تمہاری مرضی... اور شادی کے بعد الگ رہنا چاہو تو وہ بھی تمہاری مرضی۔“

میں حیرت کے ایک شاک سے گزرا۔ دادا صاحب نے کہا تھا کہ مجھ پر نظر نہیں رکھی جا رہی مگر انہیں پتا تھا کہ میں نے زنانہ سوٹ خریدے ہیں۔ یہ ماں تو انہیں نہیں بتا سکتی۔ بیک وقت انہوں نے مجھے ڈھیل بھی دے دی تھی اور پابند بھی کر دیا تھا۔ وہ مجھے پتنگ کی طرح کنٹرول کر رہے تھے جس کی ڈور ان کے ہاتھ میں تھی۔ ایک دم میرے اندر اس شخص کے بارے میں جاننے کی خواہش نے زلزلہ پیدا کر دیا تھا جسے آج تک میں صرف اپنے دادا کے طور پر جانتا تھا۔ ایک دبلا پتلا پھونس بڈھا جو پھونک مارے سے اڑ جائے مگر درحقیقت ایک خطرناک طاقتور جرائم پیشہ۔

دادا صاحب سے ان کے بزنس کی بات کرنا سوئے ہوئے شیر کو جگانے والی بات تھی۔ اس کا نتیجہ الٹا نکل سکتا تھا۔ وہ مجھے کچھ نہ بتاتے اور بے عزت کر کے نکال دیتے۔ تاہم میں تہیہ کر چکا تھا کہ اپنے طور پر ان کے ماضی وحال کی حقیقت جاننے کی کوشش ضرور کروں گا۔ یہ کوشش خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی اور لاحاصل بھی۔

"تم نے بتایا نہیں... کون ہے وہ لڑکی؟"

میں چونکا۔ "ابھی کوئی نہیں دادا صاحب... جب ہو گی تو میں آپ کو بھی بتا دوں گا۔ اچھا اب میں جا سکتا ہوں؟"

انہوں نے سر ہلایا۔ "آج نو تاریخ ہے۔ اگلے مہینے کی نو کو میں تم سے پوچھوں گا نہیں... تم مجھے بتاؤ گے کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

یقیناً ماں سب سے زیادہ جانتی تھی اور دادا صاحب کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی تھی لیکن اسے میں نے دوسرے نمبر پر رکھا۔ پہلے اعجاز تھا جس کے دادا اور میرے دادا صاحب دوست تھے۔ دوست کا لفظ ان کے نام کے ساتھ بڑا عجیب لگتا تھا۔ ان کے کاروباری شریک ہو سکتے تھے۔ حریف یا دشمن... دوستی تو شریف لوگ کرتے ہیں۔ میرا اعجاز سے ملنا دہرے مقاصد کا حامل تھا۔ کاروبار کی بات کو سنجیدگی سے پھر شروع کرنا جو میری غیر سنجیدگی کے باعث ختم ہو گئی تھی۔ مگر اس سے پہلے دادا صاحب کے بارے میں اعجاز کی معلومات سے استفادہ کرنا۔

اعجاز کو میں نے اتوار کی شام ڈنر کے لیے بڑی مشکل سے راضی کیا۔ کھانے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ ہم نے ریسٹورنٹ میں ایک کنارے کی میز پکڑ لی۔ میں نے کہا۔ "اعجاز! کسی حد تک میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تم خاندانی طور پر میرے دوست ہو... اور ابھی تک لاہور میں میری کسی سے شناسائی بھی نہیں۔"

"تم نے پہلی ملاقات میں اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ بعد میں تم اتنے نان سیریس کیوں ہو گئے تھے؟"

"سوری فار دیٹ... میں نے جان بوجھ کے ایسا کیا تھا لیکن وہ میری غلطی تھی۔ میں تمہارے تعاون سے ہی کچھ کروں گا۔ لیکن آج میں بات کرنا چاہتا ہوں دادا صاحب کی... تم انہیں کب سے جانتے ہو؟"

"ظاہر ہے جب سے ہوش سنبھالا۔"

"کیا جانتے ہو تم ان کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"شاید اتنا ہی جتنا وہ میرے بارے میں جانتے ہوں گے۔ دوست تو میرے دادا تھے۔ والد صاحب کہتے تھے کہ اچھے آدمی ہیں۔"

"کس بنیاد پر... وہ تو جرائم کی دنیا کے ڈان ہیں... مافیا کنگ ہیں... اور بے حد خطرناک آدمی ہیں۔"

اعجاز ہنسنے لگا۔ "یہ ویسی ہی بات ہے جیسے لیلیٰ مجنوں کو کلر اور تھری ڈی میں بنانے والی بات کرتے وقت تم سیریس نہیں تھے۔"

"نہیں نہیں... یہ نان سیریس بات نہیں ہے، حقیقت ہے۔ انہوں نے خود مجھے کل سب بتایا ہے۔"

وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ "ایک بات بتاؤں تمہیں۔ ہم بزنس والے بھائی بندوں کے سوا کسی کو اپنے بزنس میں سیٹ کرنے کے لیے کوئی مدد نہیں کرتے۔ الٹا کوشش کرتے ہیں کہ وہ ادھر نہ آئے، کچھ اور کرے مگر تمہارے ساتھ میں نے ایسا نہیں کیا۔ معلوم ہے کیوں؟ تمہارے دادا صاحب کی وجہ سے... ان کا مقروض ہوں میں۔"

"اچھا، کتنا قرضہ لیا تھا تم نے... اب کتنا رہ گیا ہے؟"

وہ نفی میں گردن ہلانے لگا۔ "میں نے ان سے کوئی رقم نہیں لی۔ وہ میرے والد کے نہیں، دادا کے دوست تھے۔ بہت پرانی بات ہے دادا نے ان سے کہا ہو گا کہ میرا لڑکا کچھ نہیں کرتا۔ اسے کہیں سیٹ کرنا ہے۔ نوکری کے لائق تھا ہی نہیں۔ میٹرک کیا ہوتا تب بھی چپڑاسی ہی لگتا۔ بزنس کرانے کے لیے سرمایہ چاہیے تو وہ میرے پاس نہیں۔ دادا صاحب نے کہا کہ پھر اس کی شادی کی کیا جلدی پڑی تھی۔ دادا نے بتایا کہ شادی کا اس نے خود کہا تھا اور میں نہ کرتا تو وہ کرا دیتے، لڑکی والے اور پھر اسے بنا لیتے گھر داماد... اب بھی مجھے خطرہ یہی ہے کہ اس نے کچھ نہ کیا تو وہ میرے بیٹے کو بزنس کرا کے مجھ سے چھین لیں گے۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ اس پر دادا صاحب نے اپنے دوست کو تسلی دی کہ تم بے فکر ہو جاؤ اور سب مجھ پر چھوڑ دو اور دادا صاحب نے جو کہا تھا کیا۔ میرے ابا کو بزنس کرایا۔ یہی فرنیچر کا بزنس... مجھے نہیں معلوم اس میں کتنا سرمایہ لگا اور وہ کہاں سے آیا۔ یہ معلوم ہے کہ بعد میں جب بزنس چل گیا تو میرے دادا نے دادا صاحب کو ادھار چکانا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ بزنس اس لیے چلا کہ دکان موقع کی جگہ پر تھی، میکلوڈ روڈ پر... اور خالی بھی نہیں تھی۔"

"کب کی بات ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"انڈیا پاکستان کی جنگ سے پہلے کی۔ اس وقت بھی یہ لاکھوں کا کھیل تھا، مجھے معلوم ہے۔ یہاں سب سینما تھے جو اب نہیں رہے۔ جگہ بہت قیمتی تھی۔ آج ہم جو کچھ ہیں، اسی کی وجہ سے ہیں۔ تمہارے دادا صاحب کی مدد کی وجہ سے... دادا اور دادا صاحب کی دوستی کیسے ہوئی تھی، مجھے نہیں معلوم۔ وہ غالباً بچپن کے دوست تھے مگر میرے دادا یہ سب کر ہی نہیں سکتے تھے۔ دوسری بات جو دادی سے پتا چلی، ابا بہت بگڑے ہوئے تھے۔ کسی کے قابو میں نہیں آتے تھے۔ پڑھا بھی نہیں تھا۔ معلوم نہیں اماں کے گھر والوں نے انہیں کیا دیکھ کے پسند کر لیا تھا؟ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اماں کی تو بہنیں تھیں اور ان کے والد پولیس کے محکمے سے... ریٹائر ہوئے۔ تنخواہ کیا ہوتی ہے کسی اے ایس آئی کی مگر آمدنی تھی... انہوں نے سوچا ہو گا کہ ایک تو ٹھکانے لگے۔ میں اماں کی برائی نہیں کر رہا ہوں۔ یہ میری ماں تھی جس نے ابا کو لگام ڈالی اور ذمے دار بنایا لیکن دادا صاحب نے بھی کوئی چکر ضرور چلایا تھا کہ ابا سیدھے ہو گئے اور ان کے سسر صاحب بھی۔ آج جو کچھ تم دیکھ رہے ہو نا... دادا صاحب کا کمال ہے۔"

"یعنی اس وقت بھی دادا صاحب بڑی چیز تھے۔" میں نے کہا۔

"ہوں گے دنیا کے لیے... میں نے تو انہیں ہمیشہ اسی طرح گھر میں آتا دیکھا، دونوں دوست شطرنج کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی مچھلی کے شکار کے لیے بھی جاتے تھے۔ لڑتے بہت تھے اور فضول باتوں پر... دادی بتاتی ہیں کہ ایک بار لڑائی اس بات پر ہوئی تھی کہ پری چہرہ نسیم کچھ نہیں مدھو بالا کے آگے... دراصل میرے دادا نے نسیم کی فلم "پکار" میں ایک چھوٹا سا دو منٹ کا رول کیا تھا۔ انہوں نے نسیم کو خود دیکھا تھا اور ساری عمر اس کے غائبانہ عشق میں مبتلا رہے۔ وہ دادا صاحب سے کہتے تھے کہ تم نے مدھو بالا کو صرف پردے پر دیکھا ہے۔ میں نے روبرو دیکھا ہے۔ لڑائی کے بعد ایک ہفتہ دونوں نہیں ملے۔ پھر دادا صاحب آ گئے اور بولے کہ ہاں یار تو ٹھیک کہتا ہے۔ چل بساط نکال اور چائے بنوا۔ دادی خوب ہنستی تھیں ایسی باتوں کو یاد کر کے۔ اب دادا تو رہے نہیں... دادی یاد کرتی ہیں کہ پہلے وقتوں کی دوستی بھی کیا ہوتی تھی۔ جان مانگو تو دوست انکار نہ کرے۔"

میں نے کہا۔ "جب دادا مر گئے تو انہوں نے آنا چھوڑ دیا؟"

"نہیں، اب بھی آتے ہیں دادی کے پاس ہر جمعرات۔ پہلے قبرستان جاتے ہیں پھر دادی کے سامنے آ کے سر جھکا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بات ہمیشہ کہتے ہیں... بھابی! کوئی مسئلہ تو نہیں۔ ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ ایک کپ چائے پیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔"

میں کچھ حیران ہوا۔ "اب بھی؟ ہر جمعرات کو... مجھے کبھی پتا نہیں چلا۔ دراصل میں تو لندن میں تھا۔"

"تمہیں واقعی کچھ پتا نہیں۔ دادی سے پوچھو، وہ کہتی ہیں کہ وہ آدمی نہیں فرشتہ ہیں۔ ہاں ایک بات اور... دادا صاحب کہتے تھے کہ اپنا قرض زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔ دادی نے بتایا کہ ایک بار دونوں دوست مچھلی کا شکار کھیل کے واپس آ رہے تھے۔ مچھلیاں لٹکا رکھی تھیں بنسی کے ساتھ کندھے کے پیچھے۔ نہ جانے کہاں کی بات ہے، کوئی ریچھ ان پر حملہ آور ہوا۔ وہ مچھلیاں کھانا چاہتا تھا۔ دادا صاحب کو میرے دادا نے بچایا۔ ریچھ دادا صاحب کو زخمی کر دیتا۔ دادا نے سامنے آ کے ان کو بچا لیا اور ایک خنجر سے اس پر وار کیے۔ وہ خود بھی زخمی ہوئے مگر ریچھ مارا گیا۔ اس کو دادا صاحب قرض شمار کرتے تھے۔"

"یعنی تمہاری دادی کو بہت کچھ معلوم ہے؟"

"بہت کچھ کیا... جو انہوں نے دیکھا۔ معلوم تو تمہاری اماں کو بھی ہو گا۔" اعجاز نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کسی کو بتاتے نہیں۔ بہت سے غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ تم یہ انڈر گراؤنڈ مافیا کی بات کرو گے تو دادی کی خاک سمجھ میں آئے گا۔ مگر تم کہو کہ وہ بہت بڑے اور خطرناک بدمعاش غنڈے ہیں تو وہ بگڑ جائیں گی کہ شرم نہیں آتی ایک فرشتے پر الزام تراشی کرتے ہوئے۔ بات نہیں کریں گی وہ تم سے... کبھی جمعرات کو آ کے دیکھو، وہ کیسی شرافت اور عاجزی کے ساتھ سر جھکا کے دادی کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور چائے پیتے ہیں مگر انہی کے ہاتھ کی بنی ہوئی۔ ابا سے بس سلام دعا ہوتی ہے جیسے مجھ سے۔ چلو اب کھانے کا آرڈر دو۔ باقی باتیں پھر سہی۔"

میں اعجاز کی باتوں سے سخت کنفیوز ہوا۔ میرے سامنے اب دو متضاد چہرے تھے۔ ایک سیاہ اور دوسرا سفید۔ اور میں پریشان تھا کہ درست کسے سمجھوں۔ وہ جو دادا صاحب خود کہتے ہیں یا وہ جو ان کے بارے میں دوسرے کہتے ہیں۔ اس معاملے میں اعجاز کی دادی سے پہلے میں نے اماں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

کھانے کے بعد میں نیچے اترا تو اعجاز ہاتھ ملا کے اپنی

گاڑی کی طرف چلا گیا۔ میں اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا کہ میری نظر کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ میں نے مریم کو دیکھا۔ وہ صدر دروازے کی سیڑھیاں اتر کے اب پارکنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی۔ مجھ پر جیسے جنون کا دورہ پڑا۔

''مریم!'' میں نے چلّا کے کہا اور اس کی طرف لپکا۔ وہ ٹھٹک کے رکی اور پیچھے دیکھنے لگی۔ اب شک شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ مریم نہ ہوتی تو اس آواز پر کیوں رکتی۔

میں اس کے سامنے پہنچا تو اس کے چہرے پر ناگواری دیکھی۔ ''آپ نے آواز دی تھی مجھے... اس بدتمیزی کے ساتھ؟''

میں سخت خفیف ہوا۔ ''آئی ایم سوری... مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں پھر نہ نکل جائیں پہلے کی طرح۔''

''پہلے کی طرح؟'' اس کے ماتھے پر شکن ایک سوالیہ نشان بن گئی۔

''جی... دراصل ابھی چند روز پہلے آپ لبرٹی میں شاپنگ کے لیے گئی تھیں، اس پلازا میں جہاں خواتین جاتی ہیں۔ نام نہیں یاد آ رہا ہے... وقت ہوگا ایک بجے کے بعد کا... دس منٹ بعد۔''

''میں شاپنگ کے لیے جاتی ہوں وہاں... لیکن آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں آخر؟''

''کیا آپ مجھے صرف پانچ منٹ دیں گی... صرف پانچ منٹ؟''

اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور کچھ مسکرائی۔ ''اوکے... آپ کا وقت شروع ہوتا ہے... اب۔'' اس نے ''کون بنے گا کروڑپتی'' شو کے میزبان امیتابھ کے انداز میں کہا۔

میں نے چیلنج قبول کر لیا۔ ''مس مریم! میں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی لندن سے آیا ہوں، سات سال بعد... وہاں ایک ریسٹورنٹ میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے امی کو لنچ پر بلایا تھا۔ آپ اس کی کرائے دار تھیں اور وہ آپ کو اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس کے بعد سے میں دیوانہ وار آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ میری تلاش کے بارے میں لندن پولیس تک جانتی ہے۔ ان کے سراغ رساں بھی آپ کو تلاش نہ کر سکے... لیکن...''

''آپ کا وقت ختم... اب میرا جواب سن کے روانہ ہو جائیں تو اچھا ہے۔ میں کبھی لندن نہیں گئی۔ میں کسی امی کو نہیں جانتی۔ یا تو آپ کا ذہنی توازن درست نہیں یا آپ کا طریقۂ واردات یہی ہے۔ آپ ہر لڑکی کو ایسے ہی سرپرائز دے کر تعارف حاصل کرتے ہیں۔''

''قسم خدا کی ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے فوراً اپنا کارڈ نکالا۔

''قسم جھوٹے لوگ کھاتے ہیں۔'' اس نے قدرے شوخی سے کہا۔ ''ایک تیسرا امکان یہ ہے کہ آپ نے بہت پی رکھی ہے۔ اب میری گاڑی کے سامنے سے ہٹ جائیں اور مجھے جانے دیں ورنہ میں گارڈ کو اشارہ کرتی ہوں۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ یہ کارڈ رکھوا اپنے پاس۔''

گارڈ واقعی ہماری طرف دیکھ رہا تھا لیکن مشکوک نظروں سے نہیں۔ میں بھی اس فائیو اسٹار ہوٹل سے نکلا تھا اور مریم بھی چنانچہ یہ خیال اس کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ میں مریم کا بیگ چھین کر بھاگنا چاہتا ہوں یا اسے پریشان کر رہا ہوں۔ اس کے پیکرِ حسن و شباب اور ناز و ادا کو نہ جانے اور کتنے دیکھ رہے ہوں گے پھر بھی میں پیچھے ہٹ گیا۔ اب میں نے اس کی گاڑی دیکھ لی تھی اور اس کا نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا اور مطمئن تھا کہ اس کا سراغ لگا لوں گا۔ اس کے حوصلہ شکن اور جارحانہ رویّے کا جواب میں نے پُراعتماد مسکراہٹ سے دیا اور کارڈ پھر بڑھایا۔ ''ایسی بداخلاقی کی ضرورت بھی نہیں۔ ایسے کارڈ تو بہت ہوں گے آپ کے پاس... رکھ لیجیے شاید آپ کو ضرورت پڑے۔ نہ پڑے تو آپ پھینک بھی سکتی ہیں۔''

خلافِ توقع اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا اور کارڈ لینے کے بعد بھی دیکھتی رہی۔ میں فوراً پلٹ کے چل پڑا۔ میری گاڑی اسی قطار میں کافی آگے تھی اور مجھے لوٹ کر اسی راستے سے مین گیٹ تک جانا تھا۔ چند منٹ کے وقفے سے میں پھر وہاں سے گزرا تو بے اختیار میری نظر ادھر گئی جہاں اس کی کار تھی اور مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا کیونکہ گاڑی وہاں موجود تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کو سائڈ میں روکا اور اتر کے دیکھا۔ وہ کار میں بھی نہیں تھی۔ میری نظر دروازے کی طرف گئی جہاں سے وہ نکلی تھی اور چند قدم پیچھے میں آیا تھا۔ قدرتی طور پر یہ سوال میرے ذہن میں آیا کہ کیا وہ واپس اندر چلی گئی؟ ممکن ہے وہ کچھ بھول آئی ہو۔

میں نے چوکیدار سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ ''جو خاتون ابھی اس کار کے پاس کھڑی مجھ سے باتیں کر رہی تھیں، کیا وہ پھر اندر گئی ہیں؟''

گیٹ کیپر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں سر! وہ تو چلی گئیں۔''

''چلی گئیں؟ لیکن ان کی گاڑی تو موجود ہے یہ بلیک

کرولا۔''

وہ بوکھلا گیا۔ ''گاڑی میں ہی گئی ہیں وہ۔''

''مگر ان کی گاڑی تو اپنی جگہ موجود ہے۔'' میں نے خفگی سے کہا۔

''سر! یہ تو مجھے نہیں معلوم... وہ تو گئی ہیں سفید گاڑی میں... شاید سِوک تھی۔'' بڑے ہوٹل کا چوکیدار گاڑیوں کے ماڈل پہچانتا تھا۔

بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ بلیک کرولا کے پاس ضرور کھڑی تھی لیکن وہ گاڑی اس کی نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ساتھ کھڑی دوسری گاڑی میں بیٹھی ہو جس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ میں تو اس کا یوں راستہ روکے کھڑا تھا کہ وہ درمیان کی تنگ جگہ میں سے گزر کر ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ نہیں کھول سکتی تھی۔ پھر مجھے دوسری بات یاد آئی۔ اس نے گاڑی کو پلٹ کے کھڑا کیا تھا۔ اس کا رخ ہوٹل کے گیٹ کی طرف تھا۔ ساتھ والی گاڑی ایسے ہی کھڑی ہوگی جیسے دوسری سب گاڑیاں۔ باقی سب نے ریورس کر کے گاڑی نکالی ہوگی۔ وہ سیدھی ڈرائیو کر کے چلی گئی ہوگی۔

میرا غصے سے برا حال ہو گیا۔ میں نے اپنی عقل کو بھی کوسا اور اسے بھی۔ وہ پھر مجھے جُل دے کر نکل گئی تھی۔ قصور بہرحال اس کا نہیں تھا۔ میں ایک منٹ رک کے دیکھ لیتا تو مجھ پر حقیقت عیاں ہو جاتی لیکن میں اس کے رویّے کے جواب میں بے رخی اور ناراضی ظاہر کر رہا تھا۔ میں پھر گاڑی میں بیٹھا اور دل گرفتہ سا باہر نکلا۔ اب امید کے خلاف امید یہ رہ گئی تھی کہ کارڈ اس نے رکھ لیا تھا۔ شاید وہ فون کر لے مگر وہ کیوں فون کرے گی؟ ایسے نہ جانے کتنے کارڈ کے ساتھ اپنا دل نتھی کر کے اسے ہر روز پیش کرتے ہوں گے۔

یہ ہو سکتا تھا کہ میں پھر اگلے روز شام کے وقت جاؤں اور مجھے وہی گیٹ کیپر ملے تو میں اس سے پوچھوں کہ کیا وہ سفید گاڑی والی خاتون یہاں باقاعدگی سے آتی ہیں۔ نمبر تو وہ کیا بتائے گا۔ مین گیٹ پر ہوٹل میں داخل ہونے والی ہر گاڑی سیکیورٹی چیک کے رسمی عمل سے گزرتی تھی مگر وہ صرف نمبر کا اندراج کرتے تھے، گاڑی کا ماڈل نہیں لکھتے تھے اور یہ بھی نہیں کہ اسے کوئی کالا دیو چلا رہا تھا یا سبز پری۔ تاہم میں نے کچھ دن باقاعدگی سے ہوٹل میں دھرنا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں پیچھے لاؤنج میں بیٹھ جاتا تو شیشوں کے پیچھے سے سب آنے جانے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ ریگولر کسٹمر ہوگی تو پھر نظر آئے گی۔ اکیلی، اپنی فیملی کے ساتھ یا کیلی کے ساتھ... اس خیال کو میں نے یوں دور رکھا جیسے لوگ قریب آنے سے پہلے ہی فقیر کو ''معاف کرو بابا'' کا سگنل دے دیتے ہیں۔

میں اس حکمتِ عملی سے بھی مطمئن تھا اور اپنے کارڈ کی طرف سے بھی... چنانچہ صبح میں نے دادا صاحب کی پراسرار شخصیت کو سمجھنے کے لیے ماں کو جرح کے لیے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔

ماں کو میں نے اس کے بیڈروم میں گھیر لیا۔ ''مجھے کچھ پوچھنا ہے تم سے۔''

''پوچھ۔'' ماں نے بے دلی سے کہا کیونکہ وہ انکار نہیں کر سکتی تھیں۔

''حلف اٹھا کے وعدہ کرو مجھے جو بتاؤ گی، سچ بتاؤ گی۔ سب سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں بتاؤ گی۔'' میں نے کسی جج کے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

وہ مسکرائی۔ ''حلف اٹھوائے گا مجھ سے؟''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سر پر رکھ لیا۔ ''میرے سر کی قسم کھاؤ کہ جھوٹ نہیں بولو گی۔ پورا سچ بتاؤ گی۔''

اس کا رنگ اڑ گیا کیونکہ ہر ماں کی طرح میں نے اس کی جذباتی کمزوری پکڑ لی تھی۔ اب وہ انکار نہیں کر سکتی تھی اور سچ بولتے ہوئے ڈرتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ماں! تم جانتی ہو دادا صاحب کتنے خطرناک آدمی ہیں۔'' اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''اسی لیے تو روکتی تھی تجھے۔''

''تم جانتی ہو وہ کیا کرتے ہیں یا کرتے تھے؟ جب انہوں نے مجھے لندن بھیجا تھا تو اس کا مقصد بھی مجھے خطرات سے دور کرنا تھا۔ تم نے بھی ان کے ساتھ کئی سال روپوشی میں گزارے تھے۔''

ماں نے سر جھکا لیا۔ ''دادا صاحب نے بتایا ہے تو غلط کیسے ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیا کرتے ہیں؟ بزنس کیا ہے ان کا... آسان زبان میں سمجھاتا ہوں۔ وہ ہیروئن اسمگل کرتے ہیں یا اسلحے کی؟ ناجائز طریقے سے لوگوں کو... میرا مطلب ہے عورتوں کو ملک سے باہر لے جا کر بیچتے ہیں۔''

''یوسف! پاگل ہو گیا ہے تو۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ان کے ملک میں یا ملک سے باہر سیاسی دہشت گردی کرنے والوں سے مراسم ہیں یا وہ جعلی نوٹ چھاپتے ہیں؟ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں انڈر گراؤنڈ ورلڈ کے ڈان... مافیا کنگ... وہ بھی سامنے

نہیں آتے اور اپنے نیٹ ورک کو خاموشی سے کنٹرول کرتے ہیں۔ بے اندازہ دولت کے مالک ہوتے ہیں اور میں سنی سنائی پر اعتبار کر کے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ کل خود انہوں نے مجھ سے جو باتیں کی ہیں، ان سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اب میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ سات سال لندن میں بھی رہ آیا ہوں۔ بھاڑ نہیں جھونکا... انہوں نے جس طرح مجھے لندن سے نکلوایا، وہ خود مانتے ہیں۔"

"وہ تو ضروری تھا۔" ماں نے کہا۔

"کیوں ضروری تھا میرا اس ملک میں واپس آنا... جہاں لوٹ مار ہے اور دہشت گردی ہے۔ لاقانونیت ہے اور تعصبات ہیں... تمہیں معلوم ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟" میں نے انہیں گھڑی اور موبائل فون کے چھینے جانے والی ساری بات بتائی۔

"کیا مجھے چھوڑ کے تو اکیلا رہتا وہاں؟"

"اکیلا کیوں رہتا؟ میں آپ کو بھی بلا لیتا۔ مجھے تو مل ہی گئی تھی شہریت... اور خود دادا صاحب کے لیے یہ کیا مشکل تھا۔ ان کی اپنی زندگی جیسی بھی گزری، اب باقی کتنی ہے۔ ہم تو آرام سے رہتے۔ اب تو میں دوبارہ لندن بھی نہیں جا سکتا۔ میرا ریکارڈ خراب کرا دیا انہوں نے۔ امریکا جاؤں تو بھی مشکل ہوگی کہ میں پہلے برطانیہ سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا اپنے کرمنل ریکارڈ کی وجہ سے... آپ کی زندگی تو انہوں نے تباہ کی تھی، میری بھی کر دی۔"

ماں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "یوسف! آہستہ بول۔"

"میں نہیں ڈرتا ان سے... مجھے بتاؤ تم کیوں ڈرتی ہو اتنا؟ قسم کھا چکی ہو تم ماں۔"

اس نے ایک آہ بھری۔ "کیا میں اپنے لیے ڈرتی ہوں؟ اس لیے ڈرتی ہوں کہ مجھے اپنی زندگی سے بہت پیار ہے؟" وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتی رہیں... "کوئی بھی عورت کیا صرف اپنے لیے جیتی ہے یا اس مال و دولت کے لیے جو اسے میسر ہے؟ کیا ملتا ہے مجھے اس دولت میں سے اور میرے کس کام کی ہے یہ دولت؟"

"پھر کیا ہے یہ سب؟"

"بیٹا! ہر عورت میرے جیسی ہوتی ہے۔ اس کی اپنی خواہشات بھی ہوتی ہیں مگر پہلے وہ مانگتی ہے سہاگ کی سلامتی... اور جب اولاد ہو تو ان کی زندگی... کوئی عورت کر سکتی ہے ایسا کہ دولت کے بدلے اپنے شوہر یا اولاد کو بیچ دے؟ دشمنوں کے حوالے کر دے اور خوش ہو کہ اب نہ روک ٹوک نہ ذمے داری... عیش سے گزرے گی زندگی... اب تک میں جو سوچتی رہی جو کرتی رہی... صرف تیرے لیے۔"

"کیونکہ شوہر کے لیے آپ کا کہنا ہے، وہ مر گیا... دادا صاحب بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ لیکن مرنے والے کا ذکر کوئی اس طرح نہیں کرتا جیسے دادا صاحب کرتے ہیں۔ کیا ان کا بیٹا نہیں تھا وہ؟ میں بچپن سے دیکھتا اور سنتا آرہا ہوں۔ میرے باپ کے بارے میں جانتے بوجھتے مجھ سے حقائق کو چھپایا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ میں... میرا باپ اور اس کا باپ... سب کے درمیان جذباتی رشتہ محسوس نہیں ہوتا۔"

ماں نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "میں کیا بتاؤں تجھے یوسف؟"

"مجھے بتاؤ کہ میرا باپ کون تھا... کیا کرتا تھا... تم سے اس کی شادی کب اور کیسے ہوئی تھی... وہ کب مرا اور کیسے... وہ کہاں دفن ہے؟"

"ایسا مت کہہ... وہ جہاں بھی ہے اللہ اسے خوش رکھے۔" اس نے آنکھوں میں آنے والے ایک قطرۂ اشک کو جھٹک دیا۔

"مجھے ہمیشہ سے شک تھا۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اس گھر میں میرے باپ کا ذکر جیسے ممنوع تھا۔ وہ مر گیا ہوتا تو ہر سال اس کی برسی ضرور منائی جاتی۔ اس کا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کے غم میں رہتا۔ اس کی قبر پر پھول چڑھانے اور فاتحہ خوانی کرنے جاتا مگر ایسا نہیں تھا۔ کیا تم جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟"

ماں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ "معلوم ہوتا تو تجھے بہت پہلے بتا چکی ہوتی۔"

"مگر خود اس قید خانے سے بھاگ کے اس کے پاس نہ جاتیں؟ کیونکہ تمہیں اس سے محبت نہیں... کوئی جذباتی وابستگی نہیں... کیا اس نے طلاق دے دی تھی تمہیں؟"

"نہیں، آج بھی اس کی بیوی ہوں میں۔"

"پھر؟ کیا وہ تمہیں چھوڑ کے بھاگ گیا تھا کسی اور کے ساتھ؟ کون ہے وہ عورت؟"

"نہیں جانتی میں یوسف۔"

"جانتی نہیں ہو یا مجھے بتانا نہیں چاہتیں؟"

"اس کا نام چھپا کے مجھے کیا ملے گا؟ سچ یہی ہے کہ اس کا نام مجھے معلوم نہیں۔" وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔

میں اٹھ کے ماں کے لیے پانی لایا اور اس کے پرسکون ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ میں کسی تفتیشی پولیس افسر

کی طرح سفاکی اور چالاکی سے کام لینے پر مجبور تھا۔ اب حقیقت کو جاننا میرا حق تھا۔

"ابا کی شادی زبردستی تم سے کر دی گئی تھی؟"

"تو جانتا ہے دادا صاحب کو... ان کا حکم کون ٹال سکتا ہے... تیرا باپ کیسے انکار کرتا۔"

"کیسے ہوئی تھی یہ شادی اور کب؟ سب بتاؤ مجھے۔"

وہ کچھ دیر ماضی کے جھروکوں میں جھانکتی رہی جو میرے لیے بند تھے مگر اس نے کھلے رکھے تھے۔ "میرے ابا سیانده کلاں اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی میں اکلوتی بیٹی تھی جسے خود انہوں نے بڑی محبت اور محنت سے پڑھایا تھا۔ انیس سو پچاسی میں پرائیویٹ امتحان دے کر میں نے بی اے کر لیا تھا۔ اس وقت میں بائیس سال کی تھی۔ وہ باتیں یاد ہیں مجھے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ خوب صورت بھی بہت ہوں گی۔ کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی۔"

ان کی صورت پر شرمانے کی خفیف سی سرخی اور ایک پرحسرت مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اب اس کا کیا ذکر... خوب صورتی ہی میری بدبختی بنی۔ مجھے معلوم نہیں رشتہ کیسے ہوا... کس ذریعے سے پیغام آیا۔ میں تو آگئی یہاں اور اس وقت تو مجھے ایسا لگا جیسے میں سنڈریلا ہوں۔ ایک غریب لڑکی جو شہزادے کو پسند آگئی۔ وہ محل میں پہنچ گئی جہاں نوکر چاکر، کنیزیں اور ہر خواہش پوری کرنے والے اشارے کے منتظر نظر آتے تھے مگر یہ خواب تھا جو بہت جلد ٹوٹ گیا۔"

"اس گھر میں نہ آپ کی شادی کی کوئی تصویر ہے... نہ میرے ابا کی... کیسے تھے وہ؟"

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ "بالکل تیری طرح... جیسے تو شہزادہ گلفام ہے۔"

"وہ تو ہر ماں کے لیے اس کا بچہ ہوتا ہے۔ آخر ان کی کوئی تصویر کیوں نہیں ہے اس گھر میں... دادا جان کے حکم سے؟"

ماں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "اور کیا میں ایسا کر سکتی تھی؟"

"آخر اتنی نفرت کیوں تھی ان کو اپنے بیٹے سے؟"

"نفرت پہلے تو نہیں تھی۔ وہ بھی ایک فرمانبردار بیٹا تھا۔"

"آپ نے ایک بھی تصویر چھپا کے نہیں رکھی؟"

"رکھی تھی، اب نہیں ہے۔" ماں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب تک امید زندہ تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ لوٹ آئے گا۔"

"آخر کیوں چھوڑ گئے وہ آپ کو... اور شادی کے کتنے عرصے بعد؟"

"دو ہفتے بعد... دو ہفتوں میں تو ہاتھ کی مہندی بھی نہیں اترتی ایک نئی دلہن کی... بس ایک دن میں اٹھی تو وہ نہیں تھے۔"

"وہ اچانک غائب ہو گئے آپ کو بتائے بغیر؟"

ماں کا سر آہستہ سے ہلا۔ "یہ پندرہ دن بھی یوں گزرے... کہ نہ گزرتے تو اچھا تھا۔"

"میں اس بات کا مطلب کیا لوں؟ آپ کی شادی زبردستی کر دی گئی تھی... آپ کی مرضی کے خلاف؟"

"نہیں، یہ بات نہیں... یہاں لڑکیوں کی پسند ناپسند کہاں چلتی ہے۔ پسند کرتے ہیں لڑکے کے ماں باپ اور بیاہ دیتے ہیں لڑکے سے... اس کی بھی کون سنتا ہے۔ مجھے زیادہ خوشی تھی شادی کی کیونکہ میں تو بیاہ کے راج محل جا رہی تھی۔ کٹیا کی رہنے والی کا خواب سچ ہو گیا تھا۔ لوگ رشک کرتے ہوں گے میری قسمت پر اور ماں باپ تو خوش تھے ہی... دادا صاحب پڑھے لکھے اور معقول انسان تھے۔ پھر جب میں نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا تو میرا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ لیکن ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور خوشی کا سونے سے کیا تعلق... وہ تو پیتل سے بھی مل جاتی ہے... خوش میرا شوہر نہیں تھا۔ زبردستی اس کے ساتھ ہوئی تھی۔"

"انہوں نے اعتراف کر لیا تھا آپ کے سامنے؟"

"ہاں، میں بھی جانتی ہوں کہ شادی سے پہلے لڑکے لڑکیاں دل لگی میں کسی پڑوسن یا کزن سے دل لگا بیٹھتے ہیں مگر شادی کے بعد نہ وہ بیویوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے کتنے پرستار تھے اور نہ بیویاں جاننا چاہتی ہیں کہ شوہر نے کس کس سے دل لگی کی اور کہاں دل لگایا۔ زندگی سکون سے وفادار رہ کے گزر جاتی ہے۔ میں بھی کیوں پوچھتی... انہوں نے صاف کہا کہ فاطمہ یہ شادی دادا صاحب نے زبردستی کی ہے۔ جب میں خوش نہیں تو پھر تمہیں خوشی کیسے دوں گا؟ مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا۔ میں اس اعترافِ جرم کو پی گئی۔ وہ گم صم رہتا تھا جیسے سوگ میں ہو۔ بات بہت کم کرتا تھا۔ تین دن بعد اس نے خود مجھے چھیڑا۔ 'تم پوچھو گی نہیں... کہ تم جیسی لڑکی کے ساتھ میں خوش کیوں نہیں ہوں؟' میں نے ٹالا کہ ہو گی کوئی ایسی بات مجھے کیا۔ مگر انہوں نے کہا۔ 'میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا۔' پھر میں نے پوچھ لیا کہ کون ہے

وہ... اور انہوں نے کہا کہ مجھے خود نہیں معلوم وہ کون ہے اور کہاں ہے... لیکن ہے ایک لڑکی۔ کب سے میں اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ اس کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہوں۔ وہ ملتی ہے اور پھر کھو جاتی ہے۔ اس بات نے مجھے حیران کیا۔ میں نے پوچھا کہ ایسی کون لڑکی ہے تو انہوں نے ایک عجیب کہانی سنائی... انہوں نے کہا کہ مجھے سب سے پہلے وہ قاہرہ میں ملی تھی۔"

"قاہرہ کب گئے تھے وہ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"وہ مرچنٹ نیوی میں تھے۔ تجارتی جہازوں پر دنیا بھر میں آنا جانا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی دادا صاحب کا فیصلہ تھا۔"

"آئی سی... اس وقت بھی وہ اسمگلنگ کرتے ہوں گے اور بیٹے کو بھی اس لائن پر ڈالنا چاہتے ہوں گے۔"

"وہ آفیسر تھے۔ جہاز بصرہ پر لنگر انداز ہوا۔ ایک ہفتے بعد اسے لنگر اٹھانا تھا۔ تین دن کے لیے عملے کو قاہرہ جانے کی اجازت ملی۔ کم تو بصرہ بھی نہیں لیکن قاہرہ تو مشرق کا پیرس ہے۔ ٹورسٹ دنیا بھر سے آتے ہیں تو ان کی تفریح کے اسباب بھی سب مہیا ہیں۔ وہ کسی نائٹ کلب میں گئے جہاں وہ رقص ہوتا ہے جس میں ڈانسر پیٹ ہلاتی ہے۔"

"بیلی ڈانس..." میں نے ہنس کے کہا۔ "تمہیں تو سب معلوم ہے ماں۔"

"انہوں نے ہی بتایا تھا مجھے... وہاں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ جوا، شراب سب... کچھ پلاتی ہیں شراب... وہ حقہ پلاتی تھی۔ اسے شیشہ کہتے ہیں، نازک شیشے کے حصے جن میں خوشبودار تمبا کو ڈالا جاتا ہے اور بھی بہت سے نشے والی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ وہ حقہ لے کر جوا کھیلنے والوں کے درمیان پھرتی تھی۔ الجزیرہ کلب تھا غالباً اس کا نام۔ دوسرے حصے میں ڈانس ہوتا تھا اور بار تو ہر جگہ تھا۔ وہ کوئی انڈین تھی۔ اس کی چوٹی بہت لمبی تھی اور جب وہ بال کھولتی تھی تو وہ کمر سے نیچے تک جاتے تھے۔ ظاہر ہے حسین تو ہوگی اور جوان بھی... بس اس پر مر مٹے وہ... مگر دوبارہ گئے تو وہ نہیں ملی۔ انہوں نے دوسرے کلب دیکھے، قحبہ خانے اور شراب خانے دیکھے۔ اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ جہاز لنگر اٹھا کے پورٹ سعید چلا گیا اور یہ رہ گئے قاہرہ میں... انہوں نے دیوانگی میں نہ کسی کو بتایا نہ چھٹی لی۔ نتیجہ یہ کہ نوکری گئی۔ دو مہینے یہ لاپتا تھے۔ پھر ویزا اور پاسپورٹ ختم ہو گئے تو پولیس نے پکڑا، اس وقت دادا صاحب کو پتا چلا۔ اس سے پہلے کوئی کوشش ناکامیاب نہیں ہوئی تھی۔ خیر ان کو واپس لایا گیا تو یہ مجنوں بنے ہوئے تھے پھر موقع ملتے ہی نکل گئے۔ اہرام مصر میں بھٹکتا پھرا... اسکندریہ... بصرہ... پھر دمشق کی طرف نکل گیا۔ مریم کوئی خیالی مخلوق تھی کہ ملی نہیں۔"

مجھے یوں لگا جیسے ایک دھماکے سے راکٹ فائر ہوا جس نے مجھے زمین سے اٹھا کے خلا میں پہنچا دیا۔ "مریم؟" میں نے چلّا کے پوچھا۔ "یہی نام لیا تم نے ماں... یا میں نے غلط سنا؟"

"مجھے مریم ہی بتایا تھا انہوں نے... کسی نے بتایا کہ وہ کسی عرب شیخ کے حرم میں ہے۔ کسی نے کہا کہ واپس انڈیا چلی گئی۔ وہ پاکستانی کو بھی انڈین کہتے ہیں۔ وہ بمبئی چلا گیا کسی بحری جہاز میں چھپ کے، وہاں پکڑا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ بعد میں دو بار نظر آئی لیکن ہاتھ نہ آئی۔ انہوں نے اظہار محبت بھی کر دیا تھا لیکن اس نے شاید اہمیت نہیں دی۔ انڈین پولیس نے تو پکڑ کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ دادا صاحب کا اثر رسوخ کام نہ آتا تو وہیں جیل میں سڑ جاتا۔ باپ نے بیٹے کو چھڑا لیا اور یہاں لا کے شادی کی زنجیر سے باندھ دیا مگر دیوانے کو باندھ سکا ہے کوئی... بندھی ہوئی میں رہ گئی۔ ایک صبح دیکھا تو بیڈ پر اس کی جگہ خالی تھی۔ گھر میں بھی نہیں تھا وہ۔ چوبیس سال ہو گئے وہ دادا صاحب کو بھی نہیں ملا۔ یا وہ آج بھی مریم کے پیچھے سرگرداں ہے یا اس سے شادی کر بیٹھا ہے یا... دنیا میں ہی نہیں ہے۔ یہ میں کیسے فرض کر لوں...؟"

میں سب سن رہا تھا اور کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ میرے دماغ میں خیالوں کے بگولے سنسنا رہے تھے اور پس منظر میں ایک صدایوں گونج رہی تھی جیسے خاموشی میں کسی گرجا کے گھنٹے بج رہے ہوں۔ وہ عبادت کے لیے بھی بلاتے ہیں اور کسی کے مرنے کی خبر بھی دیتے ہیں۔

مجھے تاریخ کے گرداب نے اپنے بھنور میں کھینچ لیا تھا۔ ماں نے مجھے تاریخ کے حوالے اپنے انداز میں دیے تھے۔ پچھلی نسل کی تاریخ میں مریم نے وہ کیا تھا جو اگلی نسل کے ساتھ مریم آج کر رہی تھی۔ کسی وقت دادا صاحب سے بھی تو پوچھنا چاہیے کہ آپ کیوں اکیلی بدروح کی طرح دنیا میں رہ گئے ہیں۔ قارون کا خزانہ اور فرعون کی رعونت آپ کے کس کام کی اگر وہ چھوٹی سی چیز جسے خوشی کہتے ہیں آپ کو میسر نہیں... کیا آپ بھی کسی مریم کے آسیب کا شکار ہوئے تھے... آخر کون ہے یہ مریم؟

میں مسلمان تھا۔ دوسرے جنم یعنی آواگون کے مسئلے کا قائل نہ تھا جو ہندو مذہب کے عقائد کا حصہ ہے۔ انسان کے سات جنم ہوتے ہیں۔ اچھے اعمال ہوں تو وہ اگلے جنم میں سکھ پاتا ہے ورنہ دکھ اٹھاتا ہے۔ نہ جانے کتنی ہٹ فلمیں اسی خیال پر مبنی تھیں۔

کیا ایک مریم بار بار جنم لے کر اس خاندان کی نسلوں کے لیے آسیب بن کے نمودار ہو رہی ہے؟ میری اور میرے باپ کی کہانی میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ مجھے بھی مریم ملتی تھی اور جھلک دکھا کے غائب ہو جاتی تھی۔ میں نے بھی اسے گلی گلی، نگر نگر دیوانہ وار تلاش کیا تھا اور ابھی نہ جانے یہ تلاش مجھے جنوں کی کون سی منزل تک پہنچائے گی۔ کسی دن میں بھی اپنی بیوی کو بیوہ کیے بغیر اس سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤں گا۔ یا میرے خدا... کیا یہ آسیب اسی طرح ہمارا پیچھا کرے گا یا مجھ پر پہنچ کے یہ کہانی ختم ہو جائے گی؟

ماں کے سوال پر میں چونکا۔ "تو کہاں چلا گیا؟" میں نے کہا۔ "میں... یہاں ہوں نا تمہارے سامنے۔"

"نہیں، یہاں نہیں تھا تُو... تُو کہیں اور تھا۔"

میں نے بات کو گھما دیا۔ "ماں! یہ دادا صاحب کیا ہمیشہ سے اکیلے ہیں؟ دادی کے بارے میں انہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی...؟ ان کے بھائی بہن بھی تو ہوں گے؟"

"نہیں، یہ بھی عجیب بات ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کے اکلوتے تھے۔ اس سے پہلے کا مجھے کوئی پتا نہیں۔"

"شادی تو انہوں نے کبھی کی۔ میرا باپ اس کا ثبوت ہے لیکن ان کے ساتھ دادا صاحب کا دوغلا رویّہ ہے... لگتا ہے اس بیٹے کے بغیر وہ نہیں رہ سکتے تھے جبھی تو بار بار اسے مریم کے چنگل سے چھڑا کے لے آتے تھے مگر ان سے نفرت اس گھر کے در و دیوار میں بسی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کو شک تھا۔"

ماں میری بات سمجھ گئی۔ "کون پوچھ سکتا ہے ان سے؟ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ شادی کے صرف ایک سال بعد... جب تیرے والد کی عمر چند ہفتے کی ہوگی۔"

"یعنی میرا شک صحیح بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو بہت پرانی بات ہے، پاکستان اس وقت نہیں بنا تھا مگر سال وہی تھا... 1947ء... دادا صاحب مشرقی پنجاب کی کسی تحصیل میں تھے۔ کیا کہتے تھے اسے... ہاں کلکٹر... ایک انگریز کے ساتھ... اس کا نام مجھے یاد نہیں۔ یہ جو انگریزوں نے ایک کمیشن بنایا تھا پاکستان اور ہندوستان کی سرحد مقرر کرنے کے لیے۔"

"ریڈ کلف کمیشن۔" میں نے کہا۔

"دونوں اس میں چلے گئے تھے... انگریز کو جانا تھا۔ جب تک وہ یہاں رہے انہوں نے ملک کو خوب لوٹا۔ یہ انگریز بھی واپسی سے پہلے اتنا جمع کر کے لے جانا چاہتا تھا کہ واپس ولایت جائے تو خود بھی آرام سے بیٹھ کر کھائے اور اس کی اگلی نسل کو بھی کمی نہ پڑے۔"

"دادا صاحب کی شادی نہیں ہوئی تھی؟"

"بتایا نا اسی سال ہوئی تھی۔ سنا ہے پرتھ میں کوئی لڑکی تھی جس سے ان کو عشق ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ راضی نہیں تھے۔ پھر وہ غائب ہو گئی۔"

میں چونک پڑا۔ "وہ بھی غائب ہو گئی؟"

"ہاں اور پھر ملی کسی ریفیوجی کیمپ میں... کیمپ سرحد کے دونوں طرف تھے جہاں اغوا کی جانے والی لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔ کچھ بھاگ کے آجاتی تھیں تو کچھ کو تلاش کر کے لایا جاتا تھا۔ اکثر تو دونوں طرف کے خاندان انہیں قبول نہیں کرتے تھے۔ نہ ہندو نہ مسلمان... وہ لاوارث پڑی اپنوں کا انتظار کرتی رہتی تھیں کہ کوئی ان کو تلاش کرتا آئے اور انہیں لے جائے۔ غالباً وہیں دادا صاحب نے پھر اسے دیکھا۔"

"مریم کو؟"

"نام مجھے نہیں معلوم... اور اس سے شادی کر لی۔ اسے بھی ہندو بلوائی اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"یعنی میں نے جو سوال کیا تھا، بے بنیاد نہیں تھا۔ کیا وہ امید سے تھی؟"

"مجھے نہیں پتا۔ کیمپس میں بہت بچے پیدا ہوئے جن کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ماں ہندو ہو یا مسلمان، باپ کا پتا نہیں تھا۔ صرف اتنا جانتی ہوں میں کہ تیرا باپ دس بارہ دن کا تھا جب دادا صاحب نے اسے شوٹ کر دیا تھا لیکن وہ بڑے افسر تھے، ان پر ہاتھ کون ڈال سکتا تھا۔ لاوارث لاشیں تو ہر فسادزدہ شہر کی سڑکوں پر سے روز اٹھائی جاتی تھیں اور وہ سرحد کے دونوں طرف آتے جاتے تھے۔"

اس سے پہلے کہ ماں کچھ اور کہتی دروازہ ایک دم کھلا اور میں نے دادا صاحب کو دیکھا۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور وہ اندر آنے کے بعد ایک جگہ کھڑے ہو گئے

تھے۔ ان کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور ان کی نظر ماں پر جمی ہوئی تھی۔

''توتم نے سب بتا ہی دیا اسے؟'' انہوں نے کہا۔

''ہاں، اب آپ گولی ماردو مجھے... یوسف کی جان بخشی کردو۔ قصور تو میں نے کیا ہے۔'' ماں نے کہا اور میرے سامنے ہاتھ پھیلا کے ڈھال بن گئی۔

''میں نے سب سنا۔ اپنے کمرے میں۔'' دادا صاحب بولے۔ ''مگر بہو... اسے جتنا بتانا ضروری تھا، میں نے خود ہی بتا دیا تھا۔ جو تم نے بتایا اس سے یوسف کو فائدہ کچھ نہیں ہوگا... نقصان زیادہ ہوگا۔''

پھر ان کا ہاتھ اٹھا۔ میں نے دھکا دے کر ماں کو فرش پر گرا دیا اور دادا صاحب پر جست لگائی۔ اس وقت تک وہ فائر کر چکے تھے۔ میں زمین پر گرا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر دادا صاحب گرے اور میں نے خون کو ان کے سر سے ابل کر فرش پر بہتا دیکھا۔ گولی انہوں نے خود پر چلائی تھی۔

دادا صاحب کے انتقال کی خبر میں نے صرف اعجاز کو دی تھی یا اپنے پاس پڑوس... شاید ان کے ملازمین میں سے کسی نے... جو درحقیقت انہی کے گینگ میں شامل ہوں گے، خبر اخباروں کو دی اور ایک بڑے اخبار میں یہ اشتہار کے طور پر ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کے موٹے حروف کے ساتھ یوں شائع ہوئی کہ نامور سماجی کارکن کا انتقال پُرملال... سوئم بعد نماز جمعہ ماڈل ٹاؤن کی فلاں مسجد میں ہو گا۔ نیچے سوگواروں میں صرف میرا نام تھا۔ خبر میں اسے خودکشی ہی بتایا گیا تھا لیکن اضافہ یہ کیا گیا تھا کہ مرحوم عرصہ دراز سے اپنی سیاسی وسماجی مصروفیات سے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ وہ انتہائی مخیر اور فلاح کے کاموں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے اور بہت سے مستحق ناداروں کی امداد خاموشی سے کرتے تھے۔ طویل ناقابلِ علاج بیماری کے باعث وہ ڈپریشن کا شکار تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔

صبح میں نے باہر شامیانہ لگا دیکھا۔ دوپہر سے قبل لوگ آنا شروع ہوئے۔ تعزیت کا فون اعجاز کے سوا کسی نے بھی نہیں کیا تھا اور اس کی دادی نے میری ماں سے تعزیت کی تھی۔ نمازِ ظہر سے قبل ہی شامیانہ بھر گیا۔ نہ جانے کس کس نے مجھے گلے لگا کے اور پُرملال چہرے بنا کے صبر کی تلقین کی۔ شاید سو بار میں نے ان کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ آنے والوں میں کچھ اہم سیاسی شخصیات کی موجودگی میرے لیے حیران کن تھی۔ میں انہیں پہچانتا نہیں تھا۔

اعجاز نے مجھے کافی لوگوں کے بارے میں مفید معلومات دیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ دادا صاحب کے کچھ بدنام سیاست دانوں سے بھی تعلقات تھے۔ اب تک میں نے صرف سنا تھا کہ کرپٹ بیوروکریٹس اور لیڈر بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے بڑے بڑے اسمگلرز کی مدد لیتے ہیں اور پیسا دبئی یا سوئٹزرلینڈ لے جاتے ہیں، عرفِ عام میں یہ منی لانڈرنگ کہلاتا ہے۔ آنے والوں میں یقیناً میرے دادا صاحب کے حریف اور دشمن بھی ہوں گے۔ خبر بے بنیاد تھی۔ نہ وہ طویل مدت سے ناقابلِ علاج بیماری کا شکار تھے اور نہ انہوں نے خود کو ڈپریشن میں گولی ماری تھی لیکن اسے ہی سچ مانا جا رہا تھا۔

اب میری بھی مجبوری تھی کہ واحد صبر جمیل کے مستحق کی حیثیت سے انتہائی غم زدہ نظر آؤں۔ یہ اداکاری میں نے ٹھیک کی۔ ماں کے پاس آنے والیوں کی تعداد انتہائی قلیل رہی۔ اعجاز کی دادی کے علاوہ کچھ محلے دار خواتین ضرور آئیں مگر کسی بدنام بزنس مین، سیاست داں یا بیوروکریٹ کی کسی اہلیہ نے زحمت نہیں کی۔ یہ سب لوگ دوبارہ بھی دکھائی نہیں دیے۔ مزید حیرانی مجھے سوئم پر ہوئی۔ جو تدفین کے لیے عمل سے بچنا چاہتے تھے، وہ سوئم پر نمودار ہوئے۔ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

سوئم سے فراغت ہوئی تو گھر چکن قورمے، بریانی کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا اور ملازمین نے بچ جانے والی دیگوں کو مسجد بھجوا کے مزید ثوابِ دارین کی فراہمی یقینی بنا دی تھی۔ گھر کے اندر سناٹا تھا۔ میں ماں کے کمرے میں بیٹھا تھا اور زیادہ پُرسکون تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کی ہمت نہ رکھتا تھا کہ اب ہم آزاد ہیں۔

دن میں کھانے کی نہ فرصت تھی اور نہ خواہش۔ اب میں نے ماں کے ساتھ کھانا کھایا۔ میں نے پوچھا۔ ''ماں! دادا صاحب نے خود کو گولی مارنے سے پہلے کہا تھا کہ میں نے سب سن لیا ہے... کیسے؟''

''ان کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے یہاں خفیہ کیمرے، مائکروفون وغیرہ لگے ہوں گے؟'' میں نے چھت کا بغور جائزہ لیا۔

''ہوں گے... مجھے کیا پتا... میں تو تجھ سے اس لیے کہتی تھی کہ آہستہ بول۔''

''میں لائبریری میں چیک کرتا ہوں۔'' میں نے

کہا۔

گھر خاصا آسیب زدہ لگ رہا تھا۔ میں نے نوکروں سے ساری لائٹیں جلانے کے لیے کہا اور لائبریری میں جاکے ان کے سارے رابطوں کے ذرائع کا جائزہ لیا۔ مجھے دو سیٹلائٹ فون ملے جو THORAYA کے تھے اور ان کو ہماری حکومت یعنی پیمرا نہ چیک کرسکتی تھی اور نہ بند کرسکتی تھی۔ دو بلیک بیری تھے جن کے پیغامات کو خفیہ پن کوڈ کے بغیر کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ بہت آسانی سے میں نے گھر کے اندر کی آوازوں کو سننے کا نظام تلاش کرلیا اور ماں کی ساری گفتگو کا ٹیپ حاصل کرلیا۔ دادا صاحب نے مرتے وقت سچ ضرور بولا تھا۔

مجھ پر ایک عجیب سی دہشت کا غلبہ تھا۔ اس بچے کی طرح جس نے ابھی ازار بند اور جوتوں کے تسمے باندھنا سیکھا ہو اور اسے تختِ شاہی پر بٹھا دیا جائے کہ اس مرکزِ اقتدار سے امورِ سلطنت چلاؤ۔ میرے علم اور قیاس کے مطابق یہ لائبریری کسی قومی یا بین الاقوامی جرائم پیشہ خطرناک گروہوں کے نیٹ ورک کا کنٹرول سینٹر تھا لیکن میں جو ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول کو پوری طرح آپریٹ نہ کرپاتا تھا اُسے خاک سمجھتا۔ اس وقت تو میں نے یہی فیصلہ کیا کہ فوری طور پر نہ سہی لیکن میں اس شیطانی قوت کے مرکز کو اولین فرصت میں ختم کردوں گا۔ ممکن ہوا تو اس مافیا پیلس سے خود بھی نکل جاؤں گا۔

مجھے یقین ہے کہ اس رات ماں کی آنکھ بھی نہ لگی ہو گی۔ میں اپنے کمرے میں جاگتا رہا کیونکہ خیالات کی پریشان کن یلغار میں پلک جھپکانا بھی محال تھا۔ میں نے کئی بار کافی پی اور لندن کو یاد کرتا رہا جہاں اعصاب کی تقویت کے لیے شراب ایک سہارا بنتی تھی۔

میں خود کو اور ماں کو اس شیطانی چکر سے بحفاظت نکال کے سکون اور سلامتی والے کسی ایسے مکان میں لے جانا چاہتا تھا جو گھر لگے۔ لیکن مجھے اپنی راہ میں بہت سی رکاوٹیں نظر آتی تھیں۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ دادا صاحب کے بینک اکاؤنٹ کہاں تھے۔ ملک میں اور ملک سے باہر... ان کے اثاثے کتنے تھے اور کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے۔ شاید وہ رفتہ رفتہ سب بتا دیتے۔ ماں نے ان کے ظاہر کا پردہ اٹھایا تو وہ اپنے باطن کے ساتھ سمجھوتا نہ کرسکے۔ ایک فوری جذباتی ردِعمل کے تحت انہوں نے کسی ڈائریکٹر کی طرح کہا، کٹ... اور اپنی زندگی کی فلم وہیں ختم کردی۔

شاید ماں کو بینک اکاؤنٹس کا علم ہو یا اس کوٹھی کے کسی تہ خانے میں یا تجوریوں میں دنیا بھر کی کرنسی بھری پڑی ہو۔ اثاثے اگر ہوں گے تو انویسٹمنٹ کی صورت میں... کیا ان کی دبئی میں یا سوئٹزرلینڈ میں پراپرٹی ہوگی؟ میں یہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کسی درویش جیسے استغنا کے ساتھ ساری حرام کی کمائی سے دستبردار ہو کے ماں کا ہاتھ پکڑوں اور اس مافیا پیلس کو خیرباد کہوں۔ میں دادا صاحب کا جائز قانونی وارث تھا۔ میرا اس کمائی پر حق تھا۔ اس غیر اخلاقی، غیر قانونی یا غیر شرعی دولت کو جمع کرنے میں میرا ایک فیصد دخل نہ تھا۔ جس نے یہ سب کیا تھا، وہ گیا سکندر کی طرح دنیا سے خالی ہاتھ... مجھ پر کوئی الزام کوئی بارِ گناہ نہیں... اور میں نے یہ سب چھوڑا تو کون سا یہ مال مستحق ناداروں کی فلاح پر استعمال ہوگا۔ حکومت سب ضبط کرلے گی۔

میرا خیال تھا کہ اگر یونہی سوچتا رہا تو میں آج رات اور اس سے اگلی رات بھی سو نہیں پاؤں گا۔ میں خواب آور گولیاں استعمال کرنے کا جواز رکھتا تھا مگر وہ دستیاب نہ تھیں چنانچہ میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں اور وہ سب دعائیں اور آیات پڑھنے لگا جو ماں نے مجھے سوتے وقت پڑھنا سکھایا تھا۔

پھر اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھا کے کہا۔ ”ہیلو۔“

دوسری طرف سے ایک لڑکی نے کہا۔ ”کون... دلیپ کمار؟ یا یوسف خان...“ اس کے لہجے میں شوخی اور شرارت تھی۔

میں نے کہا۔ ”کون ہو تم؟“

”تم بتاؤ۔“ وہ ہنسی تو جیسے گھنگھرو بکھر گئے۔

”دیکھو... تم ان میں سے ہو جو رات کو اِدھر اُدھر کال کر کے لطف لیتی ہیں تو آج میں بالکل اس موڈ میں نہیں ہوں۔“

”اپنا موڈ ٹھیک کرلو... یہ کیا مشکل ہے... اور مجھ سے بات کرو گے تو سارے غم دور ہو جائیں گے تمہارے۔“

ایک دم میرا دماغ دادا صاحب سے ہٹ کے واقعی بہت ریلیکس اور ایزی ہونے لگا۔ میں نے کہا۔ ”اوکے... میں یہ نسخہ آزماؤں گا کیونکہ میں اتنا اپ سیٹ تھا کہ خواب آور گولیوں کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔ شاید تم سے کچھ دیر باتیں کرنے سے فرق پڑے۔ اب بتاؤ کہ تم ہو کون... مجھے تو جانتی ہو تم...؟“

”میں مریم ہوں۔“

یہ الفاظ ایک بم کا دھماکا بن کے میرے کان میں پھٹے۔ میں نے چلا کے کہا۔ ”مریم... تم واقعی مریم ہو؟“

”اُفوہ... اتنا چلاتا ہے تو فون رکھ دو... تمہاری آواز سن لوں گی میں۔“ وہ ہنسی۔

”تم وہی ہونا... سفید ہنڈا سٹی میں نکل گئی تھیں مجھے بلیک کرولا دکھا کے؟“

”دو منٹ اور ٹھہرتے تو دیکھ لیتے خود... مگر تم تو بھاگے ایسے جیسے بیوی دیکھ رہی تھی غصے سے۔“ وہ پھر ہنسی۔

”بیوی؟ اس کے لیے تو شادی کرنی پڑتی ہے اور تم اب...“

”واہ! کیا بات ہے... تعارف ہوا نہیں اور ڈائریکٹ پروپوزل... جناب دلیپ کمار صاحب! میں شادی شدہ ہوں۔ وہ تو کارڈ نظر آگیا تمہارا تو میں نے سوچا بات کرلوں۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

”گویا فون پر تم جھوٹ سچ جان لیتے ہو؟ کیا بات ہے... نام پتا معلوم نہیں میرا۔“

”اب فون نمبر آگیا ہے تو پتا معلوم کرلوں گا میں... نام مریم ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”میرا نام مریم نہیں ہے۔“

”پھر جھوٹ... مریم نام نہیں تو میرے پکارنے پر رکی کیوں تھیں؟“

”وہ تو تم مجھے اللہ رکھی کہہ کے بھی آواز دیتے اور میری طرف یوں دوڑتے آتے تو میں رک جاتی۔ اچھا، ابھی اجازت... میرا شوہر آرہا ہے۔“

”مریم!“ میں چلایا مگر لائن کٹ چکی تھی۔ وحشت میں بار بار نمبر ملانا بے مقصد اور لاحاصل ثابت ہوا۔ دوسری طرف سے وہی جواب آتا رہا کہ جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔ یا میرے خدا! یک نہ شد دو شد... اس مریم کو بھی آج ہی آنا تھا۔ ایک اور مریم... خاندان کی پرنحوست تاریخ کا اگلا باب یا ایک تلاش کا مبارک انجام۔ ماں تو ہر واقعے کو کسی سال کی نحوست سے وابستہ کرلیتی ہے۔

اور اس وقت مجھ پر چودہ طبق روشن ہوگئے جب مجھے خیال آیا کہ دادا صاحب نے خودکشی 18 اکتوبر کو کی تھی۔ اور یہ وہ منحوس تاریخ تھی جب بالاکوٹ کا زلزلہ ایک لاکھ زندگیوں کو نگل گیا تھا۔ او مائی گاڈ! میں ایک دم اٹھ بیٹھا اور صبح تک ایسے ہی بیٹھا رہا۔ مریم کے تصور میں... اس کی آواز کے خیال میں... اس کی ہنسی... اس کا ”کیا بات ہے“ کہنے کی ادا... اس کے جھوٹ کی سفیدی میں شرارت... میں واقعی مایوسی اور پریشانی کے خلجان سے نکل آیا تھا۔ اور خوش تھا۔ اس کے دعوے میں صداقت تھی۔

میں ماں کو سلام کرنے گیا اور وہیں ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ ”ماں... اب کیا ہوگا؟“

”کیا ہوگا؟“ وہ بولی۔ ”مجھے بھی یہی فکر تھی۔“

”پہلے بتاؤ دادا صاحب کے زمانے میں گھر کیسے چلتا تھا؟ اخراجات کہاں سے پورے ہوتے تھے... پیسا کہاں ہے؟“

”پیسا تو ہے... الماری میں دیکھ لے تُو... نوٹ بھرے پڑے ہیں نیچے سے اوپر تک۔“

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”گھر میں؟ اور تمہیں کوئی ڈر نہیں... چور ڈاکو کا... آگے کیا کریں گے ہم... یہ کاغذ کے ڈھیر کسی ٹرک میں ڈال کے بینک لے گیا تو پولیس مجھے الٹا ٹانگ دے گی کہ پیسا جعلی نہیں تو پھر ذرا حساب بتاؤ آئے کہاں سے؟“

”دادا صاحب کے ہوتے میں نے تو سوچا نہیں کبھی۔“

”ان کے بینک اکاؤنٹس کے بارے میں کچھ پتا ہے؟ اور ان کی جائداد کہاں کہاں ہوسکتی ہے؟“

”کیسی باتیں کرتا ہے... یہ مجھے کیسے معلوم ہوگا؟“

”مر گئے... دیکھو ماں! میرا تو خیال ہے کہ آج رات نکل لیں یہاں سے... جتنا مال ہے سب سمیٹ لیں۔ ساری زندگی کے لیے بہت ہے۔ روپوش ہو جائیں... مجھے تو ان نوکروں کی فوج سے ڈر لگتا ہے۔ ان کی آنکھیں دیکھ کر... ان سے کون نمٹے گا؟“

”یہ سب چلے جائیں گے۔ انہوں نے کہہ دیا ہے۔ صرف ایک وہ بڑی بی رہیں گی جو داروغہ بیگم ہیں۔“

میں نے سکون کی سانس لی۔ ”چلو یہ اچھا ہے۔ ہم خیر و عافیت کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں، یہ پہلا کام ہے۔ پھر کہیں سیٹل بھی ہو جائیں گے۔ یہاں نہ سہی، اسلام آباد ہے، کراچی ہے۔“

”جیسی تیری مرضی... میں تو آگے کا سوچ رہی ہوں۔“

”میری شادی کا؟ ضرور سوچو... لڑکی مل گئی ہے۔“

ماں کے کوئی سوال کرنے سے پہلے ایک ملازم نے مجھے بتایا۔ ”وکیل صاحب آئے ہیں... ڈرائنگ روم میں

بیٹھے ہیں۔"

"کون وکیل صاحب؟ میں نے تو کسی وکیل کو نہیں بلایا۔"

"دادا صاحب کے قانونی مشیر... آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"رحمان صاحب ہوں گے۔ جا کر لے۔"

رحمان صاحب کے سر پر بالکل سفید گھنے بال تھے۔ وہ چھ فٹ قد کے بھاری بھرکم شخص تھے جن کی شخصیت سے خلوص اور نیک دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ انہوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "میں دادا صاحب کا قانونی مشیر ہوں اور آپ کی راہنمائی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "بڑی عنایت کی آپ نے میرے حال پر... مجھے واقعی راہنمائی کی سخت ضرورت تھی۔"

"آپ دادا صاحب کے وارث ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی سارے اثاثے آپ کے نام منتقل کر دیے تھے۔ میں آپ کو سمجھا دیتا ہوں۔"

"دیکھیے... نہ میرا دادا صاحب کے کاروبار سے کوئی تعلق تھا اور نہ میں آج یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کرتے تھے اور کیوں... آپ مجھے اس دلدل سے نکال لیں جس میں آج میں خود کو گرا ہوں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ان کے کتنے بینک اکاؤنٹس تھے اور کہاں کہاں... اور کیا اثاثے تھے۔"

رحمان صاحب مسکرائے۔ "ان کا صرف ایک بینک اکاؤنٹ تھا۔ اس میں جو کچھ ہے، سب تمہیں مل جائے گا قانونی حق وراثت ملنے کے بعد... اور پراپرٹی صرف یہ ہے۔ آپ یہ بینک اسٹیٹ منٹ دیکھ لیں۔"

میں نے ان کے ہاتھ سے کاغذات لے لیے اور ان سے گھر میں موجود کالے دھن کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی...

بالآخر رحمان صاحب خضر راہ... فرشتۂ غیب یا الٰہ دین کے چراغ والے جن کی طرح نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے دنیاوی تجربے، قانونی مہارت اور ذہانت سے میرے سارے مسئلے حل کر دیے جن کے بارے میں خود میں ذرا بھی پُرامید نہیں تھا۔

☆☆☆

شاید کچھ پڑھنے والوں کو اس کہانی کے انجام سے مایوسی ہو... لیکن حقیقت میں کوئی ڈراما نہیں ہوتا اور اس کہانی پر کوئی پُراسرار فلم بنانے والا دو والیا ہو سکتا ہے۔

آج میں ایک نئے گھر میں جو پہلے والے کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے مگر زیادہ خوب صورت ہے، اپنی بیوی کے ساتھ بڑے سکون سے زندگی گزار رہا ہوں۔ وہ کوئی پراسرار ہستی یا روح نہیں تھی اور نہ یہ اس کا دوسرا تیسرا جنم تھا۔ حقیقت میں تو اس کا نام بھی مریم نہیں۔ اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ سرِراہ کوئی چلا کے مجھے بھی پکارے "زرداری صاحب" اور دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا ہو تو میں پلٹ کے اور رک کے ضرور دیکھوں گا۔ اس کا نام تو بڑا دقیانوسی ہے۔ رضیہ سلطانہ جو میری ماں فاطمہ کو بہت پسند ہے۔ اس کا باپ اکبری منڈی کا آڑھتی تھا۔ میرے جیسا داماد اسے یوں ملا جیسے تیل بیچنے والے کے آنگن میں تیل کا کنواں نکل آئے۔ انکار وہ کیسے کرتا۔

دادا صاحب کی زندگی کتنی پراسرار تھی، مجھے نہیں معلوم اور میں جاننے کی کوشش کرتا تو گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ... بلکہ سر ڈالتا۔ دنیا کے لیے وہ کیا تھے، کیسے تھے... مجھے اس سے کیا سروکار... میرے لیے وہ صرف دادا صاحب تھے۔ اپنی جانشینی کے چکر میں انہوں نے اپنا بیٹا گنوا دیا تھا۔ اپنے پوتے کو انہوں نے پورا تحفظ اور ایک اچھا خوش حال مستقبل فراہم کرنا یقینی بنایا اور جب یہ مقصد پورا ہو گیا اور ان کی شخصیت کے بے نقاب ہونے کا خطرہ پیدا ہوا تو انہوں نے کہا کہ بس اب میرا کام تو ختم ہوا اور وہ چلے گئے۔ میری نظر میں وہ صرف دادا ہیں، دادا صاحب نہیں۔

دراصل ہم زندگی کے حقائق میں اتفاقات اور حادثات کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے بچہ کلیڈ اسکوپ میں رنگین شیشوں کو گھما کے دم بخود کرنے والے پیٹرن دیکھتا ہے۔ حقیقت تو کچھ بھی نہیں ہوتی۔ وہ صرف شیشے کے بے مصرف ٹکڑے ہوتے ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں "دادا صاحب ویلفیئر ٹرسٹ" تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ چشمہ پہنے سادہ ساڑی میں ملبوس ایک پُروقار عورت اس کی نگراں ہے۔ پہلے وہی اس ٹرسٹ کی عمارت کی مالک تھی لیکن آج یہ دادا صاحب کی یاد میں ایک صدقہ جاریہ ہے۔

اور ہاں... شادی کے بعد میں نے اور رضیہ نے اپنا ہنی مون لندن میں گزارا تھا۔ کیسے جبکہ وہاں تو میرا داخلہ ہی ممنوع تھا۔ مجھے تو وہاں پہلے قانونی طور پر ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ سمجھا کریں نا... دولت کی نہ کوئی جغرافیائی سرحد ہوتی ہے اور نہ قانونی... اور اس کا کوئی رنگ بھی نہیں ہوتا۔